منازل العرفان

في تفسير القرآن الكريم

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث

حضرت مولانا سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہم

جلد گیارہ

سورۃ النبأ تا سورۃ الناس

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منازل العرفان

فی

تفسیر القرآن الکریم

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ ۔ کوئٹہ

فہرست مضامین منازل العرفان جلد یازدہم

سورۂ نبأ۔ سورۂ نازعات

سورۂ عبس۔ سورۂ تکویر

سورۂ انفطار۔ سورۂ مطففین

سورۂ انشقاق۔ سورۂ بروج

سورۂ طارق۔ سورۂ اعلیٰ

سورۂ غاشیہ۔ سورۂ فجر

سورۂ بلد۔ سورۂ شمس

سورۂ لیل۔ سورۂ ضحیٰ

سورۂ الم نشرح۔ سورۂ تین

سورۂ علق ۔ سورۂ قدر

سورۂ بینہ ۔ سورۂ زلزال

سورۂ عادیات ۔ سورۂ قارعہ

سورۂ تکاثر ۔ سورۂ عصر

سورۂ فیل ۔ سورۂ قریش

سورۂ ماعون ۔ سورۂ کوثر

سورۂ کافرون ۔ سورۂ نصر

سورۂ لہب ۔ سورۂ اخلاص

سورۂ فلق ۔ سورۂ ناس

سُورَةُ النَّبَإِ

مكيةٌ آياتها ۴۰ ركوعاتها ۲

سورۂ نبا مکی ہے، اس میں چالیس (۴۰) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورة النباء ہے، جو دوسری آیت سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ اس کو سورۃ عم، سورۃ عمّ یتساءلون اور سورۃ التسائل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سورت دو رکوع اور چالیس (۴۰) آیتوں پر مشتمل ہے، اس کے کلمات کی تعداد ایک سو تہتر (۱۷۳) اور حروف کی تعداد نو سو ستر (۹۷۰) ہے۔

ربط و مناسبت:

اس سے قبل سورۃ المرسلات میں قیامت اور منکرینِ قیامت کا بیان تھا، نیز اہل جنت کے لیے نعیم مقیم اور کفار کے لئے عذاب الیم کا تذکرہ تھا، اس سورت میں بھی تقریباً انہیں چیزوں کا بیان ہے۔

شان نزول:

باتفاق العلماء والمفسرین یہ سورت عہد نبوت کے ابتدائی دور میں مکہ مکرمہ میں سورۂ معارج کے بعد نازل ہوئی۔

مختصر مضامین:

کفار کا وقوعِ قیامت سے انکار کیوں؟

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر بات ویسے تو اہل مکہ کے لیے حیرت انگیز تھی، وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں

سنتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمالِ کریمہ کا مشاہدہ کرتے تو ان پر عجیب قسم کی سراسیمگی طاری ہو جاتی، سب سے زیادہ جس چیز نے انہیں پریشان کر رکھا تھا وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تعلیم تھی کہ: اس جہاں رنگ و بو کے بعد ایک اور جہاں بھی ہے، اس چند روزہ مختصر زندگی کے بعد ایک ایسی ابدی زندگی بھی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے، قیامت کے دن انہیں اور ان کے آباء و اجداد، بلکہ پوری انسانیت کو قبروں سے نکال کر ربّ کائنات کے سامنے پیش کیا جائے گا، اور وہاں ان سے ان کے چھوٹے بڑے سب اعمال کا حساب لیا جائے گا''۔

ان کی عقل (جس کی دقیقہ سنجی پر انہیں بڑا گھمنڈ تھا) اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھی کہ ہزاروں صدیوں کی پہنائیوں میں ان کی مشت غبار کے بکھرے ہوئے ذرے کون جمع کرے گا؟ اور پھر ان میں روح کیسی پھونکی جائے گی؟ وہ اس مسئلہ پر شب و روز غور کرتے، آپس میں بحث و تمحیص کرتے، ان کی مجلسوں میں اس موضوع پر گرما گرم مذاکرے ہوتے رہتے، لیکن وہ کسی صورت میں وقوعِ قیامت کو ماننے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ پاتے۔

اس نہ ماننے میں ایک نفسیاتی جھجک بھی سدّ راہ بنی ہوئی تھی، اگر وہ وقوعِ قیامت کو تسلیم کرتے تو ان کی زندگی کا سارا نقشہ تلپٹ ہو کر رہ جاتا، اس معاشرہ میں انہیں لوٹ کھسوٹ کی جو آزادی میسر تھی، عیش و طرب کی محفلیں، جن میں مدہوش اور بدمست جوانیاں ساری رات محو رقص رہا کرتی تھیں، بادہ ارغوانی کے بلوریں جام، مصروف گردش رہتے، جہاں ہر ضرورت مند کا استیصال مباح تھا، جہاں قرض خواہ اپنے مقروض سے من مانی شرح پر سود لیا کرتا تھا، اگر وہ روزِ حساب پر ایمان لاتے تو ان کو ان تمام لغویات سے دست کش ہونا پڑتا، جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔

اس سنگ گراں کو ان کی راہ سے ہٹانے کے لیے قرآن کریم میں متعدد بار بڑے زور و شور سے بڑے زور دار دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ اس سورت مبارکہ میں بھی یہی موضوع زیرِ بحث ہے۔ پہلے تو دوٹوک الفاظ میں یہ بتا دیا کہ تمہارے انکار سے حقیقت نہیں بدل سکتی، قیامت ضرور برپا ہوگی، تم خود اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرو گے، اور اس کا اعتراف بھی کرو گے، لیکن پھر اس وقت تمہارا قیامت پر ایمان لانا تمہیں جہنم سے بچا نہیں سکے گا۔

کفار کے اعتراض کا جواب:

پھر ان کے اس اعتراض کا بھی جواب دیا کہ ان کے منتشر ذروں کو کیسے جمع کیا جائے گا؟ بتا دیا کہ ان ذروں کو جمع کرنے والا وہ قادر مطلق اور حکیم اور خبیر و علیم ربّ تعالیٰ ہے جس کی قدرت اور حکمت کے جلوے قدم قدم پر اس

کی عظمت وکبریائی کی گواہی دے رہے ہیں، جو ایسے محیر العقول کام انجام دے سکتا ہے، اس کے لیے تمہیں از سرنو زندہ کرنا اور تمہارے ذرات کو جمع کرنا ہرگز مشکل نہیں۔

قیامت برپا کرنے میں حکمت الٰہی:

اس کے بعد قیامت برپا کرنے کی حکمت بتائی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک انسان ساری عمر لوگوں پر ظلم وستم کرتا رہے، غریبوں کو لوٹتا رہے، دادعیش دیتا رہے، اپنے خالق ومالک کی نافرمانی کرتا رہے، اور دوسرا شخص ساری عمر بنی نوع انسان کی خدمت کرتا رہے، پریشانوں کی غمگساری، محتاجوں کی امداد، یتیموں اور بیواؤں کی سرپرستی کرتا رہے، اپنے ربّ کریم کی اطاعت سے سرموانحراف نہ کرے، ان دونوں شخصوں کے اعمال میں اتنی سنگین تفاوت کے باوجود اس کا نتیجہ بالکل یکساں رہے؟ کہ نیکوکاروں کو ان کے نیک اعمال کا کوئی صلہ نہ ملے، اور برے لوگوں کو ان کی برائیوں کی سزا نہ ملے، تو اس سے بڑی ناانصافی اور کیا ہوسکتی ہے؟ تو بتادیا کہ قیامت برپا کرنے میں حکمت الٰہی یہ ہے کہ بدکاروں کو ان کی بدی کی سزا دی جائے، اور نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا اجرعظیم مرحمت فرمایا جائے۔

کفار کی غلط فہمی کا ازالہ:

آخر میں اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کردیا جس میں اکثر کفار مبتلا تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ قیامت اگر آ بھی گئی تو اس روز بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہمیں ہی ملیں گی، ہمیں جو عزت اور سرفرازی اس دنیا میں نصیب ہے قیامت کے دن بھی یہ ہمیں نصیب ہوگی، اور ہمارے جان نثار خدام اور وفادار ملازم اس وقت ہمارے اردگرد حلقہ زن ہوں گے، اگر کسی فرشتہ نے ہماری طرف دست تعدی دراز کیا تو ہمارے درجنوں جواں سال اور بہادر بیٹے ان کو مزہ چکھادیں گے، اور یہ ہمارے بت جن کی ہم پرستش کرتے ہیں قیامت کے دن ہماری شفاعت کریں گے وغیرہ، اس لئے ہمیں دوزخ کا کوئی اندیشہ نہیں۔

ان کم عقل اندھوں کو بتادیا کہ اس قسم کی خام خیالیوں کو اپنے دل سے نکال دو، وہاں کسی کی مجال نہ ہوگی کہ دم مار سکے، شفاعت کے لیے وہی زبان کھول سکے گا جس کو رحمن ورحیم نے منصب شفاعت پر سرفراز کیا ہوگا، تمہارے یہ بے جان بت اس روز خود دوزخ کا ایندھن بنیں گے، تمہاری نجات کا انہیں کب خیال ہوگا؟

آخر میں تنبیہ فرمادی کہ آج راہ حق اختیار کرلو، اس فرصت کو غنیمت جانو، ورنہ قیامت کے روز تمہاری حالت اتنی ناگفتہ بہ ہوگی کہ تم اپنی زندگی سے بیزار ہوں گے، اور بصد حسرت یہ کہہ رہے ہوں گے: ﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾

کاش کہ میں مٹی ہو جاتا۔

❁ ❁ ❁

﴿الجزء الثلاثون﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ مُخۡتَلِفُوۡنَ ؕ﴿۳﴾ کَلَّا
سَیَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ ثُمَّ کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵﴾ اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِہٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّ الۡجِبَالَ
اَوۡتَادًا ﴿۷﴾ وَّ خَلَقۡنٰکُمۡ اَزۡوَاجًا ۙ﴿۸﴾ وَّ جَعَلۡنَا نَوۡمَکُمۡ سُبَاتًا ﴿۹﴾

ترجمہ: کس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں؟﴿۱﴾ کیا وہ اس بڑی اور اہم خبر کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟﴿۲﴾ جس میں وہ اختلاف کرتے رہتے ہیں﴿۳﴾ یقیناً وہ جان لیں گے﴿۴﴾ پھر یقیناً وہ اُسے جان لیں گے﴿۵﴾ کیا ہم نے نہیں بنادیا زمین کو بچھونا﴿۶﴾ اور پہاڑوں کو میخیں﴿۷﴾ اور ہم نے پیدا کیا تمہیں جوڑا﴿۸﴾ ہم نے بنایا تمہاری نیند کو آرام﴿۹﴾

معارف ومنازل

﴿عَمّ﴾ اصل میں "عن ما" تھا، "ما" استفہامیہ پر جب حرف جار داخل ہو تو تخفیف کی خاطر الف کو گرادیتے ہیں، جیسے "فِیمَ، لِمَ، عَمَ" پھر نون کو میم میں ادغام کرکے اسے ﴿عَمّ﴾ پڑھتے ہیں، نیز اس طرح سے "ما" استفہامیہ اور "ما" خبریہ میں امتیاز ہو جاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر:

یہ سورت ان سورتوں میں سے ایک ہے جو آغاز دعوت واعلانِ نبوت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئیں۔ رسول اکرم ﷺ جس ہمہ گیر روحانی انقلاب کے داعی بن کر تشریف لائے تھے اس کی کامیابی کا انحصار عقیدہ قیامت پر تھا، اور اسی عقیدہ کو تسلیم کرنا اور ماننا کفار مکہ کے لیے بڑا مشکل اور کٹھن تھا، اس سورت اور اسی مضمون کی دیگر سورتوں میں کفار مکہ کی غلط فہمیوں کو دور کرنے پر زور دیا جارہا ہے، اور قیامت کے بارے میں ان کے شکوک وشبہات کو دور کیا

جا رہا ہے، اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ کے ایسے ایسے اہم قابل ذکر دلائل پیش فرما رہے ہیں جو وقوعِ قیامت کو یقینی ثابت کرنے والے ہیں۔ اگر وہ لوگ تعصب اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر ان دلائلِ قدرت میں غور کریں تو انہیں وقوعِ قیامت پر یقین آ جائے، اور ان کو وقوعِ قیامت کے بارے میں کسی قسم کا شک وتردد باقی نہ رہے، اور اس کے انعقاد میں گوناگوں حکمتیں ان پر آشکارا ہو جائیں۔ پوچھا جا رہا ہے کہ مکہ کے سردار کس موضوع پر تبادلہ خیال کرتے رہتے ہیں؟ کس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ جہاں محفلوں میں جمع ہوتے ہیں تو اسی چیز کا مسلسل تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔

النبأ سے کیا مراد ہے؟

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہ ہمہ وقتی بحث وتمحیص اور چہ میگوئیاں ایک بہت بڑی اہم خبر اور عظیم سانحہ قیامت کے بارے میں ہو رہی ہیں، "قال الراغب: النبأ خبر ذو فائدة عظيمة" ﴿النبأ﴾ اس خبر کو کہتے ہیں جس میں بہت بڑا فائدہ ہو۔ عظیم فرما کر مزید اس کی عظمت وبڑائی ثابت فرمائی، یعنی یہ خبر معمولی نہیں جس کا جاننا اور نہ جاننا برابر ہو، بلکہ یہ بہت فائدہ مند اور واقعی نفس الامری یقینی ہے۔ حضرت مجاہدؒ اور بعض علماء کے نزدیک ﴿نبأ عظيم﴾ سے مراد قرآن کریم ہے۔ قتادہؒ کے نزدیک مراد حشر ہے۔ دیگر اکثر مفسرین کے نزدیک مراد قیامت ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ﴾ [ص: ۶۸] (آپ کہہ دیں کہ وہ ایک بڑی خبر ہے، تم اس سے اعراض کرنے والے ہو)۔ اس بڑی اہم خبر میں اختلاف کرنے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے سے ظاہراً ایسا لگتا ہے کہ تم اس قابل اور صاحب استعداد ہو کہ اس کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہو، مگر واقع میں ایسا نہیں، کیونکہ یہ خبر عظیم تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔

وقوعِ قیامت کے بارے میں باطل نظریات:

ان کے بحث وتمحیص اور چہ میگوئیوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، کیونکہ یہ لوگ اس بارے میں متفق الرائے نہیں ہیں، بلکہ یہ مختلف الخیال الگ الگ بولیاں بول رہے ہیں، اس بارے میں ان کی آراء کے اختلاف کی کوئی معیاری حد نہیں۔ بعض لوگ وقوعِ قیامت کو اس لئے ناممکن کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک عالم قدیم ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ یہ نیلگوں آسمان اور اس میں آویزاں کھربوں چمکتے دمکتے ستارے، یہ سورج اور چاند، یہ فلک بوس جبال، رنگ برنگ پہاڑ اور یہ مختلف عناصر، یہ سب چیزیں ہمیشہ ہمیشہ یونہی برقرار رہیں گی، اور ان کے درہم برہم ہونے کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا، اور نہ ان کو نیست و نابود کرنا کوئی حکیمانہ اور دانشمندانہ فعل ہے، اس لئے قیامت کے بارے میں جو کچھ ہمیں بتایا جارہا ہے یہ سب من گھڑت باتیں ہیں۔ اور قدیم فلاسفہ و بعض موجودہ مغرب نواز لوگوں کا اب بھی یہی خیال ہے کہ وہ کسی خرق والتیام یعنی آسمانوں میں شکست وریخت کے قائل نہیں۔

بعض کا یہ خیال ہے کہ ہماری صرف یہی دنیوی زندگی ہے۔ ﴿اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَنَحۡیَا وَ مَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ﴾ [المؤمنون: ٣٧] (بس ہماری یہی دنیوی زندگی ہے، مریں گے اور زندہ رہیں گے، اور ہمیں دوبارہ زندہ کرکے ہرگز نہیں اٹھایا جائے گا)۔ اس کی وجہ وہ یہ بتایا کرتے ہیں: ﴿مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَهِیَ رَمِیۡمٌ﴾ [یس: ٧٨] (کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا حالانکہ وہ بوسیدہ ہوں؟)۔ ﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا﴾ [الاسراء: ٤٩] (کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہوں؟)۔ ﴿ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ﴾ [الرعد: ٥] (کیا ہم ایک نئی پیدائش میں ہوں گے؟)۔ کیا جب ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی اور مٹی میں مل جائیں گی اور ہواؤں کے جھونکے انہیں صدہا بار الٹ پلٹ کرکے رکھ دیں گی تو پھر ان بکھرے ہوئے کروڑوں ذروں کو جمع کرنا قطعاً ناممکن ہے۔

بعض لوگ قیامت کو غیر ممکن نہیں کہتے تھے، لیکن انہیں یہ بھی یقین نہ تھا کہ قیامت ضرور آئے گی، وہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ ﴿اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَیۡقِنِیۡنَ﴾ [الجاثیة: ٣٢] (ہم تو بس صرف گمان ہی کرتے ہیں، اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں)۔ وہ ایسے شکوک وشبہات میں گرے ہوئے تھے کہ وقوع وعدمِ وقوع قیامت کے متعلق کوئی آخری حتمی فیصلہ نہیں کرسکتے تھے، اور بعض لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اول تو قیامت برپا ہی نہ ہوگی، اور اگر بفرضِ محال برپا ہوگئی بھی تو اس روز اللہ تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے ہی ہمیں سرفراز فرمائے گا، اور یہ مسلمان جو آج غربت کے شکنجہ میں کسے ہوئے، مفلوک الحال ہیں، ان کا اس روز بھی کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔

ان میں سے کئی ایسے لوگ بھی تھے جنہیں علماء نصاریٰ کے پاس اٹھنے بیٹھنے کا موقعہ ملا تھا، اور وہ ان کی باتوں سے متاثر ہوکر اگرچہ جسمانی بعثت کے قائل تو نہ تھے، لیکن روحانی بعثت کو وہ بھی تسلیم کرتے تھے، اور بعض لوگ تناسخ کے قائل تھے کہ روح اپنے نیک وبد اعمال کے بعد جسم بدلتی رہتی ہے، وغیرہ۔

بحث کَلَّا:

سیبویہ کے نزدیک کَلَّا حرفِ ردع اور زجر ہے۔ صفار کہتے ہیں یہ اسم ہے، اور کسی کلام کو مسترد کرنے کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسے ارشاد ہے: ﴿قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤی اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا﴾ [الشعراء] (یعنی موسیٰ

علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا: ہم تو پکڑے گئے، آپ علیہ السلام نے ان کے اس کلام کی تردید کرتے ہوئے کہا: ﴿كَلَّا﴾ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، نہ فرعون ہمیں اپنے محاصرہ میں لے سکتا ہے، اور نہ دریا ہمارا راستہ روک سکتا ہے)۔ کبھی یہ حقاً کے معنی میں ہوتا ہے، اب یہ کیسے معلوم ہوگا کہ كَلَّا ردع اور رد کے لیے استعمال ہوا ہے یا حَقاً کے معنی میں مستعمل ہے؟ تو علامہ زرکشی ''البرہان'' میں فرماتے ہیں: ''اگر وقف ﴿كَلَّا﴾ پر ہو تو اس وقت ردع اور رد کے معنی میں ہوگا، اور اگر كَلَّا سے پہلے وقف ہو اور كَلَّا سے اگلے جملے کی ابتداء ہو تو اس وقت یہ حقاً کے معنی میں ہوگا۔

یہاں سورۃ النبأ میں ان دونوں آیتوں میں كَلَّا سے جملے کی ابتداء ہورہی ہے، اور وقف اس سے پہلے ہے، اس لئے یہ یہاں حقاً کے معنی میں ہوگا۔ ''و منهم من نظر إلى المعنيين فيقف عليها إذا كانت بمعنى الردع و يبتدئ بها إذا كانت بمعنى التحقيق وهو أولى''۔ [البرهان في علوم القرآن]

یہ اختلاف صرف اولویت میں ہے، اگر اسے ردع اور رد کے معنی میں لیا جائے تو پھر بھی غلط نہ ہوگا۔ علامہ زرکشی اس کی ترکیب کے متعلق لکھتے ہیں: ''و تكون كلا بمعنى حقاً عن الكسائي فيبتدئ بها لتأكيد ما بعدها فتكون في موضع المصدر و يكون موضعها نصباً على المصدر والعامل محذوف أي أحق ذلك حقاً''۔ [البرهان] یعنی امام کسائی کے نزدیک كلّا حقّاً کے معنی میں ہوگا، اور اس سے جملے کی ابتداء ہوگی، اس کا مقصد بعد میں آنے والے کلام کی تاکید کرنا ہوتا ہے، اس وقت یہ مصدر ہوگا، اور عامل محذوف کا مفعول مطلق ہوکر منصوب ہوگا۔

قرطبی نے بھی كلّا کے معنی حقاً سے ذکر کیا ہے، أي حقا ليعلمون۔ مگر جمہور علماء كلّا کو حرفِ بسیط مانتے ہیں۔ ثعلب نحوی کہتے ہیں: كلّا لاءِ نافیہ اور کافِ تشبیہ سے مرکب ہے، حالت ترکیب میں کاف اور لام کے انفرادی معنی باقی نہیں رہے، اسی لئے لام کو مشدّد کیا گیا ہے۔

سیبویہ، خلیل، مبرّد، زجاج اور اکثر بصری علماء کے نزدیک كلّا کے معنی صرف ردع اور رد کرنے کے ہیں، خواہ بطور زجر و توبیخ کے ہو، یا بطور تربیت اور ادب آموزی کے، اسی لئے ان علماء کے نزدیک قرآن مجید کے تمام (۳۳) مقامات میں جس جس جگہ كلّا آیا ہے ہر جگہ كلّا پر وقف کرنا جائز ہے، اور بعد میں آنے والا کلام نئے سرے سے شروع ہوتا ہے۔

بعض لوگ تو یہاں تک قائل ہیں کہ کفار مکہ چونکہ سخت سرکش تھے، تہدید آمیز کلام انہیں کے لیے زیادہ

نازل ہوا ہے، اور کلّا کے معنی بھی تہدید وزجر ہی ہے، اس لئے جن سورتوں میں کلّا آیا ہے، ان کی (اکثر) آیات کو مکی ہی سمجھنا چاہئے۔ [لغات القرآن]

﴿كَلَّا سَيَعْلَمُونَ﴾ پھر ہرگز نہیں، تاکید کے ساتھ فرمایا کہ عنقریب جان لیں گے کہ قیامت کا آنا متحقق و برحق ہے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ ﴿أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا﴾ کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو گہوارہ؟ یعنی کرۂ ارض کو تمہارے لئے گہوارہ بچھونے کی طرح نہیں بنادیا؟ تمہاری بقاء، تمہاری نشوونما اور آرام وآسائش، سیر وتفریح کے لیے جو چیزیں مطلوب اور ضروری تھیں یہ سب کی سب بڑی فیاضی سے تمہارے لئے بکثرت مہیا کردی گئی ہیں، اور حد نگاہ تک پھیلے ہوئے زرخیز ودلکش اور روح پرور میدان، ان میں لہلہاتے ہوئے کھیت، سبزیاں، باغات اور تناور درخت، سرسبز ودلفریب وادیاں، ابلتے ہوئے چشمے، ٹھنڈے اور شیریں پانی کے دریا، یہ کس نے پیدا کئے ہیں؟ جس لطیف وخبیر نے تمہیں زندہ وسلامت خوش حال رکھنے کے لیے کمال حکمت سے ہر چیز فراہم کی ہے، کیا وہ مردہ زمین کو زندہ کرنے پر قدرت والا علیم ربّ اس بات پر قادر نہیں کہ تمہیں مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کردے؟

﴿وَّالْجِبَالَ أَوْتَادًا﴾ ذرا اس سلسلہ کوہ وجبال کی طرف دیکھو! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنگ برنگے پہاڑ کیل کی طرح زمین میں گاڑے ہوئے ہیں، تاکہ ان کے وزن وثقل سے کرۂ ارض کی اضطراری حرکت رک جائے۔ اس کے علاوہ ان پہاڑوں میں تمہارے لئے اَن گنت، بے شمار فوائد ومنافع ہیں، یہ پہاڑوں اور فلک بوس چوٹیوں کا، جس نظم ونسق کے ساتھ، قطار در قطار سلسلہ ہے، اتنا باریک وحیرت انگیز ہے کہ ادنیٰ غور وفکر کے ساتھ پیدا کرنے والی ذات اور اس کی عظمت نکھر کر دل ودماغ پر حاوی ہوجاتی ہے، کیا اتنی بڑی مخلوقات کو پیدا کرنے والا ایک بالشت بھر انسان کو دوبارہ زندہ نہیں کرسکتا؟ کتنی حماقت اور بے انصافی کی بات ہے، جس پر یہ ناداں ڈٹے ہوئے ہیں۔

﴿وَّخَلَقْنٰكُمْ أَزْوَاجًا﴾ اور ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں جوڑا جوڑا، اس سے مراد مرد وزن کا جوڑا بھی ہوسکتا ہے، اور مؤمن وکافر اور نیک وبد کے جوڑے بھی ہوسکتے ہیں۔ اول معنی حقیقی ہیں، دوسرے وتیسرے امکانی ہیں، منکرین قیامت سے کہا جارہا ہے کہ اگر تم بصیرت وبصارت سے کام لوتو وقوعِ قیامت کا مسئلہ بآسانی حل ہوسکتا ہے، اس وسیع وعریض، ہموار وسازگار کرۂ ارض کو دیکھو، پھر اس پر گاڑے ہوئے سلسلہ کوہ وجبال کو دیکھو، پھر اپنی تخلیق اور اس کے مضمرات کو دیکھ کر غور کرو۔

☆☆☆

نسل انسانی کی مردوزن میں تقسیم:

اگر تمہاری نظر اتنی تیز و بینا نہیں کہ وسیع زمین اور فلک بوس پہاڑوں میں اس کی حکمت کے جلووں، نیرنگیوں کو دیکھ سکو تو آؤ اور تھوڑی دیر اپنی ذات میں غور وفکر کرو، اس نے تم سب کو مرد پیدا نہیں کیا، اور نہ سب کو عورتیں بنایا، تم خوب غور کرو، مردوزن دونوں کی تخلیق ایک قطرۂ آب (منی) سے ہوتی ہے، ایک ہی رحم میں نشوونما پاتے ہیں، دونوں کی خوراک بھی یکساں ہے، لیکن کسی کو نر، کسی کو مادہ بنایا، ایک باپ بننے کے قابل، دوم ماں بننے کے قابل، جسے باپ بننا ہے اس کو تمام ایسے آلات، قوتیں، صلاحتیں، جسمانی ساخت، وغیرہ عطا ہوئی ہیں کہ جس کے باعث وہ باپ بننے کے منصب پر فائز ہوسکتا ہے، جس کو ماں بننا ہے وہ ماں بننے کی تمام جسمانی اور نفسیانی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے، اگر تمہیں جوڑا جوڑا نہ بنایا جاتا تو افزائش نسل کیسے ہوتی؟ اگر تم جوڑا جوڑا پیدا نہ کئے جاتے تو زندگی کا یہ دشوار گزار سفر ہر کیف ورنگ سے محروم ہوجاتا، تمام تسکین وسرور ملیا میٹ ہوکر رہ جاتے، اور کہیں بھی کیف وراحت کی زندگی میسر نہ آتی، جس ذات واحد لاشریک نے نسل انسانی کو مردوزن میں تقسیم کرکے ان کی تمام صنفی ضروریات کا اہتمام کیا ہے اس کے لیے تمہیں دوبارہ زندہ کرنا ہرگز کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔

﴿وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَكُمۡ سُبَاتًا﴾ ہم نے تمہارے لئے نیند کو آرام اور راحت بنادیا۔

نیند ایک نعمت ہے:

اگر ان تمام باریکیوں میں تمہیں غوطہ زنی کی مہلت وفرصت نہیں تو ذرا اپنی نیند اور بیداری کی دو مختلف متضاد حالتوں میں غور کرو، بیداری کی حالت میں تم دماغی یا جسمانی مشقت کرتے ہو، تم تھک کر، پریشان ہوکر چور چور ہوجاتے ہو، تم میں مزید کام کرنے کی سکت باقی نہیں رہتی، اچانک سکون والی نیند تمہیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے، کچھ وقت کے لیے تم دنیا و مافیہا سے آزاد اور بے خبر ہوجاتے ہو، اور تمام تفکرات، پریشانیوں اور غموں سے تمہیں نجات مل جاتی ہے، کچھ دیر سو لینے کے بعد جب بیدار ہوجاتے ہو تو دماغی تھکاوٹ و درماندگی اور جسمانی تھکاوٹ و گرانی کافور ہوچکی ہوتی ہے، جوش ونشاط کی کیفیت کی ایک نئی تازہ زندگی عود کر آتی ہے، اور از سر نو حیات وزندگی کا آغاز کردیتے ہو، گویا ایک عارضی موت کی آغوش میں چلے جانے کے بعد ایک نئی زندگی میں قدم رکھا۔

خوب غور کرو، ہم نے تمہارے لئے نیند کو آرام وراحت کا ذریعہ بنایا ہے، اگر ہم تمہیں نیند کی نعمت سے محروم کردیں تو یہ زندگی تمہارے لئے موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ بن جائے، اور دنیا کی ساری لذتیں تلخ ہوجائیں، یہ

نیند جسے لوگ موت کی بہن کہا کرتے ہیں، یہ میری قدرت وشفقت ہے جسے میں نے تمہارے لئے قوت ونشاط کا سرچشمہ بنادیا ہے، اگر میں اسے چھین کر تمہیں محروم کردوں تو اس کے حصول کے لیے شاید تم ساری دولت خرچ کرنے کے لیے تیار ہوجاؤ، مگر پھر بھی تمہیں حاصل نہ ہو۔ میری قدرت کاملہ کا جب یہ عالم ہے تو تمہارا دوبارہ زندہ کرنا کیا کوئی مشکل ہے؟ جبکہ روزمرہ کی موت کے بعد ہر روز میری حکمت وقدرت سے مرنے کے بعد تمہیں ایک نئی زندگی کے ساتھ نوازا جاتا ہے، اسی پر دوبارہ زندگی کا ترتب ہوگا۔

وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ⑩ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ⑪

ترجمہ: ہم نے رات کو بنادیا لباس کی طرح پردہ پوش ⑩ اور بنایا دن کو رزق وروزی کمانے کا ذریعہ ⑪

معارف ومنازل

دنیا دارالاسباب بھی ہے اور دارالعمل بھی، اسی کی خاطر یہاں رات دن کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے جاری رکھا، اور رات دن کے مفادات ومقاصد کو الگ الگ بنادیا، جو کام دن کو ہوتے ہیں وہ رات کو نہیں ہوسکتے، اور رات میں ہونے والے کام دن کے وقت انجام نہیں پاتے، آخرت چونکہ دارالاسباب اور دارالعمل نہیں، اس لئے وہاں رات دن کا کوئی چکر نہیں چلتا۔

رات کے فوائد ومقاصد:

رات کے فوائد ومقاصد یہ ہیں کہ جب رات آتی ہے تو تمام آبادی پر تاریکی کا پردہ چھا جاتا ہے، ہر چیز تاریکی میں ڈوب جاتی ہے، جو کام دن کی روشنی میں انجام پاتے تھے وہ بند ہوکر ٹھپ ہوجاتے ہیں، سڑکیں سنسان، کاروباری مراکز، دفاتر، بازار، خرید وفروخت کی منڈیاں، عدالت ودیگر کاروباری دفاتر بند ہوجاتے ہیں، حتیٰ کہ رہائشی مکانات بھی بند ہوجاتے ہیں۔ دوسری طرف جو کام دن کی روشنی میں نہیں ہوسکتے تھے ان کے دروازے کھل جاتے ہیں، پھر ایک طرف سے شیطان کے پرستار اپنے لہو ولعب، عیاشی، شراب نوشی، زنا، بدکاری اور اپنے دیگر بہت سے مذموم ارادوں میں محو ہوجاتے ہیں، برائی کے عشرت کدوں میں پہنچ کر اُن ناجائز اعمال میں لگ جاتے ہیں، جن کی ظلمت وتاریکی رات کی ظلمتوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

دوسری طرف جب رات آتی ہے تو رب العلمین جل شانہ کے بندے اپنے نیک وسعید ارادوں کے ساتھ وضوء وطہارت، نماز واذکار، اور تلاوتِ قرآن جیسے نورانی اعمال میں منہمک ہوکر راتوں کی ظلمتوں کو نورانی بنانے کی کوششوں میں ﴿قِيَاماً وَّ قُعُوداً وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ﴾ [آل عمران:۱۹۱] (کھڑے ہوکر اور بیٹھ کر اور ان کی کروٹوں پر) کا مصداق بن کر اپنے سجدہ نیاز سے، نالہ دل گداز سے، اشکبار آنکھوں سے راتوں کے خالق و مالک کی بارگاہ میں جبین نیاز رکھ کر اس کے منانے اور راضی کرانے میں محو ہوجاتے ہیں، یہی کرتے تھے وہ لوگ جن کے بارے میں فرمایا: ﴿كَانُوا قَلِيلاً مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ﴾ [الذاریات:۱۷] (وہ رات میں سے کم سوتے ہیں)۔ ؎

رومی ہو، غزالی ہو، سعدی ہو، کہ رازی ہو ☆ کچھ ہاتھ نہیں آتا جز آہِ سحرگاہی

ہرجا کہ درے بود بشب در بندند

الا در دوست را کہ بشب باز کنند

جب دن کی روشنی نمودار ہوتی ہے تو تاریکی کے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں، زندگی کی تمام معطل چیزیں حرکت میں آجاتی ہیں، ایک خوفناک مگر لطف اندوز ہل چل شروع ہوجاتی ہے، "کلّ الناس يغدو فبائع نفسه فمعتقها أو موبقها"۔ رزق وروزی جمع کرنے اور کمانے کا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے، جنت ودوزخ کے خریداروں کا مجمع لگ جاتا ہے، جائز وناجائز دونوں کے عاشق میدان میں اتر کر اپنے عزائم پورے کرنے میں مشغول ہوجاتے ہیں، جنت کے خریدار جنت کے پیچھے دوزخ کے خریدار دوزخ کے پیچھے دوڑ لگاتے ہیں۔ ؎

جنتی در عشق جنت سودمند ☆ دوزخی در دام دوزخ قید وبند

.......✿......✿......✿.......

وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴿۱۲﴾

ترجمہ: اور بنایا ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان سخت مضبوط ومحکم ﴿۱۲﴾

معارف ومنازل

پوری انسانیت کو کائنات کی نیرنگیوں کے دیکھنے ملاحظہ کرنے کی دعوت دی جارہی ہے کہ ہماری قدرت اور پختہ کاری کی شان وشوکت اگر دیکھنا چاہو تو آؤ ذرا آسمانوں کی اس نیلی چھت کی طرف آنکھ اٹھا کر اوپر دیکھو، ہزاروں

صدیاں بیت چکی ہیں اس سائباں کو تنے ہوئے، ذرا بتاؤ شکست وریخت کا کوئی نشان اس میں نظر آتا ہے؟ کہیں کوئی کجی، شکن، رخنہ، سوراخ کوئی جھول نظر آتا ہے؟ ہرگز نہیں، پھر دیکھو، بار بار ملاحظہ کرو، دوربین لگا کر دیکھو، تمہاری آنکھیں خیرہ وماندہ ہوکر لوٹ جائیں گی، مگر کوئی عیب نظر نہیں آئے گا، جب عیب کا وجود ہی نہیں تو نظر کیا آئے اور کیسے نظر آئے؟

ہم نے انہیں بلند وبالا اتنا مضبوط ومحکم بنایا جس کی کوئی مثال نہیں، پھر اس کے ساتھ بے شمار کھربوں کے حساب سے درخشاں چمکدار نورانی ستارے بڑی پیوندکاری کے ساتھ بنا کر جوڑ دیا، مجال نہیں کہ کوئی ستارہ اپنے مدار سے سرک جائے، یا راستہ تبدیل کرے، یا کسی اجرام سے ٹھکرائے، یا نظام الاوقات کی خلاف ورزی کرے، یا سست رفتاری یا تیز رفتاری کا مظاہرہ کرے، یہ تو تم ہو کہ اپنے خالق ومالک کے حکموں کا انکار کر کے خلاف ورزی پر ڈٹے ہوئے گمراہ ہو۔ مزید تفصیل سورۃ الملک کے فوائد میں دیکھی جائے۔

وَّجَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾

ترجمہ: اور ہم نے چمکتا ہوا روشن چراغ بنایا﴿۱۳﴾ (سورج مراد ہے)۔

معارف ومنازل

﴿وَهَّاج﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں روشنائی اور گرمی دونوں کا مادہ رکھا ہوا ہو۔ امام مقاتلؒ فرماتے ہیں "الوهج يجمع النور والحرارة"۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سورج میں نور اور حرارت دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ "سراج وہاج" کسی ایک ملک، ایک علاقہ کے لیے نہیں، بلکہ سارے عالم، خشکی، تری، سمندر، دریا، کوہ وجبال، جنگل و صحراء، انسانی آبادی، حیوانات، نباتات، اور جمادات، غرض یہ کہ سارے عالم کو روشنی اور حرارت اندازے کے ساتھ مہیا کر رہا ہے، مجال نہیں کہ کہیں بے اعتدالی ہو۔

سورج رب کی قدرت کا ایک کرشمہ:

یہ سورج کا حجم زمین کے حجم سے تیرہ (۱۳) لاکھ مرتبہ بڑا ہے، یہ زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر رواں دواں محو سفر ہے، روزانہ عرش معلّٰی کے نیچے سجدہ کر کے اجازت ملنے پر اپنا سفر جاری رکھ کر شروع کرتا ہے، اس کا

درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سینٹی گریڈ ہے، اس کا قطر آٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار میل ہے، بلکہ بعض ستارے سورج سے بھی لاکھوں مرتبہ بڑے ہیں، کئی ستارے ایسے بھی ہیں جن کا قطر سورج کے قطر سے آٹھ سو گنا بڑا ہے۔ تفصیل سورۂ ملک میں گزر چکی ہے۔

سورج کی روشنی اور حرارت جو ایک بڑی نعمت خداوندی ہے، اللہ ربّ العزّت نے یہ کارخانہ عالم مفت بلا معاوضہ، بلا قیمت اپنے بندوں کے لیے پیدا فرمایا ہے، جس سے مسلمان وغیر مسلم یکساں فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ ایک ایسا منظم اور مربوط نظام ہے جس میں کبھی کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی، یہ سورج کرۂ ارض سے کتنا بعید ہے، حالانکہ اس کا اصلی چہرہ اوپر عرش معلیٰ کی طرف ہے، زمین کی طرف اس کی پشت ہے، اس کے باوجود وہ مناسب مقدار میں زمین کو روشنی پہنچا رہا ہے، اور اسی مناسبت سے حرارت بھی پہنچا رہا ہے، جس سے انسان، حیوان، نباتات وغیرہ برابر پرورش پا رہے ہیں، اور یہ طلوع وغروب، رات دن کی کمی بیشی، موسموں کی تبدیلی، یہ سارے بآواز بلند اور ببانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ اس پورے محکم ومربوط نظام کا پیدا کرنے والے، اور چلانے والے ایک واحد لاشریک ہستی ہے جو علیم وخبیر بھی ہے اور قادر وحکیم رحمن ورحیم بھی ہے، ﴿فَتَبَارَكَ اللهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۴] (پس اللہ برکت والا ہے جو بہترین پیدا کرنے والا ہے)۔

..........❁.....❁.....❁..........

وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اور ہم نے آسمان کی طرف سے (نچوڑنے والے بادلوں سے) موسلا دھار پانی برسایا﴿۱۴﴾ تاکہ اس سے سبزہ اور دانے اُگائیں﴿۱۵﴾ اور گھنے باغات﴿۱۶﴾

معارف ومنازل

﴿مُعْصِرٰت﴾ سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو بادلوں کو نچوڑتی ہیں اور بارش برساتی ہیں۔ ﴿مُعْصِرٰت﴾ ان بادلوں کو بھی کہتے ہیں جو بارش کے پانی سے لدے ہوتے ہیں، اور ابھی انہوں نے برسنا شروع نہیں کیا۔ قال الفراء: "المعصرات السحاب ینجلب بالمطر ولم یمطر، ثجاجا صبابا مدراراً"۔ (موسلا دھار) فرمایا: ہمارا نظام پختہ کار اور ہر کام میں حکمت ہی حکمت جلوہ افروز ہے، بارشیں برسا کر بقاء عالم کا سامان مہیا فرما رہے ہیں، تمہارے

لئے ہر طرح کا اناج، سبزہ، پھل فروٹ سینکڑوں قسم کے غذائی سامان پیدا کر رہے ہیں، حیوانات کے لیے ہر قسم کا چارہ اگاتے ہیں۔

﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ﴾ انسانی زندگی، بلکہ ساری مخلوقات کی زندگی جن اہم اور ضروری چیزوں پر موقوف ہے کہ جن کے بغیر کوئی متنفس ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا وہ روشنی، ہوا اور پانی ہیں، ان میں سب سے زیادہ ضرورت کی چیز پانی ہے، اسی پانی کی اہمیت کی خاطر فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ [الأنبياء: ۳۰] (اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کر دیا ہے)۔ دیکھیں! پانی کا اصلی منبع و مرکز زمین نہیں، زمین نے اتنا کیا کہ پانی کو ذخیرہ کر کے محفوظ رکھا، اصل سرچشمہ بادل ہے، جس نے پانی برسا کر زمین کو سیراب کیا، اور زائد پانی زمین کی تہہ تک پہنچ کر ذخیرہ بنایا، اور پہاڑوں پر برف جم کر سارا سال دریاؤں کی شکل میں خشک، زرعی، قابل کاشت زمینوں کو سیراب کیا، جس سے سینکڑوں قسم کی غذائی اشیاء تیار ہوئے، اگر صرف پانچ دقیقہ یہ ہوا یا روشنی رک جائے تو کرۂ ارض پر کوئی متنفس زندہ نہ رہے۔

.......❁.......❁.......❁.......

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ
فَكَانَتْ أَبْوَابًا ﴿۱۹﴾ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾ لِّلطَّاغِينَ
مَآبًا ﴿۲۲﴾ لَّابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَاءً
وِفَاقًا ﴿۲۶﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ
كِتَابًا ﴿۲۹﴾ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾

ترجمہ: بیشک فیصلہ کا دن ایک مقرر وقت ہے ﴿۱۷﴾ اس روز صور پھونکا جائے گا تو تم چلے آ ؤ گے فوج در فوج ﴿۱۸﴾ اور کھول دیا جائے گا آسمان تو وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا ﴿۱۹﴾ اور حرکت دی جائے گی پہاڑوں کو تو وہ سراب بن جائیں گے ﴿۲۰﴾ درحقیقت جہنم ایک گھات ہے ﴿۲۱﴾ یہ سرکشوں کا ٹھکانا ہے ﴿۲۲﴾ پڑے رہیں گے اس میں عرصۂ دراز ﴿۲۳﴾ وہ نہیں چکھیں گے اس میں کوئی ٹھنڈی چیز اور نہ پانی ﴿۲۴﴾ بجز کھولتے پانی اور گرم پیپ کے ﴿۲۵﴾ ان کے گناہوں کی پوری سزا ﴿۲۶﴾ یہ لوگ روزِ حساب کی توقع ہی نہیں رکھتے تھے ﴿۲۷﴾ اور انہوں نے ہماری آیتوں کو سختی سے جھٹلایا ﴿۲۸﴾

حالانکہ ہر چیز کو ہم نے گن گن کر لکھ لیا تھا۲۹ پس اے منکرو! اپنے کئے کا مزا چکھو، اب ہم نہیں زیادہ کریں گے تم پر مگر عذاب۳۰

معارف ومنازل

ربط ومناسبت:

ماقبل آیات میں مناظرِ قدرت وصنعت اور انعاماتِ ربانی کا ذکر تھا، جن سے یہ ثابت ہوگیا کہ قادر مطلق نے ابتداءً اس کائنات کو وجود عطا فرمایا ہے، اس کو دوبارہ پیدا کرنا بھی اس کے لیے کوئی مشکل نہیں، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انعامات بغیر فائدے کے پیدا نہیں کیں، تو ان انعامات سے فائدہ اٹھانے والوں سے حساب کتاب اور باز پرس عین انصاف ہے، لہٰذا مذکورہ آیات میں اسی حساب وکتاب کے دن کا ذکر ہے۔

جزاوسزا کا دن مقرر ہے:

قیامت کا وقت اللہ پاک کے علم محیط میں معین ومقرر ہے، کفار بطور استہزاء شور مچاتے تھے کہ قیامت جلدی برپا کرکے دکھائیں، تمہاری قیامت کب آئے گی؟ ذرا جلدی لاکر دکھاؤ، وغیرہ۔ تو فرمایا: قیامت کے برپا کرنے کا ایک وقت معین ہے، اس سے پہلے یہ کسی کے مطالبے پر نہیں آسکتی؟ جب آئے گی تو کسی کو موقع نہیں دے گی، اور نہ کوئی طاقت اس کو ٹال سکے گی، آج جو لوگ اس کا انکار کررہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب اسرافیل علیہ السلام کا صور پھونکا جائے گا، تو سارے اولین وآخرین بیک وقت حاضر ہوجائیں گے، فوج درفوج میدانِ محشر میں جمع ہوجائیں گے۔ ﴿هٰذَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ جَمَعۡنٰكُمۡ وَالۡاَوَّلِيۡنَ﴾ [المرسلات: ۳۸] (یہ ہے فیصلے کا دن، ہم نے تم کو اور پہلوں کا جمع کردیا)۔ ﴿اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ مِيۡقَاتُهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ﴾ [الدخان: ۴۰] (بیشک فیصلے کا دن ان سب کے جمع ہونے کا وقت ہے)۔

افواج کی تشریح:

خطیب نے ''السراج المنیر'' میں ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے: ''میری امت کے دس اصناف کا حشر دس گروہوں کی صورت میں ہوگا، بعض کی صورت بندروں کی ہوگی، یہ چغلخور ہوں گے، بعض سوروں کی شکل پر ہوں گے، یہ حرام خور ہوں گے، بعض سرنگوں ہوں گے، سرنیچے ٹانگیں اوپر اور آنکھیں نیچے، ان کو اسی طرح گھسیٹا

جائے گا یہ سود خور ہوں گے، کچھ لوگ نابینا اٹھیں گے، ادھرادھر سرگرداں ہوں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جو فیصلہ میں ظلم کرتے تھے، یعنی بے انصافی کرتے تھے، بعض گونگے، بہرے، پاگل و بے عقل ہوں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے اعمال پر مغرور تھے، بعض کی زبانیں سینہ پر لٹکتی ہوئی ہوں گی، اوران کے منہ سے لہواور پیپ بہتا ہوگا، جس سے تعفن پیدا ہوگی، یہ وہ علماء اور واعظ ہوں گے جن کا کردار ان کے گفتار کے خلاف تھا، بعض لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں گے، یہ پڑوسیوں کو دکھ دینے والے ہوں گے، بعض لوگوں کو آتشی تختوں پر صلیب دی گئی ہوگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو حاکم سے جا کر لوگوں کی چغلیاں کھاتے تھے، بعض لوگوں کی بدبو مردار سے زیادہ سڑی ہوئی ہوگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو نفسانی خواہشات اور لذات میں مزے اڑاتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے مالی حق زکوٰۃ وعشر وغیرہ ادا نہیں کرتے تھے، بعض لوگوں کو تارکول کی لمبی چادریں پہنائی جائیں گی، یہ رعونت فخر اور تکبر غرور کرنے والے ہوں گے۔

حضرت براء بن عازب اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما نے ایسی ہی حدیث بیان کی جس کو ثعلبی نے نقل کیا ہے۔ [مظهري] یہ وہ بے عمل لوگ تھے جنہوں نے دنیا میں غفلت اور لاپرواہی کی من مانی زندگی گزاری، اور احکامِ شریعت کا پاس نہیں رکھا، پس ان کا حشر اپنے ہم مشرب وہم خیال لوگوں کے ساتھ ہوگا، یعنی کفار، فجار، منافقین اور مبتدعین، ہر ایک کا حشر الگ ہوگا، اسی طرح شرابی، زانی، بے نماز، چور، قاتل، غرض ہر طبقہ وہر ٹولہ کا حشر اسی طبقہ کے لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ ان کے علاوہ اتقیاء، صلحاء، علماء، اسخیاء، شہداء، حفاظ، قراء، اور دیگر قسم کے عباد، زہاد وغیرہ ہوں گے جن میں سے ہر طبقہ کا مجمع علیحدہ علیحدہ ہوگا، ان پر کرامتوں اور عنایتوں اور طرح طرح کے انعام واعزاز وفضائل کی برکتیں اور رحمت الٰہی کی بارشیں ہوں گی۔

اے اللہ تعالیٰ ! اپنے فضل وکرم اور بے انتہا رحمتوں کے طفیل ہمیں اور ہمارے متعلقین کو اپنے خاص بندوں کی فہرست میں شامل فرمایئے، یارب ! یاارحم الراحمین ! ہم سب پر رحم فرما۔ آمین ثم آمین یارب العلمین

﴿وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ اس وقت یہ بلند وبالا مضبوط آسمان جگہ جگہ سے پھٹ جائے گا، یوں معلوم ہوگا جیسے ہر جگہ دروازے ہی دروازے ہیں، آلام ومصائب کے طوفان اٹھیں گے، اور پورا نظام درہم برہم ہوگا۔ ﴿وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ﴾ [الحاقة: ۱۶] (اور آسمان پھٹ پڑے گا، اور وہ اس دن بالکل بودا پڑ جائے گا) کے تحت تفصیل گزر چکی ہے۔

﴿وَّسُيِّرَتِ الۡجِبَالُ فَكَانَتۡ سَرَابًا﴾ یہ اونچے موٹے فلک بوس پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے، ریزہ ریزہ ہوکر روئی کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے، ان کی کیفیت گرد وغبار کی ہوگی۔

سراب کا مطلب:

''سراب'' ریت کو کہتے ہیں، گرمیوں میں دور میدانوں میں دیکھنے والوں کو دریا کی طرح پانی معلوم ہوتا ہے، مگر نزدیک پہنچنے پر کچھ نہیں ہوتا، جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍ ۭ بِقِيۡعَةٍ يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ﴾ [النور: ۳۹] (اور جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال جیسے میدان میں سراب جس کو پیاسا آدمی پانی گمان کرے، یہاں تک کہ اس کے پاس آجاتا ہے تو اس کو کچھ بھی نہیں پاتا، اور اس کے پاس اللہ (کا عذاب) پالیتا ہے)۔

سراب کو دور سے دیکھنے والا پانی سمجھ کر اس کی طرف بڑھتا ہے، جب قریب پہنچتا ہے تو وہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہوتا، پہاڑوں اور کفار کے اعمال کی یہی کیفیت ہوگی۔ قرطبی نے سراب کے معنی "لاشئی" یعنی بے حقیقت وموہومی کے معنی میں کیا ہے۔

﴿اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتۡ مِرۡصَادًا لِّلطّٰغِيۡنَ مَاٰبًا﴾ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ﴾ [الفجر: ۱۴] (بیشک تمہارا پروردگار گھات میں ہے)۔ گھات لگا کر بیٹھنے والا، پوشیدہ رہ کر آنے والوں کا انتظار کرتا ہے، جب مطلوب شخص بے خبری کے عالم میں نزدیک پہنچتا ہے تو شکاری کی طرح اس پر وار کرتا ہے، اور جھپٹ کر پکڑ لیتا ہے، تو جہنم بھی کفار کے لیے تیار ہوکر بڑی بے تابی سے ان کے لیے گھات لگا کر بیٹھا ہوگا، جوں ہی وہ وہاں پہنچیں گے تو ان کو قابو کرلے گا۔

مِرۡصَاد سے کیا مراد ہے؟

﴿مِرۡصَاد﴾ کا معنی ہے: وہ جگہ جہاں بیٹھ کر کسی کی نگرانی یا انتظار کیا جائے۔ بعض مفسرین نے ﴿مِرۡصَاد﴾ کے معنی گزرگاہ بتایا ہے، اس وقت معنی یہ ہوں گے کہ سب لوگ جہنم کے اوپر سے گزر جائیں گے، اور پل صراط جہنم کے اوپر ہوگا، دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ [مریم: ۷۱] (اور تم میں سے ہر کوئی جہنم پر آنے والا ہوگا)۔ جہنمی اس میں گر جائیں گے اور جنتی مختلف کیفیتوں کے ساتھ اسے عبور کریں گے اور جنت پہنچ جائیں گے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت گزرنے لگے گی تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پل صراط کے قریب کھڑے

ہوکرفرمائیں گے: ”یارب سَلِم سَلِم“۔ یاربّ! سلامت رکھ، سلامتی دیدے۔ [مظھري]

دوزخ کے پل پرگزر:

میدانِ محشر میں بڑے سخت، دل گداز اور پریشان کن مناظر دیکھنے میں آئیں گے، ایک مرحلہ وزنِ اعمال کا ہوگا، ایک مرحلہ وہ ہوگا جب نامۂ اعمال دائیں یا بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، ایک مرحلہ اسی پل صراط پر گزرنے کا ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ”جہنم پر پل صراط تلوار کی دھار کی طرح ہوگی، اس کے دوطرفہ بڑے بڑے کانٹے ہوں گے، ایک طبقہ برق رفتاری کے ساتھ گزر جائے گا، ایک طبقہ ہوا کی طرح، کچھ لوگ گھوڑ سواروں کی طرح، کچھ اونٹوں کی رفتار کے ساتھ، بعض لوگ پیدل لوگوں کی مانند اور بعض اس سے بھی کم رفتار کے ساتھ اُس پر گزر جائیں گے، جیسے اعمال ہوں گے ویسے گزرنے کا مرحلہ ہوگا۔

اس دن عید قربانی کرنے والے لوگ اپنی عید قربانیوں پر سوار ہوکر بڑے آرام سے گزریں گے: ”إنها مطایاکم علی الصراط“۔ [ترمذي] بہرحال! جیسا عمل ویسی رفتار، کوئی بآسانی گزرجائے گا، کوئی پھسل کر نیچے جہنم میں گرجائے گا۔ اللّٰھم ثبتنا علی الصراط یوم تذل الأقدام۔ آمین۔ یہ جہنم سرکش وطاغی، باغی اور بے ایمان و بےعمل لوگوں کا ٹھکانا ہوگا، جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے بغاوت کی۔

﴿لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا﴾ جہنمی جہنم میں عرصہ دراز تک رہیں گے۔ ﴿اَحْقَاب﴾ حقب کی جمع ہے، بمعنی دہر وزمانہ۔ ﴿اَحْقَاب﴾ کے معنی دھور کے ہیں۔ فراء جونحو اور لغت کا امام ہے وہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حقب اسی (۸۰) سال کی مدت کو کہتے ہیں، ہر سال تین سو ساٹھ روز کا ہوتا ہے، اور آخرت کا ہر دن دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے، پھر کہتے ہیں کہ اس آیت سے کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ جب یہ طویل مدت گزرجائے گی تو دوزخی جہنم سے رہائی پالیں گے، کیونکہ یہاں ﴿اَحْقَاب﴾ کی مقدار کو بیان نہیں کیا گیا کہ وہ ﴿اَحْقَاب﴾ کتنے ہیں؟ اور ان کی تعداد کیا ہے؟ اگر ان ﴿اَحْقَاب﴾ کی تعداد بیان کی جاتی، یعنی دس یا بارہ ﴿اَحْقَاب﴾ کہا جاتا تو پھر توقیت سمجھی جاتی کہ دس یا بارہ صدیاں وہ وہاں گزاریں گے۔

کیا کفار جہنم سے نکل جائیں گے؟

یہاں ﴿اَحْقَاب﴾ کی تعداد مذکور نہیں، اس لئے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ قرنہا قرن وہاں رہیں گے، جب ایک قرن ختم ہوجائے گا تو دوسرا قرن شروع ہوجائے گا، پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں اور یہ سلسلہ ابدالآباد تک جاری

رہے گا، اس لئے کفار کا جہنم سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ﴿أَحْقَابًا﴾ کا بصیغہ جمع آ جانے سے کوئی گنجائش دوزخ کے عدمِ خلود کے قائلوں کے لیے نہ رہی۔ ولم یرد به عدد محصور بل الأبد كلما مضى حقب تبعه آخر غير نهاية ولا يستعمل الحقب والحقبة إلا إذا أريد تتابع الأزمنة وتواليها۔ [مدارک] وعن قتادة وهو ما لا انقطاع له۔ [ابن کثیر]

تقریباً سارے مفسرین حضرات نے یہی مرادلیا ہے کہ حقب و أحقاب کے معنی ابدالآباد خلود ہی کے ہیں، خصوصاً جب قرآن مجید میں چونتیس (۳۴) مقامات پر یہ تصریح کی گئی ہے کہ: ''کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے''، اور بعض مقامات پر صرف ''خٰلِدِیْن'' پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ ''اَبَدًا'' کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے، اس لئے قرآن حکیم کی کسی آیت کا ایسا مفہوم بیان کرنا جو دوسری کثیر آیات کے خلاف ہو، کسی مؤمن کو زیب نہیں دیتا، بلکہ اس طرح کرنے سے بڑے مفاسد پیدا ہوں گے، اور قرآن حکیم کی آیتوں اور احکام میں تعارض و اختلاف پیدا کر کے تکذیب حق جیسے خدشات رونما ہوں گے، جو صریح حرام ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کے احکام نہایت درجہ قطعی اور یقینی ہیں، پورے قرآن میں ایک ایسی آیت یا حکم موجود نہیں جو دوسری آیت یا حکم کے ساتھ معارض ہو، اگر کسی شخص کو ایسا خدشہ وشبہ درپیش ہو تو وہ اس کی نادانی اور بے علمی کی وجہ سے ہے۔ [فتح الباری، روح]

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ آخرت کی زندگی دائمی ابدی ہے، جس کے لیے کوئی انقطاع نہیں، جنتی ہمیشہ جنت میں اور دوزخی ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے، پھر ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ فرض کرو اگر زمین سے آسمانوں تک پوری فضاء کو رائی کے دانوں سے بھر دیا جائے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کوئی پرندہ ایسا پیدا فرمائے جو سو سال کے بعد صرف ایک دانہ اٹھا کر کھائے، پھر بھی امکان ہے کہ شاید یہ رائی کے دانے کسی وقت ختم ہو جائیں مگر آخرت کے ایام کبھی ختم نہیں ہوں گے، وہ اس سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

پس اس مثال کی گہرائی میں اگر صحیح غور کیا جائے تو آخرت کے ایام کے لیے کوئی اختتام وانقطاع نہیں ہوگا اور یہ عقل وتصور سے نہایت بالاتر ہے، کہاں یہ پوری کائنات اپنی وسعتوں کے ساتھ، کہاں یہ اس کی بھرائی رائی کے چھوٹے دانے اور کہاں وہ پرندہ کا ہر سو سال بعد ایک دانہ اٹھا کر کھانا، یہ عجائبات قدرت میں سے ایک عجوبہ ہے، پس جس طرح جنتی زندگی عقل کے احاطہ سے بالاتر ہے، اسی طرح اس کا دوام وبقاء بھی دائرہ عقل سے باہر ہے، اسی طرح

دوزخی زندگی سے بھی عقل انسان عاجز ہے۔ "أعاذنا الله منها"۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بالفرض اگر جہنمیوں سے کہا جائے کہ جہنم میں تمہارے رہنے کی مدت دنیا کی عمر کے برابر ہے تو وہ بیحد خوش ہو جائیں گے، اسی طرح اگر اہل جنت کو معلوم ہو کہ جنت میں ہمارے رہنے کی مدت دنیا کی عمر کے برابر ہے تو وہ نہایت رنجیدہ ہو جائیں، لیکن دونوں سے حقیقۃً یہی کہا جائے گا کہ ہر ایک فریق کا رہنا ابد الآباد و دائمی ہے جس کی کوئی حد نہیں، پس جنتی بے حد راضی اور خوش ہوں گے، جہنمی بے انتہا پریشانی میں ڈوب جائیں گے، ان کے عذاب میں اضافہ ہو جائے گا۔

﴿لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا﴾ ایسے لوگوں کو جہنم میں نہ تو ٹھنڈک نصیب ہوگی اور نہ ہی پینے کے لئے کوئی مشروب (پانی) مہیا کیا جائے گا، مگر: ﴿إِلَّا حَمِيمًا وَّغَسَّاقًا﴾ سوائے گرم کھولتے ہوئے پانی کے، اور دوزخیوں کے زخموں سے بہنے والی پیپ اور کچا لہو، ان کو پلایا جائے گا۔

حمیم وغساق:

حدیث شریف میں ہے کہ فرشتے لوہے کے گرز سر پر مار کر زبردستی ان کے منہ میں ڈالیں گے، جس وقت منہ کے قریب کریں گے، شدت حرارت سے دماغ تک کی کھال اتر کر نیچے لٹک پڑے گی، منہ میں پہنچ کر گلے میں پھنس جائے گی، بڑی مصیبت اور تکلیف کے ساتھ، ایک ایک گھونٹ کر کے حلق سے نیچے اتاریں گے، اور پیٹ میں پہنچنا ہوگا کہ آنتیں کٹ کر باہر آجائیں گی۔ ﴿وسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ﴾ [محمد: ١٥] (اور ان کو گرم پانی پلایا جائے گا تو وہ ان کے آنتوں کو کاٹ ڈالے گا)۔ ﴿وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ﴾ [الکهف: ٢٩] (اور اگر وہ فریاد کریں تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی سے جیسے تلچھٹ جو چہروں کو جھلس دے گا)۔ أعاذنا الله منها و سائر المؤمنين۔ [تفسير عثماني]۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ☆ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جہنمیوں کو پینے کے لیے جو پیپ دی جائے گی وہ نہایت سخت بدبودار ہوگی، حدیث میں ہے کہ دوزخ کے پیپ کا ایک ڈول بھر کر اگر دنیا میں پھینک دیا جائے تو اس کی بدبو تعفن سے کوئی چیز کھانے پینے کے قابل نہ رہے، اور زمین کی نشوونما کی طاقت ہی ختم ہو جائے، اور سارا جہاں ہی تباہ ہو جائے۔ [مسند أحمد: جلد ٣]

﴿جَزَاءً وِّفَاقًا﴾ انہیں جو سزا دی جا رہی ہے یہ کوئی ظلم و زیادتی اور کسی بے رحمی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ انہوں

نے اپنے لئے یہ سزائیں خود تجویز کی ہیں۔ پیغمبروں علیہم السلام نے انہیں ہر طرح سے سمجھا کر بتایا کہ فلاں عمل اور کردار کا نتیجہ فلاں مواخذہ کی شکل میں ہوگا، اور ایمان باللہ والیوم الآخر کا نتیجہ خوشحالی کی صورت میں ہوگا، پس انہوں نے اپنے اختیار اور مرضی کے ساتھ انتخاب کیا، تو یہ تباہ کن سزائیں ان کے کفر وشرک اور اعمال بد کا پورا پورا بدلہ ہوں گی، جیسے اعمال ویسے نتائج ہوں گے، وہ اس لئے کہ:

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۝ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا﴾ انہوں نے خالق کائنات محسن حقیقی کے ساتھ کھلم کھلا بغاوت کی اور آخرت کے یوم حساب کو جھٹلایا، اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی تعلیمات و دیگر تمام تکوینی احسانات واقدار کی تکذیب کی، نہ محاسبہ کی پرواہ کی، اور نہ آخرت کا خوف رکھا، بڑے غرور و ڈھٹائی کے ساتھ اللہ پاک کے احکام کا مذاق اڑایا، اور بس یہ لوگ ہر چیز کے انکار پر تلے ہوئے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ: ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا﴾ ازل سے ابد تک ہم نے ہر چیز کو کتاب میں لکھا اور شمار کیا ہے، ہر ذرہ ہمارے دفتروں (کتابوں) میں محفوظ ہو چکا ہے۔

جب یہ ناشکرا انسان روزِ قیامت اپنے نامہ اعمال کا مطالعہ کرے گا تو حیرانی اور حسرت کے ساتھ خود اقرار کر کے کہے گا: ﴿يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ۝ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ﴾ [الحاقة: ٢٦] (اے کاش! مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا، اور مجھے پتہ ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے)۔ اور وہ اس طرح بھی گویا ہوگا: ﴿مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا﴾ [الكهف: ٤٩] (یہ کیسا عمل نامہ ہے جو نہ چھوٹا عمل چھوڑتا ہے اور نہ بڑا مگر اس کو گن لیتا ہے، اور انہوں نے جو عمل کیا ہے اس کو حاضر پائیں گے)۔

جب اپنے سارے اعمال حتی کہ قلبی ارادوں تک کو سامنے حاضر پائے گا اور آنکھوں سے ملاحظہ کرے گا تو کہے گا: یہ عجیب نوشتہ دیوار یا کتاب اعمال ہے، جس میں ہر چھوٹی بڑی چیز درج ہے، وہ اپنے اعمال کو سامنے دیکھ کر دنگ رہ جائے گا، اور فرشتے اسے توبیخاً کہیں گے: ﴿اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾ [الإسراء: ١٤] (اپنا عمل نامہ پڑھ لو، آج تم خود اپنے حساب کے لیے کافی ہو)۔ آج اپنا محاسبہ خود کرو اور نامہ عمل پڑھ کر خود فیصلہ کرو، کیا کسی انکار کی گنجائش ہے؟ پس حکم ہوگا:

﴿فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا﴾ دنیا میں ہر روز تم اپنے سرکشی، غرور و معاصی میں اضافہ کرتے رہے، آج اسی طرح تمہارے عذابوں میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا، پس عذاب کا مزہ چکھو، ہم نہیں زیادہ کریں گے

تمہارے لئے مگر عذاب۔ مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ جس طرح اہل جنت کے لیے نعمتیں اور فضیلتیں بے شمار ہیں، اسی طرح دوزخیوں کی نقمتیں اور سزائیں بھی بے شمار ہیں۔ أعاذنا اللہ منہ

قرآن حکیم جہاں جہاں جنت اور اس کی نعمتوں کا تذکرہ کرتا ہے، وہاں متصل دوزخ اور اس کی نقمتوں کا بلا تاخیر بیان ہوگا، تاکہ ترغیب وترہیب دونوں مذکور ہوں، اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح رہے کہ دار آخرت میں بھی جنت ودوزخ میں ایک رابطہ قائم ہے کہ آئے دن جوں جوں جنتیوں کے اعزاز واکرام میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا رہے گا، اسی طرح ان ہی لحات اور لحظات میں دوزخیوں کے عذاب اور مختلف نقمتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا، اور ان کی حسرتوں اور ذلتوں میں زیادتی ہوتی رہے گی تاکہ دونوں پہلوؤں میں ربط وبرابری قائم رہے۔

❁ ❁ ❁

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۝۳۱ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ۝۳۲ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۝۳۳ وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۝۳۴ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۝۳۵ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝۳۶ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ۝۳۷ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝۳۸ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝۳۹ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝۴۰

ترجمہ: بیشک متقی پرہیزگاروں کے لیے کامیابی ہی کامیابی ہے ۝۳۱ ان کے لیے باغات اور انگوروں کے گچھے ہوں گے ۝۳۲ اور جواں سال ہم عمر عورتیں ہوں گی ۝۳۳ اور لبریز چھلکتے ہوئے جام ہوں گے ۝۳۴ نہ سنیں گے وہاں بیہودہ لغویات جھوٹی بات ۝۳۵ وہ بدلہ ہوگا تیرے ربّ کی طرف سے حساب سے دیا ہوا ۝۳۶ جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے حد مہربان (اس کی مخلوق میں سے) کوئی اس کے سامنے بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ۝۳۷ جس دن روح اور فرشتے قطار در قطار کھڑے ہوں گے، وہاں کوئی بھی بات نہیں کر سکے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے، اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے گا ۝۳۸ یہ دن برحق ہے پس جو چاہے اپنے ربّ کی طرف ٹھکانا پکڑے ۝۳۹ بیشک ہم نے تمہیں قریب آنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے جس دن دیکھے آدمی جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اور کافر یوں کہے گا: کاش میں مٹی ہوتا ۝۴۰

معارف ومنازل

متقی سے مراد وہ شخص ہے جو شرک وکفر اور تمام معاصی سے اجتناب کرے، اور نہایت احتیاط کے ساتھ زندگی گزارے، اور اتباعِ سنت کو اپنا شعار بنائے۔

تقویٰ کیا ہے؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تقویٰ کسے کہتے ہیں؟ تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: "أما سلكت طريق ذا شوك؟" کیا کبھی آپ خاردار راستے پر چلے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بارہا چلا ہوں، حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر آپ نے ایسے راستے پر کیا کیا؟ انہوں نے کہا کہ: "شمرت ثوبي واجتهدت" میں نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے اور بڑی احتیاط کے ساتھ وہاں سے گزرا، اور ہوشیاری سے قدم رکھے کہ کہیں میرے کپڑے کانٹوں کے ساتھ نہ الجھ جائیں، تو اُبی رضی اللہ عنہ نے کہا: "فذلك التقوى"، یعنی اسی کیفیت کا نام تقویٰ ہے، اس دنیا میں فسق وفجور اور طرح طرح کے گناہوں کے کانٹے ہر طرف بچھے ہوئے ہیں ان برائیوں سے بچ کر نکلنے کا نام تقویٰ ہے، عام گناہوں سے اکثر لوگ بچنے کی کوشش کرتے ہیں مگر مخفی گناہوں سے بچنا ہی تقویٰ ہے۔ [ترمذي]

متقیوں کا ثواب:

متقی حضرات جنہیں رضائے الٰہی اور جنت کا حقدار گردانا گیا ہے (یہ کوئی عام معمولی منصب نہیں، یہ بہت بڑا مرتبہ ومقام ہے) دن رات کلام اللہ المجید کی تلاوت، اس کی تعریف اور مدح وثناء میں رطب اللسان ہے، یہ وہ پاکباز جماعت ہے جنہوں نے کانٹوں پر چل کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھا، انہوں نے آخرت پر سب کچھ قربان کیا ہے، اس لئے ان کے متعلق فرمایا: ﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا﴾ "بیشک متقی لوگوں کے لیے کامیابی ہی کامیابی ہے"۔ ان متقیوں کے لیے کبھی فلاح کا اعلان ہے، کبھی سعادت کا، کبھی نجات کا، کبھی فوز وصلاح کا، کبھی رضائے الٰہی کا، کہیں جنتوں کا اور کہیں ہر قسم کی کامیابیوں، عیش وعشرتوں اور طرح طرح کی نعمتوں کا، کیونکہ انہوں نے اصلاحِ عقائد کے ساتھ اصلاحِ اعمال کا ذخیرہ جمع کیا، پس ان کے مقدر میں فوز وفلاح ہی لکھا گیا۔

تقویٰ کی اقسام:

تقویٰ سات قسم پر ہے، اور متقی میں ساتوں اقسام موجود ہوتی ہیں، سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں اس کی تفصیل

گزر چکی ہے۔ ﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی﴾ [البقرۃ:۱۹۷] (اور توشہ حاصل کرو، پس بہترین توشہ تقویٰ ہے)۔ البتہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ وہ ہے کہ باطن کو ہر اس چیز سے محفوظ رکھا جائے کہ جو ماسوئ اللہ میں مشغول کر دے، یہ تقویٰ کا حقیقی درجہ ہے، قرآن مجید میں سو سے زائد مقامات پر تقویٰ کا ذکر ہے، سورۃ البقرۃ کے شروع میں تفصیل گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

﴿حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا﴾ جن لوگوں نے استقامت کے ساتھ صغیرہ وکبیرہ گناہوں بلکہ مباحات تک سے اجتناب کیا اور یوم الآخرۃ پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی تیاری کی، ان کے لیے ہر قسم کا فوز وفلاح ہے، وہ اس طرح کہ ان کے لیے باغات اور انگور کے میوے ہیں، دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ [المرسلات:۴۲] (اور میوے ان کی خواہش کے) جو کچھ وہ مطالبہ کریں گے یا انہیں خیال میں گزرے گا، یا ﴿يَتَخَيَّرُوْنَ﴾ [الواقعۃ: ۲۰] (جو کچھ پسند کریں گے)۔ حدیقۃ وہ باغ ہے جس کے چاروں طرف دیوار ہو، اگر دیوار نہ ہو تو اسے روضۃ اور بستان کہتے ہیں۔ مختلف نصوص میں جنتی باغوں کے متعلق تینوں قسم کے الفاظ مستعمل ہیں۔

﴿وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا﴾ نوخیز اور نوجوان دوشیزہ ہم عمر عورتیں (بیویاں) ہوں گی، دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ﴾ [الدخان:۵۴] (اور ہم نے ان کا نکاح کرایا سفید بڑی آنکھوں والیوں کے ساتھ)۔ ﴿وَ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ [البقرۃ:۲۵] (اور ان کے لیے جنت میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی)۔ ﴿هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ﴾ [یس:۵۶] (وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے)۔ یہ نوخیز، نوجواں، ہم عمر، پاکیزہ، حسینہ جمیلہ، اعلیٰ درجہ کی خوبصورت، خوب سیرت، ظاہری و باطنی صفات حمیدہ سے موصوف ومتصف اور تمام ظاہری و باطنی عیوب ونقائص سے پاک ومنزہ ہیں، یہ متقی لوگوں کی باطنی و قلبی تسکین اور باطنی آرام وسکون اور تفریح قلب ودماغ کی نعمتیں ہیں۔

حدیث پاک میں آیا ہے کہ: ''اگر جنتی عورت صرف جھانک کر اپنا چہرہ دنیا میں ظاہر کرے تو سارا جہاں منور ہو جائے گا، سورج کی روشنی ماند پڑ جائے گی، اگر جنتی حور اپنا لعاب سمندر میں ڈالے تو سمندر کا پانی شہد سے زیادہ شیریں ہو جائے گا، اس کے سر کا دوپٹہ قیمت میں سارے جہاں کے مال ومنال سے بڑھ کر ہے، اگر اس دوپٹے کو دنیا میں کھول دیں تو اس کی مہک وخوشبو سے سارا جہاں معطر رہے گا، اگر اس کے دانت ظاہر ہوں تو اندھیری اور تاریک رات دن کی طرح روشن ہو جائے گی''۔ [درمنثور، ترمذی] حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ فرماتے ہیں (یہ ترمذی کی

حدیث کا مضمون ہے) کہ وہاں جوانی دائمی ہے، بڑھاپا نہیں، تندرستی ہے بیماری نہیں، خوشی ہے غم نہیں، ہر نعمت کی فراوانی ہے کمی نہیں، غناء ہے فقر نہیں، انعامات واکرام ہے ذلت نہیں، محبت ہے کوئی بغض وعداوت نہیں، ہر قسم کی راحت ہے کوئی فریب نہیں، وغیرہ وغیرہ۔[عزيزي] سورۃ الرحمن اور سورۃ الواقعہ میں جنت اور جنتی نعمتوں کا قدرے تفصیل سے بیان ہے۔فليراجع

لطف یہ کہ یہ نعمتیں دائمی اور ابدی ہیں، جس شباب ونو جوانی کا تذکرہ ہے وہ بھی ابدی ودائمی ہے، وہاں ''لا يفنى شبابهم ولا يبلى ثيابهم، قلوبهم كقلب رجل واحد، لا يسمعون لغوا ولا تأثيما وغير ذلك من الإنعامات التي لا تعدّ ولا تحصى''۔

''بہشت آنجا کہ آزارے نباشد''

﴿وَّكَاْسًا دِهَاقًا﴾ جنتیوں کے لئے شراب سے لبریز چھلکتے ہوئے پیالے، شراب خالص، اور شراب طہور کے جام ہوں گی، جنتی یہ جام انتہائی روح پرور کیف وسرور کے ساتھ پئیں گے، کیونکہ ان متقیوں نے دنیاوی گندی اور ناپاک شراب سے اجتناب کرکے اپنے مقدر میں شراب طہور لکھوائی، اور دنیوی محرمات سے پرہیز کر کے ابدی، دائمی، غیر متناہی، اصلی اور حقیقی سعادتوں پر فائز ہوئے۔

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا﴾ وہاں نہ لغو ہوگی نہ بیہودہ بات اور نہ جھوٹی بات۔

﴿اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴾ کا دور دورہ ہوگا، فرشتے اور ہزاروں خدام وغلمان بکھرے ہوئے جواہرات اور موتیوں کی طرح سلام سلام پیش کرتے رہیں گے، سورۃ الدہر میں تفصیل گزر چکی ہے۔

﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا﴾ یہ بدلہ ہوگا تیرے ربّ کی طرف سے، حساب دیا ہوا، جیسا کسی جنتی کا عمل ہوگا اسی حساب سے اسے بدلہ دیا جائے گا، دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ [الأنعام: ۱۳۲] (اور ہر جنتی کا درجہ اس کے عمل کے مطابق ہوگا)۔حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جنت میں سو درجے ہیں اور ہر درجہ کا دوسرے سے فاصلہ اس قدر ہے جتنا زمین سے آسمان کا''۔[بخاري، ترمذي] یہ درجات اور مختلف عنایات ان کے اعمال کے مطابق ہوں گی، مثلاً انبیاء کرام علیہم السلام کا درجہ، صدیقین، شہداء، صالحین، علماء، اسخیاء، و غير ذلک من المتقين۔

چونکہ یہ درجاتِ اکرام وانعام، حور وقصور، شراب طہور، متقین کے نیک اعمال کے عوض میں ہیں، اس لئے اس

کو جزاء کہا گیا، اور پھر چونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم، جود واحسان جلوہ نما ہے، اس لئے اسے عطاء کہا گیا، پھر عطاء کی صفت حساب ذکر فرما کر اس کی کثرت بتادی۔ قال قتادة: الحساب بمعنى الكثير۔ عرب کہتے ہیں: "أحسبت فلانا أي كثرت له العطاء حتى قال: حسبي"۔ جب کسی کو اتنا کچھ زیادہ دیا جائے کہ وہ کہے: بس بس! مجھے اتنا کافی ہے، تو عرب کہتے ہیں: "أحسبتُ فلانا"۔ حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ حِسَاباً سے مراد یہ ہے کہ جس کسی سے اللہ تعالیٰ نے جتنا وعدہ کیا ہے عطاء اس کے مطابق ہوگی۔ بعض کو ایک کے بدلے دس، بعض کو سات سو اور بعض کو بے حد و بے حساب دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اعمال کے مختلف مراتب کے لحاظ سے۔

کافروں کے متعلق ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ فرمایا، اور متقین کے حق میں ﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا﴾ فرمایا، یہ دونوں جملے ایک بہت بڑے فرق کو واضح کر رہے ہیں۔ "فلله الحمد و المنة"۔

﴿رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا﴾ آسمانوں اور زمینوں کے درمیانی تمام موجودات کا ربّ، مربی، پالنے والا اور خالق و مالک وہی ذات پاک واحد لاشریک ہے۔

﴿الرَّحْمٰنِ﴾ جو نہایت ہی مہربان ہے، یہ رحمٰن ہی ہے جس نے متقین کو بے پناہ نعمتوں سے نوازا، ان کی نیکیوں کی قدردانی فرما کر اپنی رحمانیت کا ثبوت واضح فرمایا، تھوڑی اور مختصر عمر کی مختصر اور قلیل اعمال کے عوض وہ نعمتیں عطا کیں، جو کسی کے وہم و خیال میں نہ ہوں، جو ذات پاک تمہیں اور ساری مخلوقات کی پرورش کرتی ہے، بچپن سے جوانی تک، اسی طرح ہر چیز کو پرورش کے ذریعہ آہستہ آہستہ بڑھا کر آخری کمال تک پہنچاتی ہے، اسی طرح تمہارے حسنات، صدقات، عبادات کو بڑھا بڑھا کر انتہائی کمال تک پہنچایا، ایک کھجور کو پہاڑوں کے برابر لے آیا، تم قیامت میں اپنے حسنات کو پہاڑوں کے برابر دیکھ کر ششدر و حیران رہ جاؤ گے کہ یہ ذخیرۂ اعمال ہم نے دنیا میں انجام نہیں دیا، یہ کیسے ہمارے نامہ اعمال میں لکھے گئے؟ وہاں تمہیں بتایا جائے گا کہ ہم نے تمہارے قلیل اعمال کی پرورش کر کے انہیں اس درجے تک پہنچایا، یہ محض ہماری بخشش اور قدرشناسی ہے کہ تمہارے اعمال کی پرورش کر کے انہیں انتہائی عروج و کمال بخشا، یہ ہے رحمٰن جل شانہ کا عظیم احسان اور بے انتہاء بخشش۔ "رحمن الدنيا والآخرة و رحيمهما"۔ [حصن حصين: ج ۴]

اور یہ بھی حدیث میں منقول ہے کہ اس کی سو رحمتیں ہیں، ایک رحمت دنیا کے لیے ننانوے (۹۹) رحمتیں آخرت کے لئے۔ [بخاري] یہ جنتی بے شمار و بے حساب نعمتیں اسی رحمتوں کا فیض و بخشش ہے، جس کی حد و انتہا نہیں

ہے۔ایک حدیث میں آیا ہے کہ جنتیوں کے لباس ہی خدا تعالیٰ کی رضا مندی کے ہوں گے، بادل ان پر آئیں گے اور ان سے کہیں گے: ہم تم پر کیا برسائیں؟ پھر وہ جو فرمائیں گے، بادل ان پر وہی برسائیں گے، یہاں تک کہ نوجوان کنواری دوشیزہ لڑکیاں بھی ان پر برسیں گی۔ [ابن أبي حاتم ابن كثير]

﴿لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا﴾ وہ واحد لاشریک، خالق و مالک اور مختار کُل ہے، اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے سامنے بات کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، کس کی مجال ہے کہ اس کے سامنے لب کشائی کرے؟ کسی کو دم مارنے کی ہمت نہ ہوگی، جو لوگ یہاں بک بک کر بولتے ہیں وہاں ایسے کافروں کو خوب پتہ چلے گا، جب میدانِ محشر میں اس کے جلال کا ظہور ہوگا، اسی جلال نے تو قیامت برپا کی، پورے نظامِ دنیا کو تہہ و بالا کر کے بڑے بڑے آسمانوں اور فلک بوس پہاڑوں کو ریت کی طرح بہا کر تباہ کیا، اِسی جلال کے سامنے تو انبیاء و رسل علیہم السلام "نفسي نفسي" کا رٹ لگا کر کہیں گے، "اللّٰهم سلِّم سلِّم" اور "إن ربيّ غضب اليوم غضباً لم يغضب قبله مثله" وغیرہ۔اور حدیث پاک میں فرمایا: "کثرت سے پڑھا کرو: "يا ذا الجلال و الإكرام"۔ [ابن كثير، الرحمٰن]

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾ جس دن روح (جبرئیل علیہ السلام) اور فرشتے قطار در قطار کھڑے ہوں گے۔

روح سے کیا مراد ہے؟

بعض علما فرماتے ہیں کہ روح سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں، جب قیامت کا دوم نفخہ صور پھونکا جائے گا، انسان فوج در فوج حاضر ہوں گے۔﴿فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ﴾ [الزمر: ٦٨] (اچانک وہ کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں گے)۔فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے، اور جبرئیل امین علیہ السلام بھی حاضر ہوں گے، ان کی حاضری اس لئے ہوگی کہ وہ پیغام رساں ہیں، آج کی عدالت میں مجرمین کا چالان پیش فرمائیں گے۔

بعض حضرات نے روح سے قرآن حکیم مراد لیا ہے، جیسے: ﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [الشورى: ٥٢] (اور اسی طرح ہم نے قرآن تمہارے پاس بھیجا ہے ہمارے حکم سے)۔ و في الحديث: "القرآن حجة لک أو عليک"۔ تو ظاہر ہے کہ عدالتی فیصلے اسی قرآن کی روشنی میں ہوں گے، اور فرمایا: "إن الله يرفع بهذا القران أقواماً ويضع به آخرين"۔ [ترمذي] آج کا دن یوم الفصل ہے، لوگوں کا فیصلہ ہوگا: "یرفع و یضع" کا اصلی وقت یہی ہے، اگرچہ دنیا میں بھی جاری رہا تھا۔

اکثر مفسرین حضرات اسی پر ہیں کہ روح سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں، جس طرح لیلۃ القدر کی اہمیت کی خاطر فرمایا: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ﴾ [القدر: ۴] (اس رات فرشتے اور روح نازل ہوں گے اپنے پروردگار کے کی اجازت سے)۔ اور فرمایا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ [الشعراء: ۱۹۳] (اس کو روح الامین نے نازل کیا ہے تمہارے دل پر)۔ [حجۃ اللہ البالغہ: جلد اول] میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے روح سے مراد روح انسانی لیا ہے، اور اس پر سیر حاصل بحث کی ہے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ وہاں کوئی بات نہیں کر سکے گا، کسی کو بات کرنے کی ہمت نہیں ہوگی سوائے اس کے جسے حضرت رحمٰن جل شانہ نے اجازت و اذن دی ہو، اور اس نے بات بھی صحیح ٹھیک کی ہو۔ مطلب یہ کہ درست بات کی ہو، اس سے کلمہ توحید مراد ہے جس نے **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** پڑھا صدق دل سے اور ایمان لایا، بس اس نے صواب اور درست بات کی اور اس نے سچ بولا، تو ایسے لوگوں (مؤمنوں) کو بات کرنے اور شفاعت کرنے کی علیٰ حسب الدرجات اجازت ہوگی اور بولنے کی بھی اجازت مل جائے گی، یہی لوگ ﴿اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَه﴾ کے مصداق ہوں گے۔

شفاعت اور اس کی اقسام:

قیامت کے دن اللہ ربّ العزّت کے حکم و اجازت سے کئی قسم کی شفاعتیں ہوں گی، ان شفاعتوں کے حقدار اہل توحید ہی ہوں گے، کفار و مشرکین ہر قسم کی شفاعتوں سے محروم رہیں گے، البتہ مختصر جزوی شفاعتوں کی بڑی فہرست ہے، مثلاً ماہ رمضان کی شفاعت، قرآن عظیم الشان کی شفاعت، حسنات و نیکیوں کی شفاعت، صدیقین، شہداء، صالحین، علماء، حفاظ، قراء اور نابالغ چھوٹے بچوں کی شفاعت وغیرہ، لیکن شفاعت کبریٰ خاصہ مخصوصہ، صاحب مقام محمود، حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے بلا شرکت غیر۔ اس کی تفصیل صحیحین "بخاری و مسلم" میں اس طرح ہے:

کافی عرصہ سے سب لوگ خاموشی اور بے چینی سے سر جھکائے تڑپ رہے ہوں گے، اور پسینے میں ناف تک، کچھ سینے اور منہ تک شرابور ڈوبے ہوئے کھڑے ہوں گے، یہ کیفیت نہایت سخت اور ناقابل برداشت ہوگی، آخر تمام اہل محشر حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں شفاعت کی درخواست کریں گے اور آپ علیہ السلام اپنی معذوری بیان کر کے کسی اور کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے، پھر دوسرے انبیاء اولوالعزم پیغمبروں علیہم السلام کے پاس باری باری

درخواست کریں گے۔نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، لیکن یہ سارے پیغمبر اپنی اپنی معذوری بیان کر کے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے، تب لوگ الحاح وزاری کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر ختم نبوت جیسے عظیم منصب کا واسطہ پیش کریں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سارا ماجرا سن کر فرمائیں گے: "اَنَا لَهَا، اَنَا لَهَا" میں ہی اس کا حقدار، سزاوار ہوں، میں ہی یہ کام انجام دوں گا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرش الٰہی کے سایہ میں جا کر سجدہ ریز ہو جائیں گے اور اپنے ربّ جل مجدہٗ کی حمد وثناء ایک خاص طرز پر پیش کریں گے، فرمایا: (مجھے وہاں الہام ہوگا ابھی وہ ذہن میں نہیں) حضرت جبار جل شانہ ارشاد فرمائیں گے: "یا محمد! ارفع رأسک سل تعطہ وقل تسمع واشفع تشفع"۔اے محمد! سر اٹھا اور مانگ جو مانگنا ہے، جو سوال کرو گے پورا ہو جائے گا، جو شفاعت کرو گے قبول کر لی جائے گی۔ ﴿عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ [الإسراء: ۷۹] (امید ہے کہ تمہارا پروردگار تمہیں مقامِ محمود تک پہنچائے گا)۔

یہی وہ شفاعت کبریٰ ہے جو کہ سید المرسلین رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختص ومخصوص ہے، اسی شفاعت عظمیٰ کا ثمرہ وفائدہ تمام مؤقف والوں کو حاصل ہوگا۔مشرک، کافر، یہودی، نصاریٰ، ہندو، بدھ مت، صابی، غرض بے شمار مذاہب باطلہ رکھنے والے اس سے مستفید ہو جائیں گے، گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت جس طرح عمومی ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت بھی عمومی ہے۔ **صلی اللہ علیہ وسلم**

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور مسلم نے حضرت انس وحضرت جابر رضی اللہ عنہما کی روایت سے اور امام احمدؒ نے حضرت ابن عمر، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کی روایت سے، اور بزار وبیہقی نے حضرت عبدالرحمن بن عقیل رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ہر پیغمبر کی ایک مقبول خصوصی دعا ہوتی ہے، چنانچہ ہر نبی نے اپنی دعا میں عجلت کی (اور وہ قبول کر لی گئی) مگر میں نے اپنی دعا امت کی شفاعت کے لیے ذخیرہ کر لی، یعنی محفوظ رکھ کر دنیا میں نہیں مانگی"۔حضرت حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ حدیث معنی کے لحاظ سے متواتر ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: "شفاعتي لأهل الكبائر من أمتي"۔میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لیے ہوگی جنہوں نے کبائر معاصی کا ارتکاب کیا۔

اس سلسلہ شفاعت میں مختلف سیاق وسباق کے ساتھ بے شمار احادیث وارد ہیں، جن کو 'فتح الباری میں کتاب الرقاق، کتاب التوحید' کے ضمن میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیلی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔صحیح

بخاری میں ''حدیث شفاعت'' حضرت انس بن مالک اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے، اس میں یہ تصریح ہے کہ شفاعت عظمیٰ کے علاوہ مختلف قسم کے گناہ گاروں کے لیے چار قسم کی شفاعتیں ہوں گی، یہ حدیث بخاری دوم کتاب التوحید میں باین الفاظ موجود ہے: "ثم أعود الرابعة فأحمده بتلک المحامد ثم أخر له ساجدا فيقال: يا محمد! ارفع رأسک و قل يسمع و سل تعطه و اشفع تشفع، فأقول: يا رب! ائذن لي فيمن قال: لا إله إلا الله، فيقول: و عزتي و جلالي و كبريائي و عظمتي لأ خرجن منها من قال: لا إله إلا الله"۔ [بخاري] خلاصہ یہ ہے کہ چار قسم کی شفاعتیں یہی ہیں جو اس حدیث میں بیان ہوئیں۔

پنجم شفاعت کبریٰ (عامہ) جس سے اپنے، پرائے، مؤمن اور کافر غرض تمام اہل موقف مستفیض ہوں گے، اور ساری خلقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح وثناء بیان کرے گی، یہی مقام محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے، جسے قرآن وحدیث نے مقام محمود کے نام سے یاد فرمایا۔

ششم بعض خوش نصیبوں کے لیے بغیر حساب کے جنت میں داخل کرنے کی شفاعت فرمائیں گے۔

ہفتم وہ موحد مسلمان جو اپنے گناہوں کے باعث عذاب دوزخ کے مستحق قرار پائیں گے، مگر وہ دخول نار سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے ذریعہ بخش دیئے جائیں گے۔

ہشتم اہل جنت کے مدارج ودرجات کی ترقی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفاعت فرمائیں گے، اور ان کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

نہم پل صراط پر اپنی امت کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔ پل صراط پر گزرنا اتنا سخت اور خطرناک ہے جس کے بیان کرنے سے زبان قاصر ہے اور لکھنے سے قلم عاجز اور تصور وسوچنے سے، قوت عقلیہ جواب دے دیتی ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خصوصی شفاعت نہ فرمائیں تو شاید معدودے چند شخصیتوں کے سوا کسی کے لیے گزرنا ممکن نہ ہو، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے طفیل عام مؤمن موحدوں کا گزرنا ممکن ہوجائے گا۔

دہم شفاعت، یہ بھی شفاعت عظمیٰ ہوگی، جس سے تمام امتوں کے موحد مسلمان مستفیض ہوں گے، یہ عظیم شفاعت جنت کے دروازے پر ہوگی، جہاں اوّلین وآخرین تمام امتوں کے مؤمن موحد جمع ہوجائیں گے، مگر جنت کا دروازہ بند ہوگا، کھلے گا نہیں، پس سارے لوگ حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے پاس رجوع کریں گے اور یہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام "اذهبوا إلى غيري اذهبوا إلى محمد"

(صلی اللہ علیہ وسلم) کہیں گے، پس میں عرش الٰہی کے سایہ میں سجدہ ریز ہو کر اسی طرح الحاح وزاری شروع کروں گا، جس طرح پہلے کی شفاعت کبریٰ میں کیا تھا، پھر وہی جواب ملے گا جس طرح پہلے ملا تھا حتیٰ کے داروغۂ جنت میرے لئے جنت کا دروازہ کھول دے گا''۔ [ابن کثیر تفسیر سورۃ الزمر] یہ کُل دس شفاعتیں ہوں گی۔

جفا کم کن کہ فردا روز محشر ☆ بروے مصطفیٰ شرمندہ باشی

﴿ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا﴾ یہ دن برحق ہے، پس جو چاہے اپنے ربّ کی طرف ٹھکانا پکڑے، برحق راستہ اختیار کر کے اس پر چلے اور یہ بات یقینی ہے کہ جو شخص اللہ پاک کا راستہ اختیار کرے گا تو اس کے لیے اور اس پر ہدایت کا دروازہ کھل جائے گا، اس سے واضح ہوا کہ حق و باطل کے راستے اختیاری ہیں، ہر شخص اپنے اختیار وانتخاب کا مالک ہے۔

﴿اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا﴾ ہم نے تمہیں قریب آنے والے عذاب سے ڈرایا ہے، اور خبردار کیا ہے، انبیاء ورسل علیہم السلام کے ذریعہ حجت پوری کر دی ہے، یہ ''عذاب قریب'' قیامت کا دن ہے، جسے مشرک محال یا بعید گمان کرتے ہیں، مگر ہم اسے قریب جانتے ہیں، دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا﴾ [المعارج: ٦] (بیشک وہ قامت کا دن دور سمجھ رہے ہیں، اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں) یہ لوگ قیامت کو محال اور دور سمجھتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک وہ یقینی اور قریب ہے، بلکہ ہر شخص کی موت کے ساتھ اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے، جبکہ موت سے کسی کو انکار بھی نہیں اور خلاصی بھی نہیں۔ پھر فرمایا کہ قیامت آنے پر کیا ہوگا؟ تو ارشاد فرمایا:

﴿يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾ جس دن ہر شخص دیکھے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، پوری زندگی کا ریکارڈ سامنے آئے گا، ایک ذرہ برابر عمل نامہ میں زیادتی کمی نہ ہوگی، اگر انسان کو اپنا عمل نامہ خود لکھنا ہوتا شاید کچھ فروگزاشت ہو جاتی، مگر کراماً کاتبین نے جو کچھ لکھا نگہداشت اور غیر جانبداری میں ایسا منظم لکھا کہ فروگزاشت اور سہو ونسیان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہی کتاب جزا وسزا، خیر وشر، جنت ودوزخ کی بنیاد بنے گی، جس کے مندرجات پر کامیابی ونا کامی کا فیصلہ ہوگا۔

دراصل یہ فیصلہ اور اس کی حقیقت برزخی زندگی، یعنی قبر سے شروع ہوگی، جو کہ چھوٹی قیامت کہلاتی ہے، نیک اعمال مؤمن کے پاس خوبصورت، حسین وجمیل ساتھی کی شکل میں، اور برے اعمال کافر اور منافق وفاجر کے پاس ایک خطرناک بدصورت شخص کی شکل میں قبر کے اندر ظاہر ہوں گے۔ [رواہ أحمد، مظهري]

﴿وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾ اور کافر کہے گا: اے کاش! میں مٹی ہوتا، تاکہ میرا حساب و کتاب نہ ہوتا۔ حدیث پاک میں ہے: ''جب اللہ تعالیٰ جانوروں کو ایک دوسرے سے انصاف دلائیں گے، پھر ان سے کہا جائے گا: ''کونوا ترابا''، اب مٹی بن جاؤ اور فنا ہو جاؤ، اس منظر کو دیکھ کر کافر تمنا کریں گے کہ کاش! ان کی طرح ہم بھی مٹی بن جاتے، کیا ہی اچھا ہوتا آج عذاب سے بچ جاتے۔ [ترمذي]

بعض روایات میں آیا ہے کہ جنات کو بھی یہی حکم ہوگا کہ مٹی ہو جاؤ، انہیں دیکھ کر کافر بھی تمنا کریں گے: اے کاش! ان کی طرح ہم بھی مٹی ہو جاتے۔ [درمنشور] بعض روایات میں آیا ہے کہ کافر سے مراد شیطان ہے، وہ بھی بنی آدم کی طرح مٹی ہونے کی تمنا کرے گا، اے کاش! بجائے آگ کی پیدائش کے مٹی سے پیدا ہوا ہوتا، تو شیطنت اور دائمی عذاب و غرور سے بچ جاتا۔ [کشاف]

فائدہ:

جنات بھی بنی آدم کی طرح ایمان و اعمالِ صالحہ اور احکامِ شریعت کے بالاتفاق مکلف ہیں، قرآن و حدیث کے اکثر و بیشتر نصوص اس پر گواہ اور ثبوت ہیں، سید الانبیاء ﷺ کی بعثت انسانوں اور جنات سب کے لیے ہے، جنات جنت و دوزخ دونوں جگہوں کے اسی طرح حقدار رہیں گے جس طرح بنی آدم۔ تفصیل سورۃ الجن کے فوائد میں دیکھ لی جائے۔

سُورَةُ النّٰزِعَات

مكيةٌ آياتها ٤٦ ركوعاتها ٢

سورۂ نازعات مکی ہے، اس میں چھیالیس (۴۶) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام النازعات ہے، یہ کلمہ اس کی پہلی آیت کا پہلا کلمہ ہے، اس کا دوسرا نام السائرة ہے، اور الطامة بھی اسے کہتے ہیں۔

تعداد آیات، کلمات ورکوع:

اس میں دو رکوع، چالیس (۴۰) آیتیں ہیں، اس کے کلمات کی تعداد ایک سو ستانوے (۱۹۷) اور حروف کی تعداد سات سو ترپن (۷۵۳) ہے۔

ربط ومناسبت:

ماقبل کی سورت اور اس سورت کے معانی ومطالب تقریباً قریب قریب ایک ہیں۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول سورۃ النباء کے بعد ہے۔

مختصر مضامین:

فرشتوں کی قسم کیوں کھائی گئی؟ سورۃ المرسلات کے شروع میں فرشتوں کی پانچ صفات کا تذکرہ تھا،

اسی طرح اس سورۂ نازعات کے شروع میں بھی فرشتوں کی پانچ صفات کا بیان ہے، فرشتے تکوینی طور پر نظام کائنات کے چلانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں، اس محکم و پختہ نظام کے مختلف امور پر اسی جماعت کے مختلف طبقات مقرر ہیں، ان کی قسم کھا کر ربّ العزت سبحانہ نے قیامت کے واقع ہونے کو یقینی بنایا، اور واضح فرمایا کہ جو فرشتے امورِ کائنات کی انجام دہی پر مامور ہیں، یہی قیامت کے دن حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کی خدمات بھی انجام دیں گے، انہی کے ایک سربراہ ''اسرافیل'' صور پھونک کر قیامت کا مرحلہ شروع کرائے گا، اور انہی کا ایک سربراہ انسانی روحوں کے قبض پر مقرر ہے، جو ہر شخص کے لیے جزوی قیامت برپا کرائے گا۔

اس سورت میں فرعون، اور اس کی تباہی کا بیان ہے، جس کو انہی فرشتوں کے ایک سربراہ نے انجام دیا تھا۔

مشرکین مکہ کو تنبیہ:

مشرکین مکہ کو تنبیہ ہے کہ تم فرعون جیسے ظالم و جابر بادشاہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہو، جسے اللہ تعالیٰ نے لمحوں میں تباہ کیا، اگر تم اس کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہو تو تمہارا حشر اس سے بھی بدتر ہوگا، اسی طرح یہ بیان بھی ہے کہ منتشر ذرات و عناصر اور تمہاری ہڈیاں اور بکھرے ہوئے اجزاء کو ترتیب دے کر تمہیں دوبارہ زندہ کرنا نہایت ہی آسان کام ہے، جس ذات پاک نے یہ بڑا جہاں اپنے حکم و فرمان سے پیدا فرمایا بغیر کسی مادہ کے، وہ تمہارے مادی اجسام کی دوبارہ پیدائش پر بڑا قادر و توانا ہے، اگر تم فلاح چاہتے ہو تو اس کی وحدانیت کا اقرار کرو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہارا انجام نہایت ہی برا ہوگا، اور دوزخ کا ابدی عذاب تمہارے لئے مقرر ہوگا۔

کفار کا سوال: ''قیامت کا وقوع کب ہوگا؟''

کفار بار بار پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ ذرا اس کی آمد کی تاریخ تو بتا دیں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! انہیں کہہ دیں کہ اس کی تاریخ بیان کرنا میرے فرائض میں نہیں، اور نہ ہی مجھے اس کا علم ہے، اس کی تاریخ کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جسے اس نے اپنی حکمت کے تحت صیغہ راز میں رکھا ہوا ہے، میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ یقینی ہے اور قریب بھی، میرے ربّ نے اپنی حکمت کے تحت قیامت کی آمد اور اس کے صحیح وقت کو اپنے پاس مخفی رکھا ہے، اور کسی پیغمبر کو اس کا وقت موعود نہیں بتایا ہے، وہ جب چاہے گا اسے برپا کرے گا۔ البتہ میں تمہیں اس کی وہ علامات بتا دیتا ہوں، جنہیں وحی کے ذریعہ میرے ربّ نے مجھے مطلع فرمایا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ﴿۴﴾ فَالۡمُدَبِّرٰتِ
اَمۡرًا ۘ﴿۵﴾ یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَۃُ ۙ﴿۶﴾ تَتۡبَعُہَا الرَّادِفَۃُ ؕ﴿۷﴾ قُلُوۡبٌ یَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ ۙ﴿۸﴾ اَبۡصَارُہَا
خَاشِعَۃٌ ۘ﴿۹﴾ یَقُوۡلُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِی الۡحَافِرَۃِ ؕ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَۃً ﴿ؕ۱۱﴾ قَالُوۡا تِلۡکَ اِذًا
کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ ﴿ۘ۱۲﴾ فَاِنَّمَا ہِیَ زَجۡرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ﴿ۙ۱۳﴾ فَاِذَا ہُمۡ بِالسَّاہِرَۃِ ﴿ؕ۱۴﴾

ترجمہ: قسم ہے ان فرشتوں کی جو غوطہ لگا کر نہایت سختی سے کھینچنے والے ہیں ① اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو نرمی سے گرہ کھولنے والے ہیں ② اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں ③ اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو تعمیلِ حکم میں سبقت کرنے والے ہیں ④ اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو ہر امر کی تدبیر کرتے ہیں ⑤ جس دن کانپے گی کانپنے والی ⑥ اس کے بعد آئے گی پیچھے آنے والی ⑦ اس دن بہت سے دل دھڑکنے والے ہوں گے ⑧ ان کی آنکھیں پست ہوں گی ⑨ وہ کافر لوگ کہتے ہیں: کیا ہم پھر الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے؟ ⑩ کیا جب ہم بوسیدہ (بھربھری) ہڈیاں ہو جائیں گے؟ ⑪ وہ لوگ کہتے ہیں: ایسا پلٹنا تو یقیناً نقصان دہ ہوگا ⑫ پس بیشک وہ تو ایک ہی ڈانٹ ہوگی ⑬ پھر اچانک وہ تمام لوگ ایک چٹیل میدان میں ہوں گے ⑭

معارف ومنازل

فرشتوں کی پانچ صفات:

یہاں پانچ صفات کا ذکر ہو رہا ہے: ﴿النَّازِعَات، النَّاشِطَات، السَّابِحَات، السَّابِقَات، المُدَبِّرَات﴾ ان پانچوں صفات سے مراد فرشتے ہیں۔

کفار کی روح کی کیفیت:

﴿النَّازِعَات﴾ نزع سے ماخوذ ہے، معنی ہے: "الجذب بالشدۃ" انتہائی قوت کے ساتھ کھینچنا مراد ہے، معنی یہ ہے کہ قسم ہے ان فرشتوں کی جو کافر کی روح کو انتہائی شدت کے ساتھ اس کے بدن کے مختلف حصوں میں غوطہ لگا کر کھینچتے ہیں۔ جب نزع کے ساتھ غرقاً کا اضافہ کیا گیا، اور نزع بمعنی انزاع ہوا، تو اس کی شدت میں بے حد اضافہ ہوا، "أي إنزاعا في النزع من أطراف الأجساد"، یعنی جسمِ کافر کے دور دراز حصوں میں غوطہ

لگا کر اس کی روح کو نکالنا اور باہر کرنا، کیونکہ کافر طبعی طور پر موت سے متنفر رہتا ہے، اور دنیوی زندگی کو ابدی زندگی تصور کر کے مرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، تو فرشتے زبردستی نہایت قوت کے ساتھ کارروائی کر کے جسم کے تمام حصوں سے اس کی روح کو بیدردی کے ساتھ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مؤمن کی روح کی کیفیت:

﴿وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا﴾ اس کے بالمقابل مؤمن کی روح کے نکالنے کا بیان ہے، مؤمن فرمانبردار رہتے ہوئے عالمِ آخرت اور وصول الی اللہ کے لیے بیتاب رہتا ہے، تو اس کی روح میں سیر الی اللہ اور رجوع الی اللہ کا جذبہ موجزن رہتا ہے، تو فرشتے نہایت نرمی و سہولت کے ساتھ اس کی روح نکالنے میں کارروائی کرتے ہیں، جب وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ اے پاکیزہ اور ایماندار روح! پاکیزہ بدن سے ایک پاکیزہ عالم کی طرف نکلنے کی تیاری کرو، تو وہ بصد خوشی ورضامندی نکلنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، پس نہایت سہولت کے ساتھ اسے ہاتھوں ہاتھ لے کر نکال دیتے ہیں، جیسے کہ آٹے سے بال کو پکڑ کر بڑی سہولت کے ساتھ کھینچا جاتا ہے، یا کسی مشکیزے یا بوتل کے بندھن کھولنے سے بسہولت اندر کا پانی نکلنا شروع ہو جاتا ہے، یا جیسے کہ پیشانی سے پسینہ کا قطرہ ٹپک جائے، کافر کی باغی روح میں یہ کیفیت نہیں ہوتی، تب تو اس کو شدت کی کارروائی کر کے نکال دیتے ہیں۔ "النشط الإخراج بسهولة"۔ جیسے کسی کنویں سے بسہولت پانی کا ڈھول نکالنا، یا کسی عقدے کو کھول دینا، یہ عام مؤمنوں کی ارواح کا حال ہے۔

خواص کی روح کی کیفیت:

رہا خواص، متقی اور عشق الٰہی میں ڈوبے ہوئے مؤمن کی ارواح کا حال، وہ تو معبودِ حقیقی کے وصال کے لیے زندگی بھر بیتاب رہتے ہیں، اور وہ اس گھڑی کا نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے رہتے ہیں، جب یہ گھڑی آپہنچتی ہے تو ان کی بیقراری میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، وہ ایسے وقت کو غنیمت جانتے ہوئے دنیا کے قید و بند کی زنجیروں کو توڑ کر باہر نکلنے پر خوشی محسوس کرتے ہیں، کسی عارف نے کہا: ؎

وعدۂ وصل چون شود نزدیک ☆ آتش عشق تیز تر گردد

نذر کردم کہ بر آید بسرم آن روزے ☆ تا در میکدہ شادان وغزل خوان بردم

انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح کی کیفیت:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کہ کوئی نبی ایسا نہیں کہ اس

کو دنیا و آخرت کے رہنے میں اختیار نہ دیا گیا ہو، اس سلسلے میں جب ملک الموت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تاکہ ان کی روح قبض کرے، انہوں نے فرمایا: ''اے ملک الموت! کیا کسی دوست کو دیکھا ہے کہ اپنے دوست کی روح قبض کرے؟ ملک الموت دربارِ الٰہی میں حاضر ہوئے، ارشاد ہوا کہ ان سے کہو کہ کیا کسی دوست کو دیکھا ہے کہ اپنے دوست کے پاس جانے کو ناپسند کرے؟ انہوں نے یہ سن کر فرمایا: ابھی میری روح قبض کریں''۔ [مسند أحمد] حدیث شریف میں آیا ہے کہ دنیا مؤمنوں کے لیے قید اور جیل خانہ کی مانند ہے، اور کافروں کے لیے جنت ہے، تو اس کے پیش نظر مؤمن کی روح اس جیل خانہ سے نکلنے پر خوشی محسوس کرتی ہے، تاکہ ابدی راحتوں میں داخل ہو اور کافر کی روح اس جنت سے نکلنے اور ابدی عذاب کی طرف کسی صورت میں تیار نہیں ہوتی۔

﴿وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا﴾ قسم ہے ان فرشتوں کی جو حکمِ خداوندی کی تعمیل کئے جانے پر کائنات کی فضاؤں میں تیرتے رہتے اور پھرتے ہیں، جس طرح کہ مچھلی دریاؤں میں یا ستارے اپنے مدار فضاؤں میں تیرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿کُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ﴾ [یٰس: ۴۰] (اور سب مدار میں تیر رہے ہیں)۔

''سبح'' پانی میں تیرنے کو کہتے ہیں، تیز رفتار گھوڑے کو ''فرس سابح'' کہتے ہیں، یہ فرشتے ان ارواح کو لے کر فضاءِ عالم میں تیرتے ہوئے بڑی برق رفتاری اور نہایت تیزی سے بارگاہ ربانی میں پیش کرتے ہیں، اسی طرح احکامِ الٰہی کی تعمیل میں وقتاً فوقتاً مشرق سے مغرب، جنوب سے شمال اوپر سے نیچے محو پرواز رہتے ہیں، اور احکامِ الٰہی کی تعمیل میں مصروف رہتے ہیں۔

﴿فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا﴾ قسم ہے ان فرشتوں کی جو احکامِ خداوندی کے بجالانے میں بڑی چستی اور مستعدی کے ساتھ دوڑ لگا کر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں، اگر مرنے والا مؤمن ہو تو اس کی روح علیین کے مقام پر پہنچا کر رجسٹر میں اندراج کراتے ہیں، اگر مرنے والا کافر ہو تو اس کی روح سجین کی کتاب میں درج کروا کر جہنم رسید کرتے ہیں۔ ﴿فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا﴾ قسم ہے ان فرشتوں کی جن کو جن تکوینی فرائض (امورِ تکوینیہ) کی انجام دہی سونپی گئی ہے، اس کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں، اس کارخانۂ ہستی میں موت و حیات، رزق، روزی، صحت و بیماری، بارش، آبادی، طوفان، ہوائیں آندھیاں، سردی، گرمی، نظامِ شب و روز اور دیگر مختلف بے شمار تغیرات، حوادث، تبدیلیاں، جو بحکم ذوالجلال والاکرام انہیں سپرد ہوئے ہیں، بڑے نظم و نسق اور خوش اسلوبی سے تدبیر کر کے مکمل کرتے ہیں۔

چار بڑے مقرب فرشتے اوران کی ذمہ داری:

حضرت عبدالرحمن بن ثابت سے منقول ہے کہ سارے جہاں کے تمام انتظامی امور چار بڑے مقرب فرشتوں کے سپرد ہیں: جبرائیل، میکائل، اسرافیل، عزرائیل علیہم السلام۔ یہ بڑے مقرب ہیں، اوران کے ماتحت کارکن خدمات انجام دینے والے فرشتے اتنے زیادہ ہیں کہ جنہیں ربّ العزّت سبحانہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا فرمایا: ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ [المدثر: ۳۱] (تیرے ربّ کے لشکروں کواس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا)۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذمہ وحی، ہواؤں اور خدائی لشکروں کا نظام سپرد ہے، اور بارشوں، بادلوں، کھیتی، سبزی وغیرہ کے تمام امور میکائل علیہ السلام کے ذمہ ہیں، دریاؤں، خشکیوں، غرض ہر مقام پر روحوں کو قبض کرنا حضرت عزرائیل علیہ السلام کی ذمہ داری ہے، اور حضرت اسرافیل علیہ السلام تمام احکامِ خداوندی ان تک پہنچاتے ہیں، اس کو حاجب اور دربان کی حیثیت حاصل ہے، اور نفخ صوراس کی ذمہ داری ہے۔ واللہ اعلم

أخرج ابن المبارک في الزهد عن ابن أبي جبلة بسنده قال: أول من يدعى يوم القيمة إسرافيل فيقول الله عزّ و جل: هل بلّغت عهدي؟ فيقول: نعم رب قد بلغتُ جبرئيل، فيدعي جبرئيل فيقال: هل بلغک إسرافيل عهدي؟ فيقول: نعم فيخلي عن إسرافيل فيقول لجبرائيل: ما صنعت في عهدي؟ فيقول: يا رب بلغتُ الرسل فيدعي الرسل فيقال لهم: هل بلغكم عهدي؟ فيقولون: نعم فيخل عن جبرئيل۔ [كتاب الزهد]

وقوعِ قیامت کی کیفیت:

ان پانچوں قسموں کا جواب محذوف ہے، وہ یہ کہ قیامت ضرور آئے گی، یعنی وقوعِ قیامت کی کیا کیفیت ہوگی؟ فرمایا: ﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ جس روز کانپے گی کانپنے والی (زمین) جب پہلا صور پھونکا جائے گا تو زمین اپنے اوپر پہاڑوں سمیت زبردست کانپ اٹھے گی، دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ﴾ [الحج: ۱] (بیشک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے)۔ اور فرمایا: ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ [الزلزال: ۱] (جب زمین کو زبردست ہلا دیا جائے گا)۔ آسمان کا حال پہلے بیان ہوا کہ: ﴿فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ [النبأ: ۱۹] (پس وہ دروازے ہوں گے)۔ اسی طرح دیگر اجرامِ فلکیہ کا بھی کہ وہ سارے آپس میں ٹکرائیں گے اور ریزہ ریزہ ہوکر تباہ ہوجائیں گے۔

﴿رَجْفَةٌ﴾ شدید حرکت واضطراب اور جنبش کو کہتے ہیں، اس تباہ کن اضطراب وزلزلہ کے ساتھ سارانظام عالم درہم برہم، خاکستراور تباہ وبرباد ہوجائے گا، اس کا نام ہے: ’’فزعِ اکبراور نفخۂ اولیٰ، جس سے تمام علویات و سفلیات تباہ ہوجائیں گے، سمندروں میں آگ لگ جائے گی، چالیس سال تک یہی کیفیت رہے گی، پھر:

﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ﴾ اس کے بعد ایک دوسرا جھٹکا ہوگا، اور یہ نفخہ ثانیہ ہوگا، جس کے ساتھ ہر چیز دوبارہ قائم ہوجائے گی، میدانِ حشر برپا ہوجائے گا اور حساب وکتاب کا مرحلہ شروع ہوجائے گا۔ (گھوڑے پر جو سوار کے پیچھے آدمی بیٹھتا ہے، اس کو ردیف کہتے ہیں)۔

عبادالشیطان کی حالت:

﴿قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ﴾ کتنا خطرناک مہیب منظر ہوگا کہ بڑے بڑے شیر دل سلاطین وامراء، تاج تخت والے اور عظیم قوموں اور جرار لشکروں کے سپہ سالار تھر تھراتے ہوئے کانپنے لگیں گے، ان کے دل بیقراری کے عالم میں دھڑکنے لگیں گے، اوران کی آنکھیں خوف وشرمندگی کی وجہ سے پست اور جھکی ہوئی ہوں گی، اوپر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی نہ ان میں ہمت ہوگی اور نہ جرأت ہوگی، یہ حال منکرین توحید ورسالت اور منکرین قیامت کا ہوگا۔

عبادالرحمٰن کی حالت:

عبادالرحمن، کلمہ خواں، رکوع وسجدوں پر زندگی گزارنے والے، نہایت مطمئن، بے خوف وخطر، سکون و اطمینان میں رہیں گے، انہیں کسی قسم کا غم وپریشانی اور اضطراب نہ ہوگا، قرآن حکیم نے ان کے متعلق پہلے سے اعلان کیا ہے، فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ [حم السجدة:۳۰] (بیشک جنھوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، اور پھر استقامت اختیار کی ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور غم نہ کرو، اور جنت کی خوشخبری سنو جس کا تمہیں وعدہ کیا جاتا ہے)۔

اسی طرح سورۂ انبیاء میں ارشاد ربانی ہے: ﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ [الأنبياء:۱۰۳] (نہیں پریشان کرے گی انہیں وہ بڑی خوفناک گھبراہٹ، فرشتے ان کا استقبال کریں گے، اور انہیں بتائیں گے کہ یہی وہ تمہارا دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، جس پر تم نے عقیدہ جما کر ایمان لایا تھا)۔

عبادالشیطان کی مزید ذلت:

﴿اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ﴾ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ذلیل ہوں گی، اور دلوں کی دھڑکن کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھیں ندامت وحسرت کے مارے پست ہوں گی، اوپر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوگی۔

حَافِرَۃ اور نَخِرَۃ کیاہے؟

﴿یَقُوۡلُوۡنَ ءَ اِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِی الۡحَافِرَةِ﴾ وہ آج استہزاء کہتے ہیں کہ کیا ہم الٹے پاؤں دوبارہ اٹھا دیئے جائیں گے؟ حَافِرَۃ سے مراد پہلی دنیوی حالت ہے، جب کوئی شخص اسی راستے سے پلٹ جائے (واپسی) جس پر چل کر وہ آیا ہے، تو عرب کہتے ہیں: ''رجع فلان في حافرته أي طريقته التي جاء فيها فحفرها''۔ یعنی عرب جس راستہ کو وہ پہلے اپنے قدموں سے کھود آیا ہے، اور اپنے نقوش پا ثبت کر آیا ہے اسی پر وہ دوبارہ لوٹ گیا۔

﴿ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ کیا جب ہم بوسیدہ بھر بھری ہڈیاں ہوجائیں گے؟ یعنی ہماری ہڈیاں اس قدر بوسیدہ ہوجائیں گی کہ ہاتھ میں لینے سے مٹی کی طرح ریزہ ریزہ ہوجائیں گی۔ کفار ازراہِ مذاق ایک دوسرے کو کہتے تھے: کیا یہ سچ ہے کہ ہمیں الٹے پاؤں پلٹا دیا جائے گا؟ یعنی شاہراہِ حیات پر چل کر ہم قبر کی منزل تک پہنچے ہیں، کیا پھر لحد سے اٹھا کر ہمیں دوبارہ پہلی زندگی کے مراحل پر لے جایا جائے گا؟ یہ من گھڑت باتیں ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نَخِرَۃ بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں، جب ہڈی بالکل بوسیدہ ہوجائے اور اس کے اندر کا مغز گل جائے، پائپ کی طرح خالی ہوجائے اور اس میں ہوا گزرنے لگے، جس سے نخیر آواز پیدا ہوجائے، ایسی ہڈیوں کو عظام نخرہ کہتے ہیں۔

حیات بعد الممات:

اللہ تعالیٰ نے حیات بعد الممات کے مسئلہ کو قرآن حکیم میں بے شمار طریقوں سے سمجھایا ہے، فرمایا: تمہارے سامنے ہر روز قیامت برپا ہوتی ہے، اور نئی زندگی ملتی ہے مگر تم مانتے نہیں، زمین میں کھیتی پیدا ہوتی ہے، پھر وہ پک کر ختم ہوجاتی ہے اور پھر آئندہ فصل نئی زندگی کے ساتھ ابھرتی ہے، تم ان چیزوں پر کیوں غور نہیں کرتے؟ اسی طرح بحیثیت مجموعی پوری کائنات وقت موعود پر درہم برہم ہوجائے گی، اور جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا اس کو کھینچ کر دوبارہ باہر نکالا جائے گا۔ ﴿قَالُوۡا تِلۡكَ اِذًا کَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴾ کہتے ہیں اگر ایسا ہوگیا تو پھر ہمارا نقصان ہی نقصان ہوجائے گا، جب ہم ساری زندگی قیامت کو جھٹلاتے رہے، اس کے لیے ہم نے کوئی عمل ہی نہیں کیا کوئی تدبیر یا تیاری نہیں کی، یہ

ان کی گفتگو بطور استہزاء تھی کہ پھر ہمیں تو خسارہ ہی خسارہ ہوگا، فرمایا:

﴿فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ تم وقوعِ قیامت کو محال سمجھ رہے ہو، بوسیدہ ہڈیوں اور بکھرے ہوئے ذروں کو اکٹھا کرنا اور ان کو زندہ کرنا تمہیں بڑا مشکل نظر آرہا ہے، بیشک ایسا کرنا تمہاری دسترس سے تو باہر ہے، لیکن علیم کل قادر مطلق کے لیے بڑا آسان ہے، صرف ایک جھڑک اور ڈانٹ کی دیر ہے، بحر و بر، شرق و غرب میں منتشر ذرے فوراً جمع ہو جائیں گے اور تم زندہ ہو کر جواب دہی کے لیے:

﴿ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾ ایک صاف کھلے ہوئے چٹیل میدان میں ہمارے روبرو فوراً کھڑے کر دیئے جاؤ گے۔ الساهرة "البيضاء"۔ [قرطبي] یہ میدان نہایت ہموار ہوگا، ﴿لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا﴾ [طٰهٰ: ١٠٧] اس میں کوئی کجی یا اونچ نیچ نہیں ہوگی۔ سهر کے معنی بیداری بھی ہے، گویا تمام لوگ اچانک خوابِ غفلت سے بیدا ہو جائیں گے۔

نفس اور روح کے متعلق حضرت علامہ پانی پتی صاحبِ تفسیر مظہری کی تحقیق کا خلاصہ:

روح اور نفس:

اس تحقیق سے بہت سے اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "نفس انسانی ایک جسم لطیف ہے جو اس کے جسمِ کثیف کے اندر سمایا ہوا ہے، اور وہ انہی مادی عناصر اربعہ سے بنا ہے (مطلب یہ ہے کہ وہ روح سے الگ ہے)۔ فلاسفہ اور اطباء اسی کو روح کہتے ہیں مگر درحقیقت روحِ انسانی ایک جوہرِ مجرد اور لطیفہ ربانی ہے، جو اس طبعی روح، یعنی نفس کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتا ہے، اور طبعی روح یعنی نفس کی حیات خود اس روح ربانی کے ساتھ وابستہ ہے۔

روح مجرد اور لطیفہ ربانیہ کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے:

اس روح مجرد اور لطیفہ ربانیہ کا تعلق اسی جسمِ لطیف یعنی نفس کے ساتھ کیسا اور کس طرح کا ہے؟ اس کی حقیقت کا علم ان کے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کو معلوم نہیں، اور یہ جسمِ لطیف جس کا نام نفس ہے اس کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنی قدرت سے ایک آئینہ کی مثال بنایا ہے، جو سورج کے بالمقابل رکھ دیا گیا ہو، تو آفتاب کی روشنی اس میں ایسی آجاتی ہے کہ یہ خود آفتاب کی طرح روشنی پھیلاتا ہے۔ نفس انسانی اگر تعلیم وحی کے مطابق ریاضت و محنت کر لیتا ہے تو

وہ بھی منور (روشن) ہو جاتا ہے، ورنہ وہ جسمِ کثیف کے خراب اثرات میں ملوث ہوتا ہے، یہی جسمِ لطیف ہے جس کو فرشتے اوپر لے جاتے ہیں اور پھر اعزاز واکرام کے ساتھ نیچے لاتے ہیں، جبکہ وہ منور ہو چکا ہو، ورنہ آسمان کے دروازے اس کے لیے نہیں کھلتے ہیں، بلکہ اوپر ہی سے نیچے پٹخ دیا جاتا ہے، یہی جسمِ لطیف ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں ہے کہ ہم نے اس کو مٹی سے پیدا کیا، پھر مرنے کے بعد واپس اس (زمین) میں لوٹائیں گے، پھر اسی سے دوبارہ پیدا کریں گے، یہی جسمِ لطیف اعمالِ صالحہ سے منور اور خوشبودار بن جاتا ہے، اور کفر وشرک اور دیگر معاصی سے بدبودار اور گندہ ہو جاتا ہے۔

روح مجرد کا تعلق جسمِ کثیف کے ساتھ:

باقی روحِ مجرد، اس کا تعلق جسمِ کثیف کے ساتھ بواسطہ جسم لطیف، یعنی نفس کے ہوتا ہے، اس پر (روح مجرد لطیفہ ربانی) موت طاری نہیں ہوتی، قبر کا عذاب وثواب بھی اسی جسم لطیف یعنی نفس کے ساتھ وابستہ ہے، اس نفس کا تعلق قبر سے ہی رہتا ہے، روح مجرد لطیفہ ربانی علیین میں ہوتی ہے، اور روح مجرد یعنی لطیفہ ربانی اس کے ثواب و عذاب سے بالواسطہ (بواسطہ نفس) متاثر ہوتی ہے، اس طرح روح کا قبر میں ہونا بمعنی نفس کے صحیح ہے، اور اس کا عالم ارواح یا علیین میں رہنا بمعنی روح مجرد کے صحیح ہے، اس سے ان روایات مختلفہ کی تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ [مظهري باختصار و تغیر]

خلاصہ الکلام: جسمِ کثیف، جسمِ لطیف، روحِ مجرد، (جوہر مجرد) یہ تینوں مختلف چیزیں ہیں، انسان انہیں تینوں سے مرکب ہے، جسمِ کثیف اور جسمِ لطیف مادی ہیں، ان کی پیدائش چاروں عناصر سے ہے، یعنی عالمِ سفلی کی پیداوار ہیں، اور موت انہی پر طاری ہوتی ہے، عذاب ثواب کا براہ راست انہیں دو کے ساتھ تعلق ہے۔

جوہر مجرد لطیفہ ربانی:

بخلاف جوہر مجرد لطیفہ ربانی کے کہ وہ مادی نہیں، اس کا تعلق عالمِ بالا سے ہے، اس پر براہ راست عذاب و عقاب وثواب کا تعلق نہیں ہوتا، اور اس پر موت طاری نہیں ہوتی، وہ جہاں سے آئی وہاں جا پہنچی، یعنی وہ علیین میں رہتی ہے، اگر وہ ثواب وعقاب سے موصوف ہے تو بواسطہ نفس ہوگا نہ کہ براہ راست، اور یہ بھی ہے کہ جسمِ کثیف اور جسمِ لطیف میں خیر وشر دونوں کا مادہ مرکوز ہے، جبکہ جوہر مجرد صرف خیر کے ساتھ موصوف ہوگا، اور عام طور پر لوگ کہا کرتے

ہیں کہ ارواحِ طیبہ یا ارواحِ خبیثہ یہ صفات جوہر مجرد کی نہیں، بلکہ ان کا متعلق جسمِ لطیف یعنی نفس ہی ہے، اگر وہ وحی کی تعلیمات پر کاربند ہو تو طیبہ ہوگا، ورنہ خبیثہ کہلائے گا۔

نفس کی تین صفات:

علماء کرام نے نفس کے جو تین صفات بیان کی ہیں: نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ، یہ صفات جسمِ لطیف کی ہیں، جوہر مجرد کے ساتھ ان کا براہ راست کوئی تعلق نہیں، البتہ بواسطۂ نفس کے بالتبع ہے۔ واللہ اعلم۔

حافظ ابن عبد البر مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے تمہید میں اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں یہ حدیث تخریج کی ہے: **إن اللہ تعالیٰ خلق آدم و جعل فیہ نفسا و روحا، فمن الروح عفافہ و فہمہ و حلمہ و جودہ و سخاءہ و وفاءہ، و من النفس شہوتہ و غضبہ و سفہہ و طیشہ۔ [روض الأنف]**

ترجمہ: اللہ ربّ العزّت نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، اس میں نفس بھی رکھا اور روح بھی، تو روح سے اس کی عفت و پاکدامنی، اس کا علم و فہم اور اس کا جود و کرم اور وفاء عہد ہے، اور نفس سے اس کی شہوت اس کا غضب اور برافروختگی ہے۔

خلاصۃ الخلاصہ یہ ہوا کہ جسمِ لطیف اگر جسمِ کثیف سے متأثر ہو کر اس کی تابعداری کی اور جوہر مجرد سے بالکلیہ کٹ گیا تو یہ خبیثہ کہلائے گا، اور اگر جسمِ لطیف نے جوہر مجرد کی تابعداری کر کے جسمِ کثیف کے اثرات سے بیزاری اختیار کی تو نفس طیبہ اور مطمئنہ کہلائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

روح اور نفس میں فرق:

علامہ ابو القاسم قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اخلاقِ حمیدہ کے منبع و معدن کا نام روح ہے، اور اخلاقِ ذمیمہ کے معدن و سرچشمہ کا نام نفس ہے، مگر جسمِ لطیف ہونے میں دونوں مشترک ہیں، جیسے کہ ملائکہ اور شیاطین جسمِ لطیف ہونے میں دونوں شریک ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ملائکہ نورانی ہیں، نور سے پیدا ہوئے ہیں اور مجموعۃ الخیر ہیں، شر سے محفوظ ہیں، اور شیاطین ناری ہیں، نار سے پیدا ہوئے ہیں اور مجموعۃ الشر ہیں، خیر سے بالکل عاری ہیں۔ پس روح جنس ملائکہ سے ہے اور نفس جنس شیاطین ہے۔

علماء کرام نے نفس و شیطان کو ایک دوسرے کا بھائی اور ہمنوا کہا ہے، جس طرح قرآن کریم نے شیطان کو

انسان کا دشمن کہا ہے، اسی طرح نفس کو سب سے بڑا دشمن بتایا گیا ہے، ایک ضعیف الاسناد حدیث میں آیا ہے: "أعدی عدوک نفسک التي بین جنبیک"۔ اے انسان! تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے، جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان واقع ہے، یہی وجہ ہے کہ اصلی شیطان استعاذہ پڑھنے سے ہٹ جاتا ہے، اور نفس پر استعاذہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دوم شیطان اپنے کام میں نفس کا محتاج ہے، جبکہ نفس اپنے کام میں شیطان کا چنداں محتاج نہیں، شیطان نفس کے واسطہ اور مدد سے گمراہی پھیلاتا ہے، مگر نفس گمراہ کرنے میں مستقل ہے، اور شیطان کو کسی دوسرے شیطان نے گمراہ نہیں کیا، بلکہ اس کو گمراہ کرنے والا اس کا نفس ہے۔

بہر حال! نفس انسان کا دشمن ہے، اور روحِ نورانی اس کا دشمن نہیں، کیونکہ روح میں شر کا مادہ نہیں اور وہ جنس ملائکہ میں سے ہے، بخلاف نفس کے کہ وہ جنس شیاطین میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد کو صوفیاء کرام جہادِ اکبر کہتے ہیں، ایک ضعیف حدیث بھی نقل کرتے ہیں۔ بہر حال قرآن وحدیث میں نفس کے ساتھ بکثرت جہاد کا حکم آیا ہے، مگر روح کے ساتھ جہاد کا حکم نہیں ہوا۔ صوفیاء کرام روح کو بمنزلہ مرد (شوہر) اور نفس کو بمنزلہ عورت (زوجہ) کے شمار کرتے ہیں، کیونکہ روح کا کلمہ مذکر اور نفس مؤنث سماعی مستعمل ہے، پھر اس ازدواجی تعلقات کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہوں گی وہ اس طرح کہ ماء الرجل کی سبقت سے نرینہ اولاد (اعمالِ صالحہ اخلاقِ حمیدہ) پیدا ہوں گی، اور ماء المرأۃ کی سبقت سے مؤنث اولاد یعنی اعمالِ سیئہ اور اخلاقِ ذمیمہ پیدا ہوں گی، اور تمام عقلاء اس بات پر متفق ہیں کہ عورت ضعیف العقل ہے، اس کے مشوروں پر عمل کرنا بہتر نہیں، اسی طرح نفس کے مشورے بھی قابلِ قبول نہیں، بلکہ مخالفت ضروری ہے۔

قرآن حکیم میں مختلف معانی ومطالب کے لیے کلمہ روح اکیس (٢١) مرتبہ ذکر ہوا ہے، جبکہ لفظ نفس مختلف اور بکثرت معانی اور اغراض میں تقریباً دو سو بیانوے (٢٩٢) مرتبہ مذکور ہے، اور کہیں کسی مقام پر اس کی فضیلت وبہتری کا اصالتاً ذکر نہیں، البتہ چند جگہوں میں تعاوُہ بھی روح کی وجہ سے۔ واللہ اعلم

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰى ﴿١٥﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٦﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿١٧﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَاَهْدِیَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿١٩﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰیَةَ الْكُبْرٰى ﴿٢٠﴾

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ

نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾

ترجمہ: کیا آپ تک موسیٰ کی خبر پہنچی ہے؟ ﴿۱۵﴾ جب پکارا اس کو اس کے ربّ نے مقدس وادی طویٰ میں ﴿۱۶﴾ کہ جاؤ! فرعون کے پاس کہ وہ سرکشی اختیار کر گیا ہے ﴿۱۷﴾ اور اسے کہو کہ تجھے پاک ہونے کی رغبت ہے؟ ﴿۱۸﴾ اور میں تمہیں تمہارے ربّ کی طرف رہنمائی کروں تا کہ تیرے اندر خوف پیدا ہو جائے ﴿۱۹﴾ پس موسیٰ نے اسے بڑی نشانی (عصاء) دکھائی ﴿۲۰﴾ پس فرعون نے تکذیب کی اور جھٹلایا ﴿۲۱﴾ پھر وہ پھرا کوشش کرتا ہوا ﴿۲۲﴾ پس اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور پکارا ﴿۲۳﴾ کہنے لگا: تمہارا بڑا ربّ تو میں ہوں ﴿۲۴﴾ پس پکڑا اس کو اللہ تعالیٰ نے آخرت اور دنیا کی عبرتناک سزا میں ﴿۲۵﴾ بیشک یہ واقعہ عبرتناک ہے اس کے لیے جس میں خوف خدا پایا جاتا ہے ﴿۲۶﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر:

مسئلہ توحید ورسالت اور اثباتِ قیامت واحکامِ شرعیہ کے بعد سب سے زیادہ قرآن حکیم نے اُمَمِ سابقہ کے حالات بیان کئے ہیں، اور ان میں سب سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم (یہود وغیرہ) کا بیان ہے۔ اس سلسلے میں فرعون اور اس کی قوم کا خاصا تذکرہ نمایاں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے تین بڑے مقاصد ہیں:

(۱) فرعون کی ہدایت اور اس کی اصلاح وتربیت۔ (۲) بنی اسرائیل قوم کی فرعون کی غلامی سے آزادی۔ (۳) بنی اسرائیل کی ہدایت واصلاح اور ان کی دینی تعلیم وتربیت۔

اس سلسلے کو قرآن حکیم نے جابجا مختلف سورتوں میں کبھی تفصیل کے ساتھ، کبھی اجمالی مختصر طور پر برائے یاد دہانی وعبرت مختلف انداز میں بیان فرمائے ہیں۔ یہاں سورۃ النازعات میں جہاں اثباتِ قیامت کا بیان چل رہا ہے، اس کے ضمن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر ہونے لگا، جس سے اصلی مراد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حوصلہ بڑھانا اور آپ کی تسلی کرانی ہے کہ آپ سے پہلے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجود تنہائی اور بے سروسامانی کے فرعون جیسے عظیم ظالم، مطلق العنان اور جبار بادشاہ کے ساتھ ٹکر لیا، تو تاریخ عالم اس پر گواہ ہیں کہ فرعون باوجود مادی بے پناہ

قوت کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے غرق ہوکر ساڑھے سولہ لاکھ،بعض تاریخی حوالہ سے ستر لاکھ کی تعداد مذکور ہے(مظہری وغیرہ نے اسی کو لیا ہے)جرار لشکر سمیت تباہ ہوا،جس کے نتیجے میں موسیٰ علیہ السلام کامیابی سے ہمکنار ہوئے،بنی اسرائیلی قوم نے آزادی حاصل کر کے فرعون کی مملکت اور تمام مال و دولت باغات وخزانوں کے مالک بن گئے۔

یہی سنت اللہ قیامت تک جاری رہے گی کہ حق کے مقابلے میں باطل تباہ و برباد ہوتا رہے گا،اور حق کا بول بالا ہوتا چلا جائے گا،یہ آپ کے مخالفین کفار مکہ کی فرعون کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں،یہ لوگ فرعون کے عشرعشیر تک نہیں پہنچے،لہٰذا ان کے مقدر میں شکست کے سوا کچھ بھی نہیں،آپ غالب رہیں گے اور آپ کا دین بحکمِ الٰہی دائم و قائم رہے گا،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبیدہ خاطر اور پریشان نہ ہوں،پوری ہمت و استقامت کے ساتھ اپنا مشن جاری رکھیں،اور فرعون کے انجام سے انہیں آگاہ کریں۔

کچھ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں پیدا ہوئے،تابوت کے ذریعہ فرعون کے محل میں پہنچے،یہ ربّ العزت سبحانہ کی قدرت کے کرشمے ہیں کہ انہیں دشمن کے گھر پہنچایا،دشمن کے زیر سایہ اس کے گھر میں پرورش پائی،والدہ محترمہ کی گود میں آکر ان کی روحانی سکون کا ذریعہ ثابت ہوئے،مگر فرعون کے دل میں ہمیشہ ہیجان وخوف رہتا تھا،کیونکہ صغرسنی ہی میں موسیٰ علیہ السلام نبوت وتقویٰ اور اخلاقِ حمیدہ کے نمایاں مظہر تھے۔ایک فرعونی درباری ان کے مکے سے قتل ہوا،اگرچہ ان کا ارادہ قتل کا نہیں تھا،محض تنبیہ کرنا مقصود تھا،دوسرے دن یہ راز فاش ہوا،فرعون اور اس کے حواریوں نے اس کو بہانہ بنا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا چاہا،مگر اہل ایمان کہاں یہ برداشت کرتے؟تب تو خاندانِ فرعون کے مؤمن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع کردی۔

آپ علیہ السلام نے وہاں سے خاموشی کے ساتھ مدین کا سفر شروع کیا اور وہاں پہنچے،یہ علاقہ فرعون کے قلمرو سے باہر تھا،ایک کنویں پر آگئے،اور درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے،لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے گئے،دو کمسن لڑکیاں اپنے جانوروں کے پانی پلانے میں پریشان گھوم پھر رہی تھیں،کنویں کے منہ پر شہر والوں نے بڑا پتھر رکھ چھوڑا تھا،پوچھنے پر بتایا کہ ہم کمزور ہیں،ہمارے والد بوڑھے اور شیخِ کبیر ہیں،ہمارا بھائی کوئی نہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بڑے پتھر کو بآسانی دور کردیا،جس کو دسیوں آدمی نہیں اٹھا سکتے تھے،ان کے ریوڑ کو پانی پلا کر رخصت

کیا، واپس درخت کے سایے میں آرام کرنے لگے۔اور ﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ﴾ [القصص: ٢۴] (اے میرے پروردگار! آپ نے میرے پاس جو خیر نازل کی ہے میں اس کا محتاج ہوں) پڑھ لیا، وہ لڑکیاں گھر پہنچیں تو یہ سارا قصہ اپنے والد محترم حضرت شعیب علیہ السلام کو سنایا، والد محترم نے ان میں سے ایک کو واپس روانہ کر کے فرمایا کہ اس شخص کو جا کر لے آؤ، اس نے جا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماجرا سنایا، فرمانے لگے: چلو تم پیچھے پیچھے آؤ اور مجھے راستہ بتایا کرو۔

شعیب علیہ السلام کی خدمت حاضری:

وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا پورا واقعہ سنایا، پیغمبر سمجھ گئے اور کہنے لگے: ﴿لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ﴾ [القصص: ٢۵] (ڈرو نہیں، تم نے ظالم قوم سے نجات پالی ہے) کیونکہ نبی، نبی کی شناخت کرتا ہی ہے، اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی تک مبعوث نہیں ہوئے تھے، مگر نبوت کے آثار و علامات ان کی مبارک پیشانی میں جلوہ افروز و نمایاں تھے۔

لڑکی نے والد محترم سے درخواست کی کہ یہ شخص طاقتور بھی ہے اور امانت دار بھی، کیوں نہ اس کو اجیر و خدمتگار مقرر کیا جائے۔ پیغمبر شعیب علیہ السلام راضی ہوئے، بیٹی سے نکاح کی پیشکش کر دی، آٹھ سال تک بکریاں چرانے کو حق مہر مقرر فرما کر مزید دو سال کی خدمت اس کی مرضی پر چھوڑ دی، دس سال کا عرصہ پورا ہوا، حضرت شعیب علیہ السلام نے اجازت دیدی، سواری کے لیے ایک گدھا، معاش کی خاطر چند بکریاں اور ایک مبارک عصا سپرد فرما کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رخصت کیا۔

موسیٰ علیہ السلام وادی طویٰ میں:

شام کے عام راستے کے بجائے ایک غیر معروف راستے پر سفر شروع کیا، فلسطین کے علاقے پر گزرتے ہوئے وادی طویٰ پہنچے، سخت سردی میں بادلوں کے گرج و چمک میں یہاں جا پہنچے، بیوی حاملہ تھیں، ولادت کا دردِ زہ شروع ہوا، بکریاں منتشر ہو گئیں، چقماق کے ذریعہ آگ جلانا چاہا مگر فائدہ نہ ہوا، دور کسی پہاڑ کے دامن میں آگ نظر آئی، ادھر راستہ بھی غیر معروف و ناہموار تھا، بیوی سے فرمایا: (ایک خادم بھی ساتھ تھا) کہ تم یہاں ٹھہرو، میں دور ایک آگ دیکھ رہا ہوں، وہاں سے راستے کا پتہ بھی معلوم کروں اور آگ کا شعلہ (قبس) حاصل کر کے لے آؤں گا، قریب پہنچے تو حیران رہ گئے، چاروں طرف زبردست روشنی پھیلی ہوئی ہے، آگ بجائے زمین کے ایک بڑے

درخت کی بلندی پر گھوم رہی ہے، نزدیک آئے تو ندا آئی کہ اے موسیٰ! جوتے اتار کر قریب آؤ، یہ آگ نہیں، یہ تجلی اعظم ہے، میں تیرا ربّ ہوں، ﴿فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ [طٰہٰ: ۱۲] (جب موسیٰ آگ کے پاس آئے تو انہیں ندا ہوئی کہ میں تمہارا پروردگار ہوں، جوتے اتار دو، بیشک تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو)۔

عطاء نبوت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سفارش:

قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر بہت خوبصورت انداز میں بیان فرمایا، بہت سی نوازشات وہدایات سے نوازے گئے اور خلعت نبوت سے سرفراز فرمائے گئے، اور حکم ملا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ اپنی زبان مبارک کی لکنت دور ہونے کی درخواست کی، اور اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت ورفاقت کی سفارش کی، اور ربّ العزّت عزّ سبحانہ نے اپنی معیت ونصرت کا وعدہ فرمایا۔

پس دونوں بھائی مبلغ بن کر مدعی اُلوہیت فرعون کے پاس آئے، معجزات دکھائیں، ﴿تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ [الإسراء: ۱۰۱] (نو واضح نشانیاں) پیش فرمائیں، جوں جوں مرض کی دوا بڑھتی گئی، فرعون کے کفر وانکار میں بھی اضافہ ہوتا گیا، ساحرانِ فرعون کا مرحلہ پیش آیا، عصاء موسوی نے سب کو منہ میں لے کر نگل لیا، فرعون ہار گیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیت گئے، دو ہزار سے زائد جادوگروں نے ایمان قبول کیا، یہ سلسلہ روز افزوں بڑھتا گیا، نتیجے میں فرعون اور اس کے ستر لاکھ سے زائد فوجی بحر قلزم کی موجوں کی نذر ہوکر ہمیشہ کے لیے جہنم رسید ہوئے۔ بنی اسرائیل نے ساڑھے پانچ سو سالہ فرعونی غلامی سے نجات پائی۔

انجامِ فرعون سے عبرت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی:

تو اہل مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ تم فرعون سے کوئی بڑے طاقتور نہیں ہو، وہ بھی تو معبود اور ربّ بنا ہوا تھا، فرعون جاندار اور طاقتور معبود تھا، اس کے حشر وانجام کو دیکھو کیسا برا ہوا؟ یہ تمہارے بے جان معبود تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتے، لہٰذا تم لوگ اس کے انجامِ بد سے سبق سیکھو، اور یہ بھی سوچو کہ ربّ العزّت وحدہٗ لاشریک لہٗ نے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو کامیاب فرما کر اس کے طاقتور مخالف کو غرق کیا، وہی واحد لاشریک تمہارے مقابلے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیاب کرکے تمہیں اور تمہارے بے جان معبودوں کو خاک میں ملا کر نیست ونابود فرمائیں گے، وہ اس پر قادر ہے کہ تمہاری بکھری ہوئی ہڈیوں کے ذرات کو اکٹھے کرکے روزِ قیامت دوبارہ زندہ کرکے حساب وکتاب کے

لیے اپنی عدالت میں پیش فرمائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جاؤ فرعون کے پاس کہ اس نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے، اس کی سرکشی کا یہ عالم ہے کہ ربّ تعالیٰ کا بندہ ہو کر اس نے اُلوہیت و خدائی کا دعویٰ کیا ہے، صرف یہ نہیں، بلکہ اس نے خلقِ خدا پر ظلم و تعدی کا بازار گرم کر رکھا ہے، یہ طریقہ بہت قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے کہ حکمران اپنی رعایا کو مختلف نظریات اور مختلف طبقات میں تقسیم کرتے رہے ہیں، اور ان کے مفادات کو آپس میں متصادم کرتے رہتے ہیں، تا کہ وہ متحد ہو کر ان کے ظلم و تعدّی کے خلاف علمِ بغاوت بلند نہ کر سکیں، جس طرح مغربی ممالک کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہمارے زمانے میں لوگوں اور غریب ملکوں میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے، فرعون نے ایسا ہی کیا تھا، عوام کے شعور و حقوق پر ڈاکہ ڈال کر انہیں مختلف نظریات میں تقسیم کیا ہوا تھا، جس کے بل بوتے پر وہ بڑے آرام سے ان پر حکمرانی کر رہا تھا، قرآن کریم نے اسے ﴿اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ [الدخان: ٣١] (وہ چڑھائی کرنے والا تجاوز کرنے والوں میں سے تھا) کے الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور فرعون کی تکذیب:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ اس کے پاس جائیں اور اسے سمجھائیں کہ مشتِ خاک سے پیدا شدہ انسان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ غرور میں آ کر معبودِ حقیقی کی صفت کا، یعنی اُلوہیت کا مدّعی ہو، اگر تو چاہے تو میں تجھے رزائل سے پاک ہونے کا طریقہ بتلا کر ہدایت کا راستہ دکھا سکتا ہوں، اگر تیری مرضی ہو تو اس راہ پر تجھے چلا سکتا ہوں، جو اللہ پاک کی معرفت کی راہ ہے، اس طرح تیرے دل سے غرور اور سرکشی دور ہو جائے گی، اور تیرے دل میں ربّ کا خوف پیدا ہو جائے گا، اور جب اس کا خوف پیدا ہو گیا تو یہ ساری خرمستیاں اور غرور و پندار کافور ہو جائیں گے۔

﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝٢٠ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝٢١ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝٢٢ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝٢٣ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝٢٤﴾ جب موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے اسے حق کی دعوت پیش کی، اپنی صداقت پر دلیل پیش کی اور اپنا عصا اس کے سامنے زمین پر پھینکا جس نے اژدہا بن کر پھنکارنا شروع کیا، مگر بدقسمت نے اسے جادو اور موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر کہہ کر ان کی تکذیب کی، اتنے بڑے معجزے کو دیکھ کر بھی حق کو تسلیم نہیں کیا، اور مقابلے پر اتر آیا۔ جس کی تفصیل قران حکیم نے مختلف سورتوں میں بیان کی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔

☆☆☆

ساحرانِ مصر کے ساتھ مقابلہ:

یہاں مختصراً اتنا واضح ہو کہ فرعون اور اس کی جماعت نے اس معجزہ کا توڑ پیش کرنے کے لیے زبردست اقدام کیا، مصر کے گوشے گوشے سے زبردست ماہر جادوگروں کو اکٹھا کیا، اور ان کو بڑے بڑے انعامات کی لالچ دی، وہ لوگ جنہیں اپنے فنِ جادو پر بڑا ناز تھا بڑی جرأت اور کروفر کے ساتھ حاضر ہوئے، اور حضرت پر سبقت لے جانے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے اپنی رسیوں پر ایسے ایسے منتر پھونکے کہ وہ بیشمار رسیاں سانپ بن کر لہرانے لگیں، پوری زمین پر پارہ کی طرح حرکت کرنے لگیں، جس پر پورے مجمعے میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی، اور بذاتِ خود جادوگروں کو اپنے غلبے کا پورا پورا یقین ہوتا گیا۔

ادھر فرعون نے اعلان کیا کہ میں ہی تمہارا سب سے بڑا ربّ ہوں، اور یہ سب میرے حکم سے ہو رہا اور چل رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ و اعتماد پر اپنا عصا زمین پر پھینکا، تو وہ اژدھا بن کر ان ہزاروں سانپوں کی طرف لپکا، اور چشمِ زدن میں ان سب کو نگل گیا۔

اس تابناک معجزہ نے پورے مجمع کو شکست فاش سے دوچار کردیا، اور فرعونیوں کو ذلّت آمیز شکست دے کر ان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ دوسری طرف وہ ہزاروں جادوگروں نے شکست تسلیم کرتے ہوئے حق و صداقت کے سامنے ہتھیار ڈال کر ایمان لانے کا اعلان کردیا۔ روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے آپس میں مشورہ کئے بغیر بیک آواز کلمہ کا ورد شروع کردیا۔ فرعون کو اللہ تعالیٰ نے ایسا شرمندہ و رسوا کردیا کہ سر اٹھا کر اوپر دیکھنے کی اس میں ہمت پیدا نہ ہوئی، یہ اتنی بڑی ہزیمت تھی کہ سارا مجمع مع فرعون کے تڑپ تڑپ کر ذلیل و خوار ہوگئے۔

یہ مجمعِ عام کی رسوائی دنیا کی ذلّت و گرفت کا مصداق ہے، اس کے بعد دریائے قلزم میں پورے لشکر کے ساتھ غرقاب ہونا، یہ دنیا و عقبیٰ دونوں کی ذلّت کی مثال ہے، بعدازاں ﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ [المؤمن: ٤٦] (اور جس دن قیامت برپا ہوگی فرعون والوں کو سخت عذاب میں داخل کردو) یہ آخرت کے عذابِ ابدی کی مثال ہے۔

بیشک فرعون کی ہزیمت و شکست اور تباہی میں ہر اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے، جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو، اور بے بہرہ اور بدنصیب قلوب کبھی ہدایت قبول نہیں کریں گے، ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب اللہ تعالیٰ کا عذاب چاروں طرف سے انہیں گھیر لے گا، اور اس کا قہر و غضب تباہ کن بجلی بن کر انہیں بھسم کرکے رکھ

دے گا، یہ اس کا فیصلہ ہے کہ ﴿كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ﴾[المرسلات:۱۸] (ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں)۔

﴿فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى﴾ پس اللہ تعالیٰ نے فرعون کو آخرت کے عذاب دوزخ میں گرفتار کرلیا اور دنیا کے عذاب (غرق) میں تباہ کیا۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى﴾ اس قصہ میں بڑی عبرت ہے ڈرنے والوں کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں علیہم السلام کی مخالفت سے دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جاتی ہیں، اور ابدی ذلت و خواری میں گرفتار ہونا پڑتا ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿٢٩﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿٣١﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿٣٢﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾

ترجمہ: کیا پیدا کرنے کے اعتبار سے تم زیادہ سخت ہو یا آسمان؟ اس کو اللہ نے بنایا ہے ﴿٢٧﴾ اس کی بلندی کو اٹھایا ہوا ہے، پھر اسے ٹھیک کیا ہے ﴿٢٨﴾ اور اس کی رات اندھیری بنائی ہے، اور اس کے دن کے دھوپ کو باہر نکالا ہے ﴿٢٩﴾ اور اس کے بعد زمین کو بچھا دیا ہے ﴿٣٠﴾ اس میں سے اس کا پانی اور اس کا چارہ نکالا ہے ﴿٣١﴾ اور پہاڑوں کو گاڑھ دیا ہے ﴿٣٢﴾ تاکہ تمہیں اور تمہارے مویشیوں کو فائدہ پہنچائے ﴿٣٣﴾

معارف و منازل

اثباتِ قیامت اور حیات بعد الممات:

دلائل اثباتِ قیامت کا سلسلہ جاری تھا، درمیان میں یہ سلسلہ منقطع ہو کر روئے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی طرف پھر گیا، اب اسے دوبارہ شروع فرما کر مزید دلائلِ قدرت کے ضمن میں اثباتِ قیامت اور حیات بعد الممات کا تذکرہ ہو رہا ہے، فرمایا: ذرا غور کرو! جو آنکھیں تمہیں قدرت نے عطا کی ہیں انہیں اوپر کی طرف موڑ کر آسمان کا نظارہ کرو، تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمیں دوبارہ زندہ کرنا اور ہمارے منتشر بکھرے ہوئے ذرات کو جمع کرنا مشکل ہے، سو دیکھو تم چند بالشت قد و قامت کے انسان ہو، اور اس آسمان کی بلندی کا فلک کی پہنائیوں اور وسعتوں کا اندازہ لگاؤ، پھر اس

میں بے شمار تارے، ستارے، سیارے اور کہکشاؤں کا محیر العقول اور غیر متناہی سلسلہ دیکھو، یہ کس نے پیدا کیا؟ اور یہ بات تم تسلیم بھی کرتے ہو کہ یہ منظم اور مربوط نظام کا بنانے والا اور خالق ربّ العزّت ہی ہے، فرمایا: ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ [الزخرف:۸۷] (اور اگر آپ ان سے پوچھ لیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے)۔

جب اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور حاکمیت تمہارے ہاں مسلم ہے، اگر تم عقل وانصاف سے محروم نہیں ہو تو تمہیں بداہتاً باآسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ جو پروردگار ان بڑے بے پناہ اجرام کو پیدا کرسکتا اور انہیں بغیر ستونوں کے قائم رکھ سکتا ہے، وہ اس پر بڑا قادر ہے کہ "یومِ موعود" کے دن تمہیں پہلی دنیوی وجود پر پیدا فرمائے گا، اور حساب وکتاب کی خاطر اپنے حضور میں حاضر فرمائے گا، یہ تمہاری دوبارہ زندگی اس کے لیے بہ نسبت آسمانوں کے بڑا آسان اور یقینی ہے۔

﴿سَمْكَهَا﴾ بمعنی ارتفاع وبلندی اور چھت کے ہے، یعنی آسمان کو ہم نے بہت بلند واونچا کردیا، جس تک تمہاری رسائی ممکن نہیں اور کبھی تم اس کو پا نہیں سکو گے۔ پھر فرمایا: ﴿فَسَوّٰهَا﴾ اس نیلگوں بلند وبالا آسمان کو ایسا نقش دار اور خوبصورت بنایا اور درست فرمایا کہ اس میں نہ رخنہ، نہ شگاف نہ جھول اور نہ کوئی عیب۔ ﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ﴾ [الملک:۳] (نظر لوٹاؤ، کیا تم کو رخنہ دیکھ رہے ہو؟) شیخ سعدیؒ نے فرمایا:

نگہ کن براین گبند زرنگار ☆ کہ سقفش بود بے ستون استوار

یاد رکھو کہ جو ربّ اس نظام کی تخلیق اور تدبیر پر قادر وتوانا ہے وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر بڑا قادر وتوانا بھی ہے۔

﴿وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا﴾ خلاقِ زمین وآسمان کی قدرت دیکھو کہ اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو نورانی بنا کر ظاہر فرمایا، یہ اس کی قدرت وحکمت ہوئی، کہیں رات ہے، کہیں دن، یہ کیسے کیسے انقلابات ہیں، بعض ملکوں میں سورج طلوع کررہا ہے، دیگر علاقوں میں غروب کا منظر ہے، سویڈن اور ناروے میں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہے، لوگ انڈونیشیا میں صبح کی نماز ادا کررہے ہیں اور لندن کے مسلمان نماز عشاء میں مصروف ہیں، برصغیر میں دن ہے اور امریکہ میں رات کی تاریکی ہے، یہ سارا نظام آسمان اور اس کے سورج سے مربوط ہے فرمایا: ﴿يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ [النور:۴۴] (اللہ رات اور دن کو الٹ پلٹ رہا ہے)۔

شمس وقمر کا یہ انقلاب وتبدیلی ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ اور ثبوت ہے، جس کا نام قیامت اور ﴿الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى﴾ ہے۔ یہ سارے چھوٹے انقلابات کسی بڑے انقلاب (قیامت) کے لیے مقدمۃ الجیش کے پیغام ہیں، اوران میں سے ایک تمہاری دوبارہ زندگی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس رات کی تاریکی اور دن کی روشنی کے ساتھ تمہارے اور دیگر مخلوقات کے ہزاروں فوائد ومنافع وابستہ بھی ہیں۔

﴿وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا﴾ اس کے بعد زمین کو بچھایا، یہ زمین فرش بھی ہے اور گہوارہ بھی، دیکھو اس میں کیا کیا منافع ہیں، جو آگے بیان ہوں گے۔

اس مقام پر شبہ یہ ہو رہا ہے کہ اس ﴿بَعْدَ ذٰلِكَ﴾ سے معلوم ہو رہا ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان کی تخلیق اور برابری کے بعد کی گئی، حالانکہ سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ﴾ [البقرة: ۲۹] (اللہ نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا) اور سورۂ فصلت میں یہ تصریح ہے کہ زمین کی تخلیق پہلے ہوئی اور آسمان کو بعد میں پیدا کیا گیا۔

تو جواب یہ ہے کہ ان دونوں کی تخلیق صرف چھ دن میں مکمل ہوئی، زمین کی تخلیق چار دن میں اور آسمانوں کی پیدائش میں صرف دو دن صرف ہوئے، پہلے دو دن میں صرف زمین کا کرہ اور مادہ غیر مرتب پیدا ہوا، اس کے بعد دو دن میں آسمانوں کو بنایا گیا، آسمانوں کی تخلیق کے بعد دو دن میں غیر مرتب مادہ ارضی کی استوار، برابری، پھیلاؤ اور کوہ و جبال، حیوانات ودیگر بے شمار منافع پیدا کئے گئے، یہ کُل چھ دن کے عرصہ میں۔ اگر کہیں آسمان کی پیدائش کو اول کہا گیا ہو تو معنی یہ ہوگا کہ زمین کے پھیلاؤ سے وہ پہلے ہے، اور اگر زمین کی پیدائش کو اولیت حاصل ہو تو یہ اس کے مادہ اور کرہ کے لحاظ سے جو کہ آسمان کی تخلیق سے پہلے ہے، تو یہ اولیت وثانویت اضافی معنی کے لحاظ سے ہوں گی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی فرمایا جو کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے۔

﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا﴾ یعنی پانی بھی زمین ہی سے نکالا اور چراگاہیں بھی، عام طور سے کہتے ہیں کہ نور وروشنی کے بغیر زندگی محال ہے، یہ بات ایک حد تک صحیح ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ راتوں کی تاریکی جزوی طور پر اس کی نفی کرتی ہے، ہاں! جن چیزوں کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے، وہ پانی اور ہوا ہے ان کے بغیر جزوی زندگی بھی محال ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور ان کی منفعتوں کا کوئی شمار نہیں کرسکتا، یہ اتنی بکثرت ہیں کہ سارا جہاں ان کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ پانی کے میٹھے اور نمکین مختلف بے شمار چشمے طرح طرح کے مختلف ذائقوں اور مختلف رنگ کے میوے، پھل

اور ہزاروں قسم کی خوشذائقہ سبزیاں، ترکاریاں، پھول، درخت، جڑی بوٹیاں، خشک میوے، گھاس، سبزہ، چارے یہ سب زمین اور میٹھے پانی کی پیداوار ہیں، ہر موسم میں باری باری سے جو دستیاب ہیں، کبھی ان میں انقطاع نہیں ہوتا۔ چند ایک کا موسم ختم ہوتا ہے تو دوسرے نمونے پک کر آ جاتے ہیں، ماہرین نے اب تک صرف سیب کے دو ہزار نمونے دریافت کئے ہیں، مزید ہر پھل پر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ [الرحمٰن: ۱۳] (تو تم دونوں اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟) بیچارہ انسان ہر قسم کے کھانے کا عادی ہے، مگر مصنوعات سے صانع کی معرفت تک رسائی کا عادی نہیں، بلکہ اُلٹا انکار و تکذیب پر کمر بستہ اور جزا و سزا بعد الموت کے حساب سے منکر ہے۔

﴿وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾ ذرا یہ مختلف رنگ، پیلا، سبز، سیاہ، سرمگیں، سرخ، سفید، پھر نرم، سخت، معتدل ہر طرح کے کوہ و جبال بلند و بالا فلک بوس نظام پر غور کرو، تدبر و تفکر کے ساتھ ملاحظہ کر کے دیکھو، یہ پہاڑ کیسے عجیب و غریب، قطار در قطار، مربوط و محکم نظم کے ساتھ کیل کی طرح زمین میں گاڑے ہوئے پیوست ہیں، تاکہ ان کے ثقل اور وزن سے کرۂ ارضی کی اضطراری حرکت رک جائے، اور زمین ساکن و خاموش رہے، جھول کر اپنے اوپر مخلوقات کی تباہی کا سامان نہ بنے، اِلَّا ماشاء اللہ۔

اس کے علاوہ ان کوہ و جبال میں تمہارے لئے بے شمار فوائد و منافع ہیں، ایک ادنیٰ دھات سے لے کر ہیرے، جواہرات، سونے چاندی تک کے ذخائر انہیں پہاڑوں کے اندر کے خزانوں سے تمہیں دستیاب ہوتے ہیں اور جنگلی تمام جانور چرند پرند، حلال جانور اور طرح طرح کی بوٹیاں، بیش قیمت لکڑی، عمارتی سامان انہیں پہاڑوں سے مہیا ہوتے رہتے ہیں، تم اور تمہارے مویشی اور جانور روزمرہ فیضیاب ہو رہے ہیں، اور سکون و آرام کے ساتھ خوشحال زندگی عیش و طرب کے ساتھ گزار رہے ہیں۔

موسم خزاں میں سارے سبزے مردہ ہو کر خشک ہوتے اور مرجھا جاتے ہیں، جوں ہی بہار کا موسم شروع ہوتا ہے یہ سارے مردے دوبارہ زندہ ہو کر لہلہاتے ہیں، تو جو قدرت ان بوٹیوں، درختوں، سبزوں، پھولوں کو مرنے کے بعد دوبارہ ایک تابناک اور نئی زندگی عطا کرنے پر قادر ہے، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ تمہیں موت کے بعد از سر نو تازہ بتازہ دوبارہ زندگی عطا کرے، اسی کا نام ہی تو قیامت ہے جس کا بیان آنے والی آیتوں میں واضح ہے۔

فرمایا:

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْکُبْرٰی ﴿۳۴﴾ یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۳۹﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۴۱﴾

ترجمہ: تو جب بڑی آفت آئے گی ﴿۳۴﴾ اس دن انسان اپنے کاموں کو یاد کرے گا ﴿۳۵﴾ اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے نکال کر رکھ دی جائے گی ﴿۳۶﴾ تو جس نے سرکشی کی ﴿۳۷﴾ اور دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھا ﴿۳۸﴾ اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے ﴿۳۹﴾ اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا ﴿۴۰﴾ اس کا ٹھکانہ بہشت ہے ﴿۴۱﴾

معارف ومنازل

﴿اَلطَّآمَّةُ الْکُبْرٰی﴾ ناقابل برداشت مصیبت، تمام مصیبتوں کی ماں، بڑا انقلابی ہنگامہ، جو ہر چیز پر غالب ہو، ہر چیز اس کی زد میں آجائے اور پاش پاش ہو جائے، یہ مصیبت محض یہ نہیں کہ انسانوں پر گرفت کرے، بلکہ بلند و بالا آسمان، نظامِ شمسی، کوہ وجبال، سمندر و دریا، کرۂ ارض اور تمام مخلوقات پر غالب آکر سب کو درہم برہم کر کے رکھ دے، اور اینٹ سے اینٹ بجادے، پورے جہاں کو خاکستر بنا کر تباہ کردے، یہ قیامت کی مصیبت ہے، جو تمام مصیبتوں سے ہولناک اور وحشتناک ہے، اور ساتھ اَلْکُبْرٰی کا اضافہ کر کے مزید تاکید کے ساتھ اس کی دل گداز ہولناکی کو پختہ اور واقعی قرار دیا گیا تاکہ کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔

﴿یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی﴾ اس دن غفلت میں ڈوبا ہوا انسان خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنا ہر کارنامہ یاد کرے گا۔ ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ [الکہف:۴۹] (اور جو عمل انہوں نے کیا ہے اس کو حاضر پائیں گے)۔ اس وقت انسان کے سامنے اس کی زندگی کی فلم گھومنے لگے گی اور بلوغ سے لے کر موت تک کی فلم سامنے شیشہ کی طرح گھومنے لگے گی، ہر اشارہ اور ہر چھپا ہوا کردار سامنے آکر ظاہر ہو جائے گا، مجال نہیں کہ کوئی ادنیٰ عمل یا گفتار پردۂ خفا میں رہے، اور وہ اعمال جنہیں وہ بھول گئے تھے ایک ایک کر کے نسیان کے پردوں سے ابھرنے لگیں گے، اور وہ حواس باختگی کے عالم میں کہنے لگے گا: ﴿مَالِ هٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا کَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ [الکہف:۴۹] (یہ کیسا عمل نامہ ہے کہ نہ چھوٹا عمل چھوڑتا ہے اور نہ بڑا مگر اسے گن لیتا ہے)۔

اگر اس نے اچھے کاموں اور نیک اعمال کے ساتھ زندگی گزاری ہوتو اس کی مسرتوں کی انتہا نہ ہوگی، اور اگر معاصی اور برے اعمال میں قیمتی عمر برباد کر کے حاضر ہوا ہے تو اس کی پریشانی دیدنی ہوگی، جب صحائفِ اعمال ہاتھ میں دیئے جائیں گے تو جو اعمال فراموش ہوئے تھے ایک ایک کر کے ہر ذرہ یاد آنے لگے گا، کچھ بھی نہیں چھپے گا، اور جس جہنم کا وہ آج تک مذاق اڑاتا رہا اور مسلسل انکار کرتا رہا وہ آج اس کی آنکھوں کے سامنے ظاہر کر دی جائے گی، وہ اسے اچھی طرح دیکھ کر گھبراہٹ میں بیہوش ہو جائیں گے۔﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى﴾[الحج:] (اور لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ بیہوش ہیں، حالانکہ وہ بیہوش نہیں ہوں گے)۔

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى﴾ قرآن حکیم نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ﴾ [هود:۱۰۵] (تو ان میں سے کوئی بد بخت ہوگا، اور کوئی نیک بخت)۔ اُدھر فرمایا: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ﴾[عبس: ۴۱] (اس دن بعض لوگوں کے چہرے چمکدار، نورانی اور خنداں ہوں گے، اور کچھ کے چہرے بے رونق، نہایت سیاہ ہوں گے)۔

روزِ محشر میں لوگوں کے دو گروہ:

یہ دونوں قسم کے لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی نسل ہی سے ہوں گے، جو دو متضاد گروہوں میں تقسیم ہوں گے: ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جنہوں نے بغاوت اختیار کر کے سرکشی کی اور حدود اللہ کو توڑ کر من مانی کی، دنیا کی اس حقیر زندگی پر نازاں رہے، اور دنیوی زندگی کے آرام و آسائش کو ابدی زندگی کے دائمی آسائشوں پر ترجیح دے کر نہایت غلط فیصلہ کیا، دنیا میں ان کی جد و جہد دولت اور مال کے حصول، شہرت و نام آوری حاصل کرنے کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی، ان کے شب و روز اسی کشمکش میں گزرتے رہے کہ اس دنیا میں اونچے سے اونچے محلات کے مالک ہوں، بڑے بڑے منصب اور اونچے عہدوں پر فائز ہوں، اور یہ لوگ اخروی زندگی کے منکر رہے، اور اس کے حصول کے لیے نہ محنت کی نہ توجہ، اور نہ ہی مال خرچ کیا اور نہ وقت صرف کی، اور نہ ہی سوچنے کی زحمت گوارا کی۔

آج کا فیصلہ ان کے خلاف صادر ہو کر انہیں سنایا جائے گا کہ تمہارا حشر و ٹھکانا جہنم ہی ہوگا، اور ابدی سزا تمہاری مقدر رہے گی، تم نے جن عظمتوں اور عیش و عشرت پر عمر ضائع کر دی آج وہ سب بے سود بے مقصد ثابت ہوئے، آج کی منڈی میں تمہارے کھوٹے سرمایہ کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ سڑے ہوئے مال کو کچرہ خانے کے سپرد کیا

جاتا ہے، اور وہ جہنم ہی ہے، تو فرمان ہوگا: ﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ﴾[الأعراف:۳۹] (پس عذاب چکھتے رہوان اعمال کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے)۔

دوسرا خوش قسمت گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو توحید وایمان پر قائم و نازاں رہے، معبود برحق کی اطاعت میں زندگی کھپائی، عمر بھر یہ تصور کر کے ڈرتے رہے کہ انہوں نے ایک دن اپنے ربّ کے روبرو کھڑے ہونا ہے، انہوں نے اتباعِ ربّ العٰلمین کو اپنا شعار بنا کر اتباعِ نفس وہویٰ سے اجتناب کیا، اور اپنے نفس کے گھوڑے کو کبھی بے لگام نہیں چھوڑا، انہوں نے نفس پر ایسا مضبوط کنٹرول رکھا جو کبھی حدود اللہ اور احکامِ شریعت کی بے حرمتی پر اتر نہ سکا، اور نفسِ مطمئنہ انہیں نصیب ہوا، آج انہیں کہا جارہا ہے: ﴿يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ﴾ [الزخرف:۷۰] (اے میرے بندو! آج تم پر کوئی ڈر نہیں، اور نہ تم غمگین ہوں گے۔ جنت میں داخل ہوجاؤ تم اور تمہاری بیویاں خوش ہو رہے ہوں گے)۔ آج جنت کی فضاء اور روح پرور بہاریں تمہارے لئے چشم براہ منتظر ہیں، جنت کے حور وغلمان، جواہرات اور موتیوں کے ہار پہنے ہوئے تمہارے استقبال کے لیے نہایت بیتاب ہیں، جنت کے فرشتے قطار در قطار تمہارے خیر مقدم کے لیے اور تمہیں سلام کہنے کے لئے چشم براہ ہیں۔

لغات:

﴿هَوٰى﴾ بمعنی خواہش مطلقاً، پھر اس میں تخصیص کر کے صرف ناجائز چیزوں پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں ﴿الهوىٰ﴾ کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "الهوىٰ الانهدام و السقوط من علم"۔ بلندی سے پستی کی طرف گرنے کا نام ہے، جو کہ روحانیت کے اونچے مقام سے پستی، یعنی خواہشاتِ نفسانیہ کی طرف آنا اور نفس کا تابع بننا اور حق سے کٹ کر باطل کی غلامی کو ھویٰ کہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا: ﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ [الجاثية:۲۳] (جو شخص محض خواہش نفس کو اپنا حاکم اور معبود ٹھہرا لے)۔ ھویٰ کو ہویٰ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ انسان کو دنیا میں ہر مصیبت میں پھنساتی ہے، اور آخرت میں ھاویة (جہنم کا نام ہے) یعنی دوزخ میں پھینک دیتی ہے۔ "قيل سمي به لأنه يهوي صاحبه في الدنيا إلى كل داهية وفي الأخرة إلى الهاوية"۔

☆☆☆

ترک ہوائے نفس کے درجات:

سب سے نچلا درجہ حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں کہ ترک ہوائے نفس کے کئی مرتبے ہیں، سب سے نیچے والا درجہ یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ کی مخالفت سے اجتناب کرے، نیز اسلاف کرام کے متفق علیہ عقائد کی مخالفت سے پرہیز کرے۔ درمیانہ درجہ یہ ہے کہ انسان کسی گناہ کا ارادہ کرے اور پھر قیامت کی حاضری کے خوف سے اس سے باز رہے، اور تمام مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرے۔ اور سب سے اوپر والا درجہ وہ ہے جس کو حدیث پاک نے بیان فرمایا: "لا یؤمن أحدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ"۔ [بغو ۵]

حدیث کے معنی یہ ہیں کہ نفس اور نفسانی خواہشات سے مکمل آزادی ہو، اور اتباعِ شریعت طبیعت ثانیہ ہو، یہ بہت اونچا مقام ہے جسے ولایت عظمیٰ کہتے ہیں، یہ درجہ ہر کس و ناکس اور ہوس ناک لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اول و دوم درجہ متقی پرہیزگار اور متبع سنت لوگوں کو ریاضت و محنت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت بہاؤ الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ربّ ذوالجلال والاکرام کے قرب کا سب سے نزدیک راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی مخالفت کرتا رہے، اور فرماتے ہیں کہ نفس کی چالیں بڑی باریک ہوتی ہیں، کبھی وہ گناہوں کے ذریعہ اور عجیب و غریب خواہشات سے انسان کو اپنے ربّ سے دور کرتا ہے، اور کبھی نیک اعمال پر ابھارتا ہے، ایک غیر اہم نیکی پر اسے آمادہ کرتا ہے، جس سے ایک اہم اور اشرف نیکی کا ترک لازم آتا ہے، جو اُسے یاد نہیں رہتا، کبھی نیک اعمال کے باعث ریا، شہرت، خود پسندی میں مبتلا کر کے حق تعالیٰ سے دور کرتا ہے۔

اصلاح احوال کے تدابیر:

ایک بہترین تدبیر اصلاح احوال کی خاطر علماء ربانیین نے جو ترتیب دی ہے، اس میں چار طریقے بہت اہمیت کے حامل ہیں:

اول: یہ ہے کہ ہر عمل اور ہر کام سے پہلے شرعی حکم ضرور معلوم کرے، پھر اسی پر کاربند رہے۔

دوم: یہ کہ روزانہ سونے سے پہلے دن کے اعمال یاد کر کے محاسبہ کرے، نیکیوں پر شکر بجالائے اور غیر شرعی امور پر ندامت اور خوب استغفار کرے، اور آئندہ کے لیے ان کے چھوڑنے کا مکمل عزم کرے۔

سوم: کسی بھی عمل پر غرور و خود پسندی نہ کرے، اور ریا سے پرہیز کرے۔

چہارم: تمام خلائق حتیٰ کہ کفار وفساق بلکہ کتوں اور گدھوں سے خود کو کمتر اور حقیر تصور کرے، اور بس۔

حضرت امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ قصیدہ بردہ میں فرماتے ہیں: ؎

وخالف النفس والشيطان واعصهما	★	وان هما محضاك النصح فاتهم

یعنی نفس اور شیطان کی مخالفت اور نافرمانی کرو، اگر وہ تیری خالص خیر خواہی بھی کریں تب بھی مشتبہ سمجھ کر باور نہ کرو، کیا نفس وشیطان کسی کی خیر خواہی پر آمادہ ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! یہ دونوں بڑے چالباز اور ازلی دشمن ہیں، کبھی ناصح کے روپ میں سودا بازی کرتے ہیں، مگر ہوشیار رہو اور اجتناب کرو، کیونکہ کانٹے دار درخت سے کبھی پھول چننا ممکن نہیں سوائے کانٹوں کے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ثلاث مهلكات هوىً متبع، وشح مطاع، وإعجاب المرأ بنفسه وهي أشدهن"۔ [البيهقي، مظهري] یعنی تین چیزیں انسان کو ہلاک کرنے والی ہیں: نفس کی وہ خواہشات جن کی پیروی کی جائے، بخل اور کنجوسی، جس کی اطاعت کی جائے، اور خود بینی کہ انسان اپنے نفس کو بہتر سمجھنے لگے۔ فرمایا: "یہ تیسری چیز سب سے زیادہ مہلک ہے" (کیونکہ ابلیس لعین کو تو اسی تیسری چیز نے تباہ وبرباد کیا)۔ ؎

مرا اورا رسد کبریا ومنی ☆ کہ ملکش قدیم ست وذاتش غنی

بڑائی صرف حق تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے، اور المتکبر اس کا نام نامی ہے، اور یہ اس کی خصوصی چادر ہے، جو شخص اس چادر کو اپنے اوپر ڈالنا چاہے گا، وہ پاش پاش ہو کر لعنتی بن جائے گا۔ ؎

تکبر عزازیل را خوار کرد ☆ بزندان لعنت گرفتار کرد

(سعدی)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾
اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾

ترجمہ: یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ وہ کب قائم ہوگی؟ ﴿۴۲﴾ آپ کو اس کے ذکر سے کیا واسطہ ﴿۴۳﴾ قیامت کی انتہا تو تیرے ربّ کی طرف ہے ﴿۴۴﴾ بیشک آپ ڈرانے والے ہیں اس شخص کو جو

اس قیامت سے خوف کھاتا ہے ﴿۴۵﴾ گویا جس دن وہ لوگ اس قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے (تو یہ خیال کریں گے) کہ وہ نہیں ٹھہرے دنیا میں مگر ایک دن کا پچھلا پہر یا دوپہر کا وقت ﴿۴۶﴾

معارف ومنازل

دونوں گروہوں کے نتائج بیان کرنے کے بعد روئے سخن پھر منکرین قیامت کی طرف پھر گیا کہ یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ ﴿اَیَّانَ مُرْسٰىهَا﴾ کہ وہ کب آئے گی؟ کس وقت قائم ہوگی؟ یہ سوال گزشتہ تمام سورتوں میں مسلسل چلا آرہا، اور ہر موقع پر یہی سوال اور اسی طرح کے جوابات دیئے جارہے ہیں کہ قیامت کا وقوع پختہ یقینی ہے اور قریب بھی ہے، وہ ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، مگر اس کا علم اور اس کی خاص گھڑی میرے ربّ کے پاس ہے اور یہ خاصہ خداوندی ہے، کسی نبی ورسول کو قیامت کا علم نہیں دیا گیا، میں بھی انہیں میں سے ایک رسول ہوں۔ ﴿قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ﴾ [الأعراف:۱۸۷] (آپ کہہ دیں کہ قیامت کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے، اس کو اپنے وقت پر اللہ ہی ظاہر کرے گا)۔ میرے فرائض میں شمار نہیں کہ میں تمہیں اس کا اصلی وقت بتادوں، اور نہ ہی یہ میرا منصب ہے۔ البتہ یہ بات میرا منصب وفریضہ ہے کہ لوگوں کو قیامت سے مطلع کروں اور ڈراؤں، تاکہ وہ یقین کرکے اس کی تیاری کریں۔

اور یہ بھی میرا فریضہ ہے کہ اس کی علامات قوم کے سامنے واضح کروں، اور اس کی ہولناکیوں اور سختیوں سے انہیں آگاہ کروں، اور جو لوگ اس سے خوف کھاتے ہیں انہیں قیامت سے ڈرا کر چھوڑ دوں۔ رہا اس کے وقت کا تعین تو یہ نہ میرا منصب وفریضہ ہے نہ اس سے تعلق ہے، یہ صرف اور صرف خاصہ خداوندی ہے، جس طرح تم میں سے ہر شخص اپنی موت پر یقین کرتا ہے، مگر اس کے وقت کا علم اس کے پاس نہیں ہے، میرا بعینہٖ یہی حال ہے۔

بعض علماء ﴿فِیْمَ﴾ پر وقف کرکے ﴿اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا﴾ کو جملہ مستأنفہ شمار کرتے ہیں کہ آپ کی آمد قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: "بعثت أنا والساعة كهاتين"۔ مگر یہ جواب اس لئے بہتر نہیں کہ مکذبین کا سوال وقوعِ قیامت کے بارے میں ہے، نہ کہ علاماتِ قیامت کے بارے میں۔

لغات:

﴿اَرْسٰىهَا﴾ کے معنی قیامِ قیامت کے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں ﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا﴾ [هود: ۴۱] (اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا لنگر ڈالنا) کے تحت گزرا۔ اسی طرح ﴿وَالْجِبَالَ

اَرۡسٰهَا﴾ کا معنی بھی گزرا یعنی: پہاڑوں کا زمین میں گاڑنا، یہاں یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔خلاصہ یہ ہوا کہ قیامِ قیامت کسی خاص حکمت ومصلحت کے تحت خاصۂ خداوندی ٹھہرا،مخلوقات میں سے کسی کو یہ علم نہیں دیا گیا۔

﴿كَاَنَّهُمۡ يَوۡمَ يَرَوۡنَهَا لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوۡ ضُحٰهَا﴾ یہ لوگ قیامت کے واقع ہونے کا وقت پوچھتے ہیں،ان کا مطلب قیامت پر ایمان لانا نہیں اور نہ ہی اس کے لیے کوئی تیاری کرنا ہے، بلکہ محض مذاق واستہزاءان کا مقصد ہے، کیونکہ اس کے بارے میں ''بعید وغیر واقع ہونا'' ان کا عقیدہ ہے،تو انہیں یہ بتا دو کہ جب قیامت آئے گی اور تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو تمہارا حال یہ ہوگا کہ دنیوی ناز ونخرے اور تمام عیش وعشرت بھول جاؤ گے،اور ندامت وحسرت کے ساتھ کہو گے کہ یہ کیوں جلدی آئی ؟ ہمیں کسی تیاری کی مہلت کیوں نہ دی گئی؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہم نے دنیا میں چند گھنٹے گزارے اور جلدی سے ہمیں دوبارہ بلایا گیا، ہم نہیں ٹھہرے دنیا میں مگر ایک پچھلا پہر، یا ایک دو پہر کا وقت۔

گویا کہ اس دن انہیں زندگی اس قدر مختصر محسوس ہوگی کہ وہ سمجھیں گے کہ ہم نے دنیا میں ایک پورا دن بھی نہیں گزارا جس طرح دو پہر کا حصہ جلدی سے گزرتا ہے، یا پچھلا پہر فوراً ختم ہو جاتا ہے، انہیں سو سالہ اور اسی یا ستر سالہ زندگی اتنی مختصر معلوم ہوگی، آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی پوری زندگی نہایت مختصر معلوم ہوگی ،اگر یہ لوگ قیامت پر ایمان لانے والے ہوتے تو اس طرح کی بات نہ کرتے۔قاعدہ ہے کہ جب خوشحالی آجاتی ہے تو لوگ محظوظ ہو کر کہتے ہیں کہ یہ کیوں دیر سے آئی ؟ اس کو جلدی آنا چاہئے تھا، اور غم کی گھڑی جب آپہنچتی ہے تو کہتے ہیں کیوں یہ مصیبت جلدی آئی ؟ اسے کچھ دیر بعد آنا چاہیے تھا۔

سُورَةُ عَبَسَ

مكية آياتها ۴۲ ركوعها ۱

سورۂ عبس مکی ہے، اس میں بیالیس (۴۲) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نام:

اس سورت کے تین نام ہیں: سورة عبس، سورة سفرة، سورة أعمى، مگر مشہور پہلا نام ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، مکی زندگی میں سورۃ النجم کے بعد نازل ہوئی، اس سورت کی بیالیس (۴۲) آیتیں ہیں، یہ سورت ایک سوتیس (۱۳۰) کلمات، اور پانچ سوپینتیس (۵۳۵) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط و مناسبت:

ماقبل کی سورتوں کی طرح اس سورت میں بھی قیامت کے احوال اور ہولناکیوں کا بیان ہے، ماقبل سورت میں الطَّامَّةُ الْكُبْرىٰ کا ذکر تھا، اس سورت میں اس کے ہم معنی الصَّاخَّة کا بیان ہے۔

سورت کا مختصر موضوع:

شروع سورت میں ایک نابینا صحابی عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ہے، پھر قرآن حکیم کی حقانیت اور عظمت کا بیان ہے، اس کے ساتھ انسانی پیدائش اور اس کی ناشکری کے بیان کے ساتھ اللہ رب العزت کی نعمتوں کا ذکر ہے، پھر قیامت کے وقوع اور اس کی ہولناکیوں اور تمام تر سختیوں کا ذکر ہے، پھر مختصر جنتیوں اور دوزخیوں کا تذکرہ

اور بیان ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾ وَمَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی ؕ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۵﴾ فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی ؕ﴿۶﴾ وَمَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی ۙ﴿۸﴾ وَہُوَ یَخۡشٰی ۙ﴿۹﴾ فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی ﴿ۚ۱۰﴾ کَلَّاۤ اِنَّہَا تَذۡکِرَۃٌ ﴿ۚ۱۱﴾ فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ ﴿ۘ۱۲﴾ فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ﴿ۙ۱۳﴾ مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍۭ ﴿ۙ۱۴﴾ بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ ﴿ۙ۱۵﴾ کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ ﴿ؕ۱۶﴾

ترجمہ: چین بہ جبین ہوئے اور منہ پھیر لیا﴿۱﴾ کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا﴿۲﴾ اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور جاتا﴿۳﴾ یا وہ کوئی نصیحت کی بات قبول کر لیتا، سو نصیحت اس کو نفع دیتی﴿۴﴾ تو جو شخص بے پرواہی کرتا ہے﴿۵﴾ آپ اس کی طرف تو توجہ کرتے ہیں﴿۶﴾ حالانکہ آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ نہ سدھرے﴿۷﴾ اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے﴿۸﴾ اور اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ڈرتا بھی ہے﴿۹﴾ تو آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں﴿۱۰﴾ ہرگز ایسا نہ کیجیے، بیشک یہ قرآن نصیحت کی چیز ہے﴿۱۱﴾ سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے﴿۱۲﴾ وہ ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرّم ہیں﴿۱۳﴾ بلند ہیں، مقدس ہیں﴿۱۴﴾ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں﴿۱۵﴾ جو مکرّم ہیں، نیک ہیں﴿۱۶﴾

معارف ومنازل

شانِ نزول:

حضرت عبداللہ بن شریح بن مالک بن ربیعہ زہری رضی اللہ عنہ (جو کہ ابن امّ مکتوم کے لقب سے مشہور تھے) سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے خالوزاد بھائی تھے، یہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جن کا شمار السابقون الأولون میں ہوتا ہے، یہ شخص نہایت متقی پرہیزگار اور نابینا تھے، ایک روز دربارِ رسالت میں ابوجہل، عتبہ، شیبہ، ولید بن مغیرہ، امیۃ ابن خلف، عباس بن عبدالمطلب اور چند دیگر رؤساء قریش حاضر تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اسی فکر میں محو تھے کہ اگر رؤساء قریش میں سے چند اشخاص اسلام قبول کر لیں تو میرے کام میں آسانی ہو جائے گی، کیونکہ ان کے اسلام قبول کرنے کا اثر ماتحت و چھوٹے لوگوں پر پڑنا لازمی ہوتا ہے، اسی موقع کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غنیمت جانتے ہوئے بڑی دلسوزی اور تندہی سے رؤساء قریش کو اسلام کی حقانیت سمجھا

رہے تھے، کفر و شرک کے اندھیروں سے انہیں نکالنے کی کوشش فرما رہے تھے، یہ مجلس وعظ و نصیحت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک نہایت اہم اور نعمت غیر مترقبہ محسوس ہوئی۔

درایں اثناء جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس نہایت گرمی سے جاری تھی، اچانک عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا حاضر ہوئے، نابینا ہونے کی وجہ سے مجلس کا رنگ نہ دیکھ سکے، اس اہم مجلس کے فوائد کا اندزہ نہ کر سکے، اور نہ ہی حاضرین کی شناخت کر سکے، آتے ہی سوالات کا سلسلہ شروع کر کے کہنے لگے: "علّمني يا رسول الله! ممّا علّمک الله"۔ اور یہ اصرار کے ساتھ بار بار کہتے رہے، اس مداخلت بے جا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پریشان ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور پر ناگواری کے اثار نمایاں ہوئے، کیونکہ یہ سب کچھ آداب مجلس اور ضروری تبلیغ کے لیے نقصان دہ ثابت ہورہے تھے۔

حق تو یہ تھا کہ وہ آتے ہی اندازِ مجلس معلوم کر کے خاموش رہتے، اور اختتامِ مجلس کے بعد اپنے سوالات کا سلسلہ شروع کرتے، حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ سکوت فرمانے کے بعد فرمایا کہ تم ذرا ٹھہرو، میں یہاں سے فارغ ہو کر تمہاری بات پوری کروں گا، مگر وہ معذور ہونے کی وجہ سے نہ آداب مجلس سے واقف تھے اور نہ تبلیغی ذمہ داریوں سے آگاہ تھے، نہ ہی حاضرین اور ان کی اہمیت سے واقف تھے، یہاں تک کہ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہاں کون کون لوگ ہیں، لہٰذا اس نے بار بار سوال کرنا شروع کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غصہ اور رنجیدہ خاطر ہونے کے سبب بنے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چین بہ جبین ہو کر اپنا منہ ان کی طرف سے پھیر لیا، اور ان کے سوال پر توجہ مبذول نہیں فرمائی، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

شانِ مجلس نبوت اور اس کے آداب:

اس مقام پر چار چیزیں قابل توجہ ہیں: اول آداب مجلس، دوم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم و توقیر، سوم حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی منقبت، چہارم رؤسائے قریش کا رویہ۔

پہلی بات: کفار کے اسلام لانے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حریص ہونا:

عام مجلسوں سے ہٹ کر مجلس نبوت کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اشاعتِ اسلام کے ساتھ جو شوق و شغف تھا اس کا قرآن حکیم اور احادیث نے متعدد مقامات میں بکثرت تذکرہ کیا ہے۔ یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ سارے جہاں کے مقابلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام اور اس کی اشاعت کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے تھے،

یہاں تک کہ اگر کوئی اسلام قبول نہ کرتا یا آپ ﷺ کی پیش کردہ دعوت کو مسترد کرتا تو آپ ﷺ کو نہایت ناقابلِ برداشت صدمہ اور رنج لاحق ہوتا تھا۔ جب اسلام کی دعوت پیش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ لگتا تو آپ ﷺ کی مسرتوں میں بے حد اضافہ ہوتا تھا، آپ ﷺ اچھی طرح جانتے تھے کہ عام لوگ اپنے بڑوں کے تابع ہوتے ہیں، ان کا کہنا ہر وقت مانتے ہیں اور کمزور ضعفاء اپنے سرداروں کے اشاروں پر گامزن رہتے ہیں۔ اور اگر یہود کے چند بڑے بڑے لوگ اسلام قبول کرلیں یا قریش کے چند رؤساء دائرۂ اسلام میں داخل ہوں تو میرے دینی کام میں آسانی ہو جائے، کیونکہ رؤساء کے مسلمان ہونے سے نچلے طبقے پر بڑا اثر پڑتا ہے، اور سارے ضعفاء حلقۂ اسلام میں شامل ہو جائیں گے۔

حضرت عبداللہ ابن شریح رضی اللہ عنہ سے روگردانی کی وجہ:

ان امور کے پیشِ نظر ایک دن آپ ﷺ رؤسائے قریش کو اسلام کی حقانیت اور ایمان باللہ کی خوبیاں سمجھا رہے تھے، اور اپنی طرف متوجہ فرما کر اسلام قبول کرنے پر انہیں ترغیب دے رہے تھے، آپ ﷺ کی دعوت وارشاد کی مجلس خوب گرم تھی کہ اچانک حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی آمد ہوئی اور اس کے بے وقت و بے محل سوالات نے مجلس کی حرارت اور گرمائش پر پانی پھیر دیا، اور مجلس کا ذوق وشوق ٹھنڈا پڑ گیا، آپ ﷺ کی طبیعت مبارکہ پر گراں گزرا، اور آپ ﷺ نے سائل سے منہ پھیر لیا۔

اس سلسلے میں امام بخاری کتاب العلم کے شروع میں مجلس نبوی کے آداب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضور اکرم ﷺ وعظ وخطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور سلسلہ وعظ جاری تھا کہ ایک شخص نے وعظ ونصیحت کے موضوع سے ہٹ کر ایک اجنبی سوال پوچھا، حضور ﷺ نے اس کی طرف التفات نہیں فرمایا، اور اپنا موضوع ووعظ منقطع نہیں کیا، حسب سابق وعظ ونصیحت کا سلسلہ جاری رکھا، حاضرین میں سے کچھ کا خیال گزرا کہ آپ ﷺ نے سائل کا سوال نہیں سنا، اس لئے جواب نہیں دیا، کچھ لوگوں نے کہا کہ سائل کا سوال سنا مگر جواب اس لئے نہیں دیا کہ سائل کا سوال بے موقع تھا، اور آپ ﷺ کو ناگوار گزرا، جب آپ ﷺ نے اپنی بات مکمل کرلی تو سائل کی طرف متوجہ ہو کر اس کے سوال کا جواب ارشاد فرمادیا۔

آپ ﷺ کی ایک عادت مبارکہ:

تقریباً آپ ﷺ کی عادت مستمرہ یہی ہوتی کہ درمیان وعظ وارشاد میں بے موقع سوالوں کا فوراً جواب

نہیں دیتے، جب بات پوری کر کے مکمل کرتے تب درمیان کے بے موقع سوالوں کا جواب دیتے، یہاں بعینہٖ یہی بات اور نظریہ کارفرما رہا کہ رؤسائے قریش کے ساتھ جو سلسلہ کلام جاری تھا اُسے مکمل کر کے اس نابینا صحابی کی طرف متوجہ ہوتے اور جوابات ارشاد فرماتے، مگر کیا کیا جائے، صحابی ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے عجلت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معمول و عادت پر عمل کرنے کا موقع نہیں دیا، ہر چند آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا مگر وہ نہ سمجھے اور برابر التجاء کرتے رہے، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بامرِ مجبوری اس سے منہ پھیر لیا اور چین بہ جبین ہوئے کہ آپ مجھے ایک نہایت اہم تبلیغ سے روک رہے ہیں اور ایک غیر اہم بات کی طرف بلا رہے ہیں جو کہ بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔

دوسری بات: حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی دلجوئی:

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے اگر چہ یہ سنہرا موقع وعظ و ارشاد کا ضائع کیا، مگر چونکہ وہ آنکھوں سے معذور تھے، اور مشاہدہ صورت حال سے عاجز تھے، نیز وہ اس مجلس کی اہمیت سے بھی بے خبر تھے اور حاضرین مجلس سے ناآشنا تھے، ان کی اہمیت سے بھی ناواقف تھے، اس کے ساتھ وہ ہدایت یافتہ تھے، اور اپنے سوالات کے سلسلے میں بھی مخلص تھے، اس لئے معذور سمجھے گئے، اور اس کی طہارت و پاکیزگی پر قرآن کریم نے مہر تصدیق ثبت کر کے ان کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی فرمائی، انہیں چاہئے تھا کہ: "إنما شفاء العيّ السوال" پر عمل کر کے پوچھ کر معلومات حاصل کر کے توقف کرتے، اور یہ اندازہ لگاتے کہ میرے سوالات کے جوابات کے مواقع بہت ہیں، میں ہر وقت آسکتا اور پوچھ سکتا ہوں، لہٰذا صبر کرتے مجلس کی شیرینی کو تلخی میں تبدیل نہ کرتے، مگر یہ سب کچھ سوچتے سوچتے رہ گئے، چونکہ قرآن حکیم اعلان کر چکا کہ: ﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ﴾ [النور: ٦١] (اندھے پر کوئی گناہ نہیں) تو ربّ العزّت نے بجائے ملامت کرنے کے ان کی تعریف اور تزکیہ بیان فرمایا، اور ان کے حسنِ اخلاص کی مدح فرمائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع فرمائی۔

تیسری بات: مفلوک الحال غرباء اور مغرور رؤساء:

قرآن حکیم نے سورۂ ہود اور دیگر مختلف مقامات پر اقوامِ عالم، اُممِ سابقہ کے رؤساء، امراء اور مالدار لوگوں کی نخوت و غرور کا تذکرہ فرمایا ہے، دنیا میں جب بھی کوئی پیغمبر تشریف لائے تو غرباء، ضعفاء اور مساکین نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور اس کی دعوت کو قبول کیا، بلکہ یہ کہا جائے کہ انہوں نے خود کو دینِ الٰہی کا محتاج سمجھ کر اسے قبول کیا۔

رہے امراء، سرمایہ دار، رؤساء، یہ لوگ ہمیشہ مخالفت میں رہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام سے بغاوت کی، سرکشی

اختیار کر کے ان کے مقابلہ پر میدان میں اترے، غریب مؤمنوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا، انہیں طنز و طعنہ اور ملامت کیا، حتیٰ کہ وہ یہ سمجھے کہ دین الٰہی ہمارا محتاج ہے، ہم اس کے محتاج نہیں، اس کی ترقی ہمارے اوپر موقوف ہے، اگر ہم اسے قبول کریں گے تو اس کو ترقی ہوگی اور اسے چار چاند لگ جائے گا، اگر ہم اسے قبول نہیں کریں گے تو ختم ہو جائے گا۔ وہ غریبوں کے ساتھ بیٹھنے پر تیار نہیں ہوتے اور ان کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے اور ایمان لانے کو گوارا نہیں کرتے، پیغمبروں سے کہتے رہتے کہ انہیں اپنی مجلس سے دور رکھو تب ہم غور کریں گے۔

یہی حال کفارِ قریش کے رؤساء و مالداروں کا تھا، وہ کب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اپنی موجودگی میں ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جیسے مفلوک الحال مسکین کی آمد کو برداشت کرتے تھے، اور اس کے ساتھ رواداری کا مظاہرہ کرنے پر تیار رہتے تھے، ان آیتوں نے ان کے غرور و نخوت کی مکمل قلعی کھول کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کر دی:

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى﴾ مطلب یہ ہے کہ آپ ان سے مستغنی رہو، ان کے ایمان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے باز پرس نہیں ہوگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضعفاء و مساکین اور کنگال مسلمانوں کو ساتھ ملاؤ اور ان کا ساتھ دے دو۔ ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾ [الكهف:۲۸] (اور روکے رکھ اپنے آپ کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح و شام، طالب ہیں اس کے منہ کے، یعنی اس کے دیدار اور خوشنودی کے، اور نہ دوڑیں تیری آنکھیں ان کو چھوڑ کر تلاش میں رونقِ زندگانی دنیا کی اور نہ کہا مان اس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور پیچھے پڑا ہوا ہے اپنی خوشی کے، اور اس کا کام ہے حد پر نہ رہنا)۔

بعض روایات میں ہے کہ چند صنادید قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان رذیلوں (فقراء و مساکین صحابہ رضی اللہ عنہم) کو اپنے پاس سے اٹھا دیجئے، تا کہ سردار آپ کے پاس بیٹھ سکیں، (رذیل کہا غریب مسلمانوں کو اور سردار کہا دولتمند کافروں کو) ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر گزرا ہو کہ ان غرباء کو تھوڑی دیر علیحدہ کر دینے میں کیا مضائقہ ہے؟ وہ تو پکے مسلمان ہیں، مصلحت پر نظر کر کے رنجیدہ نہ ہوں گے، اور یہ دولت منداس صورت میں اسلام قبول کر لیں گے، اس پر یہ آیت اتری۔ [عثماني]

☆☆☆

چوتھی بات: آپ ﷺ کا طرز و طریقہ مصالح شرعیہ کے موافق اور عین حکمت ہے:

شانِ رسالت کی قدر و منزلت عند اللہ تعالیٰ نہایت بلند و بالا ہے، ربّ العزّت قرآن حکیم میں آپ ﷺ کی شان اور عظیم منقبت کو جا بجا بیان فرماتے رہتے ہیں، پس آپ ﷺ کے متعلق کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ ﷺ اپنے پروردگار کے حکم و منشاء کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے، یا حضرت باری تعالیٰ کی مرضی کے خلاف آپ ﷺ سے کسی عمل کا صدور ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے جو طرز و طریقہ اختیار فرمایا وہ آپ ﷺ کے علم و فرائض اور مصالحِ شرعیہ و حکمتِ تبلیغ کے عین مطابق تھا، اور کئی ایسی وجوہات بھی واضح ہیں کہ قصور و کمی صرف اور صرف حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہی کا تھا کہ اس نے تمام تر آدابِ مجلس کے خلاف سوالات کئے، اور آپ ﷺ کو بھی اس سلسلے میں خاص منشاء الٰہی کا ابھی تک بذریعہ وحی علم حاصل نہ تھا کہ یہ میرا طرز و طریقہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہے، اور اس پر مجھے تنبیہ کرنا ضروری ہوگا۔

یہ بات نزولِ آیت کے بعد آپ ﷺ کو معلوم ہوئی، جس پر آپ ﷺ سخت پریشان ہوئے، تو وحی کے بعد منشاء الٰہی کا آپ ﷺ کو علم ہوا کہ وہ آپ ﷺ کے علم اور حکمت نوازی کے سراسر خلاف ہے، اور یہ فیصلہ آپ ﷺ کے تصورات و خیالات کے برعکس صادر ہوا۔

محبوبانہ انداز میں آپ ﷺ کو تنبیہ:

اس کے اسباب بہت سارے ہو سکتے ہیں، مگر ایک واضح سبب یہ ہے کہ ایک طرف آپ ﷺ کی مجلس میں صنادید سرداران و مالدارانِ قریش کا مجمع ہے جو کہ ایمان و اسلامی اقدار سے تہی دامن و عاری ہے، اور ان کا ایمان لانا بھی مشکوک ہے، وہ کبھی طالب حق نہیں رہے اور اپنے گھمنڈ و غرور اور سرکشی میں گم ہیں۔ دوسری طرف ایک طالب حق و صداقت، ہدایت یافتہ، مخلص و مفلس اور فقیر ہے، ان کے ساتھ آپ ﷺ کے طرز عمل سے شاید کسی کو یہ فکر دامن گیر ہو کہ آپ ﷺ سرمایہ داروں کے حامی ہیں، اور فقراء کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ طرز اداء مستقبل میں ایک غلط روایت کی شکل اختیار کر لے، اور یہ تو آپ ﷺ کی شانِ عالی مقام اور منصبِ نبوت کے لیے مناسب نہیں ہوگا، اسی لئے باوجود اس صحابی کی ملامتی اور آپ کی سلامتی کے اللہ ربّ العزّت نے لطیف محبوبانہ انداز میں آپ ﷺ کو تنبیہ فرمائی، اور تمام واہمہ اور خدشات کا قلع قمع فرمایا، اور ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ﴾

[الکھف:۲۸] (اور روکے رکھا اپنے آپ کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو) کا سبق پڑھایا، اور یہ سبق آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فطرت وجبلت کے عین مطابق ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت اور تشریف آوری کا اصلی مقصد بھی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فقراء ومساکین، شکستہ دلوں اور غمزدہ وبے سہارا لوگوں کی حوصلہ افزائی کریں، اور انہیں عزّ وشرف کے اعلیٰ مراتب پر پہنچائیں، نیز مغرور ومتکبر کفار ومشرکین کی سرکشی اور حیثیت کو خاک میں ملائیں۔ اللہ تعالیٰ یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ کریمہ پر انگشت نمائی کرے، اور کہتا پھرے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رؤساء وسرمایہ داروں کی عزّت واحترام کرکے ایک بے سہارا فقیر مسلمان کو نظر انداز کردیا۔

جس قدرتِ الٰہی کا یہ عالم ہو کہ وہ کسی مکھی کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسد اطہر پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی، بھلا وہ یہ کیسے گوارا کرتی ہے کہ کوئی احمق آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت پر انگلی اٹھائے؟ تو

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى﴾ ارشاد فرما کر صیغۂ غائب کے ساتھ تعبیر کرنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ فعل حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نہیں، بلکہ کسی اور کا معلوم ہورہا ہے کہ اس سے یہ فعل صادر ہوا ہے، یہ طرزِ بیان لطف وکرم اور لطیف اندازِ محبوبیت کا نمونہ ہے، اگر یہ صیغۂ خطاب کا ہوتا تو ضرور سرزنش سمجھی جاتی اور خاطر عاطر پر گراں گزرتا۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اسے عتاب نہیں سمجھتے، بلکہ اسے گلہ سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ [التوبۃ:۴۳] (اللہ آپ سے درگزر فرمائے، آپ نے ان کو اجازت کیوں دی؟)۔

ان آیات کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا بڑا احترام کرتے تھے، اور وہ جب بھی خدمت اقدس میں تشریف لاتے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ فرماتے: "مرحباً بمن عاتبني فيه ربي"۔ [الحدیث] خوش آمدید اے وہ شخص! جس کے بارے میں میرے ربّ نے مجھے عتاب فرمایا۔ مدنی زندگی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم باہر غزوات پر تشریف لے جاتے تو ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر نمازوں کے لیے امام مقرر فرماتے، اور ماہ رمضان میں اذانِ فجر پر انہیں مقرر فرماتے۔ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ خلافت فاروقی میں جنگ قادسیہ کے مقام پر پرچم اٹھائے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمائی۔ رضی اللہ عنہ

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ چین بہ جبین ہوئے اور متوجہ نہیں ہوئے، التفات نہیں کیا، اس بات پر کہ ان کے پاس نابینا آیا۔ یہ صیغہ غائب ہے، جو متکلم کے لطف وکرم اور مخاطب کی تکریم واحترام کا مظہر ہے، اس کے بعد شبہ اعراض دور فرما کر صیغہ خطاب ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا يُدۡرِيكَ لَعَلَّهُۥ يَزَّكَّىٰٓ أَوۡ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ ٱلذِّكۡرَىٰٓ﴾ آپ کو کیا خبر شاید وہ نابینا آپ کی تعلیم کی بدولت پورے طور پر سنور جاتا، یا کم از کم کسی خاص بات میں نصیحت قبول کرتا، اور وہ نصیحت اس کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچاتی۔ یہاں حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اعمیٰ کہنے میں اس کی تحقیر مراد نہیں، بلکہ حقیقت حال کا اظہار مقصود ہے، اور بنیادی مطلب یہ ہے کہ ان کی معذوری بیان کر کے ان کی طرف سے معذرت پیش کی جارہی ہے کہ وہ بالفرض اگر بینا ہوتے تو آداب مجلس کو ضرور ملحوظ رکھتے، بلکہ ایسے وقت میں آنے کی بھی جرأت شاید نہ کرتے۔

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا معلوم کہ یہ نابینا جو بات دریافت کر رہے تھے، اس کا فائدہ یقینی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو تعلیم دیتے، تو یہ اس کے ذریعہ اپنے نفس کا تزکیہ (صفائی) کر لیتے اور اس کو کمال درجہ حاصل ہو جاتا، اگر یہ درجہ اسے حاصل نہ ہوتا تو کم از کم ابتدائی درجہ، یعنی ذکر اللہ کر کے ابتدائی نفع اٹھاتے، پھر آہستہ آہستہ کثرت ذکر اللہ سے اسے خوب ترقی حاصل ہو جاتی، اور محبت الٰہی مع خوف کے یقیناً رفع درجات کا زینہ و ستون ہی تو ہے، یہی اس کی روحانی ترقی کا ثبوت یا ذریعہ بنتی۔

ایک نکتہ:

قرآن حکیم نے یہاں دو لفظ اختیار فرمائے: ﴿يَزَّكَّىٰ اور يَذَّكَّرُ﴾ مؤمن سالک کے لیے یہی دونوں درجات متعین ہیں: پہلا درجہ کمال کا ہے، جس کے معنی ہیں: ''تزکیہ وطہارت'' یعنی تمام غیر شرعی امور، عقائد باطلہ، اعمالِ غیر شرعیہ، محرمات، اور مکروہات، بلکہ مباحات غیر طائلہ (لایعنی امور) سے مکمل اجتناب و بیزاری، جب یہ مقامِ بلند کسی کو حاصل ہو تو اتباعِ شریعت، طاعات، عبادات، اخلاقِ حسنہ، اقبال علی الاخرۃ، بغض مال و جاہ اور دنیا سے بیزاری خود بخود پیدا ہو جائے گی، اور اتباعِ شریعت طبیعت ثانیہ بن کر تمام طاعات کی ادائے گی بغیر تکلیف وتھکاوٹ کے صادر ہو جاتی رہے گی، خشیت وخوف الٰہی مع کثرت اذکار کے آسان اور سہل رہے گا، یہ درجۂ کمال ہے۔

دوسرا درجہ ﴿يَذَّكَّرُ﴾ کا ہے، یہ ابتدائی درجہ ہے، اس میں کثرت کے ساتھ ذکر الٰہی کی مشق، اللہ تعالیٰ کی خشیت وخوف کا ہر وقت استحضار، تواضع و انکساری اختیار کرنا، آہستہ آہستہ آگے قدم اٹھانا، اللہ تعالیٰ کی عظمت کو دل میں جمانا، ترک محرمات اور اکلِ حلال، صدق مقال کی مشق کرنا، حتیٰ کہ بہت سے مدارج کو طے کرتے ہوئے آگے بڑھنا، یہ دوسرا درجہ بہ نسبت اول درجہ کے کم بھی ہے اور ابتدائی بھی، مگر بہ نسبت عوام الناس کے یہ بھی کامل واعلیٰ ہے۔

رزقناهما الله بمنه و کرمه۔ آمین

مسلمانوں کی تعلیم وتربیت اور تبلیغ، بہ نسبت غیر مسلموں کی تبلیغ کے زیادہ اہم ہے:

انہی آیتوں سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ مشکوک فوائد کثیرہ سے شخصی، یقینی فائدہ زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روساء قریش کی تبلیغ کو ایک شخصی تبلیغ پر مقدم سمجھا، اور اس کی طرف متوجہ ہوئے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان مالداروں کے اسلام کو ہزاروں ماتحت لوگوں کے اسلام کے پیش خیمہ اور بنیاد تصور فرمائی، مگر وہ چونکہ گھمنڈ وغرور سے آراستہ تھے، ان کے پاس ایمان باللہ کا تصور تک مفقود تھا، اس پاکیزہ دین کے قبول کرنے کو وہ کبھی گوارا ہی نہیں کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صادق، ہدایت یافتہ اور خوف الٰہی سے آراستہ، حق ودیانت کے طالب شفقتِ نبوی سے محروم ہوئے اور موردِ عتاب ٹھہرے۔ اس پر ربّ العزّت نے جو ہدایات جاری فرمائیں اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نظریے کے برعکس ایک مسلمان طالب حق کی تائید وحمایت جاری فرمائی، یہ اس ذات پاک کا لطف وکرم اور مسلم نوازی نہیں تو اور کیا ہے؟

جس طرح اس نے روزِ قیامت میں مسلمانوں کو کفار پر ترجیح دینے کا فیصلہ کیا ہے، آج دنیا میں بھی اس نے ضعیف مسلمانوں کو بڑے بڑے کفار کی تبلیغ ودعوت پر ترجیح دے کر قوم مسلم کی بے حد حوصلہ افزائی فرمائی اور:

﴿وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى﴾ ارشاد فرما کر اپنے استغناء کا اظہار فرمایا، جیسے کسی اور مقام پر واضح فرمایا تھا: ﴿ذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ﴾[المزمل:۱۱] (یعنی مجھے چھوڑیں، جھٹلانے والوں کو میں ہی انہیں سمجھاؤں گا)۔ یہ آپ کی بولی نہیں سمجھتے، آپ ان کے ساتھ وقت ضائع نہ کریں۔ ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ [ق:۴۵] (پس قرآن کے ذریعے اس کو نصیحت کریں جو میری وعید سے ڈرتا ہو) کیا بہترین اندازِ نصیحت ہے۔ واللہ اعلم

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى﴾ جو پروا نہیں کرتا اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سنورے تو تم پر کچھ (الزام) نہیں۔ جو شخص مستغنی اور لاپروا ہے جیسے کفار قریش ہزار سمجھانے کے باوجود نہیں مانتے، حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی ماننے کے لیے بھی تیار نہیں، کبھی مفتری، کبھی مجنون وکذّاب کہنے سے نہیں شرماتے، اور کتاب اللہ کی بھی تکذیب کرتے ہیں، ظاہری مال ودولت کے بل بوتے پر، فقراء مسلمین پر طنز وتشنیع کرتے ہیں، ان کا ایمان لانا درکنار، وہ ایمان باللہ کو لغو سمجھتے ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت اشتغال بالتوحید اور حریص ہو کر ان کے درپے ہو جاتے ہیں، حالانکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ضروری تزکیہ حاصل کریں، یہ عتاب نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس افراط سے روکا ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سمجھانے اور تبلیغ

کرنے کے معاملے میں درپیش تھا، کیونکہ آپ ﷺ حد سے زیادہ ان کے ایمان پر حریص تھے: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ [الشعراء:٣] (شاید تم اس (رنج) سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کردو گے)۔حالانکہ ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ [الغاشية:٢٢] (آپ ان پر داروغہ تو نہیں)، بلکہ ﴿اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ﴾ [الرعد:٤٠] (آپ کا فرض صرف اتنا ہے کہ ان تک بات پہنچادیں)۔کل بروزِ قیامت آپ سے ہرگز یہ سوال نہیں ہوگا کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے؟ کوئی مانے یا نہ مانے اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں۔﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ [الغاشية:٢٦] (پھران کا حساب ہمارا کام ہے) آپ کا کام پہنچانا ہے، ہمارا کام حساب لینا ہے۔آپ اشتیاق وانہماک میں اعتدال رکھیں، افراط سے بچیں اور جولوگ دین کے ساتھ اشتیاق رکھتے ہیں، آپ ان کو مقدم سمجھیں اور دلجوئی کریں، تو فرمایا:

﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى﴾ اور جو شخص دوڑتا ہوا آپ کے پاس آتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا بھی ہے، آپ اس سے تغافل اور بے اعتنائی اختیار کرتے ہیں، یہ آپ کی شایان شان نہیں، تعلیم وتربیت کے زیادہ حقدار یہ مفلوک الحال فقراء مسلمین ہیں، نہ کہ مستہزئین کفارِ مکہ۔

﴿فَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ آپ کی نصیحت ان کے حق میں مفید اور کارگر ہے، نہ کہ صنادید کے حق میں، یہ لوگ حق کے متلاشی وطالب ہیں، جبکہ وہ ایسے نہیں، ان کی زمین قابلِ کاشت اور تیار ہے، جبکہ کفار کی زمین بنجر اور ناکارہ ہے، قابلِ کاشت نہیں۔مریض تو سارے ہیں، مگر مسلمان کا مرض قابلِ علاج ہے، اور وہ طالب علاج بھی ہے، برخلاف کفار کے، ان کا مرض قابلِ علاج بھی نہیں اور وہ طالب علاج بھی نہیں ہیں، زبردستی علاج کہاں فائدہ مند ہوتا ہے؟ جبکہ مریض اس کے لوازمات پرہیز وغیرہ پر تیار اور کاربند نہ ہو۔﴿وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ [البقرة:١١٩] (اور اہل دوزخ کے بارے میں تم سے کچھ پرسش نہیں ہوگی)۔روز قیامت آپ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے؟ بلکہ ان سے پوچھا جائے گا کہ ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ﴾ [المدثر:٤٢] (تم کیوں اور کس وجہ سے جہنم میں آئے؟) وہ جواب دیں گے: ﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ﴾ [المدثر:٤٣] (وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے)، اپنے جرم کا خود اعتراف کریں گے، اور اقرار کریں گے: ﴿قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا﴾ [الملک:٩] (ہمارے پاس ڈرانے والے آئے تھے پس ہم نے ان کی تکذیب کی) اور بات نہ مانی۔[روح، ابن کثیر، مظهري، معالم]

قرآن سراسر نصیحت ہے:

﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚفَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾ ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ آپ اعراض کرنے والوں کی طرف زیادہ توجہ دیں، اور جو طالب حق ہے دوڑ کر آتا ہے اور ڈرنے والا ہے اس سے آپ توجہ ہٹالیں، کیونکہ یہ آیتیں یا پورا قرآن مجید تذکرہ ہے نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اس نصیحت کو قبول کرے۔

آج کل تذکرۃ ٹکٹ کو کہتے ہیں، تو یہ پاسپورٹ وٹکٹ کی طرح مقصود تک پہنچانے کا وسیلہ وذریعہ ہے۔ علامہ ابن نباتہؒ نے کہا ہے کہ: "من جاء بجواز جاز والاسقط في النار ذات الوقود"۔ قرآن حکیم کو بطور سند و ٹکٹ لانے والا ناجی ہوگا، اور تمام مراحل سے بآسانی گزر جائے گا، اگر کسی کے پاس یہ نہ ہو، تو وہ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کی نذر ہو جائے گا۔

﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾ پس جس کا جی چاہے اس نصیحت کو قبول کرے، اجبار وزبردستی نہیں، یہ اختیاری امر ہے، ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ [البقرة:٢٥٦] (دین (اسلام) میں زبردستی نہیں) وہ زبردستی کے ساتھ کسی کے دل و دماغ میں نہیں اتارا جائے گا۔ یہی تو اصل بات ہے کہ اس کے حاملین ومبلغین ہر دور وزمانہ میں بے سروسامان، بغیر مال وحشم اور سرمایہ وفوج کے دنیا میں آتے رہے، وہ اس کی تبلیغ واشاعت میں جان کی بازی لگا کر طرح طرح کی اذیتیں اور تکالیف پر صبر اور برداشت کرتے گئے ہیں، اگر یہ زبردستی کی چیز ہوتی، تو اس کو طاقتور سلاطین، اصحاب مال وارباب اقتدار، بڑے بڑے لشکر والوں پر اتارا جاتا، تاکہ وہ طاقت وفوج کے بل بوتے پر زبردستی اسے پھیلائیں اور عوام الناس کو بزور شمشیر اس کو قبول کرنے پر مجبور کریں، مگر ایسا نہیں، یہ دین الٰہی کا مزاج نہیں، بدأ الإسلام غريبا۔

دین میں غرباء کا حصہ:

ہرقل روم نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا: "أشراف الناس اتبعوه أم ضعفاءهم؟ قلت: بل ضعفاءهم"۔ مہذب ومالدار لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں یا ضعیف؟ تو میں نے کہا: "ضعیف لوگ اتباع کرتے ہیں، تو ہرقل نے کہا: "هم أتباع الرسل"۔ [بخاری ۵] قرآن کا بغور مطالعہ کرنے والے اندازہ لگائیں کہ ایک طرف سے رؤسائے مکہ کا مجمع ہے، جو ظاہر میں شائستہ، مہذب، خوشحال، مالدار اور نامور خوبصورت ہیں، دوسری طرف ایک فقیر، نابینا، مفلوک الحال اور محتاج ہے، ظاہری نام آوری اور خوبصورتی سے محروم ہے، مگر عرش معلیٰ سے اس کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے، دوسرے طبقے کو کچھ نہیں مل رہا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس دھرتی پر بسنے والے لوگوں کے دو

طبقے ہیں:

پہلا طبقہ:

طاقتور لوگوں کا ہے، جن کے پاس اقتدار و سلطنت ہے، خزانہ و مال ہے، فوج و لشکر ہے، تمام مادیات اور وسائل کا ڈھیر ہے، ہر قسم کا تباہ کن اسلحہ ہے، کھانے پینے اور اسبابِ عیش و عشرت کے تمام تر ذرائع ہیں، وہ اپنی طاقت و قوت کے بل بوتے پر اپنے نظریات و خیالات بزورِ شمشیر فوجی ذرائع سے، اسلحہ کے زور پر، افرادی قوت اور فوج و حشم کے زور پر، مالی مراعات، دراہم و دنانیر کے زور پر زبردستی لوگوں پر مسلط کر کے اپنے نظریات منوا سکتے ہیں، وغیرہ۔

دوسرا طبقہ ضعفاء:

فقراء و بے سرو سامان لوگوں کا طبقہ ہے، ان کے پاس کچھ بھی نہیں، مادی وسائل و اسباب کے نام تک سے واقف نہیں، نانِ شبینہ کے محتاج، دنیوی عیش و عشرت، قیام و طعام، لباس و خوراک کی تمام اقسام و اصناف سے نابلد ہیں، ان کے پاس قدرت نہیں، طاقت نہیں، اقتدار و فوج نہیں، غرض یہ ہے کہ دنیوی ساز و سامان سے سراسر محروم ہیں، یہ کسی بھی طاقت کے ذریعہ سے ایک ادنیٰ نظریہ نہیں پھیلا سکتے ہیں، اور کسی بھی ذریعہ سے اپنا مطالبہ اور تصورات کسی پر مسلط کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، حتیٰ کہ اپنے قریبی رشتہ دار، دوست و احباب کو بزور یا بخاطر کسی ذاتی عقیدے پر مجبور نہیں کر سکتے۔

اگر دین کے مزاج میں سختی اور زبردستی ہوتی تو اللہ تعالیٰ آسمانی کتابوں اور نبوت کی امانت کو پہلے طبقے پر اتارتے، انہیں امین و خلیفہ مقرر کرتے، اور اپنے دین کی ترویج و اشاعت انہیں کے سپرد فرماتے، مگر ایسا نہیں ہوا، اور اس پر پوری تاریخ عالم گواہ ہے، بلکہ اس کے برعکس یہ ہوا کہ دین الٰہی، کتب سماویہ اور عنایاتِ رحمانیہ کا نزول آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک دوسرے طبقے کو سپرد ہوا۔ یہ امانتِ عظمیٰ اس طبقے کے دل و دماغ کی زینت بنی، انہی کے قلوب کو منور فرما کر یہ امانت ان کو سونپی گئی، اور اکراہ و زبردستی کے مادے کی جڑ کاٹ کر انہیں تعلیم دی گئی کہ اشاعت دین میں حکمت و مصلحتوں سے کام لو، اس سلسلہ میں شیاطین اور ابناء شیاطین کے ناروا ظلم و ستم برداشت کر کے صبر و استقامت اختیار کرو، اور ہر لمحہ اپنا فرضِ تبلیغ دعوت و ارشاد جاری رکھو، قیامت کے روز تم سے ہرگز یہ سوال نہیں ہوگا کہ یہ لوگ کیوں مسلمان نہیں ہوئے؟

یہی اسلام اور دین الٰہی کا مزاج ہے کہ قیامت تک یہ سلسلہ دوسرے طبقے کے خوش نصیبوں، علماء محدثین،

مفسرین ارباب مدارس، علماء وطلباء کا طغرۂ امتیاز رہے گا، اور یہی کمزور لوگ ہر باطل کے مقابلہ میں سینہ سپر رہیں گے، ہر طاغوتی قوت کے ساتھ جہاد کریں گے، ہر بلاء ومصیبت پر خندہ پیشانی کے ساتھ صبر کریں گے، اور ہر قسم کی مالی جانی قربانی پر کاربند رہیں گے، اسی بنیاد پر ورثة الأنبياء کہلانے کا تاج ان کے سروں کی زینت ہے، انہی کی بدولت شمس وقمر کا نظام باقی ہے، جس سے دوست ودشمن سب مستفیض ہورہے ہیں، ان کے چلے جانے کے بعد ایک گھنٹہ بھی شاید علویات وسفلیات کا نظام قائم نہ رہ سکے، اور دنیا کا بسترہ گول ہو، اسی خاطر تو کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض تک تمام مخلوقات ان کے لئے دعا گو ہیں۔

اگر اس نظام میں زور وزبردستی کا عنصر موجود ہوتا تو آج دنیا کا یہ موجودہ حال نہ ہوتا، پورے ہندوستان میں آپ کو ایک ہندو بھی نظر نہ آتا، یہاں آٹھ سو سال خالص مسلمان فاتحین کا دور اقتدار رہا، خلجی، لودھی، غلامان، مغل و دیگر سلاطینِ اسلام نے بادشاہت کی، تمام سیاہ وسفید کے مالک رہے، وہ دیندار اور امانتدار تھے، عدل وانصاف کے پیکر تھے، مجاہد تھے، تہجد گزار اور خادم قرآن تھے، بقول بعض محققین وہ علماء ومفسرین اور محدثین وفقہاء تھے، آٹھ سو سالہ اقتدار رہا، زبردستی کرتے تو سارے بزدل، بت پرست ہندوؤں کو دائرۂ اسلام میں لے آتے، مگر تاریخ گواہ ہے اور ان کی سنہری تاریخ شاہد عدل ہے کہ انہوں نے ہرگز کتاب وسنت کی تعلیم سے ہٹ کر کوئی قدم نہیں اٹھایا، بلکہ یہ خاصیت کفر وشرک کے علمبردار، یہودیت ونصرانیت کے نام نہاد مدعیانِ مساوات وانصاف کی رہی کہ زبردستی مسلمانوں پر شب خون مارتے ہیں، اور بزور شمشیر انہیں اپنے ناپاک دین قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور کررہے ہیں۔ اسپین، غرناطہ اور اندلس پر قبضہ کرکے نصف آبادی کو تہ تیغ کیا، اور باقی نصف کو زبردستی عیسائی بنایا، إنا لله وإنا إليه راجعون۔ اور کفر کا یہ رویہ اب بھی جاری ہے، شاید مسیح علیہ السلام کے نزول تک جاری رہے گا۔

﴿فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ﴾ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ متکبر ومغرور لوگوں سے کہا جارہا ہے کہ تم اتنے بڑے اور قیمتی نہیں ہو کہ قرآن پاک کو تمہارے سامنے پیش کرکے تم سے قبول کرنے کی درخواست کی جائے، اور تمہیں یہ تأثر دیا جائے کہ یہ صحیفہ بابرکت تمہارا محتاج ہے، تم اس کے محتاج نہیں ہو، بلکہ استغناء کے اظہار کے طور پر اسے پیش کیا جارہا ہے، اور عقل ودماغ سے عاری بیوقوف لوگوں سے کہا جارہا ہے کہ نادانی اور حماقت چھوڑ دو، اپنی جانوں کے دشمن نہ بنو، خود کو جہنم سے بچاؤ، تم نہیں جانتے ہو، یہ تمہارے لئے نسخۂ شفاء ہے۔ یہ ہرگز تمہارا دست نگر ومحتاج نہیں، تم مریض ہو، اس نسخہ شفاء کے محتاج ہو، کیونکہ دواء مریض کی محتاج نہیں ہوتی، بلکہ مریض ہی دواء کا محتاج ہوتا ہے، تمہاری خوش قسمتی

اس کے ماننے پر موقوف ہے، جبکہ اس کی خوش قسمتی ذاتی ہے، تمہارے ماننے پر موقوف نہیں۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست

بآب وتاب وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

قرآن سے اعراض کرنے والے لوگ:

بعض لوگوں کے دماغ میں اقتدار کا نشہ ہے، یا مال و دولت کا کیڑا ہے، یا قومیت وعصبیت کا غرور ہے، وہ قرآن پاک کو اپنا محتاج سمجھتے ہیں، اور یہ بیچارے ہمیشہ اسی غلط فہمی کے شکار رہتے ہیں کہ قرآن پاک ہمارے غلط عقائد، غلط خیالات، برے اور ناجائز رسوم کو نہ چھیڑے، بلکہ ہماری تائید کرے، بجائے اس کے کہ وہ قرآن کے تابع بنیں، الٹا یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن ہمارا تابع بنے، اور ہر رسم ورواج کے جواز پر ہماری تائید کرے، اس کے ساتھ وہ علماء اسلام سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ علماء کرام دریا دلی کا ثبوت دے کر ہمارے غلط افکار ونظریات کی تائید کریں، یا بصورتِ دیگر راضی رہیں، وہ اس عالم دین سے ناراض اور منحرف رہتے ہیں جو انہیں ٹوکتا اور ان کے عقائد و رسوم کی تردید کرتا ہے، اور اس نام نہاد عالم کی تعریف کرتے اور اسے عقلمند، مصلحت بین گردانتے ہیں، جو ان کی خواہشات پر انہیں ملامت نہ کرے، یا تائید کرے، یا کم از کم خاموش رہے۔ اگر کسی موقع پر عالم نے شرعی نکتہ نگاہ کو ملحوظ رکھ کر ان کے خلاف فتویٰ یا فیصلہ سنایا، تو قیامت برپا کرتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی اپنے مکتوبات میں رقمطراز ہیں کہ ایسے ذہن رکھنے والے قرآن کے منکر شمار ہوتے ہیں، انہوں نے قرآن کریم پر ایمان نہیں لایا، بلکہ اپنی خواہشات پر ایمان لائے، قرآن حکیم پر ایمان لانے والا قرآن پر خواہشات کو قربان کرتا اور قرآن پر جھکتا ہے، اور جن لوگوں نے قرآن پر ایمان نہیں لایا وہ اپنی خواہشات پر جھکتے اور قرآن سے بھی جھکنے کی تمنا کرتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن صفت باری تعالیٰ ہے، وہ سب کو اپنے قدموں میں جھکانے کے لیے نازل ہوا ہے، وہ کسی جابر ظالم کے سامنے نہیں جھکتا۔ حدیث میں ہے: "من ترکہ من جبار قصمه الله"۔ اگر کوئی ظالم وجابر اسے چھوڑ دے گا تو اللہ پاک اسے تباہ کردے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ قرآن کے مخالفین ہر زمانے میں ہمیشہ ذلیل وخوار ہو کر عبرت ناک عذابوں میں تباہ ہو گئے، آج بھی یہی دستور کارفرما ہے، بحمدہٖ تعالیٰ۔

﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ﴾ یہ نصیحت تذکرہ عزّت ومنقبت والے صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے، لوح محفوظ میں

مکتوب ومحفوظ ہے، قرآن پاک کی ہر سورت بمنزلہ صحیفہ کے ہے، صحیفہ اکثر چھوٹی کتابوں کو کہتے ہیں۔

﴿مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ بلند ہیں اور پاک ہیں۔ یہ بلندی باعتبار مکان بھی ہے اور عزّت وشرف کے لحاظ سے بھی، یہی وجہ ہے کہ اس کو سینے سے لگانے والے اور اس کی خدمت کرنے والے، نیز اس پر عمل کرنے والے دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں عزّت وشرف کی بلندیوں پر فائز ہوتے ہیں۔ ﴿مُطَهَّرَةٍ﴾ پاک ہیں، منزہ ومبرّا ہیں، ہر عیب ونقصان سے، اس لئے بھی کہ پاکیزہ فرشتوں نے اسے لکھا اور پھر پاکیزہ مبارک مقدس فرشتہ کے ذریعہ تمام کائنات کی پاکیزہ ہستی خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ پر نازل ہوا، پھر پاکیزہ جماعت نے قرناً بعد قرنٍ اس کی حفاظت اور ترتیل وتلاوت اور تشریح مطالب کا بیڑہ اٹھایا جو کہ آج تک بلاکم وکاست جاری ہے، اور قیامِ قیامت تک ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

﴿بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ ایسے پاکیزہ ہاتھوں میں ہیں، جو بزرگ ہیں اور نیک وصالح ہیں۔

لغات:

﴿سَفَرَةٍ﴾ جمع ہے سافر کی، جیسے کتبة جمع ہے کاتب کی، مراد لکھنے والے فرشتے ہیں، جو اس عظیم امر پر مامور ہیں ﴿بَرَرَة﴾ جمع ہے برّ کی۔ برّ اور بَرَرَة میں بہ نسبت بار اور أبرار کے مبالغہ زیادہ ہے، نہایت صالح، نیکوکار، پسندیدہ، یہ اللہ ربّ العزّت کی طرف سے انعام کا وعدہ ہے کہ جس طرح فرشتے پاک ہیں، اسی طرح قرآن حکیم کے حاملین، عالمین، عاملین اور خادمین بھی بلند وپاکیزہ عزّت وشرف کے ساتھ رہیں گے، اور قرآن مجید کی طرح نورانی اور پاکدامن وباعفت رہیں گے، شیخ سعدیؒ نے فرمایا: ۔

گلے خوشبوے در حمام روزے
رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکے یا عبیری
کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم

جمال ہمنشین در من اثر کرد
ورنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: مارا جائے (یعنی ہلاک ہوجائے) انسان کس قدر ناشکر گزار ہے وہ؟﴿۱۷﴾ کس چیز سے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے؟﴿۱۸﴾ ایک حقیر قطرۂ آب سے اللہ تعالیٰ نے اس کو (انسان) پیدا کیا، اور اس کا ایک اندازہ ٹھہرایا﴿۱۹﴾ پھر اس کے لیے راستہ آسان کر دیا﴿۲۰﴾ پھر اس پر موت طاری کی پھر اس کو قبر میں ڈال دیا﴿۲۱﴾ پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا دوبارہ اس کو زندہ کر کے کھڑا کر دے گا﴿۲۲﴾ خبردار! ہرگز پورا نہیں کیا انسان نے ابھی تک جو اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا تھا﴿۲۳﴾

معارف ومنازل

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ﴾ میں انسان سے مراد کافر ومشرک ہے، جس طرح دوسری جگہ میں فرمایا: ﴿قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ﴾ [الذاریات: ۱۰] (مارے جاویں پر جو اٹکل پچّو باتیں بنایا کرتے ہیں)۔ اسی طرح: ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ [اللهب: ۱] (ابولہب کے ہاتھ برباد ہوں، اور وہ برباد ہو چکا)۔ قرآن حکیم کے دیگر مقامات میں بھی اس طرح کے بددعائیہ کلمات مذکور ہیں۔ یہاں شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ﴿قُتِلَ﴾ کہا، بمعنی ہلاک، مگر وہ باوجود اس کے ہلاک نہیں ہوئے، جبکہ ربّ العزّت کا حکم ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کے تحت ہے، تو ایسے لوگوں کو فوراً ہلاک ہونا چاہیے تھا؟

تو میدانی کہ یک حرفے زحکمش ☆ جہان زیر و بالا خاک گردد

جواب یہ ہے کہ حضرت سبحانہ تعالیٰ نے جہاں جہاں اس طرح بددعائیہ کلمات ارشاد فرمائے ہیں اس سے مراد اخبار ہے، یعنی پیشین گوئی مراد ہے آئندہ کے لیے، یعنی کسی وقت دنیا میں یا یقینی طور پر آخرت میں اس کا ظہور ہوجائے گا۔ آیت کے معنی یہ ہے کہ کافر ومشرک تباہ ہی ہوگا بہ سبب ناشکری کے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے بلا معاوضہ اسے بے شمار ظاہری و باطنی نعمتوں سے نوازا۔ ﴿وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾

[لقمان:۲۰] (اور اللہ نے تمہارے اوپر مکمل کر دیئے ہیں اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں)۔ اور فرمایا: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ [ابراھیم:۳٦] (اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو نہیں گن سکتے)۔ سارے جہاں کی تمام نعمتیں صرف انسان کے لیے پیدا فرمائیں، اور اسے وجود حیات کی نعمت بھی عطا کی مگر یہ ناعاقبت اندیش ناشکر انسان نے شکر و رضا کا راستہ چھوڑ کر اپنے محسن حقیقی اور اس کی نعمتوں کا انکار اختیار کیا اور انبیاء و رسل علیہم السلام اور آسمانی صحیفوں کی تکذیب پر کمر باندھ لی، پس ہلاکت و تباہی کا حقدار ٹھہرا یعنی قتل کا۔ مزید دلائل قدرت بطور یاد دہانی کے ارشاد فرمائے:

﴿مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ﴾ ذرا یہ کافر و مشرک اپنی اصلیت اور بنیاد پر غور کریں کہ جب یہ دنیا میں آئے تو کیا ان کی سج دھج، کروفر کا یہی عالم تھا؟ ان کے خزانے جواہر و موتیوں سے یوں ہی پُر تھے؟ ان کے مال و عزّت باغ و متاع یوں ہی موجود و مہیا تھے؟ یہ لوگ کتنے احسان فراموش، کم ہمت و کم ظرف ہیں جو ایک حقیر مردار قطرۂ آب سے پیدا ہیں، جس کو خالق نے کئی ترتیب و الٹ پلٹ کے بعد ترتیب دے کر ایک خوبصورت شکل میں بڑے پیارے اندازے کے ساتھ تخلیق فرمایا، اور ایسے مربوط و قیمتی اجزاء کا جوڑ لگایا کہ ان کی نہ مثل ہے، نہ بدل، ایک عضو مثلاً آنکھ یا سماعت یا عقل و دماغ یا قلب و جگر جو کہ پوری کائنات اس کی قیمت پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ ساری نعمتیں تمام انسانوں کو یکساں حاصل ہیں، ان کی ساخت، شکل اور صورت کا تعین ان کی صلاحیتیں ان کے فوائد سب اسی ذات پاک کا عطیہ ہیں۔ ؎

خطائیں دیکھا کرتا ہے عطائیں کم نہیں کرتا
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اتنا مہرباں کیوں ہے؟

دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ [یٰس: ۷۹] (کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا؟ تو وہ اچانک کھلا جھگڑا کرنے والا ہوا۔ اور ہمارے لیے مثالیں بیان کیں، اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ اس نے کہا کہ ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا حالانکہ وہ بوسیدہ ہوں؟ آپ کہہ دیں کہ ان کو وہ ذات زندہ کرے گی جس ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے)۔ یہ کافر انسان کی کم ظرفی اور کوتاہ نظری و حماقت نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنی اصلیت اور بنیاد تک سے بے خبر یا غافل ہے؟

﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾ اس آیت کی تشریح میں مفسرین حضرات نے تین لطیفے بیان کئے ہیں، جو کہ تینوں صحیح اور برحق ہیں اور آیت پر منطق ہیں۔

پہلا لطیفہ:

رحمِ مادر کی ظلماتِ ثلاثہ میں اسے پروان چڑھایا، اعضاء مرکب ہوئے، پیوندکاری کے محیر العقول نمونے مرتب ہوئے، پوست، گوشت اور ہڈی، وہ بھی کئی قسم کی، اعصاب وہ بھی طرح طرح کے، اور اعضاء وہ بھی بیشمار اقسام کے، مغز، آنکھیں، گردے، مسوڑھے، جگر، قلب، پھیپڑے، غرض یہ کہ مجموعۃ الاضداد اعضاء و جوارح، پھر نفخ روح، عمر کا فیصلہ، سعادت وشقاوت کا فیصلہ، نان ونفقہ، ذکورت واُنوثت غرض یہ کہ پورا بدن تیار ہوا۔

اب یہاں سے منتقل ہو کر باہر دنیا میں اسے قدم رکھنا ہے، خود بچے میں نہ نکلنے کی قوت ہے، نہ شعور، نہ اسے راستہ معلوم ہے، نہ احساس، پھر جس گھاٹی سے اسے باہر آنا ہے وہ ناموزوں، تنگ و بے صلاحیت وغیرہ، اب اس کی پیدائش ایک معجزہ نہیں بلکہ کئی قدرتی معجزات پر مشتمل ہوگی۔ فرمایا: کوئی حیرانی کی بات نہیں، ہم نے راستہ آسان کیا اور پیدائش کے وقت بہانہ کے طور پر شدید درد کا انتظام کیا، جس کے ذریعہ ایک تکوینی حکم کے ساتھ غارِ شکم میں وسعت پیدا کردی، صرف مختصر وقت کے لیے، پس بچہ پیدا ہوا، دایا عورت اور والدہ دونوں حیران کہ یہ کیا ہوا، پس غارِ شکم واپس بند ہوا جس کا ادراک آج تک نہ ہوسکا۔ جس طرح روح مرتے وقت بدن سے نکل کر جدا ہوتی ہے مگر اس کا ادراک آج تک نہیں ہوسکا ہے۔ ابتداءِ حیات یعنی پیدائش غیر مرئی وغیر معقول، اور انتہاءِ حیات ''موت'' یہ بھی غیر مرئی وغیر معقول۔ بعض کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک جنگلی جانور کے بچے کی پیدائش دیکھ کر یہی فرمایا۔ واللہ اعلم

دوم لطیفہ:

اللہ ربّ العزّت نے انسان کے خمیر یعنی نطفہ میں بہت سے گوناگون استعداد وقوتیں ودیعت رکھی ہیں، جبکہ وہ شکمِ مادر میں نطفہ کی شکل میں تھا، علم وعمل کی قوت، تقویٰ وطہارت کی استعداد، بے شمار ایجادات کی استعداد، مصنوعات وصنعت گری کی استعداد، حصولِ رضاءِ الٰہی اور جنت حاصل کرنے کی قوت واستعداد، غرض یہ کہ اس عالمِ صغیر میں تقریباً عالمِ کبیر کے طول وعرض کے تمام مدارجِ کمال پر عروج کی قوت واستعداد، ان استعدادات وقوتوں کے وجود وثبوت کے لیے کسی دلیل کو پیش کرنے کی اس لئے حاجت نہیں کہ انسان اور اس کے روزمرہ کے تمام اعمال و

ایجادات بدیہی طور پر سب کے سامنے ہیں۔عیاں راچہ بیان، یہ ہے لطیفہ دوم کا خلاصہ۔

سوم لطیفہ:

یہ لطیفہ نہایت اہم اور بیش قیمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرما کر اُسے محض بے سہارا اور آزاد نہیں چھوڑا، اور جس مقصد کے لیے اسے پیدا فرمایا اس تک رسائی کے لیے اسے اگر چہ عقل وحواس کی نعمت سے نوازا، مگر یہ چیزیں حقیقی کامیابی اور معرفت الٰہی تک مکمل رسائی کے لیے کافی نہیں، لہٰذا وہ ربّ العٰلمین نے اس اہم اور حقیقی مقصد تک پہنچانے کی خاطر ہر وقت ہر زمانہ، ہر قرن، ہر خطہ کے لیے پیغمبروں علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کی بعثت وانزال کا سلسلہ جاری فرمایا، گویا: ﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾ کا یہی مطلب ہوا کہ انبیاء ورُسل علیہم السلام اور آسمانی کتب وحی الٰہی کے ذریعہ اصلی راستہ (صراط مستقیم) تک رسائی انسانوں کے لیے آسان ہوا، اور انہیں کے طفیل ہدایت وایمان کی دولت انسانوں کو نصیب ہوئے۔

﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ﴾ پھر اسے موت دی اور قبر میں اتارا۔یہ حقیقت حال بھی ہے باعتبار انجام کار کے کہ ایک دن ضرور اسے مرنا اور قبر میں دفن ہونا ہے۔﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ [آل عمران: ۱۸۵] (ہر جان موت کو چکنے والی ہے)، نیز فرمایا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ [الرحمن: ۲۶] (جو زمین پر ہیں سب فنا ہونے والے ہیں)، اور فرمایا: ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ [الزمر: ۳۰] (بیشک تم مرنے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں)۔ اور فرمایا: ﴿اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ﴾ [النساء: ۷۸] (تم جہاں بھی ہوں موت تم کو آلے گی)۔

یا بطور تحدیث نعمت فرمایا کہ کیونکہ موت اللہ تعالیٰ سے ملنے کا ذریعہ ہے اور دخولِ رضوان وجنت کا ذریعہ بھی ہے، فرمایا: "تحفة المؤمن الموت"۔یا یوں کہا جائے: "الموت جسر يوصل الحبيب إلى الحبيب"۔

تیسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ ایک تنبیہ اور اطلاع ہو کہ اے کافر ومشرک! تم موت سے ہرگز بچ نہیں سکتے ہو، البتہ جب تک موت کی مقرر گھڑی نہیں آتی تو انسان ہزاروں خطرات میں بھی سلامت رہتا ہے، اگر بارش کی طرح برستے ہوئے بم گر رہے ہوں پھر بھی کسی کا بال بیکا نہ ہوگا، دشمن ہر چند کسی کی ہلاکت کا فیصلہ کرے مگر ہوگا کچھ بھی نہ، اور جب صدر دفتر سے موت کا پروانہ جاری ہوتا ہے تو پھر ہزاروں پہرہ دار اور محافظوں کے جھرمٹ میں بھی موت کا ہاتھ اپنا منصوبہ مکمل کر کے رہے گا، پھر نہ کہیں بھاگنا کارآمد رہے گا اور نہ کسی جنگلی غار میں پناہ لینے سے کوئی بچ سکے گا، ہر حال میں دنیا کے مرغزاروں اور باغوں کو الوداع کرنا پڑے گا۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں یہ بول کر اڑ جائیں گے

انسان چونکہ مرکب ہے جسم اور روح سے، جسم خاکی ہے خاک سے پیدا ہے، اس کی اصل و بنیاد مٹی ہے، اس کی غذا و خوراک بھی مٹی سے ہے، تو موت کے بعد اسے اس کی ماں یعنی مٹی کے سپرد کر کے زمین میں دفن کیا جائے۔ اس کے جسم کے لیے اس سے بہتر اور زیادہ اعزاز ممکن نہیں، تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی شریعتوں کا متفقہ فیصلہ یہی ہے۔ سورۃ المائدہ میں تاریخِ انسانیت کا پہلا قتل اور پہلی موت ہابیل کا ہے، جسے اس کے بھائی قابیل نے شہید کیا تھا، ایک غراب (کوے) کے ذریعہ قدرت نے اس کے دفن کرنے کا طریقہ بتا دیا، اور یہی رسم و معاملہ تمام ادیانِ سماویہ میں مشترک ہے۔ دوم جزء روحِ انسانی ہے، وہ ایک لطیف چیز ہے جس کا تعلق عالمِ بالا سے ہے، مرنے کے بعد وہ واپس اپنے مستقر علیین کو جاتی ہے، اور اس کی غذا بھی روحانی ہے۔ اس مسئلے کی پوری تفصیل احیاء العلوم وغیرہ میں دیکھی جائے۔

﴿ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ﴾ پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے دوبارہ اسی ہیئت پر اٹھا دے، دوبارہ زندہ کر کے میدانِ محشر میں حساب و کتاب کے لیے حاضر کر دے۔ اشارہ فرمایا کہ قبر میں دفن ہونا عارضی اور چند وقت کے لیے ہے، اصل حیات اس کے بعد ہے۔ ﴿وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ﴾ [الانفطار: ۴] (اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی)۔ آگے فرمایا:

﴿كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ﴾ ہرگز نہیں، تمہاری بات نہیں چلے گی، یہ ناشکرو کافر انسان نے ابھی تک اپنے ربّ کے احکام و فرامین پورے نہیں کئے، اسے چاہئے تھا کہ اپنی اصلی پیدائش پر غور کرتا، اور اپنے وجود و اعضاء کی ترکیب اور زندگی پر فکر و غور کر کے اپنے ربّ کی نعمتوں کا اور اس کی خالقیت و وحدانیت کا اقرار کر کے اس کا شکر بجالاتا، اور اس کی دی ہوئی استعداد کو اس کی فرمانبرداری میں صرف کرتا، مگر یہ ناشکر انسان نے ایسا نہیں کیا، اس کے برعکس اس کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں لگا کر اپنا بیڑا غرق کیا، پھر ربّ العزّت نے پیدائشی نعمتوں کے بعد مزید اتمامِ حجت کے لیے انسان کو اس کی معاشی نعمتوں کی یاد دلا کر فرمایا:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا
حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: پس چاہئے کہ انسان اپنے کھانے کی طرف دیکھے ﴿۲۴﴾ کہ بیشک ہم نے بہایا پانی کو بہانا ﴿۲۵﴾ پھر پھاڑا ہم نے زمین کو پھاڑنا ﴿۲۶﴾ پھر اس زمین میں ہم نے اناج اگایا ﴿۲۷﴾ اور انگور اور ترکاریاں ﴿۲۸﴾ اور زیتون اور کھجوریں ﴿۲۹﴾ اور گھنے باغات ﴿۳۰﴾ اور پھل اور چارہ ﴿۳۱﴾ سامانِ زیست ہے تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لیے ﴿۳۲﴾

معارف ومنازل

﴿قَضْبًا﴾ ترکاری، ساگ، پات، سبزی ہر قسم کی۔ ﴿غُلْبًا﴾ گھنے درخت، بڑی شاخوں والے درخت، (گنجان درخت)۔ ﴿فَاكِهَةً﴾ پھل فروٹ، میوہ۔ ﴿اَبًّا﴾ کی جمع أوب ہے، گھاس، چارہ۔ حضرت مجاہد، حسن بصری، ابن زید، اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں کہ انسانی غذا میں میوے اور فواکہ کا جو درجہ ہے چرندوں کی خوراک میں وہی حیثیت اس کی ہے۔ [ابن کثیر] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ﴿اَبًّا﴾ کیا ہے؟ فرمایا: میں اس کا تعین نہیں کرسکتا، صحیح بخاری میں بھی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے نہ اس کے تعین کا ہم کو مکلف بنایا ہے، اور نہ اس کا حکم دیا ہے۔ [روح المعاني]

قرآن حکیم نے کھانے کے لیے یہ چند نعمتوں کا اجمالاً بطور نمونہ تذکرہ فرمایا، ورنہ دنیا کے مختلف حصوں اور علاقوں میں انسانی غذا و خوراک کی ہزاروں قسم کی عمدہ و بہترین غذائی اشیاء ہیں، جنہیں نہ شمار کیا جاسکتا ہے، نہ احاطہ ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے چپے چپے میں وہ عجیب غذائی اشیاء پیدا کی ہیں جن کی مثال نہیں، خاص کر ہمارے زمانے میں جہاں ہوائی اور بری و بحری راستوں کے ذریعہ دنیا کے ہر کونے سے دوسرے کونے تک جو مال بآسانی پہنچ جاتا ہے، یہ انسانی سمجھ و سوچ سے بالاتر ہے۔

موجودہ زمانہ میں تو ماکولات کی بے پناہ فراوانی ہے جو پہلے کبھی نہ تھی، کیونکہ پہلے زمین میں حمل ونقل کی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ پھر ان غذائی اشیاء کے حصول میں جس نظام اور محنت اور لگن کی ضرورت ہے اس کا انتظام تکوینی طور پر ایسے طریقے پر موجود ہے کہ ہر انسان اس کے ادراک سے عاجز ہے، کھانے والے کھانے سے سیر نہیں ہوتے، جبکہ بنانے اور پیدا کرنے والے، اور کاشت کرنے والے اپنی پیداواری عمل سے سیر نہیں ہوتے۔

﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا﴾ بیشک ہم نے پانی کو بہایا بہانے کے ساتھ، موسلا دھار بارشوں کے ذریعہ مردہ زمین کو نرم و سیراب کر کے قابلِ کاشت بنایا، پھر اسے پھاڑ کر ہر قسم کی ترکاری، دانے، گندم، سبزی، وغیرہ کا پودا نکال

کرا ُ گایا۔ اناج، انگور، کھجور، زیتون، اور جانوروں کے لیے چارہ، غرض ہر قسم و ہر ذائقہ میں مختلف رنگ و منافع کی غذا مہیا کی۔ دنیا کے مختلف حصوں مثلاً یورپ، افریقہ، ایشیاء، برصغیر، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں ایسے علاقے ہیں جہاں سبزہ، سبزی، باغات کا سلسلہ ہزاروں میلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ٹرین یا تیز رفتار گاڑی کا مسافر تین چار دن تک مسلسل سفر کرے تب بھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکے گا۔ ڈیرہ مراد سے لے کر ہندوستان کے آخری بارڈر تک سبزہ ہی سبزہ کا راج ہے، خشکی کا نام ونشان نہیں۔ یہی حال دیگر چند ممالک کا بھی ہے۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ نے کشمیر جیسے خطہ کو جنت الارض کا نام دیا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ ربّ العزّت سبحانہ کے انعامات اور بخشش و عنایتوں کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ کاش یہ انسان ناشکری اور بغاوت چھوڑ کر شکر گزاری اور اطاعت قبول کر لیتا، بصورت دیگر اسے خبردار کیا جا رہا ہے، فرمایا:

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿٣٤﴾ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

ترجمہ: پس جب آئے گی سخت چیخ قیامت کی ﴿۳۳﴾ جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے ﴿۳۴﴾ اور بھاگے گا اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے ﴿۳۵﴾ اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے ﴿۳۶﴾ ہر شخص کو ان میں سے اس دن ایسی فکر لاحق ہوگی جو اسے سب سے بے پرواہ کر دے گی ﴿۳۷﴾ اس دن کئی چہرے روشن ہوں گے ﴿۳۸﴾ ہنسنے والے اور خوشیاں منانے والے ہوں گے ﴿۳۹﴾ اور کئی چہروں پر اس دن گرد و غبار چڑھا ہوا ہوگا ﴿۴۰﴾ ان پر سیاہی چڑھی ہوگی ﴿۴۱﴾ یہ فسق و فجور کرنے والے کافر لوگ ہیں ﴿۴۲﴾

معارف ومنازل

﴿الصَّاخَّةُ﴾ دلوں کو ہلا دینے والی چیخ (نفخ صور دوم) وہ ہیبت ناک آواز جسے سن کر دماغ ماؤف ہو جائیں گے، اور آنکھیں تھرتھرا کر خیرہ ہو جائیں گی، کانوں کے پردے پھٹ کر بہرے ہو جائیں گے، نامور شیر، مرد بہادر بے ہمت ہو کر گر جائیں گے۔ ﴿وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً﴾ [الجاثیة: ۲۸] (اور تم ہر گروہ کو دیکھو گے کہ وہ گھٹنوں کے بل گرا ہوا ہے)۔ عوام الناس کا کیا پوچھنا، اولوالعزم ہستیاں نفسی نفسی کہنا شروع کریں گی، ایسی پریشانی کا عالم ہوگا

کہ سارے ننگے اور بے ستر ہونے کے باجود ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں گے، ایک دلخراش منظر سامنے ہوگا، دنیا میں جن آل واولاد، عزیز ورشتہ داروں پر جان ومال نچھاور کر کے نہیں تھکتے تھے آج ان سے دور بھاگنا شروع کریں گے، تمام رشتے ناطے ٹوٹ کر سوائے اپنے غم اور اپنی ذات کے کسی کو یاد نہیں کریں گے، بھائی بھائی سے، ماں باپ اولاد سے، اولاد ماں باپ سے، میاں بیوی ایک دوسرے سے قطع تعلق کر کے شناخت تک نہیں کریں گے، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ظلم وتعدّی پر گواہ نہ بنے، یا مجھ سے کوئی نیکی طلب نہ کرے، یا میرے خلاف استغاثہ نہ کرے۔ ﴿اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍ ۭ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ﴾[الزخرف:۶۷] (اس دن دوست بعض بعض کے دشمن ہوں گے، سوائے پرہیزگاروں کے)۔

آج انصاف کی عدالت قائم ہوگی، نہ کوئی بھاگ سکتا ہے، نہ چھپ سکتا ہے، آج ایک ذرہ بھر کسی پر زیادتی نہیں ہوگی، آج تقویٰ وطہارت اور توحید وایمان کی قیمت کا دن ہوگا، کھجور کے برابر نیکیاں پہاڑوں جتنی ظاہر ہوں گی، کفر اور شرک، بدعت ومعاصی کا بازار بے وقعت وبے قیمت ہوگا، بڑے بڑے فرعون ونمرود ستر ستر گز کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے پیش ہوں گے، جنت ودوزخ کا فیصلہ ہوگا، اپنے اعضاء گواہ بن کر مجرمین کے خلاف گواہی دیں گے، خوش قسمت لوگوں کے چہرے سورج کی طرح روشن ہوں گے، اعضاءِ وضو چمک دمک کے ساتھ نورانی ہوں گے۔ ﴿لِّسَعۡیِهَا رَاضِیَةٌ﴾ [الغاشیة:۹] (اپنی کوشش سے راضی ہوں گے)، اپنے نیک اعمال کی بدولت خوشیوں، مسرتوں اور راحتوں میں ہنستے ہوئے نہایت مسرور وخوشحال ہوں گے۔

جبکہ مجرمین کے چہرے کالے، سیاہ، غبار آلود، مذموم وشرمندہ ہوں گے، ادھر ادھر دیکھنے کی نہ جرأت کرسکیں گے نہ ہمت، ان کی آنکھیں خیرہ اور پست ہوں گی، وہ اپنے کئے پر پشیمان اور غمگین ہوں گے، اپنے کفر وفسق اور ناشکری پر خستہ ورسوا اور ذلیل ہوں گے۔

اے ربّ العٰلمین! ربّ العرش العظیم! سارے موحد مسلمانوں پر رحم فرما۔ آمین

سُورَةُ التَّكْوِيرِ

مکیۃٌ آیاتہا ۲۹ رکوعہا ۱

سورۃ تکویر مکی ہے، اس میں انتیس (۲۹) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ التکویر ہے، جو پہلی آیت کے لفظ کُوِّرَتْ سے ماخوذ ہے۔ یہ مکی سورت ہے۔ یہ سورت انتیس (۲۹) آیات، ایک سو چار (۱۰۴) الفاظ اور پانچ سو تینتیس (۵۳۳) حروف پر مشتمل ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی زندگی میں سورۃ المسد (اللہب) کے بعد نازل ہوئی۔

ربط ومناسبت:

سابق سورتوں کی طرح اس سورت میں بھی قیامت اور اس کے ہولناک مناظر کا بیان ہے، ساتھ ساتھ توحید ورسالت کی عظمتوں کا بیان بھی ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت کے دو موضوع ہیں: ایک آخرت، دوم رسالت۔ پہلی چھ آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلہ (نفخہ اولیٰ) کا ذکر کیا گیا ہے: سورج بے نور ہو جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، پہاڑ زمین سے اکھڑ کر اڑنے لگیں گے، لوگ اپنی پسندیدہ عزیز چیزوں کو بھول جائیں گے، جنگلی جانور بدحواس ہو کر اکھٹے ہو جائیں گے، اور سمندروں

میں آگ لگ جائے گی۔ اس کے بعد سات آیتوں میں دوسرے مرحلہ (نفخہ ثانیہ) کا ذکر ہے: روحوں کو از سرِ نو جسموں کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا، نامۂ اعمال کھولے جائیں گے، آسمان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے، جنت و دوزخ نگاہوں کے سامنے عیاں ہو جائیں گے، تب ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا کچھ لے کر آیا ہے۔

اس کے بعد رسالت کا بیان ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کی صداقت اور آپ ﷺ سے جنون وغیرہ کی نفی کا بیان ہے، اور وحی لانے والے فرشتے کی امانت و دیانت اور قرآن حکیم کی صداقت و حقانیت کا تذکرہ ہے، اور مشرکین کی بے سمجھی، عناد و ضلالت پر انہیں تنبیہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۪ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ۪ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۪ۙ﴿۴﴾
وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۪ۙ﴿۵﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۪ۙ﴿۶﴾ وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۪ۙ﴿۷﴾ وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۪ۙ﴿۸﴾ بِاَیِّ
ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ﴿۹﴾ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ۪ۙ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ ۪ۙ﴿۱۱﴾ وَ اِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ ۪ۙ﴿۱۲﴾ وَ اِذَا
الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ ۪ۙ﴿۱۳﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ﴿ؕ۱۴﴾

ترجمہ: جب سورج کو لپیٹ دیا جائے گا ﴿۱﴾ جب ستارے بکھر جائیں گے، بے نور ہو جائیں گے ﴿۲﴾ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے ﴿۳﴾ اور جب گابھن اونٹنیاں بیکار چھوڑی جائیں گی ﴿۴﴾ اور جب وحشی جانور اکٹھے کئے جائیں گے ﴿۵﴾ اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے ﴿۶﴾ اور جب جانوں (نفسوں) کو ملا دیا جائے گا ﴿۷﴾ اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکیوں سے پوچھا جائے گا ﴿۸﴾ کہ انہیں کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا؟ ﴿۹﴾ اور جب اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے ﴿۱۰﴾ اور جب آسمان کی کھال اتار دی جائے گی ﴿۱۱﴾ اور جب جہنم کو بھڑکا دیا جائے گا ﴿۱۲﴾ اور جب جنت کو قریب کر دیا جائے گا ﴿۱۳﴾ اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے ﴿۱۴﴾

معارف و منازل

﴿کُوِّرَتۡ﴾ تکویر کے معنی لپیٹنا، دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿یُکَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّہَارِ وَ یُکَوِّرُ النَّہَارَ عَلَی

اللَّیْلِ﴾ [الزمر: ۵] (رات کو لپیٹتا ہے دن پر، اور دن کو لپیٹتا ہے رات پر)، سر پر عمامہ لپیٹنے کو بھی تکویر سے تعبیر کرتے ہیں۔

نظامِ شمسی میں آفتاب عالمتاب کی بڑی اہمیت ہے، اس جہانِ رنگ و بو کا قیام و تازگی اسی نظام شمسی سے وابستہ ہے، جب تک شمس و قمر اور ستاروں کی شیرازہ بندی قائم ہے تو سارا جہاں اور آسمانی افق روشن و درخشندہ، جگمگاتے معلوم ہوتے ہیں، اور ہر چیز اپنے عروج و ترقی پر گامزن نظر آتی ہے، جب قیامت کا مرحلہ قریب آئے گا تو نفخۂ اولیٰ کی جان گداز مہیب و خطرناک آواز کے ساتھ علویات و سفلیات کی جو شیرازہ بندی تھی، وہ انتشار کا شکار ہو کر ٹوٹ جائے گی، اور بقاء و قیامِ عالم کو منسوخ کر کے تہہ و بالا اور درہم برہم کر کے نیست و نابود کیا جائے گا۔ اس روز سورج کی نور افشانی کرنے والی کرنیں اس کے اردگرد عمامہ یا کپڑے کی تھان کی طرح لپیٹ دی جائیں گی، اور یہ منبع نور بے نور ہو جائے گا، اور اسے چاند و ستاروں کے ساتھ سمندر میں پھینک دیا جائے گا، جس کی حرارت سے سارا سمندر پٹرول کی طرح آگ کی لپیٹ میں آجائے گا، اور چشمِ زدن میں پورا سمندر خشک ہو کر تباہ ہو جائے گا، یہی مطلب ہے:

﴿وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ﴾ کا، اور یہی روایت صحیح بخاری کی ہے بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ اسی طرح ابو شیخ نے ربیع بن خیثم کی روایت نقل کی ہے۔ [مظہر ۵، قرطبی، أنوار القرآن] جب شمس و قمر اور دیگر تمام ستارے سمندر میں ڈال دیئے جائیں گے تو ایک بھیانک اندھیرا نہایت خطرناک رونما ہو جائے گا، اسی کا نام قیامت ہوگا، اور یہ وزنی و فلک بوس پہاڑ ریت کی طرح بہنا شروع کریں گے، آناً فاناً روئی کی طرح یا مانند بادلوں کے فضاء میں اڑتے پھریں گے۔

عرب لوگ دس مہینے کی گابھن اونٹنیوں کو نہایت پسندیدہ بہترین مال تصور کرتے ہیں، اور بڑی قیمتیں دے کر انہیں خریدتے ہیں، جیسے موجودہ وقت اعلیٰ سے اعلیٰ گاڑیوں کا چرچا ہے، اس کے علاوہ اعلیٰ سے اعلیٰ مال و متاعِ دنیا جو لوگوں میں محبوب و مرغوب ہیں، یہ سب ناکارہ و بیکار ہو کر مالکان انہیں بھول جائیں گے، قیامت کی ہولناکیوں میں مال تو مال ہے لوگ اپنے پیارے آل و عیال اور جان سے محبوب بیوی اور دیگر رشتہ داروں سے بے خبر اور بیزار رہیں گے، ہر ایک اپنی جان کے غم و فکر میں محو ہوگا، سارے رشتے ناطے گم ہو جائیں گے، ﴿وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾ [البقرة: ۱۶۶] (ان کے تعلقات کٹ گئے) کا منظر سامنے ہوگا۔

یہ بیچارے بے گناہ وحشی جنگلی جانور ہمارے گناہوں کی پاداش میں حیران وسرگردان وبدحواسی کے عالم میں اکٹھے ہوجائیں گے، اور ہر طرف سے بھاگ بھاگ کر آبادی کی طرف منتقل ہوجائیں گے، اور تو کیا اپنی بنیادی فطرت درندگی چھیر پھاڑ بھی بھول جائیں گے، نہ شیر کسی کو پھاڑے گا، نہ اژدہا وسانپ میں ڈسنے کی صلاحیت ہوگی، یہ قیامت اتنی ہیبت ناک منظر اور وحشتناک کیفیت کے ساتھ ہوگی کہ جنگلی جانوروں کو بھی اپنے لپیٹ میں لے کر انہیں انسانوں کے ساتھ گڈ مڈ کر کے جمع کرے گی، جو بیچارے کبھی انسانی سایہ سے بھاگتے تھے آج وہ انسانی آبادی کا رخ کر کے سکتے کے عالم میں ان کی پناہ میں آئیں گے، پھر ان سے بھی حساب لیا جائے گا، جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ واللہ أعلم وعلمہ أتم

﴿وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ﴾ اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے۔ **تسجیر** کے معنی آگ لگانے اور بھڑکانے کے ہیں۔ بعض مفسرین نے بھر دینے اور خلط ملط کرنے کے معنی کیے ہیں۔ ابھی اس وقت ایک مخفی قدرت نے تمام دریاؤں میں ایک فاصلہ بطورِ برزخ مقرر کیا ہے کہ دریا آپس میں نہیں ملتے، الگ الگ اپنے نظام پر چل رہے ہیں، اور سمندر ساکن رہتا ہے، دوسرے شیرین دریا مسلسل بہہ رہے ہیں، جب صور پھونکا جائے گا تو سارے دریا قدرتی برزخ کے دور ہونے کے ساتھ اکٹھے اور خلط ملط ہوکر دریائے شور سمندر میں مل جائیں گے، اور یکجان ہوکر چاند، سورج وغیرہ کے اس میں گرنے کے ساتھ زبردست آگ لگنے سے دوزخ کی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔ جن بعض روایات میں آیا ہے کہ چاند، سورج وغیرہ کو دوزخ میں ڈالا جائے گا، اس کا مطلب بھی یہی ہوگا، اور یہ تمام روایات میں ایک قسم کی تطبیق ہے۔

﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے اس کے یہ معنیٰ منقول ہیں: "قُرنت الأرواح بالأجساد" یعنی قیامت کے روز روحوں کو اپنے اپنے اجساد کے ساتھ دوبارہ ملا دیا جائے گا۔ [قرطبي] جمہور علماء اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ حاضرینِ محشر کے جوڑے جوڑے بنا دیئے جائیں گے، یہ جماعتیں اور جتھے ایمان و عمل کے اعتبار سے ہوں گے، اس میں قومیت و وطن یا زبان کا تعلق نہ ہوگا، مثلاً کافر ایک جگہ، مؤمن ایک جگہ، پھر مؤمن وکافر میں بھی مختلف اعمال وعادات کا فرق ہوتا ہے، اس اعتبار سے کفار کے بھی مختلف گروہ ہوں گے، مشرک الگ، یہودا الگ، عیسائی الگ، صابی الگ، پارسی الگ، ہندوا الگ، بدھ مت یا دیگر اقسام الگ الگ ہوں گے، اور مسلمانوں میں بھی یہ گروہ عقیدے اور عمل میں اشتراک کی بنا پر ہوں گے، جیسے کہ بیہقی نے بروایت نعمان بن بشیر

رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جو لوگ ایک جیسے اعمال کرتے ہوں گے وہ ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں گے، علماء کرام کا مجمع الگ ہوگا، غازیوں کا الگ، مبلغین کا الگ، صوفیا الگ ہوں گے، صدقات وخیرات والے، اور اسی طرح سخی لوگوں کا الگ مجمع ہوگا، وغیرہ۔

اسی طرح سے سیئات و بداعمالیوں کے مرتکب طرح طرح کے لوگ ہوں گے، بدعت، رشوت، سود، شراب، زنا، بے نمازی، چوری، ڈاکہ، وغیرہ مختلف جرائم پیشہ لوگوں کے گروہ الگ الگ رہیں گے، ہر قسم کے گناہگاروں کا اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ حشر ہوگا، مجال نہیں کہ کوئی اپنے گروہ سے الگ ہو کر کسی دوسرے گروہ میں شامل ہو، حدیث شریف میں فرمایا: ''المرأ مع من أحب''۔ [بخاري]

دنیا میں جن لوگوں کے ساتھ یا جس گروہ کے عمل حسنہ یا سیئہ کے ساتھ وابستہ رہا، قیامت میں انہی کی جماعت کے ساتھ رہے گا، اور انہی میں ہی محشور ہوگا، ''اِنْ خیر أفخیز وَإِنْ شر أفشر''۔ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّه مِنْهُمْ﴾ [المائدة ۵۱] (تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا)۔ جو مسلمان یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کریں گے، یا ان کے طرز وطریق پر عمل کریں گے وہ قیامت میں انہی کے ساتھ محشور ہوں گے۔ ''من تشبه بقوم فهو منهم''۔ [الحديث]

کسی زانی، شرابی، رشوت خور، سود خور وغیرہ کو یہ خیال دل سے نکال دینا چاہئے کہ اس کا حشر عام بے گناہ مسلمانوں کے ساتھ ہوگا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن حکیم نے ہر جگہ وضاحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ متقین وفجار برابر نہیں ہو سکتے، اور ان کا حشر ایک جگہ ایک جیسا برابر نہیں ہو سکتا، کچھ لوگ وہ ہوں گے جو بغیر حساب و کتاب جنت میں داخل ہوں گے، کچھ سابقین اولین ہوں گے جو ہر قسم کے عذاب سے نجات یافتہ ہوں گے، کچھ اصحاب الیمین کی شکل میں دخولِ جنت کے حقدار ہوں گے، اور اس کے علاوہ دوسرے بہت سے مختلف گروہ ہوں گے جو بغیر کسی عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے، ان کے علاوہ دیگر قسم کے بے شمار گروہ ہوں کے لوگ مؤمن ہوتے ہوئے اپنے برے اعمال کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جائیں گے، اور بڑی لمبی مدتوں تک جہنم میں رہیں گے۔ مسلمان ایماندار اگرچہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رہے گا، لیکن بداعمالیوں کی سزا کے طور پر مدتوں تک جہنم میں رہے گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اوّل تو اجسام کا ارواح کے ساتھ جوڑ لگے گا، اور اجسام زندہ ہو جائیں گے گویا کہ اجسام و ارواح کی شادی ہو جائے گی، پھر کبھی ان میں جدائی نہیں ہوگی، پھر عملی اعتقادی مشارکت کی وجہ سے ہر شخص اپنے ہم

عقیدہ وہم خیال طائفہ کے ساتھ جڑ جائے گا، نیک لوگ نیکوں کے ساتھ، برے لوگ اپنے ہم خیال برے لوگوں کے ساتھ مل جائیں گے۔ "المرء مع من أحبّ" کے بموجب اپنے ہم مسلک و ہم مشرب لوگوں کے ساتھ جمع کئے جائیں گے، اور پھر جنت یا دوزخ کی طرف روانہ ہوں گے۔

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ﴾ اور جب زندہ درگور زمین میں گاڑی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں ماری گئیں؟ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [التین:۶] (پھر ہم اسے پستی والوں میں سے سب زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں)۔ پھر فرمایا: ﴿وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر:۳] (زمانے کی قسم۔ بیشک انسان بڑے گھاٹے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کریں، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں)۔

انسانی معاشرہ اگر انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور وحی الٰہی کے فیوض و برکات سے معمور ہو، تو قوت غضبیہ و شہویہ دونوں دب جائیں گی، اور یہ معاشرہ جنت نظیر کیفیت میں بدل جائے گا، اگر انسانی معاشرہ وحی الٰہی کے فیوض و برکات سے خالی ہو تو اس معاشرے پر قوت غضبیہ و شہویہ کی بے مہار حکمرانی قائم ہو جائے گی، اور وہ معاشرہ نفسانی خواہشات کا شکار بن کر جنگلی جانوروں اور درندوں والا معاشرہ بن جائے گا۔

طلوعِ اسلام سے پہلے عرب اقوام کا معاشرہ ایک بدترین جہالت کا معاشرہ تھا، یہ لوگ تمام جرائم کا دیدہ و دانستہ ارتکاب کے ساتھ اپنے بھیانک جرائم پر فخر و مباہات کے ساتھ عمل کرتے تھے، اور اسے اپنے عروج و ترقی کا نام دیتے تھے، شرک و کفر اور ہر قسم کی بغاوتوں کو اپنا کمال سمجھتے تھے، کفر و شرک کے علاوہ تمام معاصی اور تاریک جہالت کے خطرناک رسوم میں سے ایک عام بے رحمانہ رسم جو کہ پورے عرب میں عام تھی، یعنی بچیوں کو زندہ درگور کرنا، اس مقصد کے لیے انہوں نے الگ قبرستان بنایا تھا۔ مکۃ المکرمہ میں آج بھی وہ قبرستان ایک چار دیواری کی شکل میں پورے ایک ایکڑ زمین پر کعبۃ اللہ شریف سے بجانب جنوب مغرب شارع ابراہیم الخلیل کے ساتھ پہاڑ کے دامن میں موجود ہے۔ مؤرخین نے اس ظالمانہ رسم کی کئی وجوہات بیان کی ہیں:

(۱) عام عرب کی معاشی حالت بڑی خستہ ہوتی تھی، معاش کے معاملے میں وہ بڑے پریشان رہتے تھے، بچیوں کو پالنا، جوان کرنا، اور پھر ان کی شادی کرنا وہ اپنے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ تصور کرتے تھے، اس لئے ان کو

بچپن میں ہی ہلاک کرتے تھے۔

(۲) قبائل میں کشت وخون، جنگ وجدال روزمرہ کا معمول بن چکا تھا، لڑکے جوان ہوکر ایسی لڑائیوں میں ان کی مدد کرتے تھے، لڑکیاں لڑائیوں میں ان کی مدد نہیں کرسکتیں، اور پھر ان کو دشمنوں کے دستبرد سے بچانے کے لیے بھی انہیں کافی پریشانی لاحق رہتی تھی، اس لئے وہ انہیں زندہ رکھنا اپنے لئے وبال سمجھتے تھے۔

(۳) مشرکین کا تکبر وغرور بھی اس ظالمانہ عمل کا ایک سبب تھا، وہ ایک لڑکی کو پال پال کر نوجوان کرکے یوں ہی کسی کے سپرد کرنے اور اسے اپنے داماد بنانے کو اپنی حقارت اور توہین سمجھتے تھے، اس سے بچنے کا واحد راستہ یہی سوچتے کہ نہ لڑکی زندہ رہے، نہ شادی وبیاہ اور نہ ہی کسی کو داماد بنانے کی ضرورت درپیش ہو۔

(۴) قبیلہ ربیعہ پر کسی دشمن نے شب خون مار کر ان کے چند افراد کو قتل کیا، طاقتور دشمن ان کے سردار کی جواں لڑکی کو اٹھا کر ساتھ لے گئے اور خوب اس کی عزّت ودلجوئی کی، چند وقت کے بعد جب صلح ہوگئی تو اس لڑکی نے واپس جانے سے انکار کرکے مخالف قوم کے پاس رہنا پسند کیا۔ یہ طرز عمل ربیعہ جیسی قوم کی خفت کا باعث بنا، تب ربیعہ والوں نے لڑکیوں کے لیے زندہ درگور کرنے کا فیصلہ کیا، آہستہ آہستہ دوسرے قبائل میں بھی یہ رواج مقبول ہوا، اور سب نے اس پر عمل شروع کیا پھر عام ہوا۔

لیکن اس سنگدل معاشرے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو بیگناہ بچیوں کی بے کسی پر خون کے آنسو بہاتے، اور ان سے جتنا کچھ بن آتا اس سے دریغ نہ کرتے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی زید بن عمرو بن نفیل کو جب پتہ چلتا کہ فلاں شخص کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے، اور وہ اسے زندہ دفن کرنا چاہتا ہے، تو وہ فوراً وہاں پہنچتے، اور اس بچی کی پرورش، شادی بیاہ، نان نفقہ، وغیرہ اخراجات کی ذمہ داری اٹھاتے اور اس کی جان بچاتے، بلکہ بسا اوقات اس کی قیمت ادا کرکے اسے لے لیتے، اور یہ شخص مسلسل اسی نگرانی میں رہتے، بذات خود اور چند دوسرے لوگوں کے ذریعہ ایسے امور کی نگرانی کرتے۔

اسی طرح حضرت زید رضی اللہ عنہ نے سینکڑوں کی تعداد میں بے گناہ معصوم لڑکیوں کو بچایا اور انہیں زندگی بخشی، جب اسلام کا طلوع ہوا تو انہی عورتوں نے اسلام قبول کرکے صحابیت کا شرف حاصل کیا۔ رضي الله عنهن

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور شاگرد اور نامور شاعر فرزدق کے دادا حضرت صعصعہ بن ناجیہ المجاشعی رضی اللہ عنہ کا بھی یہی معمول رہا۔ حضرت آلوسیؒ نے طبرانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت صعصعہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے

سے پہلے تین سو ساٹھ لڑکیوں کو بچایا تھا۔ایک دن رحمت عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: یا رسول اللہ! میں نے زمانہ جاہلیت میں بہت سے نیک کام کئے ہیں، کیا مجھے ان کا بھی اجر ملے گا؟ میں نے تین سو ساٹھ بچیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچایا، اور ہر ایک کے عوض دو دو دس ماہی گابھن اونٹنیاں اور ایک ایک اونٹ (مجموعہ ایک ہزار اسی اونٹ) بطور فدیہ ان کے والدین کو دیا، کیا مجھے اس عمل کا اجر وثواب ملے گا؟ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ''اس عمل کا اجر تو تجھے مل گیا، جب اللہ تعالیٰ نے تجھے اسلام لانے کی توفیق مرحمت فرمائی، اور نعمت ایمان سے تجھے سرفراز کردیا''۔

فرزدق نے اپنے دادا صعصعہ رضی اللہ عنہ کے اس بے مثال عظیم کارنامے پر فخر کر کے کہا ہے: ؎

وجدی الذی منع الوائدة	★	فاحیا الوئید ولم تؤد

میرا دادا (وہ عظیم صحابی) ہیں جس نے زندہ درگور کرنے والیوں کو روکا، اس طرح ان بیٹیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچا کر زندگی بخش دی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی نعمت بہت بڑی اور ایمان کی قیمت بہت عظیم ہے، پس جن لوگوں کو ایمان بغیر کسی مالی قربانی کے مفت نصیب ہوا، انہیں شب و روز اللہ تعالیٰ شانہ کی بخششوں کا شکر بجالانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دولت ایمان سے نوازا۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رحمت للعٰلمین ﷺ کو اپنا واقعہ یوں سنایا کہ میری بیٹی بڑی تھی اور مجھ سے بہت مانوس تھی، ایک روز میں اسے لے کر چلا، راستہ میں وہاں ایک کنواں تھا، میں نے اسے دھکا دے کر کنویں میں گرادیا، اور وہ مسلسل ہائے بابا کہتی رہی اور چلاتی رہی، یہاں تک کہ اس کی آواز بند ہوگئی، اس پر رحمۃ للعٰلمین ﷺ اتنے روئے کہ آپ ﷺ کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیس بن عاصم تمیمی رحمۃ للعٰلمین ﷺ کی خدمت میں آکر کہنے لگے: یا رسول اللہ! میں جاہلیت میں آٹھ بچیوں کو زندہ درگور کر چکا ہوں، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہر ایک کے عوض ایک غلام آزاد کرو، کہنے لگے: میں اونٹوں کا مالک مالدار ہوں، فرمایا: ہر ایک کے عوض ایک بدنہ ہدیہ کرو۔
[روح المعاني]

ایک اور شخص نے اپنا واقعہ اسلام لانے کے بعد یوں بیان کیا کہ میں نے اپنی پیاری بچی کو نہلا دھلا کر عزیزوں کے پاس جانے کا بہانہ بنایا، اور لڑکی کو ساتھ لیا، وہ ہنستی کھیلتی خوشی منا رہی تھی، اسے کیا پتہ تھا کہ باپ بھیڑیا بن کر مجھے زندہ زمین میں دفن کرے گا، جنگل میں لے جا کر میں نے گڑھا کھودنا شروع کیا، میرے چہرے اور داڑھی

پر جو غبار لگ رہا تھا وہ اپنے دوپٹے سے میرا چہرہ صاف کر رہی تھی، جب گڑھا تیار ہوا تو میں اس کے دوپٹے سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کو گڑھے میں ڈال دیا، وہ چیختی چلاتی رہی، اور ابا جان ابا جان کہتی رہی، میں نے اس کی ایک نہ سنی تا آنکہ اس پر تمام مٹی ڈال کر اسے خاموش کر دیا۔ ﴿فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ﴾ [الحشر: ۲] (اے بصیرت والوں عبرت حاصل کرو) کہتے ہیں کہ ایامِ جاہلیت میں اکثر و بیشتر پیدائش کے وقت یہ رسمِ بد فوراً ادا کرتے تھے، بعض اوقات لڑکی کو زندہ درگور کرنے کے لیے چھ سال کا انتظار کرتے تھے، جب وہ چھ سال کی عمر کو پہنچ جاتی، تو نہلا دھلا کر کپڑے پہنا کر، اور سسرال میں لے جانے کا بہانہ بنا کر کسی کنویں کے سپرد کرتے، اگر کسی لڑکی کو زندہ رکھنا چاہتے تو پشم کا جبہ اسے پہنا کر جنگل میں بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے چرانے پر اسے مجبور کر کے وہاں بھیج دیتے۔ [روح المعاني]

درندگی اور وحشت و بے رحمی کا کوئی اندازہ نہ تھا، تاریخ گواہ ہے کہ فرعون مصر نے بنی اسرائیلی قوم کے لڑکوں کے ساتھ جو کھیل کھیلا اور ان کے پورے خاندانوں کے ساتھ جو ظلم و بربریت کو جائز رکھا، وہ سب لوگوں کو معلوم ہے، آخر حلیم و بردبار حق سبحانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے توسط سے نہتے مظلوم و بے بس قوم کی نجات کا فیصلہ فرمایا، اور فرعون مع لشکر تباہ ہوا۔ اسی طرح عرب کی جہالت کہیں فرعون سے کم نہ تھی، فرعون نے حاکم ہوتے ہوئے ظلم کیا، یہاں امیر و غریب، حاکم و محکوم حتیٰ کہ چرواہوں تک پوری قوم بے رحمی اور دلیری کے ساتھ اللہ ربّ العزّت کی بردباری کو چیلنج کرتے ہوئے فرعون کے نقش قدم پر چلنے میں فخر محسوس کرتی تھی، فرق اتنا ہے کہ فرعون بچوں کا دشمن رہا، اور یہ لوگ بچیوں پر ظلم و ستم ڈھا کر انہیں زندہ درگور کرنے پر ڈٹے رہے۔

ربّ العزّت سبحانہ نے اپنے آخری پیغام برحق کے ذریعے اور رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عامہ کے بطفیل پورے عرب سے جہاں تمام ظلمتوں اور گمراہیوں کا قلع قمع کر کے اسلام کے زرین اور برگزیدہ احکام کے ذریعہ تمام جہاں کو گمراہیوں سے پاک کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلام اقوامِ عرب اور پوری کائنات کے لیے نجات دہندہ ثابت ہوا۔

اب ہمارے موجودہ زمانہ میں پھر ایک خسیس و بے رحم شیطانی طاقت اور اس کے کاسہ لیس و ہمنوا بھیڑیے پورے عالم اسلام پر حملہ آور ہوئے، اب یہ شاطر و چالاک دشمن فرعون اور مشرکین عرب سے چند قدم اور آگے نکلا، اب لڑکوں کے لیے خیر ہے نہ لڑکیوں کے لیے، نہ جوانوں اور نہ بوڑھوں کے لیے، بلکہ مطلق انسانیت ظلم و ستم کی چکی

میں پس رہی اور فنا ہو رہی ہے، اب ایک نجات دہندہ اور حقیقی نجات دہندہ کا شدت سے انتظار ہو رہا ہے تاکہ عالم اسلام کو مغرب کے ظلم وستم سے آزاد کرے، اور بے لگام مست ہاتھی کو اصحاب الفیل والا سبق پڑھائے۔

یہ نجات دہندہ صرف اور صرف حضرت امام مہدی علیہ السلام ہی ہوں گے، یہ طبل جنگ بج چکا ہے، اب یہ نہ خاموش ہوگا اور نہ پسپا ہوگا، وہ ساری علامتیں اور نشانیاں منظر عام پر آچکی ہیں جن کے ساتھ ان شاء اللہ یہود ونصاریٰ اور ہنود کا خاتمہ ہوگا، یہی ہر زمانے میں سنت اللہ رہی ہے۔ اللّٰهم ارحم أمة محمد صلی اللہ علیہ وسلم

خلاصۂ مضمونِ بالا:

جب اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعٰلمین کا تاج پہن کر دنیا میں تشریف لائے اور پوری کائنات کے لیے نجات دہندہ کی حیثیت سے تشریف لائے، اور تمام تاریکیوں اور ظلمتوں کو سراسر مٹانے کے لیے تشریف لائے، اور آتے ہی حقوق اللہ وحقوق العباد کے تحفظ اور حفاظت کا مبارک نعرہ لگایا، اور اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے ہوئے یہی ذہن نشین کرایا کہ جہاں کے ہر گوشے میں صرف اللہ پاک کا پاکیزہ حکم جاری رہے گا، انسانوں کے حقوق کا مکمل تحفظ ہوگا، حتیٰ کہ گونگے، بہرے، بے سروسامان جانوروں کے ساتھ کوئی ظلم وزیادتی کی جرأت بھی نہیں کر سکے گا، جن معصوم وبے گناہ بچیوں پر صدیوں سے دنیا والوں نے جو ظلم وستم روا رکھا تھا، اس کا مکمل خاتمہ ہوگا، اور بچیوں کے گلوں میں حفظ وامانت، عزّ وشرف کے اعلیٰ قیمتی جواہرات کے ہار ہوں گے، جو صدیوں سے معتوب ومبغوض تھیں، وہ شہزادیاں بن کر عزّت وحرمت کے اعلیٰ مراتب پر براجمان ہوں گی۔

جو لڑکی والدین اور معاشرہ پر بوجھ رہتی تھی اور قوم کے لیے باعثِ عار سمجھی جاتی تھی، اب وہ معاشرہ کی قیمتی سرمایہ بن کر باعث صد افتخار ہوگی۔ حضرت رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے بچیوں کے بارے میں ارشاد فرمایا: "من ابتلي من هذه البنات بشيء فأحسن إليهن كن له سترا من النار"۔ [متفق علیه] جو شخص ان بچیوں کا باپ بننے سے آزمایا گیا، اور اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے پردہ ثابت ہوں گی۔

"من كانت له أنثى فلم يئدها ولم يهنها ولم يؤثر ولده عليها أدخله الله الجنة"۔ [أبو داؤد]۔

"من عال جاريتين حتى تبلغا جاء يوم القيامة أنا وهو هكذا وضم أصابعه"۔ [مسلم] جس کے یہاں لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ درگور نہ کرے اور نہ اس کو حقیر جانے، اور نہ بیٹے کو اس پر ترجیح دے، تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ [أبو داؤد] اور وہ جنت میں میرے ساتھ دو انگلیوں کی طرح اکٹھا ہوگا۔ [أبو داؤد] پھر

فرمایا: ''جو شخص دو لڑکیوں کو جوان ہونے تک پالے تو وہ قیامت میں میرے ساتھ ایسا ہوگا، جیسے یہ دو انگلیاں''۔ [مسلم]

الغرض! ان عفیفہ، نحیفہ، ضعیفہ اور نجیبہ بچیوں کے تحفظ و نگہداشت کے متعلق نیز ان کے ساتھ محبت اور حوصلہ افزائی اور احسان و حسنِ سلوک کے بارے میں اتنی بکثرت روایات ہیں اگر ایک جگہ ترتیب دے کر انہیں جمع کیا جائے تو ایک رسالہ مرتب ہوگا، مختصر یہ کہ یہ اللہ پاک کی نعمت اور رحمت ہی ہیں، ان پر شفقت کرو۔

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ﴾ زمین میں زندہ گاڑی ہوئی لڑکیوں سے پوچھا جائے گا۔ یہاں پوچھنے کی نسبت بجائے ظالم والدین کی بچیوں کی طرف کرکے اشارہ کیا گیا کہ ان کے والدین مشرک و بدعقیدہ لوگ اس قابل نہیں کہ ان سے سوال کیا جائے اور پوچھا جائے، یعنی اللہ ربّ العزّت نے اس انداز سے اپنے غصے اور ناراضگی کی انتہاء کا اظہار فرمایا کہ ان کے والدین کو مخاطب ہونے کے درجے سے گرادیا، اور ان کو رسوا کرنے میں مبالغہ سے کام لیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ان سے براہ راست پوچھا جائے تو وہ کوئی عذر و بہانہ تلاش کرکے جواب دیں جیسے کہ عام طور مجرم ایسا ہی کرتے ہیں اور انکار تک نوبت پہنچتی ہے۔

اس میں تیسری حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ سوال مظلوم ہی سے ہونا اس لئے مفید ہے تاکہ وہ اپنی مظلومیت کی اصلی داستان خود بیان کرے، جو عام لوگ اس کو بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں، ''فإن المظلوم أحق ببيان الظلم وماجرى عليه وجربه بنفسه دون الظالم وباقي الناس، فإن النار تحرق ماتوقد عليهامن الأرض''۔ جہاں آگ جلائی جاتی ہے زمین کا وہی حصہ متاثر ہوتا ہے نہ کہ جلانے والے اور نہ آس پاس کا حصہ۔

دراصل قیامت کے برپا کرنے کی حکمت بتائی گئی کہ ہر آدمی غور کرے کہ اگر قیامت برپا نہ ہو تو کیا یہ مظلوم اور اسی طرح لاکھوں دیگر مظلوموں کی دادرسی کی کوئی صورت ہوسکتی ہے؟ کیا بغیر قیامت کے ایسے لاکھوں ظالموں کو سزا دینا ممکن ہے؟ اگر یہ سارے ظالم سزا سے بچ جائیں تو یہ بڑی اندھیر نگری اور سراسر بے انصافی ہوگی جو کہ عدلِ ایزدی کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف اور ملک یوم الدین کے تقاضے اس وقت پورے ہوسکتے ہیں جب ذرہ ذرہ کا محاسبہ ہو، اور ہر نیک و بد کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے، اور جزا و سزا کے قانون پر مکمل عمل ہو۔ یہ دنیا دار العمل ہے دار الجزاء نہیں، جبکہ آخرت دار الجزاء ہے دار العمل نہیں، اللہ ربّ العزّت کے مکمل عدل و انصاف کا ظہور و تجلی قیامت کے روز ہوگا جبکہ مکلف انسان تو کیا غیر مکلف جانوروں کا بھی پورا پورا محاسبہ ہوگا۔

﴿وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾ جب صحیفے اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے، انسان خواہ کسی قسم کا ہو مؤمن ہو یا کافر، دنیا کے شناختی کارڈ کی طرح اس کا عمل نامہ ہوتا ہے، چھوٹے ادنیٰ عمل (اگرچہ ایک اشارہ ہو) سے لے کر بڑے اعمال تک اس کے صحیفے میں لکھے جاتے ہیں، اور جب وہ مرجائے گا تو اس کے عمل کے صحیفے کو لپیٹ دیا جائے گا اور داخلِ دفتر کردیا جائے گا۔ مؤمنین کے صحیفے علیین میں، اور کافروں کے سجین میں رکھ دیئے جائیں گے، جب قیامت قائم ہوگی تو وہاں سے نکلیں گے اور ہر شخص کا صحیفہ اس کے گلے کا ہار ہوگا جسے خواندہ ناخواندہ سب پڑھ سکیں گے، ارشاد فرمایا: ﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ [الإسراء: ۱۴] (اور ہر شخص کا انجام ہم نے اس کے اپنے گلے میں چمٹا دیا ہے۔ اور قیامت کے دن ہم اعمال نامہ ایک تحریر کی شکل میں نکال کر اس کے سامنے کریں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھیں گے۔ (اور کہا جائے گا کہ:) لو پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہو)۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس صحیفے سے مراد پروانۂ جنت و دوزخ ہے کہ حساب و کتاب کے بعد جنتیوں کو جنت کا پروانہ دائیں ہاتھوں میں جنت کے داخلہ کے وقت، اور دوزخیوں کا پروانہ بائیں ہاتھ میں جہنم کے داخلہ کے وقت جاری کیا جائے گا۔ واللہ اعلم

﴿وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ﴾ جب آسمان کی کھال اتار دی جائے گی۔ کبھی فرمایا: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ [الانشقاق: ۱] (جب آسمان پھٹ پڑے) کبھی فرمایا: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ [الانفطار: ۱] (جب آسمان چِر جائے گا)، کبھی فرمایا: ﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ﴾ [المعارج: ۸] (جس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوجائے گا)، وغیر ذٰلک من الأیات۔

مطلب و مراد سب کا ایک ہی ہے کہ نظامِ سماوی شکست و ریخت کی نذر ہوجائے گا، اور آسمان کلیۃً ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر تباہ ہوجائے گا، یہ سارے تدریجی حالات کا ایک ایک نظارہ ہوگا، جس طرح جانور کی کھال اتارنے کے بعد (یا کسی انسان کے لباس کے) اس کا ہر ہر عضو ظاہر ہوگا، اسی طرح آسمان کی کھال اتارنے کے بعد آسمان سے اوپر کی چیزیں سب نظر آئیں گی اور خفاء کا پردہ بھی ختم ہوجائے گا۔

﴿وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ﴾ جب جہنم کو گرم کرکے بھڑکا دیا جائے گا۔ پہلے فرمایا: ﴿وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ﴾ [الشعراء: ۹۱] (اور جہنم ظاہر کردی جائے گی گمراہوں کے لیے)، مطلب یہ ہے

کہ وہ جنت و دوزخ جو آج آنکھوں سے اوجھل ہیں، اس دن دونوں کا منظر آنکھوں کے سامنے ہوگا، اور مؤمن جنت کا نظارہ کر کے خوش ہوگا، اور دوزخ کا نظارہ کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے گا کہ اس سے نجات دیدی، اور کافر جہنم کو دیکھ کر بڑا پریشان ہوگا، اور جنت کو دیکھ کر اس کی حسرتوں میں اضافہ ہوگا۔ جنتی جنت میں اتنے خوش ہوں گے جتنی خوشی انہوں نے کبھی دنیا میں نہیں دیکھی، اور جہنم سے نجات پر اتنا شکر کریں گے جو دنیا کے تمام شکر گزاریوں پر غالب رہے گا۔ اسی طرح کفار کے غموں اور پریشانیوں کا حال ہوگا کہ جہنم کا غم تمام دنیوی غموں پر غالب رہے گا، بلکہ تمام دنیوی مسرتوں کو بھلائے گا۔ نعوذ باللہ

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ﴾ ہر نفس معلوم کرے گا (جان لے گا) جو اس نے حاضر کیا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ﴾ [الانفطار: ۵] (ہر انسان جان لے گا جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے)۔ اسی طرح: ﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ [آل عمران: ۳۰] (جس دن ہر انسان جان لے گا کہ جو خیر کا عمل اس نے کیا ہے وہ حاضر ہے، اور جان لے گا جو کچھ برا عمل اس نے کیا ہے)۔ آئندہ آیتوں میں صداقتِ قرآن اور حقانیتِ وحی و رسالت کا اثبات و بیان ہے، کافر ان تینوں کے منکر تھے۔

فرمایا: فَلَآ ہرگز نہیں، تمہارا انکار لغو، بے بنیاد اور مبنی بر جہالت ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ
لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ
بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ
رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾ وَمَا
تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: پس میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے (ستاروں) کی ﴿۱۵﴾ جو سیدھے چلنے والے (پھر) رک جانے والے ہیں ﴿۱۶﴾ اور قسم ہے رات کی جب وہ چلی جاتی ہے ﴿۱۷﴾ اور قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے ﴿۱۸﴾

بیشک یہ (قرآن) بڑی عزّت والے قاصد کا کلام ہے ﴿۱۹﴾ بڑی طاقت والا ہے عرش والے (اللہ تعالیٰ) کے نزدیک بڑے مرتبے والا ہے ﴿۲۰﴾ وہاں (عالمِ بالا) پر اس کی بات مانی جاتی ہے، امانتدار ہے ﴿۲۱﴾ اور تمہارے صاحب (جس پر قرآن نازل ہوا ہے) کوئی (معاذ اللہ) دیوانے نہیں ہیں ﴿۲۲﴾ اور تحقیق اس (نبی اکرم ﷺ) نے اس (جبرئیل علیہ السلام) کو کھلے کنارے پر دیکھا ہے ﴿۲۳﴾ اور نہیں ہے وہ (حضور انور ﷺ) غیب کی بات (وحی الٰہی) کے بتلانے پر بخل کرنے والے ﴿۲۴﴾ اور یہ (قرآن) شیطانِ مردود کی بات نہیں ﴿۲۵﴾ پھر تم کدھر جارہے ہو؟ ﴿۲۶﴾ یہ تو تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے ﴿۲۷﴾ جو کوئی تم میں سے سیدھے راستے پر چلنا چاہے ﴿۲۸﴾ تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ربّ ہے ﴿۲۹﴾

معارف ومنازل

﴿الْخُنَّسِ﴾ خانس اور خانسة کی جمع ہے، بمعنی پیچھے ہٹنے والے، واپس آنے والے۔ ﴿الْجَوَارِ﴾ جارية کی جمع ہے بمعنی برابر سیدھے چلنے والے، کشتیوں کو سیدھے چلنے کی بناء پر جوار کہتے ہیں، کقولہ تعالیٰ: ﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ﴾ [الرحمن: ۲۴] (اور اسی کے قبضے میں وہ جہاز ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے کیے گئے ہیں)۔

﴿الْكُنَّسِ﴾ کانس اور کانسة کی جمع ہے، بمعنی رکنا، چھپ جانا، اور ایک جگہ ٹھہرنا، یہ تینوں صفات ستاروں کی ہیں۔ اکثر مفسرین میں سے کسی نے بھی ان صفات کو فرشتوں یا ہواؤں پر منطبق نہیں کیا، پس ان تینوں صفات کا اطلاق مخصوص پانچ قسم کے ستاروں پر ہوگا، ''یعنی زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد''۔ اہل ہیئت انہیں خمسہ متحیرہ کہتے ہیں۔ ان سیاروں کی چال عام طور پر مغرب سے مشرق کی جانب ہوتی ہے، چلتے چلتے جب سورج کے قریب آتے ہیں تو رک جاتے ہیں، چھپ جاتے ہیں اور نظروں سے غائب ہوجاتے ہیں، پھر ان کی چال (واپسی) مشرق سے مغرب کی جانب شروع ہوتی ہے، گویا ان کا نظام ہی ایسا مقرر ہے کہ آگے جانا، پھر رک جانا، پھر واپس ہونا۔

بعض مفسرین نے ان تینوں چالوں والے ستاروں سے مراد تمام کواکب اور ستارے بتائے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ تینوں صفات تمام ستاروں کی ہیں، وہ چھپ بھی جاتے ہیں اور مختلف مداروں میں آگے پیچھے حرکت بھی کرتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ [یٰس: ۴۰] (اور سب مدار میں تیر رہے ہیں)۔ اور یہ بات موجودہ

سائنسدانوں کی رائے کے مطابق ہے، جو سیاروں کو متحرک مانتے ہیں اور آسمانوں سے بہت نیچے مانتے ہیں۔ بخلاف یونانی قدیم فلسفہ والوں کے کہ وہ ستاروں کو کیل کی طرح آسمان میں پیوست اور جڑے ہوئے مانتے ہیں، جبکہ وہ آسمان کو متحرک اور کواکب کو ساکن مانتے ہیں۔ یہ مسئلہ تفصیلاً پہلے سورۃ الملک میں بیان ہوا، وہاں دیکھا جائے۔

چونکہ ان آیتوں میں صداقت وحقانیتِ قرآن کریم کے بیان کے ساتھ وحی الٰہی اور وحی لانے والے فرشتہ جبریل علیہ السلام اور جس ذات عالی صفات سید العٰلمین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (موحی إلیه) کی دیانت وامانت اور عند اللہ تعالیٰ ان کی شان وعظمت کا اظہار وبیان ہے، اسی لئے ان سیاروں پر قسم کھا کر اس مضمون کو مبرہن ومدلل بیان فرمایا، کیونکہ قرآنی قسموں میں مقسم بہ کو بطور دلیل وگواہ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی خواب نہیں دیکھا جس کے ذریعہ اسے قرآن ملا۔ (حالانکہ قرآن کا نزول دفعۃً نہیں بلکہ تدریجاً ہے) بلکہ جب ستارے چھپ گئے تھے اور رات رخصت ہوگئی تھی، ﴿عَسْعَسَ﴾ دونوں معنوں پر بولا جاتا ہے، رات کا آنا اور جانا۔ [مظهري] اور صبح خوب واضح روشن ہوگئی تھی، اس وقت:

﴿بِالْأُفُقِ الْمُبِيْنِ﴾ کھلے آسمان کے کنارہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امانتدار فرشتہ کو بیداری میں دیکھا تھا، اس لئے وہ جو کچھ بیان کر رہا ہے یہ سارے چشم دید اور سنے ہوئے واقعات ہیں جو انہوں نے فرشتہ سے اخذ کئے، اور فرشتہ رسول ہیں، امانتدار، قابلِ احترام، اور برگزیدہ ہیں، محض ترجمان اور تعبیر کنندہ نہیں، جو کچھ ربّ ذوالجلال عزّ شانہ سے اخذ کرتا ہے بغیر کمی بیشی کے الفاظ ومعانی دونوں کی رعایت وپابندی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ تو وحی ان صفات ومعانی کے ساتھ ہر جہت وپہلو سے کامل بھی ہے اور اعلیٰ درجے کی یقینی اور پختہ بھی، ساتھ ساتھ یہ فرشتہ مطاع وامین بھی ہے، وہ جب پیغام وحی لے کر اترتا ہے تو اکیلا نہیں ہوتا، ایک پوری فوج کو ساتھ لے کر آتا ہے، اور اتنا مضبوط، قوی اور طاقتور بھی ہے کہ کوئی شیطانی جھتہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔ یہ وہی فرشتہ ہے جس نے قومِ لوط کی بارہ بستیوں کو مع جبال وشہروں کے چھ سو پروں میں سے ایک پَر پر اٹھایا اور آسمان تک لہرایا، پھر الٹا کر کے زمین پر دے مارا، اور کہنے لگے کہ اس پوری آبادی کو ایک مچھر جتنا ہلکا خیال کیا اور سمجھا۔

ان قسموں کی مناسبت آئندہ معانی ومطالب کے ساتھ یہ ہے کہ ان ستاروں کا چلنا پھرنا، چھپ جانا اور غائب ہونا، ایک نمونہ وتمثیل ہے، پھر صبح کی روشنی کی آمد اور اس کے نور کا تمام کائنات کے گوشوں، صحراؤں، جنگلوں اور دریاؤں پر پھیل جانا یہ بھی ایک نمونہ ومثال ہے۔ اول مثال انبیاء کرام علیہم السلام کی ہے، وہ مسلسل تاروں کی مانند تشریف

لاتے رہے اور غائب ہوتے گئے، ان کی تعلیمات سے دنیا خالی ہوگئی اور رات سے مراد وہ تاریک دور ہے، جہاں حضرت خاتم المرسلین ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے جو دنیا پر گزرا کہ چاروں طرف ظلم وزیادتی اور تاریکیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا، حق وباطل کی پہچان در کنار، شرک وکفر ودیگر تمام حیاسوز اعمال واقدار کا عروج رہا، یہی دور معصوم بچیوں کے زندہ درگور کرنے کا رہا، پھر آخر میں آفتاب عالمتاب سورج کی طلوع وروشنی کا دور آیا اور خوب واضح روشنی چار دانگ عالم کے کونے کونے اور ہر گوشے پر نمودار ہوئی، جو قیامت تک سارا جہاں اس کے نور وبرکات سے منور رہے گا۔ صاحب قصیدہ بردہ نے کہا:

فانه شمسٌ فَضلٍ هم كَوَاكبها	★	يُظهرن انوارها للناس فى الظلم
حتىٰ اذا طلعت فى الكون عمّ هُداها	★	الغلمين واَحيَتْ سائر الاُمَم

سارے انبیاء کرام علیہم السلام درخشندہ روشن تارے ہیں، اور حضرت محمد ﷺ کی مثال آفتاب عالمتاب سورج کی ہے، جنہوں نے کائنات کی تمام تاریکیوں کو ہمیشہ کے لئے نورِ قرآن اور وحی سے ختم کر کے رکھ دیا۔

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ حضرت جبریل علیہ السلام کی چھ صفات بیان ہوئیں، ہر صفت اپنے اندر گہرے مطالب ومعانی کا وہ خزانہ رکھتی ہے جس کی مثال نہ ہو۔ وہ رسول ہے، کریم ہے، طاقتور وقوت والا ہے، حضرت باری تعالیٰ کے نزدیک صاحب قدر ومنزلت اور پسندیدہ ہے، تمام آسمانی فرشتے اس کے فرمانبردار اور وہ سب کا سردار ہے، اور نہایت امانتدار وامین ہے۔

كَرِيْمٍ کی صفت اتنی جامع ہے کہ اس میں چھ عمدہ صفات مندرج ہیں، یعنی نہایت شریف، متقی، پرہیزگار، صاحب اخلاقِ حسنہ، سخی ومہربان، صاحب علم ومعرفت وحافظہ، دور اندیش، اور عقلمند۔ اس کے علاوہ باقی صفاتِ عالیہ جو اس میں ہیں وہ سونے پر سہاگہ کی مثال ہوں گی۔ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے کمالات وصفات ومزایا اتنے بے شمار ہیں کہ کوئی انہیں سپردِ قلم کرنے پر قادر نہیں، پس قرآن حکیم کی حقانیت وعظمت کی سرحدوں پر پہنچنا کسی کی مجال نہیں۔ بقول حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ یہ سلسلہ اول سے آخر تک اوپر سے نیچے تک صاف ستھرا پاکیزہ اور کامل ومکمل ہی ہے۔

﴿لَقَوْلُ رَسُوْلٍ﴾ اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن پاک حضور انور ﷺ یا جبریل امین علیہ السلام کا قول ہے، ظاہر ہے کہ یہ مبارک قول اولاً وبالذات اللہ ربّ العزّت ہی کا ہے، جبریل علیہ السلام واسطہ ہے، تو مجازاً قول اس کی طرف

منسوب ہوا۔ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ☆ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(سعدی)

اصل قول اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، تکلم اور ابلاغ کی نسبت رسول کی طرف ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو دو مرتبہ اس کی اصل صورت میں دیکھا، اس کے چھ سو بازو یعنی پر تھے، اور وہ پورے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ [بخاري، مسلم، ترمذي، مسند أحمد وغيرها]

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ یہاں تک حضرت جبریل علیہ السلام کی صفات ستہ بیان ہوئیں، مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کے پاس سے جو ہم تک پہنچا اس میں دو واسطے ہیں: ایک وحی لانے والا فرشتہ جبریل علیہ السلام، اور دوسرا پیغمبر عربی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم، دونوں کی صفات وہ ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد کسی طرح کا شک وشبہ قرآن کے صادق اور منزل من اللہ ہونے میں نہیں رہتا، کسی روایت کی صحت تسلیم کرنے کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ راوی وہ ہوتا ہے جو اعلیٰ درجہ کا ثقہ، عادل، ضابط، عاقل، حافظ اور امانتدار ہو، اور جس سے روایت کرے اس کے پاس عزّت ورحمت کے ساتھ رہتا ہو، بڑے بڑے معتبر ثقات اس کی امانت وغیرہ پر اعتماد کلّی رکھتے ہوں، اور اسی لئے اس کی بات بے چوں وچرا مانتے ہوں، یہ تمام صفات حضرت جبریل علیہ السلام میں موجود ہیں۔

وہ کریم (عزّت والے) ہیں جن کے لیے اعلیٰ متقی اور نہایت پاکباز ہونا لازم ہے، ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ اور حدیث میں ہے: "الكرم التقوىٰ"۔ بڑی قوت والے ہیں، جس میں اشارہ ہے کہ حفظ وضبط اور بیان کی قوت بھی کامل ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بڑا درجہ ہے، سب فرشتوں سے زیادہ بارگاہِ ربوبیت میں قرب اور رسائی حاصل ہے، آسمانوں کے فرشتے ان کی بات مانتے ہیں، اور ان کا حکم تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ ان کے امین اور معتبر ہونے میں کسی کو شبہ نہیں، یہ تو رسول ملکی جبریل علیہ السلام کا حال تھا، جنہیں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت قریب سے اپنی آنکھوں سے دیکھے جیسے کہ ابتداء وحی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی اصلی صورت میں ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا، جو آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پورا خلا اس کے وجود سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا، اور اس

کے چھ سو بازو (پر) تھے۔ دوسری بار حضرت جبریل علیہ السلام کو اس کی اصلی صورت میں ساتوں آسمانوں سے اوپر لیلۃ المعراج کے موقع پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا۔ [تفسیر عثماني]

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ﴾ اس سے مراد یہی رؤیت جبریل علیہ السلام مراد ہے، جیسے سورۃ النجم میں مذکور ہے: ﴿وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى﴾ [النجم:٧] (وہ بلند کنارہ پر تھے)۔ ﴿لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن جبریل علیہ السلام کا قول ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام وحی لانے والے، بولنے والے اور القاء کرنے والے ہیں، یہ وحی صرف رب العزت کا قول اور فرمان ہے، اور یہ نسبت مجازی ہے۔

ع گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ ز حلقوم عبد اللہ بود

اب دوم واسطہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی صفات کا بیان فرمایا:

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ یہ تمہارے ساتھی دیوانہ نہیں، کیونکہ بعثت و نبوت سے پہلے چالیس سال تک وہ تمہارے اور تم ان کے ساتھ رہے، اتنی طویل مدت تک ان کے تمام کھلے چھپے احوال کا تم نے مشاہدہ کیا اور تم ہی تو تھے کہ ان کی عقلمندی کا ہر وقت اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے تھے، اور ان کی امانتداریوں سے متاثر ہو کر ان کو امین کے نام سے یاد کرتے تھے، اور ساری امانتوں کو ان کے سپرد کرتے رہتے تھے۔

اور جب انہوں نے تعمیر کعبۃ اللہ کے موقع پر تمہیں ایک بڑے جنگ وجدال سے بچایا، تو تم سب ان کی عقل و دانش پر فخر کرتے رہے، تم نے کبھی ایک مرتبہ ان میں جھوٹ، فریب اور دیوانہ پن کی بات نہ دیکھی، ہمیشہ ان کے صدق و امانت اور عقل و دانائی کے معترف رہے، اب بلا وجہ اسے مجنون و دیوانہ اور دیگر القاب سے کیونکر یاد کرتے ہو، اور یہ تمہاری دیوانگی اور جنون و ناعاقبت اندیشی کے سوا کچھ نہیں۔

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ﴾ پھر جو پاکباز متقی فرشتہ جبریل علیہ السلام ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام وحی لے کر آتے ہیں، وہ بھی ان کا جانا پہچانا، انہوں نے دن کی روشنی میں آسمان کے افق پر ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس لئے انہیں اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جسے مکرم و معزز فرشتہ جبریل علیہ السلام جنہیں وہ اچھی طرح پہچانتے ہیں لے کر ان پر نازل ہوئے۔ سورۃ النجم میں اس کی پوری تفصیل گزر چکی ہے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ﴾ یہ پیغمبر ہر قسم کے غیوب کی خبر دیتا ہے، ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل

سے، یا پھر اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے، یا احکامِ شرعیہ سے یا مذاہب کی حقیقت و بطلان سے، یا جنت اور دوزخ کے احوال سے، یا واقعات بعد الموت سے، اور ان چیزوں کے بتلانے میں ذرا بھی بخل نہیں کرتے، نہ اجرت مانگتے ہیں، نہ نذرانہ، نہ بخشش، پھر کاہن کا لقب اس پر کیسے چسپاں ہوسکتا ہے؟ کاہن محض ایک جزوی اور نامکمل بات غیب کی اس میں سو جھوٹ ملا کر بیان کرتا ہے، اور اس کے بتلانے میں بھی اس قدر بخیل ہوتا ہے کہ بغیر مٹھائی اور نذر و نیاز وغیرہ وصول کئے ایک حرف زبان سے نہیں نکالتا۔

پیغمبروں علیہم السلام کی سیرت سے کاہنوں کی پوزیشن کو کیا نسبت؟ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ﴾ [ص:٨٦] (آپ کہہ دیں: کہ اس پر تم سے کوئی مزدوری طلب نہیں کرتا)۔ اسی طرح فرمایا: ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ [القلم:٤٦] (کیا آپ ان سے کوئی مزدوری طلب کرتے ہیں کہ وہ تاوان کی وجہ سے ناراض ہیں؟)۔ پیغمبروں علیہم السلام کی دعوت عام ہوتی ہے، وہ اتنے بڑے سخی اور جواد ہوتے ہیں کہ ان کا دینی و شرعی دسترخوان رات دن بچھا ہوا ہوتا ہے، جتنے غیبی خزانے ان کے سپرد ہوتے ہیں وہ سارے لوگوں پر تقسیم ہوتے ہیں، ان کی سخاوت ہر اعتبار سے ضرب المثل اور بے مثال ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ دینی و شرعی مسائل ہو یا دنیوی مال و متاع کی بخشش و تقسیم ہو، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں محاذوں پر اتنے سخی اور جواد واقع ہوئے تھے کہ کوئی اولادِ آدم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برابر نہیں ہوسکتی۔ [بخاري]

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ﴾ اور یہ قرآن کسی شیطان مردود کا قول نہیں۔ قرآن کریم توحید و ایمان، اعمالِ حسنہ، صدق و دیانت کی تعلیم ہے، شرک، کفر، برائی، بے حیائی اور تمام گندے اعمال سے اجتناب کا حکم دیتا ہے، شیطان کو کیا پڑی ہے کہ وہ لوگوں کو نیکیوں کا راستہ بتائے اور اپنا خانہ خراب کر کے شرک و معاصی سے اجتناب کی تبلیغ کرے، بلکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو کچھ تم سوچتے اور چاہتے ہو شیطان اس کی حمایت کرے، تم شیطان کی دوستی کرتے ہوئے اس کی توہین کرتے ہو کہ وہ اچھے کاموں کی تائید کرے، بھلا یہ شیطان کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟

﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ﴾ تم کدھر جارہے ہو؟ جب جھوٹ، دیوانگی، تخیل، توہم اور کہانت وغیرہ کے سارے احتمالات ختم ہوگئے، اور نبوت کی صدق و صفائی اور قرآن کی حقانیت و صداقت روزِ روشن کی طرح نکھر کر صاف واضح ہوئی تو پھر اس چشمۂ صافی کو چھوڑ کر ایک بے بنیاد سراب کی طرف بھاگ کر جانا کہاں کی دانشمندی ہے؟ اس نورِ ہدایت کی تابانیوں اور برکات سے منہ موڑ کر گمراہیوں اور تاریکیوں میں بھٹکتے رہنا تمہارے لئے موزوں نہیں۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ نہیں ہے یہ قرآن مگر نصیحت وتذکرہ ہے سارے جہانوں کے لیے۔اگر کوئی قرآن کریم کی تعلیمات وہدایات اور اس کے مضامین واحکام میں تدبر وغور کرے تو وہ یقین کرے گا کہ یہ سارے جہان کے لیے ایک سچا اور مکمل دستور العمل ہے جس میں فلاحِ دارین کے تمام اسباب ووسائل پوشیدہ ہیں،اور یہ قرآن تمام روحانی بیماریوں کے لیے مکمل علاج واکسیرِ اعظم ہے۔

﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ﴾ مگر ہدایت وہی پاتا ہے جو تم میں سیدھی راہ پر چلنا چاہتا ہے،اللہ تعالیٰ کی مشیئت ان لوگوں کو سینے سے لگاتی ہے جو ہدایت کے طالب رہتے ہیں،اور اپنی چاہتوں کو اس پاک ذات کی مشیئت پر قربان کرتے ہیں۔فارسی مصرع اسی مضمون کا پیغام ہے: ؎

ع تا نگرید طفل کے جوشد لبن

بچہ جب رونے لگتا ہے تب ماں اس کو دودھ پلاتی ہے،ورنہ نہیں۔دین میں جب اکراہ نہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ جو شخص خود ہدایت پر آمادہ نہ ہو،بدون آمادگی وطلب کے اللہ تعالیٰ اسے کیسے ہدایت وایمان نصیب کرے؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو سب سے زیادہ اس کا حقدار ابو طالب ہوتا جس نے زندگی بھر حضور ﷺ کی بے مثال حمایت وخدمت کی،مگر جب اس کی چاہت اور طلب سامنے نہیں آئی تو محروم ہوگیا۔تو مطلب یہ ہوا کہ توفیقِ الٰہی شرط اور ضروری ہے مگر توفیق کا حصول طلب وانقیاد اور توجہ صادق کے بغیر ممکن نہیں،اور یہی مطلب ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا،کہ قران کریم سے ہدایت حاصل کرنا مشئیت ایزدی پر موقوف ہے،اور مشئیت کا تعلق استعداد ورغبت کے ساتھ ہے،جہاں پر استعداد وطلب ذوق ورغبت نہ ہو تو وہاں مشئیت کیونکر متعلق ہو؟

عجیب بات ہے کہ دنیوی امور اور معاشرتی ومعاشی معاملات کے بارے میں مسلم اور غیر مسلم سب سنجیدہ ہیں،مگر دینی امور اور آخرت کے بارے میں اتنی بیداری وسنجیدگی نہیں،اس کی وجہ اولاً تو یہ ہے کہ آخرت پر یقین نہیں، دوم وجہ یہ کہ اگر دیکھا جائے تو مٹھی بھر مسلمانوں کو یقین ضرور ہے،مگر کثرت معاصی اور غفلت نے ان کے دلوں کو سیاہ کیا ہوا ہے،اور یہی چیز اکثریت کے لئے دشوار ہے۔

سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ

مكية آياتها ۱۹ ركوعها ۱

سورۂ انفطار مکی ہے، اس میں انیس (۱۹) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

پہلی آیت کے کلمہ انْفَطَرَتْ سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اور سورۃ النازعات کے بعد مکہ میں نازل ہوئی۔

تعداد آیات وکلمات:

یہ سورت انیس (۱۹) آیتوں ہیں، اسی (۸۰) کلمات اور تین سوانتیس (۳۲۹) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ "سورۃ التکویر" کی طرح سورۃ الانفطار کا بھی مرکزی موضوع توحید اور قیامت کا اثبات و بیان ہے، اور قیامت کے احوال کا اور اس کی ہولنا کیوں کا تذکرہ ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت میں قیامت اور اس کی ہولنا کیوں کا بیان ہے کہ روزِ قیامت ہر شخص کے اعمال کا پردہ چاک ہوجائے گا، اور مجرمین کو اپنے اعمال اور کارناموں کا اچھی طرح پتہ چل جائے گا۔ پھر انسان سے کہا جارہا ہے کہ اے

ناشکرا انسان! احسانِ الٰہی کا ناقدرشناس و منکر! تو اپنے ربّ کریم کی کیونکر ناشکری کرتا ہے؟ جس نے تجھے ظاہری و باطنی ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے، تیرے اعمال تمام کے تمام کرام کاتبین کے ہاتھوں لکھے ہوئے ہمارے پاس محفوظ و مکتوب ہیں، اس پختہ ریکارڈ کے مطابق روزِ قیامت تیرا فیصلہ ہوگا، اور تجھے ناشکری اور احسان فراموشی کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا الۡقُبُوۡرُ
بُعۡثِرَتۡ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ؕ﴿۵﴾ یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الۡکَرِیۡمِ ۙ﴿۶﴾
الَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ۙ﴿۷﴾ فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ؕ﴿۸﴾ کَلَّا بَلۡ تُکَذِّبُوۡنَ بِالدِّیۡنِ ۙ﴿۹﴾
وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ﴿ۙ۱۰﴾ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: جب آسمان پھٹ جائے گا﴿۱﴾ اور جب تارے بکھر جائیں گے﴿۲﴾ اور جب دریا بہہ (کر ایک دوسرے سے مل) جائیں گے﴿۳﴾ اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی﴿۴﴾ تب ہر شخص معلوم کرلے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا تھا اور پیچھے کیا چھوڑا تھا﴿۵﴾ اے انسان! تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکا دیا؟﴿۶﴾ (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضا کو) ٹھیک کیا، اور (تیرے قامت کو) معتدل رکھا﴿۷﴾ اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا﴿۸﴾ مگر ہیہات! تم لوگ جزا کو جھٹلاتے ہو﴿۹﴾ حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں﴿۱۰﴾ عالی قدر (تمہاری باتوں کے) لکھنے والے﴿۱۱﴾ جو تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں﴿۱۲﴾

معارف و منازل

وقوعِ قیامت کی کیفیت:

گزشتہ سورت میں: ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ﴾ [التکویر: ۱۱] (جب آسمان کی کھال اتار دی جائے گی) مذکور ہوئی، سورۃ الانشقاق میں ہے: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ﴾ مطلب سب کا ایک ہی ہے کہ آسمان پر تباہی آئے

گی۔ وہاں ﴿وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ﴾ [التکویر: ۲] (جب ستارے بکھر جائیں گے، بے نور ہو جائیں گے) اور یہاں ﴿وَاِذَا الۡكَوَاكِبُ انۡتَثَرَتۡ﴾ کا بھی ایک ہی مطلب ہے کہ ستارے ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔ یہ سب کچھ قیامت کے دن نفخہ اولیٰ کے ساتھ ہوگا۔

قیامت کی ہولناکیوں کی کیفیت بتائی جا رہی ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا، اس میں شگاف، دراڑیں، اور سوراخ نمودار ہو جائیں گے، ستارے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے، سمندر جو آج ساکن و خاموش ہے، وہ بہنا شروع کریں گے، وہ غیر مرئی بند (برزخ) جو ایک سمندر کو دوسرے سمندر میں آج خلط ملط نہیں ہونے دیتے، وہ ٹوٹ جائیں گے، پس سارے دریا شیرین و شور آپس میں یکجان ہو کر مل جائیں گے، اور چاند و سورج سمندروں میں پھینک دیئے جائیں گے، ان میں آگ لگ جائے گی، تب فناء ہو کر خشک ہو جائیں گے۔

قبروں کو نفخۂ دوم کے ساتھ الٹ پلٹ زیر وزبر کر کے ان میں جو لوگ دفن ہیں وہ باہر نکل آئیں گے، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوۡرِ فَاِذَا هُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمۡ يَنۡسِلُوۡنَ﴾ [یس: ۵۱] (اور (جس وقت) صور پھونکا جائے گا، یہ قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف دوڑ پڑیں گے)۔ اور اسی طرح: ﴿يَوۡمَ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمۡ اِلٰى نُصُبٍ يُّوۡفِضُوۡنَ﴾ [المعارج: ۴۳] (اس دن یہ قبر سے نکل کر اس طرح دوڑیں گے جیسے (شکاری) شکار کے جال کی طرف دوڑتے ہیں)۔ اس وقت انسان پر اس کے نیک و بداعمال کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی، اعمال نامے وصحیفے کھولے جائیں گے، حساب و کتاب شروع ہو جائے گا۔

﴿مَاقَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ﴾ سے کیا مراد ہے؟

﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاقَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ﴾ اس کا اور ماقبل سورت میں: ﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّآ اَحۡضَرَتۡ﴾ [التکویر: ۱۴] (انسان جان لے گا جو کچھ اس نے حاضر کیا ہے) دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔

﴿مَاقَدَّمَتۡ﴾ میں وہ سارے نیک وبداعمال مراد ہیں جو زندگی میں کر کے آخرت کے لئے ذخیرہ کے طور پر آگے بھیجا۔ ﴿وَاَخَّرَتۡ﴾ میں وہ تمام باقیات صالحات داخل ہیں، جن کو پیچھے چھوڑ گئے، اولاد صالح کی دعا واستغفار، مساجد، مدارس، مسافر خانے، تالیف وتصنیف، شاگرد ومرید وغیرہ، جیسے کہ حدیث پاک میں ہے کہ انسان کی موت کے ساتھ سارے اعمال منقطع اور موقوف ہو جائیں گے سوائے ان باقیات صالحات کے کہ جن کا سلسلہ پیچھے جاری رہے گا۔ اسی طرح کفار اور بدکار لوگ اپنی برائی وبدعملی سب پائیں گے، اور وہ سب کچھ پائیں گے جو آگے بھیجا تھا،

اور دوسرے وہ اعمالِ شر جو پیچھے چھوڑ گئے تھے وہ بھی اَخَّرَتْ میں داخل ہیں، مثلاً شراب خانہ، سینما گھر، گناہوں کے دوسرے اڈے وبقیّات شروغیرہ، کیونکہ جو نیکی یا بدی پیچھے رہ جائیں گی ان کا اجر وثواب، اسی طرح سزا وعقاب برزخ میں بھی مسلسل جاری رہے گا، اور روزِ قیامت پھر سب کا ایک جا ثواب وعقاب ظاہر ہوگا۔ واللہ اعلم

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾ (اے آدمی! تجھے کس چیز نے فریب دیا اپنے کرم والے ربّ سے؟)۔ قرآن کریم کا عمومی طریقہ بیان چونکہ انتہائی ناصحانہ اور مشفقانہ ہے، وہ جس پیار ومحبت سے کوئی حکم اگر دیتا ہے تو ساتھ ہی اس حکم کو آسان کرنے کے لیے چند عظیم اور غریب و پر منفعت، مخصوص نعمتوں کو ذکر کرتا ہے جنہیں دیکھ کر ایک سنجیدہ اور عقلمند انسان اپنے اندر کمی محسوس کرتا ہے اور ندامت وشرمندگی کو مٹانے کے لیے فوراً اس حکم پر عمل شروع کرتا ہے، اور شرمندۂ احسان ہو کر مکمل اطاعت کی تیاری کرتا ہے، تو یہاں بھی غور فرمائیے! کتنے پیارے انداز میں غافل انسان کو جھنجھوڑا جا رہا ہے؟ کس محبت بھرے اسلوب سے اس کو خواب غفلت سے جگایا جا رہا ہے؟

انسان کی تخلیق میں ربّ الجلیل کے انعامات:

ارشاد ہے: اے انسان! تیرا ربّ جو کریم ہے جس نے تمہیں عدم سے وجود، پھر نطفہ سے علقہ، پھر علقہ سے مضغہ کے مراحل اور بیش قیمت اعضاء کی تیاری، عقل وفہم بصارت، سماعت، گویائی، سونگھائی، صحت وتوانائی، جس کے اندر محیر العقول نظام واعتدالِ عناصر وغیرہ تمام نعمتیں مفت بلا قیمت عطا کیں، پھر اس کے لطف وکرم وعنایتوں کی آغوش میں تم پل کر جوان ہوئے، جس کے انعام واحسان کا دسترخوان ہر وقت تیرے لئے بچھا ہوا ہے، جس کی بے شمار رحمتوں کے دروازے تیرے لئے کشادہ ہیں، پھر تیرے ربّ کریم نے تجھے شکل وصورت، قد وقامت، عقلی وذہنی قوتوں، قلبی وروحانی، بہترین صلاحیتوں سے متصف کر کے پیدا فرمایا۔

اگر انسان کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ صوری اور معنوی حسن وخوبصورتی اور علم وکمال میں کوئی چیز بھی انسان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی، اگر ان کی قیمت حیوان، زور آور جانور، درندے، چرندے، پرندے، ہوائی اور آبی مخلوقات سب کی سب انسان کے سامنے سرافگندہ ہیں اور لگتا ہے کہ یہ انسان سب کا حاکم وسردار ہے، مجال نہیں کہ کوئی اس کے حکم سے سرتابی کرے، اگر انڈیل ہاتھی سے ایک فیل بان جس طرح چاہتا ہے کام لیتا ہے اور چھ سات سال کا بچہ اونٹوں کی قطار کو جدھر چاہتا ہے لے کر چلا جاتا ہے، شوخ وشنگ، برق رفتار گھوڑے پر جب سوار ہوتا ہے تو اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتا ہے، اسے دوڑاتا ہے، کبھی جنگل کا

بادشاہ، جری و غیرت مند، یعنی ببر شیر بھی اس کے پنجرے میں بند و محبوس قیدی نظر آتا ہے۔

ہر جانور اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے اپنا سر زمین پر جھکاتا ہے، مگر انسان اس طرح نہیں، وہ اپنا لقمہ ہاتھ میں اٹھا کر بڑے اعزاز کے ساتھ تناول کرتا ہے، وہ ہر قسم کے جھکاؤ سے مستثنیٰ ہے، مگر اس کا نہایت فاضلانہ اعزاز واکرام صرف اسی میں رکھا ہوا ہے کہ اپنے منعم و محسن حقیقی ربّ کریم کے حضور سر جھکائے اور ابدی سعادتوں تک رسائی حاصل کرے۔

تو قرآن کریم انہی اقدار کے تحت پیارے اسلوب اور نہایت مشفقانہ انداز میں انسان کو خطاب کا اعزاز دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے انسان! تجھے اپنے ربّ کریم سے کس نے بیگانہ کیا؟ اور وہ کونسی چیز ہے جس نے تجھے ربّ کریم سے غافل، غرہ اور لاپرواہ بنادیا؟ تم نے کس عیار و مکار کے دام فریب میں پھنس کر اپنے ربّ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا؟

تم شریف اور اشرف المخلوقات ہو، شریف بڑے قدردان ہوتے ہیں، ایک ادنیٰ احسان کے بدلے سالوں اور عمر بھر محسن کے شکر گزار رہتے ہیں، یہ احسان فراموشی اور احسان کے بدلے بغاوت و سرکشی، شرفاء کی شایان شان نہیں، اگر آپ ذرا عقل و دانش سے کام لوگے تو تجھے تیرا نفس و ضمیر ہرگز اس کی اجازت نہیں دے گا کہ کروڑوں نعمتوں کی بخشش کرنے والے ربّ سے بلاوجہ تم غافل و دور رہے۔

اگر ربّ کریم تجھ پر یہ گونا گون نعمتوں کی بارش نہ کرتا، اگر وہ تجھے پیدا ہی نہ کرتا، یا تیری شکل و صورت کو بگاڑ دیتا، یا تیرے عناصر ترکیبی میں اعتدال کو ملحوظ نہ رکھتا، تو ذرا بتاؤ اور انصاف سے کام لے کر بتاؤ کہ تو اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟ کیا اس سے اس کی عظمت و کبریائی میں کوئی فتور پیدا ہوجاتا ہے؟ ہرگز نہیں، پھر دیکھو! اس کے یہ ظاہری و باطنی، بے شمار انعامات اور حد سے بڑھ کر احسانات کا تقاضا یہ نہیں کہ تم ہر وقت اس کے حضور سر بسجود رہو، اور اس کی وحدانیت کا گیت گاؤ؟ لیکن یہ تو ہی تو ہے کہ اس سے غافل ہے، اور اس کے ذکر اور شکر کی تجھے فرصت نہیں ملتی، اور اس کی اطاعت تیرے لئے بارِ گراں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جب اس آیت کی تلاوت کرتے، تو فرماتے: غرّني کرمک (آپ کے لطف و کرم نے مجھے غافل و غرہ بنادیا)۔

اللہ تعالیٰ کا حلم و کرم دوسری صفات کی طرح غیر متناہی ہے، عام معاصی تو کیا، شرک و کفر جیسے گناہوں پر مسلسل درگزر کرتا رہتا ہے، جلدی پکڑتا نہیں، کیونکہ یہ اس کی شان کے خلاف ہے، اگر وہ معاصی و کفر وغیرہ پر متواتر پکڑتا

شروع کرے تو قیامت وقتِ موعود سے پہلے شاید قائم ہوجاتی، اور دنیا میں انسان وقت سے پہلے ختم ہوجاتا، اور یہ اس کی مرضی کے برعکس ہوتا، کیونکہ گناہگار سوائے چند ہستیوں کے سب ہی تو ہیں، مگر وہ ہر مجرم کو ڈھیل دیتا ہے، بہت دیر کے بعد مضبوط پکڑتا ہے، اور یہ بھی محدود مقدار میں، تو اسی چیز نے سب کو معاصی پر دلیر بنایا ہوا ہے۔ ؎

تو مشو مغرور بر حلم خدا ☆ دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

لطف حق با تو مواسا میکند ☆ چون تو از حد بگزری رسوا کند

﴿كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ﴾ (مگر ہیہات! تم لوگ جزا کو جھٹلاتے ہو) اس مذکورہ آیت میں اُس اصلی سبب کا ذکر ہو رہا ہے جس نے انسان کو غافل اور غرہ بنایا ہوا ہے، تو فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ تجھے روزِ جزا پر یقین نہیں، اگر تجھے یہ یقین ہوتا کہ ایک دن وہ آنے والا ہے، جہاں تو اپنے خالق ربّ کریم کے روبرو پیش ہونے والا ہے اور تجھ سے تیرے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا، تو تم بغاوت وسرکشی ہرگز اختیار نہ کرتا، اور تیری بے راہ روی اور غفلت کی یہ کیفیت نہ ہوتی۔ ذمہ داریوں کا احساس اور جواب دہی کا خوف تجھے شترِ بے مہار کی طرح زندگی بسر کرنے کی ہرگز اجازت نہ دیتا، ہر کام کرنے سے پہلے ہر بات بولنے سے پہلے تو یہ سوچتا اور بار بار سوچتا کہ ایسا کرنے اور بولنے سے مجھے اپنے پروردگار کے روبرو شرمندگی تو نہ ہوگی۔

﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (اور بیشک تم پر کچھ نگراں مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں) شاید تم نے سوچا ہوگا کہ یہی حیاتِ دنیوی ہے، اس کے بعد نہ زندگی ہے، نہ قیامت اور نہ کوئی حساب وکتاب۔ کفار کہتے تھے: ﴿اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ﴾ [المؤمنون: ۳۹] (بس ہماری یہی دنیا والی زندگی ہے، ہم مریں گے اور جئیں گے، اور ہمیں اٹھایا نہیں جائے گا)۔ یا یہ کہتے تھے کہ قیامت اگر آ بھی گئی تو ہم لوگ جیسے کہ دنیا میں بڑے مالدار وعزت والے ہیں وہاں بھی ہمارا یہی وطیرہ رہے گا، وغیر ذلک۔ تو ارشاد فرمایا کہ ہرگز نہیں! تمہارے انکار اور طرح طرح کے خیالات سے قیامت کا پروگرام تو ہرگز منسوخ نہیں ہوگا، کیونکہ اس روز کے لیے جو پروگرام رکھا گیا ہے وہ اٹل ہے، اور تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

دو فرشتے (کراماً کاتبین):

ہم نے تمہارے ہر قسم کے اعمال، گفتار، اشارات وغیرہ جمع کرنے اور لکھنے پر ایسے فرشتے مقرر کئے ہیں جو

سب کچھ تیار کر رہے ہیں، یہ فرشتے کوئی ناہنجار، بے تجربہ کار اور تمہاری طرح غافل نہیں ہیں، یہ بڑے عقلمند تجربہ کار اور بڑے درجے کے امین، متقی اور پرہیزگار ہیں۔ سابقہ سورت میں ان کے سربراہ ''جبریل امین'' کی صفات کا بیان ہوا، کرام کاتبین تقریباً انہیں صفات کے حامل ہیں، نہ انہیں رشوت دی جاسکتی ہے، نہ مرعوب اور نہ ہی مغلوب کئے جاسکتے ہیں، اسی طرح وہ اپنے فرائض میں سستی یا غفلت بھی نہیں کرتے، وہ کبھی بھی کسی کو نظر نہیں آتے، نہ کسی سے رشتہ ہے نہ دوستی، اور نہ ہی کسی کی سفارش کام کرسکتی ہے، یہ صرف اپنے پروردگار کے تابع اور فرمانبردار ہیں، تمہارے سارے اعمال بغیر کسی کمی بیشی کے حرف بہ حرف لکھ کر محفوظ کرتے ہیں، یہ تمہارے ہر ارادے اور عمل کو لکھ کر اپنے ریکارڈ میں جمع کرتے ہیں، روزِ قیامت جب اعمال نامے کھولے جائیں گے تو تمہیں خود بخود اقرار کرنا پڑے گا کہ:

﴿مَا لِهٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾[الکہف:۴۹]

(کہیں گے: ہائے شامت! یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھی ہے، اور جو عمل کئے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے)۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ''کرام کاتبین'' اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں، جو انسان کے دائیں بائیں کندھے پر ہوتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت کریم ﴿بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ﴾ ذکر فرمائی، اس کے بعد ان دونوں فرشتوں کی صفت کرام کاتبین ذکر فرمائی، تو اپنے نیک بندوں پر خصوصی انعام فرمایا کہ یہ بڑے کریم فرشتے ہیں، اول یہ کہ نظر نہیں آتے، دوم یہ کہ برے اعمال کی تشہیر نہیں کرتے، پردہ پوشی کرتے ہیں، کسی کو رسوا نہیں کرتے ہیں، ہر برائی کے لکھنے میں توقف کرتے ہیں، توبہ کی مہلت دیدیتے ہیں، تاکہ توبہ کر کے لکھنے میں نقصان نہ اٹھائے، بصورتِ توبہ وہ عملِ بد نہیں لکھتے، ہاں! بصورتِ اصرار و عدمِ توبہ تو ایک ہی برا عمل لکھتے ہیں، اگر کوئی نیک عمل کرے تو اس کو دس گنا لکھتے ہیں، اگر کوئی کسی برائی کا ارادہ کرے، پھر ترک کردے تو اس کو ایک نیکی لکھ دیتے ہیں، گویا برائی کا ترک بھی نیکی شمار ہوا۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۚ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: بیشک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے ﴿۱۳﴾ اور بیشک فجار جہنم میں ہوں گے ﴿۱۴﴾ انصاف والے دن اس میں داخل ہوں گے ﴿۱۵﴾ اور اس سے رہا بھی نہیں ہوسکیں گے ﴿۱۶﴾ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ یوم الدین کیا ہے؟ ﴿۱۷﴾ پھر آپ کو کس نے بتلایا کہ یوم الدین کیا ہے؟ ﴿۱۸﴾ وہ دن ایسا ہوگا کہ جس میں کوئی نفس دوسرے نفس کے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا، اور تمام ظاہری اور باطنی معاملات اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہوں گے ﴿۱۹﴾

معاوف ومنازل

لغات:

اَبْرَار جمع ہے بَر کی، اَبْرَار بمعنی نیکوکار، جن کے عقائد واعمال اور پوری زندگی احکامِ شریعت کے مطابق ہوں، سورۃ الدہر میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اَبْرَار کون ہیں؟

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جنہیں اَبْرَار کہا اس لئے کہ انہوں نے باپ اور بیٹوں کے ساتھ نیک سلوک کیا۔ [مظهري] مطلب یہ ہے کہ اَبْرَار وہ لوگ ہیں جنہوں نے حقوق اللہ کو ادا کر کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا بھی پاس رکھا۔ دین میں بنیادی اصول یہی دو ہیں کہ حقوق اللہ وحقوق العباد دونوں کو پورا کیا جائے، ایسے لوگ جنت اور اس کی نعمتوں میں عیش وآرام کے ساتھ محفوظ رہیں گے، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

فُجَّار کون ہیں؟

فُجَّار یعنی فاجر، الفجور سے مشتق ہے، بمعنی چاک کرنا اور پھاڑنا، یعنی وہ لوگ جنہوں نے دین اور دیانت کا پردہ چاک کیا، انہیں فاجر کافر کہتے ہیں، اور بے عمل فاسق کو بھی فاجر کو کہتے ہیں، تو یہاں تقابل کی وجہ سے پہلا معنی مراد ہے۔ دوسری آیت ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ﴾ اس پر گواہ ہے کہ کافر فاجر ہمیشہ کے لیے جہنم میں ہوں گے، جہاں انہیں ہمیشہ رہنا ہے، بخلاف مؤمن فاجر کے، وہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا، چند وقت گناہوں کی سزا مکمل کرنے کے بعد شفاعت کے ذریعہ دوزخ سے آزاد ہو کر جنت میں داخل ہوگا۔

﴿يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ﴾ (اور بدکردار دوزخ میں (یعنی) جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے) - یہ کفار فجار قیامت کے دن جہنم میں داخل ہوں گے اور:

﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ﴾ (اور اس سے چھپ نہیں سکیں گے) وہاں ہمیشہ رہیں گے، نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟ پھر تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟ اس میں تنبیہ اور تاکید ہے: ''تمہیں کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے؟'' پھر خود جواب دیا کہ یوم الدین بڑا سخت وہولناک ہے:

﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا﴾ (جس دن کوئی جان کسی جان کا کچھ اختیار نہ رکھے گی) یعنی اس دن کوئی شخص کسی شخص کے لیے کسی نفع اور فائدہ پہنچانے کا مالک اور سزاوار نہیں ہوگا، مراد فجار و کفار ہیں کہ انہیں کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں ہوگا، البتہ متقین، اَبرار اور مخلصین ایک دوسرے کے لیے اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ شفاعت کریں گے، شفاعت الانبیاء والصدیقین والشہداء والصالحین وغیرہ پر کلام پہلے سورۂ نبا میں ہو چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ (اور حکم اس روز خدا ہی کا ہوگا) سارے معاملات ظاہری و باطنی، کلّی وجزوی اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہوں گے، دنیا میں ظاہری طور پر عاریۃً اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزیں یہاں تک کہ بادشاہت بھی اپنے بندوں کو تفویض کی تھی اور ان کو اختیار بھی دیا تھا، مگر قیامت کے روز سارے اختیارات تمام مخلوقات سے سلب ہو جائیں گے، تمام فیصلے واحد لاشریک ربّ العزّت کے ہاتھ میں ہوں گے، اور وہی قضاء و فیصلوں کا مالک ہوگا، جیسے کہ فرمایا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [الغافر:۱۶] (آج کس کی بادشاہت ہے؟ اللہ کی ہے جو ایک ہے، غالب ہے)۔

تمّ تفسیر سورۃ الانفطار بمن اللہ و کرمہ والحمد للہ رب الغلمین

سُورَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

مكيةٌ آياتها ٣٦ ركوعها ١

سورۂ مطففین مکی ہے، اس میں چھتیس (٣٦) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ التطفیف یا سورۃ المطففین ہے، پہلی آیت میں یہ کلمہ موجود ہے۔

نزول:

اگر چہ کچھ لوگوں نے اس سورت کو مدنی کہا ہے، مگر صحیح یہی ہے کہ یہ سورت مکی ہے، اور اس کا نزول سورۃ العنکبوت کے بعد ہے۔ نزول کے اعتبار سے مکی سورتوں میں سب سے آخری سورت ہے، اور یہی راجح ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت چھتیس (٣٦) آیتوں، ایک سو انہتر (١٦٩) کلمات اور سات سوتیس (٧٣٠) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورتوں میں قیامت کا ذکر مختلف طریقوں پر بیان کیا گیا، اس سورت میں بھی قیامت کا بیان ہے، مگر اصلاحِ معاشرہ کے ضمن میں یہاں بھی محاسبے کا بیان حسبِ سابق ہے ذرا تفصیل کے ساتھ ہے۔

مختصر موضوع:

شروع سورت میں اصلاحِ معاشرہ اور معاملات میں دیانت وصداقت اور اس کے فوائد ونتائجِ عالیہ اور خیر

وبرکات کا بیان ہے، اور جو چیزیں معاشرہ اور دیگر معاملات کے لیے مضر ہیں اور ان کے ثمرات ونتائج نقصان دہ ہیں، ان کے بیان کے ساتھ قیامت کے مفید ومضر احوال کا تذکرہ ہے۔ اس کے ساتھ أبرار وفجار اور ان کے اعمال کا بیان اور أبرار کے لیے جنت اور دیگر خوشحالیوں اور راحتوں کا ذکر ہے، اور فجار کے لیے جہنم اور عذاب وعقاب کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ آخر میں کفار کی حقارت وذلتوں کا بیان ہے، اور اہل ایمان مؤمنین جنت میں داخل ہوکر دوزخیوں پر استہزاء کریں گے جس طرح کفار مسلمانوں پر دنیا میں استہزاء کرتے رہتے تھے۔ اہل جنت ان کے استہزاء کا جواب دے کر انہیں شرمندہ کریں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ① الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ② وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ③
اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ④ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑤ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑥

ترجمہ: ہلاکت وتباہی ہے (ناپ تول میں) کمی کرنے والوں کیلئے ① وہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں، تو پورا پورا لیتے ہیں ② اور جب وہ لوگوں کو ناپ کر دیتے ہیں، یا تول کر دیتے ہیں، تو کمی کرتے ہیں ③ کیا یہ خیال نہیں کرتے کہ مرنے کے بعد یہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے ④ ایک بڑے دن میں ⑤ اس دن کھڑے ہوں گے تمام لوگ رب العٰلمین کے سامنے ⑥

معارف ومنازل

لغات:

﴿اَلْمُطَفِّفِيْنَ﴾ یہ باب تفعیل سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، نصر اور ضرب دونوں سے آتا ہے بمعنی: قریب ہونا۔ مطفف کمی کرنے والے کو کہتے ہیں، جو کہ طفیف سے ماخوذ ہے، بمعنی قلیل اور معمولی حقیر شی، کیونکہ عام طور پر ترازو اور کیل میں خفیف چیز کی کمی ہوتی ہے۔

﴿اِكْتَالُوْا﴾ باب افتعال سے فعل ماضی کا صیغہ ہے، اِکْتِیَال اس کا مصدر ہے، پیمانہ سے ناپ کر لینا۔

﴿وَزَنُوْا﴾ ضرب سے ہے، تولنا۔ ﴿يُخْسِرُوْنَ﴾ سمع سے ہے، اور باب افعال سے بھی آتا ہے، نقصان

اٹھانا۔ ﴿وَيْلٌ﴾ کے معنی ہیں: تباہی و ہلاکت اور جہنم میں ایک وادی کا نام بھی ویل ہے۔ بعضوں نے جہنم میں ایک کنویں کا نام ویل بتایا ہے۔

قرآن کریم چونکہ آفاقی ہدایت نامہ اور ابدی کتاب ہے، اس لئے اس کے مخاطب ہر زمانہ کے لوگ ہیں، خواہ وہ مخاطب کے صیغے کے ساتھ ہوں، یا عام صیغہ غائب کے ساتھ، یہاں مطفّفین کا صیغہ اسم فاعل کا ہے، جو غائب کے حکم میں ہے۔ قرآن کریم کی آیات صراحۃً، دلالۃً، اشارۃً، اقتضاءً قیامت تک آنے والے تمام انس وجن اور ہر طبقہ وہر پیشہ کے لوگوں کے لیے ضابطۂ حیات اور راہ ہدایت ہیں، اس لئے یہاں مطفّفین کے معنی اپنے عموم کے لحاظ سے زندگی کے تمام طبقات اور پوری انسانیت کے لیے یکساں ہیں، اور ہر فرد و مجتمع تنظیم اور جماعت پر اس کا اطلاق عام ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

انسان کے لئے دو راستے:

یہ دنیا کاروبار کی ایک منڈی ہے جس میں اچھے اور برے عقائد واعمال کا سامان موجود ہے، اور انسان تاجر ہے، ہماری جان و مال، وقت وعمر، علم وعمل اور جذبات ہمارے پاس ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہیں کہ اس میں ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ اس سرمایہ سے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی قیمتی اشیاء خرید کر سرخرو اور کامیاب ہوجائیں، اور آخرت کی دائمی مسرتوں، اور راحتوں کا حقدار و مالک بن جائیں، یا کفر وشرک، نفاق، بدعت، معصیت اور خواہشات وشہوات کی خسیس ورذیل اسباب خرید کر جہنم اور ابدی عقاب وعذاب اور تباہی کے گڑھے میں گر جائیں۔ قران حکیم ہمیں ہدایت وخوشحالی کا بار بار درس دیتا ہے اور راہِ نجات کی طرف عمومی دعوت دیتا رہتا ہے، اور دیگر تمام خطرات اور مہلکات و اسبابِ تباہی سے آگاہ فرما کر بچنے اور اجتناب کی تلقین کرتا رہتا ہے۔

انسانیت کا راہنما:

ربّ العزّت سے بڑھ کر اس عالم ناسوت میں ہمارے لئے کوئی بڑا بھی خواہ اور خیر خواہ کوئی نہیں ہوسکتا، اسی طرح رسول اکرم ﷺ اور قرآن حکیم کا حال ہے۔ کامیابی اور خوشحالی کا کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر ہماری رہنمائی نہ ہوئی ہو، اور تباہی و ہلاکت کا کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر ربّ العزّت اور قرآن حکیم اور سرور عالم ﷺ نے شفقۃً و رحمۃً تنبیہ نہ کی ہو، تاہم معاشرہ اور اس کے متعلق ہر قسم خیر وشر کی رہنمائی قرآن پاک کا مشغلہ رہا ہے، اسی سلسلہ کا ایک جامع اور نہایت اہم پہلو یہی تباہی و ہلاکت اور اخروی و دنیوی بربادی ہے، جس کا نام تطفیف اور حقوق کی ادائیگی میں

کمی ہے، جسے اس مبارک سورت نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا، اور ہمیں اس قسم کی خیانتوں سے مکمل بچنے کا حکم صادر فرمایا۔

قرآن حکیم جیسا کہ بار بار گزر چکا ہے محض الٰہیات یا عقائد کی کوئی کتاب نہیں، بلکہ ایک عالمگیر اور آفاقی صحیفۂ رحمت ہے، وہ صرف اہل مکہ کے عقائد و اعمال اور اخلاق و دیانات اور معاشرتی اصلاح کے لیے نہیں، اور نہ کسی جزوی مخصوص عمل کی تبدیلی اس کا موضوع ہے، بلکہ اس کا ہر حکم و فرمان عالمگیر اور تمام انسانیت کے لیے ابدی اور دائمی ہے، اور وہ قیامِ قیامت تک تمام معاشروں کو اسلامی ڈھانچے میں مکمل تبدیلی کا خواہشمند ہے، اس کی ہر آیت سمندر کی طرح ہزاروں مسائل پر مشتمل ہے۔

تطفیف سے کیا مراد ہے؟

علماء وفقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ کمی وبیشی عرف عام یا سبب نزول کے اعتبار سے اگرچہ ایک خاص مسئلے سے متعلق ہے، مگر باعتبار عموم الفاظ اور عمومِ مفہوم ومعانی کے تطفیف کے جتنے بھی شعبے اور مواقع ہیں یہ آیت کریمہ سب پر حاوی اور مشتمل ہے، اور حقوق اللہ کی ادائیگی میں جن جن ممکنہ کمیوں کا امکان اور احتمال ہوسکتا ہے، وہ سب آیت کریمہ کے مفہوم میں مندرج ہیں۔

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾ تباہی اور بربادی وہلاکت ہے کم تولنے والوں یا کم کرنے والوں کے لیے، وہ یہ لوگ ہیں: ﴿الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ﴾ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔ یہاں لفظ علی، من کے معنی میں مستعمل ہے۔ استیفاء کا معنی ہے: پورا پورا حق وصول کرنا، تو فرمایا کہ ادھر تو یہ حال ہے کہ جب لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، مگر:

﴿وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾ اور جب وہ دوسرے لوگوں کو ناپ کر دیتے ہیں، یا تول کر دیتے ہیں، تو گھٹا کر (کمی کر کے) دیتے ہیں۔ ﴿كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ﴾ میں لام مقدر ہے، أي: كَالُوْا لَهُمْ اَوْ وَزَنُوْا لَهُمْ۔

یہ وہ برا عمل اور گناہ کبیرہ ہے جس کی بدولت قوم شعیب علیہ السلام پر تباہی آئی، اور یہ عقل ونقل دونوں کے ساتھ متصادم ایک تباہ کن عمل ہے، اور اس عمل کے بہت برے اثرات پورے معاشرے کے لیے تباہ کن اور زہر قاتل کے مترادف ہیں۔ اس قسم کے جرائم کی پوری سزا تو قیامت کو ہی ملے گی، مگر ان کے تباہ کن و برے اثرات اس دنیا میں بھی

ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، اور ان کی نوعیت اتنی سنگین اور خطرناک ہوتی ہے کہ انسان کو دن کے بارہ بجے بھی تارے نظر آنے لگیں گے، اور پورا معاشرہ مفلوج ہو کر تباہ و برباد ہو جائے گا۔

"عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خمس بخمس ما نقض قوم العهد إلا سلّط الله عليهم عدوّهم، ولا حكموا بغير ما أنزل الله إلا فشا فيهم الفقر، وما ظهرت الفاحشة فيهم إلا ظهر فيهم الطاعون، وما طففوا الكيل إلا منعوا النبات وأخذوا بالسنين، ولا منعوا الزكوة إلا حبس الله عنهم المطر"۔ [قرطبي]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان پانچ چیزوں پر یہ پانچ سزائیں ملتی ہیں: (۱) جو قوم عہد شکنی کرتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر اس کے دشمن کو مسلط کر دیتا ہے۔ (۲) جو قوم قرآن حکیم کے خلاف فیصلہ کرتی ہے اللہ تعالیٰ ان کو قلاش و تنگدست کر دیتا ہے۔ (۳) جس قوم میں بدکاری عام ہو جاتی ہے اس میں طاعون پھیل جاتا ہے۔ (۴) جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے وہاں زرعی پیداوار میں برکت نہیں رہتی اور قحط سالی پھیل جاتی ہے۔ (۵) جو قوم زکوٰۃ نہیں دیتی اللہ تعالیٰ ان پر بارش کا سلسلہ روک دیتا ہے۔

مؤطا امام مالکؒ میں حدیث ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھ کر فرمایا: "(یہ شخص رکوع و سجود طمانینت کے ساتھ صحیح طور پر ادا نہیں کر رہا تھا) کہ ہر چیز میں تطفیف، یعنی کمی ہوتی ہے، تم نے نماز میں تطفیف کیسے کر دی؟ یعنی صحیح رکوع و سجود ادا نہ کرنے پر آپ رضی اللہ عنہ نے تطفیف کا حکم لگایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تطفیف (جو کہ گناہ کبیرہ اور حرام ہے) یہ صرف کیل وزن کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اس کا اطلاق حقوق اللہ و حقوق العباد میں ہر طرح کی کمی پر ہوتا ہے، اور قرآن حکیم کا مطلب و موضوع بھی یہی عموم ہے، جس میں زندگی کے سارے اعمال درجہ بدرجہ داخل ہیں۔

تطفیف کی حرمت اور اس کے چند مواقع کا بیان:

جب تطفیف کے معنی معلوم ہوئے کہ کمی کو کہتے ہیں، اس کے حکم میں سب ائمہ متفق ہیں کہ یہ گناہ کبیرہ اور حرام ہے۔ ساتھ ساتھ اس کے انجام و عاقبت کا بیان بھی معلوم ہوا کہ مطفف یعنی تطفیف کرنے والوں کے لیے جہنم کی سزا مقرر ہے، تو مناسب معلوم ہوا کہ تطفیف کے اختصار کے ساتھ چند مواقع کا بیان ہو۔

معلوم ہونا چاہئے کہ عقائد، تنزیہ ذات و صفات باری تعالیٰ، اعمالِ صالحہ، طاعات، عبادات وغیرہ تمام اعمال

واحکامِ شرعیہ پر باللسان، بالقلب، بالجوارح، عقیدہ رکھنا، عمل کرنا، اور بجالانا اگر قران وسنت کے عین مطابق ہوتو یہ استقامت واعتدال کہلائے گا جو کہ محمود اور پسندیدہ شمار ہوگا، اگران اشیاء میں کمی اور حدودِ شرعیہ سے کمتر وپستی کے ساتھ عقیدہ وعمل ہوتو یہ تطفیف اور حرام سمجھا جائے گا۔

دوسرے درجے میں حقوق العباد کا مرتبہ ہے، اس کے مختلف بارہ مواقع ہیں:

اول: والدین اور اولاد کے حقوق:

والدین اور اولاد کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہیں ان میں ہر قسم کی کمی کو تطفیف کہتے ہیں، جو کہ حرام اور مستوجب سزا ہے۔

دوم: بھائی بہنوں کے حقوق:

بھائی بہنوں کی جانبین میں حقوق اگر یہ لوگ ایک دوسرے کے شرعی حقوق میں کمی اور خیانت کریں گے تو یہ تطفیف شمار ہوگی، جو کہ حرام اور موجب عذاب اخروی ہے۔

سوئم: حقوق الزوجین:

میاں بیوی، یعنی زوجین کے دوطرفہ حقوق، اگر یہ ہر دو فریق بموجب حکمِ شرعی ایک دوسرے کے حقوق کی پوری پوری ادائیگی نہیں کریں گے تو یہ تطفیف کے زمرے میں شامل ہے، اور روزِ قیامت سزا کے حقدار ہوں گے۔

چہارم: رشتہ داروں کے حقوق:

قریبی رشتہ دار (ذوی القربیٰ) کے حقوق جو کہ صلہ رحمی کے دائرے میں آتے ہیں، یہ حقوق بڑے محفوظ اور اہم ہیں، اگر کوئی ان حقوق کی ادائیگی میں سستی یا کمی کرے گا تو تطفیف شمار ہوکر مستوجب سزائے اخروی ہوگا۔

پنجم: ہر قسم کے متعلقین کے حقوق:

پیر ومرید، استاذ وشاگرد کے حقوق اور ان کی پاسداری، ہر دوطرف ضروری ہیں، بصورتِ عدمِ ادائیگی یا کمی کے تطفیف کہلائے گا۔

ششم: ہمسایہ پڑوسیوں کے حقوق:

پڑوسی ہمسایہ، ان کے حقوق بھی دوطرفہ شمار ہوں گے، بصورتِ عدمِ ادائیگی یہ تطفیف میں شمار ہوں گے، اور گناہ کبیرہ حرام ہے۔

ہفتم: عام معاملات اور کاروباری حقوق:

بائع مشتری، لین دین اور قرض کے معاملات، یہ سورتِ ہذا کا اصل موضوع ہے، جو کہ واضح ہے اور تطفیف حرام وممنوع ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی شامل ہے کہ لوگ مال میں (ہر قسم کا مال) ملاوٹ کرتے ہیں، یا اصلی کے ساتھ نقلی اور ردی ملا کر فروخت کرتے ہیں، یا مبیع کا عیب چھپا کر فروخت کرتے ہیں، یا بدونِ اجازت ایک ملک سے دوسرے ملک کو مال لے جا کر سمگلنگ کرتے ہیں، یا کھانے پینے کی اشیاء ذخیرہ کرتے ہیں، یہ سب گناہ اور حرام ہیں۔ تطفیف کی نمایاں قسم یہی ہیں اور مستوجب سزائے اخروی اور تباہ کن ہیں۔

ہشتم: زراعتی حقوق:

زراعت، اس میں لوگ بہت خیانت اور دھوکہ کرتے ہیں، اور شرعی اصول کی ہرگز خیالداری نہیں کرتے، جس سے لوگوں کے حقوق میں ضیاع اور کمی آجاتی ہے، جو کہ حرام اور تطفیف ہے اور یہ خیانت ہر جگہ عام ہے، مسلمانوں کو ایسی خیانتوں سے بچنا فرض ہے۔

نہم: اجارتی محنتی حقوق:

مزدوری، اجارہ داری ایک شخص کسی کام کی انجام دہی پر مزدور مقرر کرتا ہے، اس کے ذمہ مکمل برابر اُجرت کی ادائیگی کا فریضہ ہوتا ہے، اور مزدور کے ذمہ پورے وقت اور تندہی سے کام کی تکمیل لازمی ہے، ان میں سے جو اپنے فرائض میں کوتاہی کرے گا اور دوسرے کی حق تلفی یا اس میں کمی کرے گا، یہ تطفیف اور حرام ہے۔

دہم: ملازمتی اور دفتری حقوق:

ملازمت، سرکاری ملازمت ہو یا پرائیویٹ دفتری کام، تعلیمی ادارے، یا دیگر ذاتی یا عوامی ملازمت، اس میں بڑی احتیاط، وقت کی پابندی، کام کی انجام دہی، امورِ مفوضہ کی تکمیل واصلاح وغیرہ امور، اس معاملے میں معمولی لاپرواہی اور غفلت حرام اور تطفیف میں شمار ہوگی، اگر صرف وقت میں پابندی کا التزام نہ ہو، تو تنخواہ حرام ہو جائے گی۔

آج خیانت اور حق تلفی اپنے عروج پر ہے، ہوسکتا ہے کہ چند آدمی مستثنیٰ ہوں باقی تمام تر اس ناپاک خیانت اور بدعملی میں محض ملوث اور ڈوبے ہوئے ہیں، بلکہ اس جرمِ عظیم پر فخر ومباہات کرنے سے تھکتے نہیں۔ ستم ظریفی یہ کہ دینی مدارس کے علماء وفضلاء بھی اس عمومی سیلاب میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں غافل نظر آتے ہیں، اِلّا ماشاءاللہ۔

☆☆☆

یازدہم: رعایا اور ماتحت لوگوں کے حقوق:

حکمران اور رعیت (رعایا، ماتحت) کے حقوق۔ دراصل تمام جہاں کے حقوق انہیں حکمرانوں کے اردگرد گھوم رہے ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو ہر سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔ حضور انور سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں کو اللہ ربّ العزّت اپنی مخلوق پر حکمرانی عطا کرتا ہے اگر وہ لوگ خلق خدا کو تحفظ نہ دے سکے اور انہیں ہر قسم کی بہتر سہولت مہیا نہ کر سکے، تو ان کی قیامت تباہ ہوجائے گی، اور جنت تو درکنار جنت کی خوشبو تک ان پر حرام ہے۔ [ترمذي]

دوازدہم: حیوانات کے حقوق:

انسان تو انسان ہے اگر کوئی جانوروں کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت کرتا ہے، یا ان پر ظلم کرتا ہے، ضرورت سے زیادہ خدمت لیتا ہے، اور ان کی خوراک میں کمی کرتا ہے، ان کے حقوق پورا نہیں کرتا، یہ بھی تطفیف اور حرام ہے، خوب سمجھیں۔

حضرت امام مالکؒ نے فرمایا: "لکلّ شیء وفاء و تطفیف" برابری اور کمی کا تعلق ہر چیز کے ساتھ ہے، اس اعتبار سے حقوق اللہ، حقوق العباد، حقوق النفس، حقوق الحیوانات سب اس میں شامل رہیں گے، اور کسی بھی قسم کا کوئی عمل یا چیز اس دائرہ وحصار سے خارج نہیں ہوگا، اور حقوق پورے کرنے کا نام وفاء ہوگا، جس کا خاطر خواہ اجر وثواب قیامت کے دن ملے گا، اور حقوق پورے نہ کرنے کا نام تطفیف ہوگا، جس کی تباہی اور ویل کا عذاب قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ اور یہ چیز ناپ تول کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ شماری اعداد اور دیگر تخمینی انداز کی چیزیں اور اشیاء سب اس میں شامل رہیں گے۔

جس طرح موجودہ دنیا میں یہ چیزیں مختلف چیزوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے رائج ہیں، چند چیزوں کا حساب کیل ووزن کے ساتھ ہوتا ہے، بعض چیزوں کا اعداد وگنتی کے ساتھ اور کچھ چیزوں کا تخمینے اور اندازے کے ساتھ حساب وکتاب اور ادائیگی ہوتی رہتی ہے۔ حضرت امام طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: "جس قوم میں مال غنیمت کی چوری رائج ہوجائے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں دشمن کا رعب اور ہیبت ڈال دیتے ہیں، اور جس قوم میں ربا، یعنی سود خوری کا رواج ہوجائے ان میں موت کی کثرت ہوجاتی ہے، اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کا رزق قطع کردیتے ہیں، اور جو لوگ حق کے خلاف فیصلے کرتے ہیں ان میں قتل وخون عام ہوجاتا ہے، اور جو لوگ معاہدات میں غداری کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر ان کے

دشمن کو مسلط کر دیتا ہے۔ [رواہ مالک موقوفاً۔ مظهري]

فقر و فاقہ، قحط اور قطع رزق کی مختلف صورتیں:

حدیث میں جن لوگوں کا رزق قطع کر دینے کا جو ارشاد ہے اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کو رزق سے بالکل محروم کر دیا جائے، اور یہ صورت بھی قطع رزق ہی میں داخل ہے کہ رزق موجود ہوتے ہوئے وہ اس کو کھا نہ سکے، یا برحق استعمال نہ کر سکے، جیسے بہت سی بیماریوں اور مقدمات اور جھگڑوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، اس زمانہ میں یہ چیز بہت بکثرت عام ہے۔ اسی طرح قحط کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اشیاء ضرورت، خورد و نوش مفقود و نایاب ہو جائیں، اور یہ بھی ایک صورت ہے کہ اشیاء بکثرت موجود ہوں، مگر خریدار کی قوت خرید سے باہر ہوں اور کمر توڑ مہنگائی مسلط ہو۔ حدیث شریف میں جس فقر کا ذکر ہے اس سے مراد یہی ہے کہ لوگوں پر فقر و احتیاج مسلط ہو، ہر کوئی شخص اپنے کاروبار اور ضروریاتِ زندگی میں دوسروں کا جتنا محتاج ہو، وہ اتنا ہی فقیر ہے۔

اس زمانے کے حالات پر غور کیا جائے تو انسان اپنے رہن سہن اور نقل و حرکت اور اپنے ارادوں کے پورا کرنے میں ایسے ایسے قوانین میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے کہ اس کے لقمہ اور کلمہ تک پر پابندیاں ہیں، اپنا مال موجود ہوتے ہوئے خریداری میں آزاد نہیں کہ جہاں سے چاہے کچھ خریدے، سفر میں آزاد نہیں کہ جب کہیں جانا چاہے چلا جائے، ایسی ایسی پابندیوں میں انسان جکڑا گیا ہے کہ ہر کام کے لیے دفتر گردی اور افسروں سے لے کر چپڑاسیوں تک کی خوش آمد کئے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہے، یہ سب محتاجی تو ہے، جس کا دوسرا نام فقر ہے۔ اس تفصیل سے وہ شبہات رفع ہو گئے جو حدیث شریف کے ارشاد کے متعلق ظاہری حالات کے اعتبار سے ہو سکتے ہیں۔ [معارف القرآن]

﴿اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ یہاں کلمہ اَلَا تنبیہ کے لئے نہیں، بلکہ توبیخ کے لئے ہے۔ ﴿لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ میں لام، فِی کے معنی میں ہے۔ کلمہ ظنّ دو معنوں کے لیے ہے: ایک یہ کہ کفار کو قیامت کا یقین تو کیا انہیں ظنّ کا درجہ بھی حاصل نہیں۔ دوسرے یہ کہ قیامت کی ہولناکی اور دہشت ناکی اگر کسی کو ظن کی حد تک بھی حاصل ہو جائے، تو وہ بھی ڈرانے کے لیے کافی ہے، چہ جائیکہ درجہ یقین میسر آجائے۔

بڑا سخت اور عظیم دن:

فرمایا: تطفیف جیسے ظالمانہ بے رحمی کے عمل سے احتراز کرنا چاہیے، توبہ کر کے اصلاحِ اعمال پر استقامت کے ساتھ کاربند ہونا چاہیے، اور اس بات پر یقین کرنا چاہیے کہ ایک دن وہ اپنے پروردگار کے پاس معبوث ہو کر حاضر

ہو جائیں گے، وہ دن بڑا سخت اور عظیم ہوگا جو کہ پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، جس میں ساری مخلوقات کا دوبارہ اجتماع ہوگا، جس طرح روزِ ازل میں ہوا تھا اور سارے لوگ ربّ العٰلمین کے حضور کھڑے ہو کر اپنے انجام کا انتظار کرتے ہوں گے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن لوگوں کو اس قدر پسینہ آئے گا کہ زمین میں ستر ہاتھ تک پہنچ جائے گا، اور کانوں تک پسینہ کی لگام لگی ہوئی ہوگی۔ طبرانی، ابو یعلی اور ابن حبان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن کافر کو اس کے پسینہ کی لگام لگی ہوگی، یعنی منہ تک پسینہ میں غرق ہوگا، یہاں تک کہ وہ کہے گا کہ یا ربّ! مجھے اس سے نجات دے، خواہ دوزخ ہی کو بھیج دے۔ حاکم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مقامِ محشر میں کچھ لوگوں کو پسینہ کی لگام لگی ہوگی، اور وہ عرض کریں گے: پروردگار! ہمارے لئے دوزخ میں چلا جانا اس تکلیف سے آسان ہے جو ہم پا رہے ہیں، اور وہ دوزخ کے عذاب کی شدت سے واقف ہوتے ہوئے ایسا کہیں گے: **نعوذ باللہ من عقابه و عذابه۔** قیامت کے دن کی سختی اس قدر ہولناک ہے کہ جس کا اندازہ لگانا انسانی عقل و سوچ سے بالاتر ہے، اگر کوئی پڑھا لکھا انسان اس کی سختی سے متعلق احادیث و آیات اور تمام روایات جمع کر کے تنہائی میں ان پر صحیح معنی میں غور کرے، تو شاید دل پگھل جائے، کلیجہ پھٹ جائے، دماغ کام چھوڑ دے اور دنیا اور اس کی راحتوں سے نفرت پیدا ہو جائے، اور نیک اعمال کا اشتیاق و محبت پیدا ہو جائے، اور تنہائی کی زندگی گزارنے کا شوق موجزن رہے۔ بہت سے سلف صالحین نے ایسا ہی کیا اور کامیاب ہوئے۔

ایک دن جمعہ کے خطبہ میں امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص قیامت پر ایمان رکھتا ہے، وہ احمق اور بیوقوف ہے، اور جو شخص قیامت کا منکر ہے، وہ گمراہ ہے۔ [ابن کثیر] لوگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ بڑے عقلمند امیر المؤمنین کیا کہہ رہے ہیں کہ قیامت کا ماننے والا احمق و بے عقل ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو مطلب یہ ثابت ہوا کہ جو شخص قیامت کو مانتے ہوئے اس کی ہولناکیوں اور سختیوں کو جانتے ہوئے اس کے لیے تیاری نہیں کرتا، نیک اعمال کا ذخیرہ جمع کرتے ہوئے گناہوں اور معاصی سے اجتناب نہیں کرتا، یقیناً وہ احمق ہی ہوگا، اور یہ بات سو فیصد درست ہے۔

☆☆☆

آج کے مسلمان اوران کے چارطبقوں کامختصر بیان:

اگر گویم مسلمانم بلرزم ☆ کہ دانم مشکلات لاالہ را

مسلمان اس وقت صرف اسے کہتے ہیں کہ وہ خودکو مسلمان ظاہر کرے، اس معنی کے اعتبار سے ہمارے موجودہ معاشرہ میں اس کے چار طبقے نمایاں نظر آتے ہیں، ہرطبقہ کامختصر بیان ہوگا:

پہلاطبقہ:

وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر مکمل ایمان رکھتے ہیں، اور اسے حاضر و ناظر جانتے ہوئے حتی الامکان زندگی کے تمام مراحل میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت پر کاربند رہتے ہیں، ان کے دل و دماغ اور قلوب و افکار پر حبِ الٰہی اورحبِ رسول اور مکمل ایمان بالآخرۃ کا عقیدہ موجزن اور حاوی رہتا ہے، وہ اتباعِ شریعت و اتباعِ سنت کواپنی زندگی کا اصلی اور بنیادی مقصد سمجھتے ہیں، اور مکمل اعتماد ویقین کے ساتھ اس پر عمل کرتے ہیں، وہ تمام نیکیوں اوراسلامی اقدار وکردار میں ہر وقت پیش پیش رہتے ہیں، اور ہر قسم کے فواحش، معاصی اور خلافِ شریعت اعمال سے میلوں دور رہتے ہیں، وہ حبِ جاہ، حبِ مال اورحبِ دنیا سے نہایت متنفر، مستغنی اور دور رہتے ہیں، وہ احکام شریعت کا قیدی اور دنیوی خواہشات اور نفسانی لذات سے آزاد رہتے ہیں، وہ ہر محاذ پر حقوق اللہ تعالیٰ وحقوق العباد کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے ہر قسم کی تطفیف سے اجتناب کرتے ہیں۔

ان کا سمت قبلہ اوررخ قرآن پاک اور کعبۃ اللہ ہی مقرر ہے، مال حرام تو درکنار، وہ ہر قسم کے مشکوک رزق و روزی سے مکمل پرہیز واجتناب کرتے ہیں، وہ ارکانِ خمسہ اسلامیہ کی روشنی میں زندگی گزارنے کی ہرممکن کوشش کرتے رہتے ہیں، وہ دنیا کو محض ایک رہ گزر سمجھتے ہوئے آخرت کواپنی اصلی منزل قرار دیتے ہوئے اس کی مسرتوں کی تحصیل میں جدوجہد کرتے ہیں، وہ نفسانی خواہشات، روحانی امراض، کبر وغرور بغض، حسد، کینہ، تن پروری دیگر اعمالِ سیئہ سے دور رہنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، وغیرہ۔

اس قسم کے لوگ غریب پروری اوراداءِ حقوق، عجز وانکساری، طہارت وتقویٰ، علم وعمل، اوراخلاقِ حسنہ میں شب و روز منہمک رہتے ہیں، اداءِ طاعات، عبادات اور معاملات کے مراحل میں ضرب المثل اور نمونۂ روزگار سمجھے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس قسم کے لوگ نہایت معدود اور کم تعداد میں ہوتے ہیں۔ ضرب المثل مشہور ہے: ''پتھر ہر جگہ سونا ایک جگہ''۔

قرآن کریم نے جس طائفہ کو مقربین اور اصحاب الیمین کے نام سے یاد فرمایا، وہ یہی لوگ ہیں، نظام شمسی کی بقاء انہی کے دم وقدم سے وابستہ ہے، اور یہی حقیقی اصلی مسلمان ہیں، جنہیں مقربین اور اصحاب الیمین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو شوق ورغبت ہو تو اسی مخلص جماعت میں شامل ہو کر اور اس کا ممبر بن کر سعادت حاصل کرے اور مقربین درگاہ میں شامل ہو جائے، اور حظیرۃ القدس میں اپنا نام لکھوائے۔

دوم طبقہ:

وہ لوگ ہیں کہ جنہیں بیک وقت دنیا و دین دونوں سے واسطہ ومحبت ہے، وہ ایک ہی ظرف میں آگ اور پانی دونوں کو جمع کرنے کے خواہشمند ہیں۔ دراصل دنیا ان کی لیلیٰ اور وہ اس کے مجنون ہیں، مگر کمالِ دانشمندی سے اپنی محبوبہ ''لیلیٰ'' پر مذہب کا رنگدار اور خوبصورت لیبل لگا کر عوام وخواص میں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں، زہر کی بوتل پر شہد کا نام ''الشفاء'' لکھ کر فروخت کر رہے ہیں، ایک قدم دین کے حصار میں، اور دوسرا دنیا کے مرغزاروں میں جمائے ہوئے ہیں، ترک معاصی ان کے پروگرام میں شامل نہیں، وہ ہر وقت هَلْ مِنْ مَّزِيْد کی موجوں میں مستغرق رہتے ہیں۔

وہ خواہشاتِ نفسانیہ اور لذّاتِ دنیویہ میں اس طرح تیر رہے ہیں جیسے کہ مچھلی پانی میں، چند ذکر واذکار، اوراد، وظائف، تسبیح وتہلیل اور چند نوافل سے آگے ان کا اسلام و مذہب نے قدم نہیں رکھا، وہ اسی پر انحصار کرتے ہوئے اپنے آپ کو پکا دیندار مسلمان گردانتے ہیں، وہ: ﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ [البقرۃ:۲۰۸] (اسلام میں کامل طور پر داخل ہو جاؤ) پر یقین نہیں رکھتے ہیں، وہ فسق وفجور، حرام، رشوت، مکروفریب، جھوٹ وخیانت، سود، و شراب ودیگر معاصی کو بطیبِ خاطر بڑے شوق سے قبول کرتے ہیں، اور انہیں اسلامی وضوء کے نواقض میں شمار نہیں کرتے۔

کہتے ہیں کہ ایک عورت ہمیشہ بغیر وضوء کے نماز پڑھتی تھی، ایک دن اس کے بیٹے نے کہا: اماں جان! لوگ وضوء کر کے نماز پڑھتے ہیں، اور میں نے آپ کو وضو کرتے کبھی نہیں دیکھا؟ کہنے لگی: بیٹا! جب سے تیرے والد کا انتقال ہوا ہے پھر میرا وضو کبھی نہیں ٹوٹا۔ ماشاء اللہ! یہی حال ہمارے اسلام کا ہے کہ کسی بھی گناہ سے زوال پذیر نہیں ہوتا، ایمان ہو تو ایسا ہو کہ کبھی حرام یا گناہ سے کمزور نہ ہو (یہ خودساختہ ایمان کی مثال ہے) وہ حبِّ الٰہی اور محبتِ رسول اور اتباعِ شریعت کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں، مگر ان پر عمل کرنے اور چلنے سے احتراز کرتے ہیں، وہ زبانی عاشق ضرور ہیں مگر عمل ندارد۔

زنہار ازیں قوم نباشی کہ فریبند ☆ حق رابہ سجودے و نبی رابہ درودے

اس طبقہ کے مسلمان بڑی کثرت کے ساتھ ہیں، اور آج کل سارے مسلمان انہیں اعمال پر کار بند ہیں، شکل وصورت سلف کی، باقی علم وعمل اور باطن کسی اور کا، اِلَّا ماشاء اللہ۔

تیسرا طبقہ:

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اسلام پر روشن خیالی کا لیبل لگا رکھا ہے، وہ اسلام کے ابجد اور کلمۂ اسلام کے مقصد و معنی تک سے ناواقف ہیں، وہ کبھی جذبات میں آ کر اپنی مسلمانی پر فخر و مباہات کا اظہار کرتے ہوئے "اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہنے سے بھی نہیں شرماتے، اور انہیں اللہ اور رسول کا چنداں فرق معلوم نہیں ہوتا، وہ مادر پدر آزاد ہیں، وہ قرآن اور اس کی تعلیمات پر یورپ کی تقلید کو ترجیح دیتے ہیں، وہ مغرب کا سجدہ کرتے ہیں اور آپس کے گندے اعمال، یورپ کی تہذیب و تمدن، یورپی ثقافت پر چلنے کو اپنا دین و ایمان تصور کرتے ہیں، شکل وصورت، نشست و برخاست، کھانے پینے، بولنے، اور چلنے غرض تمام شعبہ ہائے زندگی میں یورپی تہذیب کو اسلامی تہذیب پر ترجیح دیتے اور سراہتے ہیں۔ ان کے مذہب میں ہر گناہ کا نام نیکی ہے، اور ہر نیکی گناہ ہے، وہ سچے دیندار مسلمانوں پر استہزاء کر کے انہیں مجنون اور قدامت پرست وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔

غرض یہ کہ اسلام کا صرف نام لینے پر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اگر ان کا بس چلے تو شائد اسلام کی عمارت کو گرادیں، وغیرہ۔ یہ لوگ آج کی اصطلاح میں مہذب، تعلیم یافتہ بیدار مغز روشن خیال کہلاتے ہیں، آج جتنے مسلمان ممالک کرۂ ارض پر آباد ہیں، ان کی اقتدار ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے، اِلَّا ماشاء اللہ۔

طبقہ چہارم:

وہ لوگ ہیں جنہیں اسلام کی بنیادی چیزوں تک کا علم نہیں، اور وہ کلمہ طیبہ کا صحیح تلفظ اور معنی سے بھی محروم ہیں، باعتبار قد وقامت، شکل وصورت، اگرچہ وہ اشرف المخلوقات انسان ہی کہلاتے ہیں، مگر عقل و دماغ، فکر و تدبر میں وہ بے شعور حیوان ہی ہیں، انہیں ربّ العزّت جل شانہ اس کی صفات، انبیاء و رُسل علیہم السلام، قبلہ، قرآن، طاعات و عبادات، قیامت، جنت دوزخ کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں، اور ان چیزوں کے متعلق علم الیقین، یا صحیح تصدیق بجائے خود انہیں صحیح تصور تک کا درجہ بھی حاصل نہیں۔ وہ خیر وشر کے صحیح مفہومِ شرعی سے ناواقف و بے خبر رہتے ہیں، صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، اس کے علاوہ انہیں اسلام و کفر تک کا فرق معلوم نہیں، تزکیۂ نفس، طہارت

باطن تو درکنار وہ ظاہری طہارت سے بھی غافل ہیں، وہ اتنے ناہنجان اور بیوقوف ہیں کہ حیوانات سے بھی کم عقل و ناداں ہوتے ہیں، نفسانی خواہشات ضرور رکھتے ہیں، مگر لاشعوری کے درجے میں، انہیں جہاں کھینچ کر چلایا جائے چل دیتے ہیں، مگر نفع ونقصان کی پہچان وشناخت کا انہیں اندازہ نہیں ہوتا۔ بہر حال! ان کی سادگی اور بیوقوفی ان کا تعارف وعلامت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے۔ قرآن کریم نے جو: ﴿اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ﴾ [التوبۃ:۹۷] (دیہاتی کفر اور منافقت میں زیادہ سخت ہیں، اور دوسروں سے زیادہ اس لائق ہیں کہ احکام سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اتارا ہے) کہا۔ یہ لوگ اکثر انہیں حقائق واحوال کے مصداق ہیں، اور انہیں باتوں پر عمل پیرا ہیں۔ اس قسم کے لوگ شہری زندگی سے بہت دور دیہاتوں میں رہتے ہیں، اور حرام وحلال، نیز طہارت ونجاست سے بالکل بے خبر ہیں، ان میں بعض غسلِ جنابت تک سے بھی بے خبر ہیں، کبھی اگر اذان سننے کا اتفاق ہوا تو مخمصے میں ڈوب جاتے ہیں، ان کے نام بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں، اور اعمال نہایت پست اور غیر شرعی ہوتے ہیں، وغیرہ۔

فائدہ:

طبقہ اول کے لوگ تطفیف سے تقریباً پاک اور بری ہوتے ہیں۔ طبقہ دوم میں تطفیف کے تمام مروجہ وممنوعہ اقسام زور وشور سے جاری ہیں، بعض افراد میں کلّی طور پر، جبکہ بعض میں جزوی طور پر، علیٰ حسب الاعمال، بمنزلہ کلّی مشکک کے، اور طبقہ ثالثہ دراصل تطفیف کے مراحل سے چند قدم آگے نکلے ہوئے ہیں۔

❁ ❁ ❁

كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِىۡ سِجِّيۡنٍ ﴿۷﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ مَا سِجِّيۡنٌ ﴿۸﴾ كِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ﴿۹﴾ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۰﴾
الَّذِيۡنَ يُكَذِّبُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ ﴿۱۱﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا قَالَ
اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۳﴾ كَلَّا بَلۡ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾ كَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ
لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّهُمۡ لَصَالُوا الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِىۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: خبردار! بیشک فجار کا اعمالنامہ البتہ سجین میں ہوگا۔⑦ اور آپ کو کس نے بتلایا سجین کیا ہے؟⑧ یہ ایک

دفتر ہے لکھا ہوا ⑨ ہلاکت ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ⑩ وہ لوگ جو انصاف کے دن کی تکذیب کرتے ہیں ⑪
انصاف کے دن کو نہیں جھٹلاتا، مگر ہر زیادتی کرنے والا گنہگار ⑫ جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتا
ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں ⑬ خبردار! (ہرگز ایسا نہیں) بلکہ ان کے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں، ان
اعمال (بد) کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں ⑭ خبردار! بیشک یہ لوگ اس دن اپنے ربّ سے حجاب میں رکھے جائیں گے ⑮
پھر یہ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے ⑯ پھر ان سے کہا جائے گا: یہی ہے وہ جس کی تم تکذیب کرتے تھے ⑰

معارف ومنازل

لغات:

کِتَاب سے مراد مکتوب، عمل نامہ۔ فُجَّار جمع ہے فاجر کی، کفار ومشرکین۔ سِجِّیْن سجن، بندی خانہ، جہاں قیدیوں کو جو رکھا جاتا ہے (اس مقام کا نام ہے)۔ آئندہ آیتوں میں اَبْرَار سے مراد عام مسلمان جو موحد ہوں، پھر عِلِّیِّیْن سے مراد بالا خانے جو ایک معزز مقام ہے، جنتوں کے اوپر عرش عظیم کے نیچے۔ مَحْجُوْبُوْن روکے ہوئے، (بابِ نصر) روکنا۔ صَالُوْا اصل میں صَالُوْنَ تھا، اضافت کی وجہ سے نون گر گیا، (بابِ سمع) جلنا، آگ میں گرنا۔ اَلْمُقَرَّبُوْن صیغہ اسم مفعول، قریب کئے ہوئے۔

دونوں آیتوں کا مطلب واضح ہے کہ کفار کی ارواح اور عمل نامے دونوں سجین میں ہوں گے جو کہ ساتوں زمینوں کے نیچے ہے، جہاں ابلیس کی فوج محبوس ہے۔ مؤمنوں کی ارواح اور اعمال نامے دونوں علیین کے مقام پر ہوں گے، جہاں جنتوں کے اوپر بالا خانے ہیں، جو کہ جنت کے حصے ہیں، جس طرح سجین جہنم کا حصہ ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ سجین جہنم کا نام ہے اور علیین جنت کا نام ہے۔ دونوں باتوں کا مقصد ایک ہی ہے کہ ارواح وکتاب جہنمیوں کے جہنم میں ہوں گے اور مؤمنوں کی ارواح واعمال نامے جنت میں ہوں گے۔

﴿لَفِيْ سِجِّيْنٍ﴾ بدکاروں کے اعمال سجین میں ہیں، یہ نہایت تنگ وتاریک مقام ہے۔ احادیث وآثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجین ایک خاص مقام کا نام ہے اور کفار وفجار کی ارواح کا مقام یہی ہے، اور اسی مقام میں ان کے اعمال نامے رہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اعمال نامے اس جگہ میں محفوظ کر دیئے جاتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی کتاب جامع ہو جس میں تمام دنیا کے کفار وفجار کے اعمال لکھ دیئے جاتے ہوں۔

یہ مقام کس جگہ ہے؟ اس کے متعلق حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''سجین ساتویں زمین کے نچلے طبقہ میں ہے، اور علیین ساتویں آسمان پر عرش کے نیچے ہے''۔ [بغوي، أحمد وغيرهما۔ مظهري باختصار] بعض روایات حدیث میں یہ بھی ہے کہ سجین کفار وفجار کی ارواح کا مستقر ہے، اور علیین مؤمنین متقین کی ارواح کی جگہ ہے۔

بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جنت آسمانوں میں ہے، اور جہنم زمینوں میں ہے، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ قیامت کے روز جہنم کو حاضر کیا جائے گا، فرمایا: ﴿وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ﴾ [الفجر: ۲۳] (اور اس دن جہنم کو لایا جائے گا) اس کا مطلب کیا ہے؟ جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جہنم کو ساتویں زمین سے لایا جائے گا۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم ساتویں زمین میں ہے، وہیں سے بھڑک کر سارے سمندر اور دریا اس کی آگ میں شامل ہو جائیں گے، اور سب کے سامنے آجائے گی۔ اسی طرح جن روایات میں آیا ہے کہ سجین جہنم کے ایک مقام کا نام ہے۔ وہ بھی اس پر منطبق ہو گیا۔ [مظهري]

﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ﴾ اور تمہیں کیا خبر کہ سجین کیا ہے؟ یہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ کفار یہ نہ سمجھیں کہ قیامت ایک عرصہ دراز کے بعد قائم ہوگی، اس وقت کسے یاد رہے گا کہ کسی نے کیا کیا؟ اور وہ رجسٹر جس میں ان کے اعمال لکھے جا چکے ہیں وہ بھی بوسیدہ ہو کر پھٹ گیا ہوگا۔ یہاں اس غلط فہمی کو دور کیا جا رہا ہے کہ ان کے لیے ایک بہت بڑا منظم دفتر ہے، جس کا نام سجین ہے، جب یہ مر جائیں گے اور ان کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جائے گا تو ان کے اعمال اس بڑے دفتر میں مہر لگا کر محفوظ کر دیئے جائیں گے، اور حرف بہ حرف روزِ قیامت اسے حاضر کریں گے، مجال نہیں کہ اس دیوان میں کوئی فروگزاشت یا کمی وزیادتی ہو۔

سجین کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ کتاب مرقوم ہے، لکھا ہوا دفتر ہے اور اس پر مہر لگی ہوئی ہے''۔ [ابن كثير] تمام اعمال جو انہوں نے زندگی میں انجام دیئے، اس کتاب میں جمع کر کے اس پر فرشتوں نے مہر لگوا کر محفوظ کر لئے اور سجین میں رکھ دیئے۔

﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ تباہی بربادی ہو جھٹلانے والوں کے لیے، اور وہ یہ لوگ ہیں:

﴿الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ﴾ جو انصاف کے دن کی تکذیب کرتے ہیں، اور طرح طرح کی بیہودہ، بے بنیاد باتیں کرتے رہتے ہیں، عقل ونقل سے جو چیز ثابت اور یقینی ہوتی ہیں، وہ دولت و مال کے بل بوتے پر اس کا انکار کرتے ہیں۔ ﴿وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ﴾ انصاف کے دن کو جھٹلاتا نہیں مگر ہر زیادتی کرنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا سراسر مجرم گنہگار۔ اَثِيْمٍ کے معنی: ''سرتاپا مجرم، گناہگار'' جس کی سرشت، جرم وزیادتی ہو اور حق وصداقت سے کوسوں دور ہو، جو دوسروں پر ظلم وتعدی کا خوگر ہو، اور لوگوں کے حقوق ضائع کرنے والا ہو، مزید قباحتوں کا بیان:

﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، حالانکہ قرآن پاک کی زبان عربی ہے، فصاحت وبلاغت اور طرزِ بیان اتنا عمدہ ہے، جسے سن کر ہر شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، بلکہ بسا اوقات یہ لوگ اپنی مجلسوں میں از خود اقرار کر چکے ہیں کہ یہ انسانی کلام نہیں، مگر ضد وعناد کی بناء پر وہ اس حقیقت حقہ کی تکذیب کرتے ہوئے اس کو گزشتہ لوگوں کی کہانیاں کہتے ہیں، اور اس کے بیان کردہ حقائق میں تدبر اور غور وفکر نہیں کرتے ہیں، اور گزشتہ قوموں کی کہانی کہہ کر تکذیب کرتے ہیں، ان قوموں کی زندگی اور تباہی سے عبرت بھی نہیں سیکھتے، جنہیں طرح طرح کے عذاب دیکر صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹا دیا گیا۔

﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ یہ قصے کہانیاں ہرگز نہیں، بلکہ یہ جو (اعمالِ بد) کرتے ہیں، ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے، یہ نصیحت آموز اور قلوب وباطن میں نورانیت پیدا کرنے والی باتیں ہیں، مگر ان بیمارانِ صفراء کو تلخ معلوم ہوتی ہیں۔ اصل خرابی ان منکرین میں ہے کہ ان کے قلوب سیاہ اور زنگ آلود ہیں، ان کے برے اعمال کی وجہ سے، کیونکہ گناہوں کی وجہ سے جب دلوں پر زنگ چڑھ جاتا ہے تو ہر قسم کی استعداد وصلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں، اور یہ لوگ ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ [البقرۃ:۱۸] (بہرے ہیں، گونگے ہیں، نابینا ہیں)۔ سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں معدوم ہو کر وہ جانوروں سے بھی بدتر ہو چکے ہیں۔

گناہ کرنے سے دل کا سیاہ ہو جانا:

حدیث شریف میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ لگ جاتا ہے، اگر توبہ کرے تو وہ داغ دور ہو جاتا ہے، اور دل صاف

ہوجاتا ہے، اور اگر وہ بار بار گناہ کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ سارے دل کو گھیر لیتے ہیں''۔ [ترمذي] اسی کو اللہ تعالیٰ نے ﴿بَلْ رَانَ﴾ [المطففين:۱۴] (بلکہ دلوں پر زنگ چڑھا ہوا ہے) سے تعبیر فرمایا۔ ران، رین اس زنگار کو کہتے ہیں جو تلوار یا آئینہ وغیرہ کو لگ جاتا ہے، یہی غبار دل کو جب لگ جاتا ہے تو دل زنگ آلود ہوکر میلا ہوجاتا ہے، اور اس کی نورانیت اور استعداد ضائع ہوجاتی ہے۔ جب آئینۂ دل صاف وشفاف ہو تو قبولِ حق کی استعداد اس میں قائم رہتی ہے، اگر آئینۂ دل غبار آلود اور زنگ آلود ہو تو اس کی چمک دمک ختم ہوجاتی ہے، پھر وہ لطیفۂ ربانی سے خالی ہوکر گدھے، کتے اور چوہے کا دل قرار پائے گا، اور ہر خیر سے خالی رہے گا۔

دل کی صفائی طاعات سے حاصل ہوتی ہے، اور زنگ گناہوں سے، کیونکہ عموماً بدکار، بے عقل، ظالم، فاسق اور بداخلاق آدمی کو لوگ بے ضمیر کہتے رہتے ہیں، یہی اس کی وجہ ہے، اور خوش اخلاق، انصاف پسند اور اچھے لوگوں کو باضمیر جو کہا کرتے ہیں، وہ انہی اعمالِ حسنہ کے سبب۔ سورۂ بقرہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ ہرگز نہیں جو یہ سمجھ رہے ہیں، بیشک یہ لوگ قیامت کے دن اپنے ربّ سے حجاب میں رکھے جائیں گے، اور رویتِ حق و دیدارِ الٰہی عزّ شانہ سے محروم رہیں گے، انہوں نے اپنے قلوب و آنکھوں پر کفر و شرک کی سیاہی و ظلمت چڑھا کر اس عظیم نعمت سے محرومی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا، یہ وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کے بغیر جنت کی خوشی و مسرت بے معنی ہے، یہ کافر کتنے بڑے بدقسمت نکلے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم	☆	نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اہل حق نے اس آیت سے مؤمنین کے لیے دیدارِ الٰہی کے ثبوت پر استدلال فرمایا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اگر جنت میں دیدار الٰہی نہ ہو تو ہم مرجائیں گے''، اسی دیدارِ مبارک کی خوشی میں اہل حق اپنی جانوں سے اور دنیوی لذّتوں سے مستغنی رہتے ہیں۔ اس کی تفصیل سورۃ القیٰمۃ میں گزر چکی ہے۔

﴿ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ﴾ پھر وہ ضرور جہنم میں داخل ہوں گے۔ ایک طرف تو وہ نعمتِ عظمیٰ (دیدارِ الٰہی) سے محروم ہوئے، دوسری طرف انہیں کیا ملا؟ ہائے شومیٔ قسمت! جہنم ملی، کیا کھویا کیا پایا۔ ہم کہتے ہیں کہ سب کچھ کھویا، کچھ نہیں پایا، لذّتِ دیدار سے محروم ہوگئے، جہنم میں داخل ہوکر سر پیٹ رہے ہوں گے اور کیا؟

اے ربّ العزّت! ہم پر رحم فرما، ہمارے ایمان سلامت رکھ، اور لذّتِ دیدار نصیب فرما۔ آمین

﴿ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾ پھر اسے کہا جائے گا: یہی ہے وہ جس کی تم تکذیب کرتے تھے۔ ﴿فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا﴾ [الطور:١٦] (صبر کرو یا بے صبری کرو) یہی ابدالآباد تمہارا ٹھکانا ہے، تم نے دنیا میں غرور و تکبر کے ساتھ پاکدامن اور معصوم ہستیوں کا مذاق اڑایا، اور کائنات کے خالق و مالک کے حکموں کے ساتھ بغاوت کر کے چند بے جان پتھروں کو اس کا ہمسر و شریک ٹھہرایا، تمہیں سب کچھ بخششوں کے باوجود شرم و حیاء نہیں آئی۔ اب ﴿ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ﴾ [الذاريات: ١٤] (اپنا عذاب چکھ لو، یہ ہے وہ عذاب جس کو جلدی مانگتے تھے)۔ نعوذ باللہ من جهنم و عقابه۔ جس قیامت کی تم نے تکذیب کی یا اسے جلدی مانگا اور طلب کیا۔ ﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾ [یونس:٤٨] (یہ وعدہ کب ہے؟) کہتا رہا، اب یہ آ گئی خوب سمجھو!

...... ۞ ...... ۞ ...... ۞ ......

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿١٨﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿١٩﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٢٠﴾ يَّشْهَدُهُ
الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ
نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ
الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢٨﴾

ترجمہ: خبردار! بیشک نیکوکاروں کا نامۂ اعمال علیین میں ہوگا ﴿١٨﴾ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ علیین کیا ہے؟ ﴿١٩﴾ ایک دفتر ہے لکھا ہوا ﴿٢٠﴾ (اس مقام پر) مقرب فرشتے حاضر ہوتے ہیں ﴿٢١﴾ بیشک اَبرار البتہ نعمتوں میں ہوں گے ﴿٢٢﴾ تختوں پر بیٹھ کر نظارہ دیکھیں گے ﴿٢٣﴾ اے مخاطَب! تو ان کے چہروں پر معلوم کرے گا نعمتوں کی تروتازگی ﴿٢٤﴾ ان کو پلائی جائے گی خالص شراب، جو سربمہر ہوگی ﴿٢٥﴾ اس کی مہر کستوری ہوگی اور اس بات میں چاہیے کہ رغبت کریں رغبت کرنے والے ﴿٢٦﴾ اور ملاوٹ اس (شراب طہور) کی تسنیم ہوگی ﴿٢٧﴾ (وہ تسنیم) ایک چشمہ ہے کہ اس سے پئیں گے مقرب لوگ ﴿٢٨﴾

معارف و منازل

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ﴾ بیشک اَبرار نعمتوں میں ہوں گے، یہ ابدی اور دائمی نعمتیں اتنی پاکیزہ، صاف شفاف اور اعلیٰ درجے کے اور اتنی بکثرت ہیں کہ آسمانوں کے ستارے ان کے مقابلے میں قلیل اور کم معلوم ہوں گے،

یہ نعمتیں محض فضلِ الٰہی اور اس کی رضا سے جنتیوں کو حاصل رہیں گی، وہاں پہنچنا اور جنت میں داخل ہونا سب سے بڑی نعمت شمار ہوگی۔

دخول جنت:

قرآن حکیم نے واضح کیا:﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ [آل عمران:۱۸۵] (جو شخص جہنم سے نجات پا گیا اور جنت میں داخل ہوا، تحقیق وہ کامیاب ہوا) اس کی حاجت پوری ہوئی، پھر اپنے اعمال کے مطابق اُسے ہر نعمت محض قلبی خواہش پر میسر آئے گی، یہ دخولِ جنت ایمان کی بدولت ہے، جو ہر مؤمن موحد کو عطا کیا جائے گا۔ حدیث شریف میں فرمایا: "من كان آخر كلامه لا إله إلا الله دخل الجنة"۔ [أبو داود، ترمذي] جس کا آخری کلام، کلمہ طیبہ "لا إله إلا الله" ہوگا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا، اور ابدی دخولِ جہنم، یعنی خلود فی النار سے محفوظ رہے گا۔ فرمایا: "لا إله إلا الله" جنت کی چابی ہے، یعنی جنت کے دروازے ایمان والوں کے لیے کھلیں گے، اور جو شخص شرک کفر ارتداد، نفاق الحاد زندقہ وغیرہ میں ڈوبا ہوا ہوگا، اس کے لیے جنت کا دروازہ قطعاً نہیں کھلے گا۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے:﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ [الأعراف:۴۰] (جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے سرتابی کی، ان کے لیے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے، اور نہ وہ بہشت میں داخل ہوں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے)۔

جنت ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے، وہاں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آسمانوں کے دروازے کھل جائیں، جب آسمان کے دروازے بند ہوں تو جنت تک کیسے رسائی ممکن ہے؟ ساتھ ساتھ تصریح کردی کہ:﴿وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ﴾ یعنی ایسے نافرمانوں کا جنت میں جانا ایسا محال ہوگا، جس طرح بڑے اونٹ کا سوئی کے سوراخ سے گزرنا، یا پار کرنا، عام اصطلاح میں اس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں، یعنی غیر ممکن۔ دخول جنت کے بعد جنت کے درجات اعمال کے مطابق ہوں گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "جنت کے سو درجے ہیں، ہر درجہ دوسرے سے اتنا بلند و بالا ہے کہ جتنا زمین سے آسمان"۔ [ترمذی]

احوالِ جنت:

قرآن حکیم میں فرمان ہے:﴿وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا﴾ [الأنعام:۱۳۲] (یعنی اہل ایمان کے لیے

درجات ان کے اعمال کے مطابق ہوں گے) جیسا کسی کا عمل ہوگا، ویسا اس کا درجہ ہوگا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ تمام درجات اعلیٰ، کامل، بے عیب اور بے نقصان ہوں گے، جنت کی ہر چیز اعلیٰ اور کامل ہے۔ فرمایا:

﴿عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنظُرُوْنَ﴾ تختوں پر جلوہ افروز ہو کر نظارے دیکھیں گے، پھر جدھر دیکھیں گے، جس طرح اور جس سمت میں، پستی یا بلندی میں، بڑے محظوظ، شادان وفرحان ہوں گے، ان کے دلوں سے، قلب و دماغ سے غل وغش، بدگمانی، بغض وحسد، کینہ، غرور اور دوسرے معیوب وخراب خیالات سب نکالے گئے ہوں گے، نہ ماضی کی پریشانی اور نہ حال ومستقبل کا کوئی رنج وغم ہوگا، تو ایسے حال میں نظارے کر کے دیکھنا کتنا عجیب و پر لطف ہوگا جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔

دیکھو! یہاں بہت سارے سرمایہ دار دنیا میں سیر وتفریح کے لیے نکلتے ہیں، جنگلوں، دریاؤں، نہروں، باغوں، پارکوں، اور ہوٹلوں میں جا کر سیر وسیاحت اور نظارے کرتے رہتے اور دیکھتے رہتے ہیں، مگر قسم بخدا! یہ دنیوی نظارے، خاردار کانٹوں اور غم و پریشانیوں سے بھرے ہوئے ہیں، اور تجربہ ومشاہدہ ہے کہ یہ سارے نظارے غم آلود اور پریشان کن ہیں، بجائے غم کم کرنے کے پریشانیوں کا ہجوم بڑھ جاتا ہے، اور لوگ خودکشی پر تیار ہو جاتے ہیں، اور تمام نظارے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ ہاں! اگر نظارہ دیکھنا ہو تو اہل بہشت کے نظارے دیکھیں، جہاں روح خوش ہو اور لذّت وسرور میں بے مثال اضافہ ہو، جہاں نورانیت ہی نورانیت ہے، خوشی پر خوشی ہے۔

﴿تعرفُ فِيْ وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾ ان کے نورانی چہروں سے نعمتوں کی جاذب نظر تروتازگی عیاں ہوگی، جیسے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ﴾ [عبس: ۳۹] (اس روز کتنے چہرے تو چمکتے دمکتے ہوں گے، ہنستے، خوشی مناتے ہوئے)۔ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً﴾ [الغاشية: ۱۱] (بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ اپنی کی ہوئی محنت کی وجہ سے پوری طرح مطمئن۔ عالیشان جنت میں ہوں گے۔ جس میں وہ کوئی لغو بات نہیں سنیں گے)۔

جیسے دنیا میں خوشحالی اور پریشانی دونوں کے آثار چہروں سے پہچانے جاتے ہیں، اسی طرح ہی روزِ محشر چہروں کی حالت ہوگی۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ سرور عالم حسینوں کے سردار حضرت خاتم الانبیاء ﷺ جب کسی دینی کام کے سلسلے میں خوش اور راضی ہوتے تھے، تو آپ ﷺ کے خد انور اور چہرۂ اقدس چودہویں کے چاند کی طرح

چمکتا تھا۔ [بخاري] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کتنے خوش قسمت تھے جنہوں نے جنت سے پہلے دنیا میں جنتی چہرے دیکھے اور نظارے کئے۔

﴿يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ﴾ ان کو خالص شراب سر بمہر پلائی جائے گی، جس کی مہر مشک کی ہوگی، تو جب ان کی خدمت میں جو خالص شراب پیش کی جائے گی، اس پر کستوری کی مہر لگی ہوئی ہوگی، یعنی اس مہر میں کستوری کی خوشبو ہوگی۔ یہاں دنیا میں بھی آج سے نصف صدی پہلے جب لوگ شربت بناتے تھے، تو بوتل کے منہ کو شہد کے موم کے ذریعہ بند کرتے تھے، اب جنت کی شراب خالص کے بوتلوں کے منہ اگر کستوری کی مہر سے بند ہو تو بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے، جہاں یہ قیمتی کستوری کی مہر ہوگی وہاں کسی ڈھکنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔

امام مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رحیق اس شراب کو کہتے ہیں جس کا رنگ سفید نہایت چمکدار ہو، ہر قسم کی میل سے پاک ہو، بے انتہا لذیذ و پاکیزہ ہو، اور اس کے پینے سے طبیعت میں نشاط ہو، جو بار بار پینے کی خواہش ہو۔

مطلب واضح ہوا کہ جن بلورین (چاندی خالص) برتنوں میں یہ رحیق مختوم رکھی ہوئی ہوگی، وہ سر بمہر ہوں گے، اور مہر بھی کستوری کی لگی ہوئی ہوگی، تاکہ ہر طرح یہ محفوظ ہو، اور اس کی مہک پر جنتی مائل اور خوش ہوں۔ جب اَبرار کرام وہاں حاضر ہو جائیں گے تو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح چمکدار چہرے والے خوبصورت، حسین و جمیل، نورانی غلمان (خدامِ اہلِ جنت) یہ شراب خالص نقرئی برتنوں میں انہیں پیش کریں گے۔

بعض مفسرین نے ﴿خِتٰمُهٗ مِسْكٌ﴾ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب جنتی اس شراب کا آخری گھونٹ پئیں گے تو انہیں اس طرح محسوس ہوگا کہ اس میں مشک خالص گھول دی گئی ہے، اور دیر تک یہ ذائقہ اور خوشبو انہیں محسوس ہوتی رہے گی۔

اس ترقی یافتہ دور اور موجودہ متمدن دنیا میں بڑے بڑے شہروں میں بہت بکثرت مشروبات کا رواج عام ہو چکا ہے، بڑی بڑی دکانوں میں سینکڑوں قسم کے مختلف رنگ و ذائقہ کی، طرح طرح کے مشروبات تیار ملتے ہیں، تازہ پھلوں اور خشک پھلوں اور ہر طرح کے فروٹ سے بنے ہوئے جوس اتنے بکثرت تیار ہو رہے ہیں جو کہ عام آدمی ان کے ناموں سے اور فوائد سے واقف نہیں، ان مشروبات کے فوائد بہت کم اور نقائص بڑے زیادہ ہوتے ہیں، اور تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ ان مشروبات کے بکثرت پینے سے طرح طرح کی مہلک اور پیچیدہ بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں، بعض ایسے امراض پیدا ہوتے ہیں جو علاج پذیر نہیں ہوتے۔

دنیوی اور جنتی چیزوں میں یہ فرق کیوں؟

جنت تو جنت ہے، نہ اس کی چیزوں کو دنیوی چیزوں پر قیاس کیا جاسکتا ہے، اور نہ دنیوی چیزوں کو جنتی چیزوں پر، دیکھیں! دنیوی چیزوں اور جنتی چیزوں کا سب کا خالق و مالک وہی ایک ہی ربّ العزّت ہے، مگر ان دونوں قسم کی چیزوں میں فرق ہے:

اول: یہ کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سو رحمتوں میں سے ایک رحمت نازل فرمائی، جبکہ آخرت کے لیے (۹۹) رحمتوں کا ذخیرہ رکھا۔ دوم: یہ کہ دنیا فانی اور عارضی ہے، جبکہ آخرت ابدی دائمی ہے۔ سوم: یہ کہ دنیا مؤمن، کافر، حیوانات، اچھے، برے سب کے لیے ہے، جبکہ جنت صرف پاکیزہ مؤمنوں کے لیے ہے، تو جنت کی نعمتوں کے اکثر و بیشتر نام وہی ہیں جو کہ دنیا کی چیزوں کے نام ہیں، صرف نام مشترک ہیں، مگر حقیقت میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ دنیا کی ہر چیز ناقص اور عیب دار ہے، جبکہ جنت اور اس کی چیزیں سب اعلیٰ، کامل اور بے عیب ہیں۔

اس مضمون پر بہت بڑی ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے، ان کے حقائق معلوم کرنے کے لیے ایک بڑی عمر درکار ہے، بلکہ پوری معلومات پر عبور محال ہے۔

﴿وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ اس بات میں چاہئے کہ رغبت کرنے والے رغبت کریں۔

دعوت عام ہے، ربّ کریم ہے، جنت دینے میں نہ بخل، نہ رکاوٹ، جو چاہے آئے اور پائے، یہ صلاحِ عام ہے یارانِ نکتہ دان کے لیے، ہر انسان کو آگے آنا چاہئے، توحید پر قائم ہو، احکامِ الٰہی پر کاربند ہو، اتباعِ شریعت اور اتباعِ سنت پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو، مامورات وحسنات پر پابندی سے عمل ہو، منہیات ومعاصی سے کلّی اجتناب ہو، تطفیف کی تمام اقسام سے بیزاری اور توبہ ہو، سارے اعمال واخلاق پاکیزہ ہوں، جب یہ سب پورے ہوں گے، تو رغبت کرنے والے مرغوب و پاکیزہ جنت کے حقدار ہوں گے، معزّز ومکرم، حیّ اور قیوم ربّ کریم کی میزبانی حاصل کریں گے، اور قابلِ احترام مہمان بن کر خلد بریں، جنت نعیم کے مہمان خانے میں آسودہ ہو کر رحیق مختوم سے سیراب ہوجائیں گے۔

بس اعلان ہوا کہ اگر ایک دوسرے پر جنت کے حصول کی خاطر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہو، تو بسم اللہ کر کے میدان میں اترو، یہ نعمت ایسی بیش قیمت ہے کہ سبقت کرنے کا حقدار وسزاوار ہے۔ فانی دنیا کی فانی چیزوں پر نہ غبطہ کرو، اور نہ ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی زحمت کرو، اصل چیز اور ابدی نعمت عظمیٰ دیدار الٰہی اور جنت ہے، اگر شوق ہے تو دروازہ کھلا ہے، آئے جس کا جی چاہے، نہ آئے کچھ نہ پائے۔

بعض علماء کرام نے کہا ہے کہ اس آیت میں منافست اور رغبت وسبقت کی ترغیب ہے، اس کے لیے جو شرائط اور ضروری ہدایات ہیں وہ مدنی سورۂ توبہ کی آیت نمبر (۱۱۱) اور (۱۱۲) میں تفصیلاً مذکور ہیں، وہ یہ ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٢﴾﴾ [التوبة: ١١٢]

(ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال، اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے، لڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں، پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں، وعدہ ہو چکا اس کے ذمہ پر سچا توریت اور انجیل اور قرآن میں اور کون ہے قول کا پکا پورا کرنے والا اللہ تعالیٰ سے زیادہ؟ سو خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے کیا ہے اس سے، اور یہی ہے بڑی کامیابی ﴿١١١﴾ وہ توبہ کرنے والے ہیں، بندگی کرنے والے، شکر کرنے والے، بے تعلق رہنے والے (دنیا کی لذتوں سے)، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، حکم کرنے والے نیک باتوں کا، اور منع کرنے والے بری باتوں سے، اور حفاظت کرنے والے ان حدود کی جو باندھی اللہ تعالیٰ نے، اور آپ خوشخبری سنا دیں ایمان والوں کو ﴿١١٢﴾)

مطلب واضح ہے کہ بغیر صحیح عقیدہ اور صحیح اعمال کے محض خالی ہاتھ ہو کر جنت کی رغبت کرنا یہ حماقت اور نادانی ہے، جنت کی رغبت ان لوگوں کو زیب دیتی ہے جو اپنے اندر ان مذکورہ صفات کو پیدا کر کے پھر استقامت کے ساتھ ان پر کار بند ہوں، اللہ والے برگزیدہ مؤمنوں کی جو صفات ہیں وہ اگر کسی شخص میں نمایاں موجود ہوں تب وہ حقیقی معنوں میں جنت کا حقدار ہوگا، اور اس کی رغبت برحق اور صحیح ہوگی، ورنہ بغیر عقیدہ وعمل اور صفات مختصہ کے کوئی شخص رغبت کرنے والوں میں شامل نہیں ہوگا اور نہ ہو سکے گا۔ حضور انور ﷺ نے فرمایا: "إن سلعة الله غالية"۔ جنت اور اس کی نعمتیں مہنگی ہیں۔ [ترمذي]

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کا سودا بڑا مہنگا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا سودا بہشت ہے، جب کوئی جان اور مال اللہ تعالیٰ کے راستے پر لگائے گا، جہاد کرے گا، اس کے تمام احکام کی تعمیل کرے گا، حقوق وفرائض بجالائے گا اور تمام معاصی سے کنارہ کش ہوگا اور پوری زندگی اس کی فرمانبرداری میں وقف کرے گا، تب جنت کا سودا پکا ہوگا، یہ ہے اللہ تعالیٰ کا سودا

جو بڑا مہنگا ہے، جسے ہر ہوسناک، نفس پرست، خواہشاتِ نفسانیہ کا غلام حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ مال اور جان دونوں کی قربانی ہر شخص کے لیے آسان نہیں۔ شاعر نے کہا اور صحیح کہا:

بر کف جام شریعت بر کف سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن
ناز پروردہ تنعم نہ بردراہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندان جفاکش باشد
در رۂ منزل لیلی کہ خطرہاست بجان
شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی

اگر کوئی جان و مال شیطانی اور نفسانی خواہشات کے راستے پر لگائی ہے تو آگے کامیابی اور جنت کی توقع رکھنا فضول اور نادانی ہے، جو نفس و شیطان کا قیدی ہوگا تو اس کی رسائی خلد بریں تک ہرگز نہیں ہوسکتی۔ آگے ارشاد فرمایا:

﴿وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ﴾ اس میں تسنیم کی ملاوٹ ہوگی۔ اور تسنیم کی حقیقت:

﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب لوگ سیراب ہوں گے، تاہم عام اَبرار کو بھی اس میں سے کچھ حصہ ملا کر دیا جائے گا، اور اس کے علاوہ اور کئی قسم کے مفرح، روح افزا، مشروبات انہیں پیش کئے جائیں گے۔ اس شراب میں تسنیم کے چشمہ کا پانی ملایا جائے گا، پس جنت کی تمام شرابوں سے یہ اعلیٰ درجے کی شراب ہوگی۔

فائدہ:

اکثر لوگ نافہمی کی بناء پر غلط فیصلے کرتے ہیں، اور کچھ متقی لوگ جنتی شراب کا نام سن کر گھبرا جاتے ہیں، کیونکہ وہ دنیوی گندی شراب پر اسے قیاس کر کے پریشان ہو جاتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دنیوی شراب اور پیشاب میں کوئی فرق نہیں، دنیوی شراب پینے والوں پر خدا کی مار اور قہر و غضب ہو، جو کوئی دنیوی شراب استعمال کرے گا وہ جنتی شراب سے محروم رہے گا، حتی کہ ائمۂ اسلام نے یہاں تک کہا ہے کہ موجودہ شراب پینے والے مرتے وقت کلمہ توحید کے اقرار سے محروم رہیں گے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

جنت اور اس کی ساری نعمتیں فیضِ الٰہی اور بخششِ ربانی کی پسندیدہ و پاکیزہ اور مسرت افزاء نعمتیں ہیں، جو

کہ پاکیزہ لوگ اپنے پاکیزہ اعمال کی بدولت انہیں حاصل کرتے ہیں، اور جنت کی شراب انہیں انعام واکرام کے طور پر پیش کی جائے گی، جبکہ دنیوی شراب گندی اور نقصان دہ اور قطعی حرام ہے، اس کے پینے والوں پر اسی کوڑوں کی حد جاری ہوتی ہے، اور اسے حلال کہنے والے دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔

دیکھیں! دودھ اور پیشاب دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، ایک ہی جانور سے پاکیزہ اور قیمتی غذا دودھ بھی پیدا ہوتا ہے اور ناپاک پیشاب بھی، دودھ کی مثال جنتی شراب کی اور پیشاب دنیوی شراب کا بدل ہے اور اس کی مثال ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا کَانُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَکُوۡنَ ﴿۲۹﴾ وَ اِذَا مَرُّوۡا بِهِمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ ﴿۳۰﴾
وَ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَهۡلِهِمُ انۡقَلَبُوۡا فَکِهِیۡنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذَا رَاَوۡهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوۡنَ ﴿۳۲﴾
وَ مَاۤ اُرۡسِلُوۡا عَلَیۡهِمۡ حٰفِظِیۡنَ ﴿۳۳﴾ فَالۡیَوۡمَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡکُفَّارِ یَضۡحَکُوۡنَ ﴿۳۴﴾ عَلَی
الۡاَرَآئِکِ ۙ یَنۡظُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾ هَلۡ ثُوِّبَ الۡکُفَّارُ مَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾

ترجمہ: بیشک جو لوگ مجرم تھے وہ ایمانداروں پر ہنستے تھے ﴿۲۹﴾ اور جب وہ گناہگار مجرم ان غریب ایمانداروں کے پاس سے گزرتے تھے تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ آنکھوں سے اشارے کرتے تھے ﴿۳۰﴾ اور جب وہ اپنے گھروں کو لوٹتے تھے تو دل لگی (مزاح) کرتے ہوئے پلٹتے تھے ﴿۳۱﴾ اور یہ لوگ جب ایمان والوں کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ بلاشبہ یہ گمراہ لوگ ہیں ﴿۳۲﴾ حالانکہ یہ مجرم ان مسلمانوں پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے ﴿۳۳﴾ تو آج قیامت کے دن ایماندار لوگ کافروں پر ہنسیں گے ﴿۳۴﴾ تختوں پر بیٹھ کر نظارہ دیکھ رہے ہوں گے ﴿۳۵﴾ کیا کافروں کو بدلہ دیا گیا ان جرائم کا جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے؟ ﴿۳۶﴾

معارف ومنازل

لغات:

﴿یَتَغَامَزُوۡنَ﴾ باب تفاعل مضارع معلوم کا صیغہ ہے، بمعنی آنکھوں سے ایک دوسرے کو اشارہ کرنا، اور مفاعلہ سے اس کا معنی ہے: عیب لگانا، حقیر ثابت کرنا۔ ﴿اِنۡقَلَبُوۡا﴾ من قلب قلباً، پلٹنا۔ ﴿فَکِهِیۡنَ﴾ جمع مذکر اسم

فاعل، فکیه فکھاو فکاهة (باب سمع) خوش طبع ہنسنے والا۔

کافر ومشرک (خاص کر کفار مکہ) اپنے غرور وسرکشی اور مال ودولت کے گھمنڈ کے ساتھ فقراء وغرباء اور مساکین ونادار مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے، کبھی ان کی نسبت کو، کبھی نسب اور کبھی معصومانہ اسلامی شکل وصورت کو، کبھی ان کے لباس وضع قطع اور غربت کو بار بار اور ہر جگہ اور ہر مجمع میں نشان ملامت بنا کر اور طرح طرح کے مذاق ومسخرہ بنا کر خوشی کا اظہار کرتے تھے، اور ان کے خلاف وہ ناشائستہ کلمات استعمال کرتے تھے، جس کی مثال نہ ہو۔

ان کو بیوقوف بھی کہتے تھے اور گمراہ بھی، انہیں مسکنت کا بار بار طعنہ دے کر کہتے تھے کہ دیکھو! یہ لوگ خود کو جنتی کہنے والے ہیں، جو موجودہ دنیوی عیش وعشرت کو ایک موہومی جنت کے عوض ترک کر کے پریشان وناگفتہ بہ حالت میں خوار ہیں، غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ دراصل اس قسم کے مذاق واستہزاء ان کو گزشتہ اقوام سے ورثہ میں ملا تھا، قوم نوح علیہ السلام اور دیگر تباہ شدہ اقوام بھی اپنے زمانے کے مسلمانوں پر ایسی قسم کے مذاق کرتے رہے، بلکہ یہ سلسلہ قیامت تک شاید جاری رہے گا، ہر زمانہ کے کفار ومشرک یا ملحد وزندیق، فاسق وفاجر اہل ایمان اور اہل حق، متقی ومتبع سنت مسلمانوں کو اسی قسم کے طعنے دیتے رہیں گے، اور ان کے ہر ہر طرز وعمل کا مذاق اڑائیں گے۔

ہمارے موجودہ زمانہ میں انگریزی خواں طبقہ اپنے اسلاف (کفار وملحدین) کے نقش قدم پر چل کر یہی سب کچھ اہلِ حق کے خلاف کر رہے ہیں اور بول رہے ہیں۔ شب روز یہی ان کا وظیفہ رہتا ہے کہ ایماندار، متقی ومتبع سنت مسلمانوں کا مذاق اڑانا علماء وطلباء، تبلیغ والوں پر طنز ومذاق کرنا ان کا جاری معمول رہا ہے اور رہتا ہے، اور حق والے ہمیشہ موردِ عتاب واستہزاء رہتے ہیں۔ یہی چیز ان کے رفعِ درجات کا باعث بھی ہے، لہٰذا انہیں پریشان اور رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

دراصل یہ استہزاء اور طعن وتشنیع اولوالعزم پیغمبروں علیہم السلام پر ہمیشہ ہوتا رہا ہے، اور انہوں نے بطیبِ خاطر صبر واستقامت کے ساتھ اسے برداشت کیا ہے، پس اگر علماء وصلحاء اور اہل حق پر ہر زمانہ میں یہ طنز ومذاق ہوتا رہا تو انہیں یہ بصد خوشی برداشت کرنا چاہئے، کیونکہ یہ ان کے حق میں مفید اور نبوت سے قریب ہونے کی نشانی وعلامت ہے، اور یہ ظاہر ہے، کیونکہ اہل حق میں سے اگر کوئی ان مغرور متکبر اہل دنیا کا اگر ساتھ دیتا ہے اور ان کی حمایت کرتا ہے تو وہ ان کے عتاب سے فارغ ہوجاتا ہے اور نجات حاصل کرتا ہے، کیونکہ وہ قرب نبوت سے محروم ہوا، تب تو مخالفین کے عتاب سے بچ گیا۔

﴿وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ﴾ جب یہ مجرم لوگ غریب مسلمانوں کے قریب سے گزرتے یا انہیں کہیں دیکھتے تو آنکھوں سے اشارہ کرتے اور ان پر طنز واستہزاء کرتے تھے، اور طرح طرح کی بولیاں بول کر گزر جاتے تھے، اور ﴿نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ﴾ [سبأ:۳۵] (ہم تو مال واولاد والے ہیں، ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا) کہتے رہتے، اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے اور کہتے: دیکھو! یہ آخرت کے والی، وارث اور جنتی حوروں کے خاوند جا رہے ہیں، جو ایک شخص کے کہنے پر آباؤ اجداد کا دین چھوڑ کر ایک فرضی آخرت پر ایمان لائے، جس کا نہ امکان ہے اور نہ وجود۔

﴿وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ﴾ وہ ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ ربّ العزّت سبحانہ نے جواب دیا کہ کیا تم کافران مسلمانوں کو حقیر سمجھ کر ان کا مذاق اڑاتے رہتے ہو؟ کیا تم ان پر نگراں ومحافظ ہو؟ جو انہیں اپنے ماتحت رکھنا چاہتے ہو، اور ایک طرح بلا وجہ ان کے ایمان لانے پر افسوس و ہمدردی کا اظہار کرتے ہو کہ یہ دنیا سے کیوں کٹ گئے؟ ہرگز ایسا نہیں، بلکہ الٹا انہیں تمہاری حالتِ زار پر افسوس ہونا چاہئے کہ تم کیوں ایمان کی دولت سے محروم رہے۔

﴿فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ﴾ تو آج مؤمن کافروں سے ہنسی کریں گے، ایک انصاف کا دن بالیقین آنے والا ہے، جس دن دولت ایمان سے مالا مال مسلمان کافروں اور ان کے انجامِ بد پر ہنستے ہوئے نظر آئیں گے، کیونکہ یہ مسلّم اصول ہے کہ جو کسی پر ہنستا ہے ایک روز ضرور وہ خوار ہو کر اس پر ہنسا جائے گا۔

قرض ست فعل ہائے بدت نزد روزگار ☆ بر ہر کدام وقت کہ خواہد ادا کند

آج روزگار (زمانے) اپنے قرض تم سے ضرور وصول کرے گا کہ جن پر ہنستے رہے، آج وہ تم پر ہنس کر تمہاری ذلت کا نظارہ کریں گے۔

﴿عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ﴾ جنت کے بالا خانوں میں تختوں پر بیٹھ کر تمہاری بدحالی اور کفر کے انجام کا نظارہ کریں گے اور تم پر ہنسیں گے، اور لطف اندوز ہو کر کافروں سے کہیں گے کہ بدبختو! تمہارا عقیدہ غلط تھا، جس پر تمہیں پیغمبروں علیہم السلام اور وحی الٰہی نے بار بار تنبیہ کی کہ فانی دنیا پر مغرور نہ ہوں، آخرت کا طلبگار بنو، اپنے خالق مالک محسن حقیقی کی توحید اور بندگی اختیار کرو، یومِ حساب پر ایمان لا کر ابدی زندگی اور جنتوں کا حقدار بنو، مگر تم نے ایک بھی نہ مانی، بلکہ خیر خواہوں اور رہنمائی کرنے والوں کا مذاق اڑایا، اور ان کے ماننے والوں پر طنز وتشنیع، اور ہنسی مذاق کیا۔

آج بتاؤ! تمہارا انجام کتنا خوفناک تباہ کن ہوگا؟ اور دنیا میں جن پر تم ہنستے رہے آج وہ جنت کے بالا خانوں پر بیٹھ کر تمہارے اوپر ہنسی مذاق کریں گے، اور تلک بتلک کا منظر ہوگا۔ ﴿قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا﴾ [الأعراف:۴۴] (یقیناً ہمارے پروردگار نے ہمارے ساتھ جس چیز کا وعدہ کیا تھا ہم نے اسے حق پایا، کیا تم نے اس چیز کو حق پایا جس کا وعدہ تمہارے پروردگار نے کیا تھا؟)۔ اس کے ساتھ فرمایا:

﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ کیا کافروں کو بدلہ ملا اس کا جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے؟ اس وقت انہیں کہا جائے گا کہ تمہیں بدلہ ملا یا نہیں؟ تم نے اپنے برے اعمال کا انجام دیکھ لیا یا نہیں؟ تم دنیا میں شرک و بت پرستی پر فخر کرتے تھے، مسلمانوں کی تحقیر کرتے تھے، آج اس کا مزہ چکھ لیا اور بدلہ ملا تم کو؟ یقیناً ان کا انجام ان کے سامنے ہوگا، اور اپنے اعمال کا بدلہ انہیں مل کر رہے گا۔

سُورَةُ الْاِنْشِقَاقِ

مكيّةٌ آياتها ۲۵ ركوعها ۱

سورۂ انشقاق مکی ہے، اس میں پچیس (۲۵) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

سورت کا نام پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ الانشقاق (معنی پھٹ جانا) اس میں آسمانوں کے پھٹ جانے کا بیان ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، سورۃ الانفطار کے بعد مکہ میں نازل ہوئی۔

تعداد آیات وکلمات:

یہ سورت پچیس (۲۵) آیات، ایک سو نو (۱۰۹) کلمات اور چار سو تیس (۴۳۰) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورتوں کی طرح یہ سورت بھی احوالِ قیامت پر مشتمل ہے، اس کے ساتھ فطری استعداد وغیرہ کا اسی طرح بیان ہے جیسے کہ سابق کئی سورتوں میں بیان ہوتا رہا۔

مختصر مضامین:

پہلے احوالِ قیامت کا بیان ہوگا، پھر انسانی اعمال کے نتائج کے طور پر صحائف اعمال کا، نیز اصحاب الیمین و

اصحاب الشمال کا تذکرہ ہوگا، پھر انسانی فطرت کا ذکر ہوگا۔ جن لوگوں نے فطرت کے مقاصد پورے کیے ان کے عروج وترقی کا بیان ہوگا۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کے تنزل اور بدبختی کا تذکرہ ہوگا جنہوں نے فطری مقاصد پورے نہیں کیے، اور اس کے ساتھ وہ اصلی و بنیادی مقاصد بیان ہوں گے جن کی نشاندہی آسمانی وحی کے ذریعے بیان ہوئی۔ آخر میں بطورِ نتیجہ مؤمنین وکافرین کے انجام کا بیان مذکور ہے، یعنی جنت ودوزخ کا بیان، مؤمنین کے لیے فلاح وسعادت کا بیان اور مشرکین ومنکرین کے لیے تباہی وشقاوت کا تذکرہ ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۝۱ وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ ۝۲ وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۝۳ وَاَلۡقَتۡ مَا فِيۡهَا
وَتَخَلَّتۡ ۝۴ وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ ۝۵ يٰۤاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدۡحًا فَمُلٰقِيۡهِ ۝۶
فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيۡنِهٖ ۝۷ فَسَوۡفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيۡرًا ۝۸ وَّيَنۡقَلِبُ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ
مَسۡرُوۡرًا ۝۹ وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهۡرِهٖ ۝۱۰ فَسَوۡفَ يَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا ۝۱۱ وَّيَصۡلٰى سَعِيۡرًا ۝۱۲
اِنَّهٗ كَانَ فِىۡۤ اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ۝۱۳ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنۡ لَّنۡ يَّحُوۡرَ ۝۱۴ بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيۡرًا ۝۱۵

ترجمہ: جب آسمان پھٹ جائے گا ۝۱ اور وہ اپنے ربّ کی بات سنے گا، اور اس کے لیے یہی بات مقرر ثابت ہے ۝۲ اور جب زمین کو پھیلا دیا جائے گا ۝۳ اور نکال دے گی وہ جو کچھ اس کے اندر ہے، اور خالی ہو جائے گی ۝۴ اور وہ سنے گی اپنے ربّ کی بات، اور یہی اس کے لیے ثابت ہے ۝۵ اے انسان! تو بیشک تکلیف اٹھانے والا ہے اپنے ربّ کی طرف تکلیف اٹھانا، پس اس سے ملنے والا ہے ۝۶ پس بہر حال جس کو اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں مل گیا ۝۷ پس عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا ۝۸ اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش خوش لوٹے گا ۝۹ اور بہر حال جسے اس کا نامۂ اعمال پشت کے پیچھے سے دیا گیا ۝۱۰ پس عنقریب وہ پکارے گا ہلاکت کو ۝۱۱ اور وہ داخل ہوگا جہنم میں ۝۱۲ بیشک وہ (دنیا کی زندگی میں) اپنے گھر والوں میں خوش تھا ۝۱۳ بیشک وہ خیال کرتا تھا کہ وہ ہرگز اپنے ربّ کے سامنے پلٹ کر نہیں جائے گا ۝۱۴ کیوں نہیں؟ بیشک اس کا پروردگار اسے دیکھنے والا تھا ۝۱۵

☆☆☆

معارف ومنازل

مذکورہ آیات کا مضمون:

محقق اعظم، دانائے رموز شریعت، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان بہیمیت اور ملکیت کی کشمش میں واقع ہے، اگر اس پر حیوانیت کا غلبہ ہوا تو اس کی فطرت دب کر کمزور ہو جائے گی، اور جب فطرتِ سلیمہ کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے تو اوپر کی ترقی کا راستہ مسدود ہو جائے گا، اور یہ بعد از موت بہشت کی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا، بلکہ جہنم کے اس گڑھے میں جا گرے گا جو ساتوں زمینوں کے نیچے ہے، اگر انسان میں فطری ترقی ہوئی اور ملکیت کا جذبہ ابھر کر حیوانیت اور بہیمیت دب گئیں تو یہ اوپر کی منزل تک پہنچ کر جنت تک پہنچ سکے گا، اور ابدی سعادت حاصل کر پائے گا۔ اس سورت میں انہی باتوں کا بیان اور تذکرہ ہے۔ [حجة الله البالغه]

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ جب آسمان پھٹ جائے گا، دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ﴾ [الحاقة:۱۶] (اور آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس دن کمزور ہوگا)۔ پھر فرمایا: ﴿وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ [النبأ: ۱۹] (اور آسمان کھولا جائے گا تو اس میں دروازے ہو جائیں گے)۔ پھر فرمایا: ﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ﴾ [المعارج:۹] (جس دن ہوگا آسمان جیسے پگھلا ہوا، اور پہاڑ جیسے اُون رنگی ہوئی)۔ وغیر ذلک۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے کہکشاں والے مقامات سے آسمان پھٹے گا، یہ وہ مقام ہے جہاں دور سے چھوٹے چھوٹے ستارے نظر آتے ہیں۔ [در منثور، عزيزي]

باقی رہی یہ بات کہ آسمان کیوں پھٹے گا؟ وہ اس لئے کہ اس دن عرشِ الٰہی پر قہری تجلی نازل ہوگی، قرآن کریم نے کہا کہ (اگر آج عرش الٰہی کے حاملین چار فرشتے ہیں جبکہ) اس دن ان کی تعداد آٹھ ہو جائے گی، جیسے سورۃ الحاقۃ میں بیان ہوا۔ اس روز بڑا ثقل واقع ہوگا، جس سے آسمان سوراخ ہو کر اس میں سوراخ والے دروازے پیدا ہو جائیں گے، جسے اَبواب (دریچے) سے تعبیر فرمایا، پھر آناً فاناً سارا آسمان درہم برہم ہو کر بادلوں کی شکل میں فناء ہو جائے گا، یہ سلسلہ ختم ہو کر دوسرا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

﴿وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ﴾ اور اپنے پروردگار کے ارشاد کی تعمیل کرے گی، اور اس کو لازم بھی یہی ہے، وہ اپنے ربّ کا حکم سنے گا اور قبول کرے گا اور ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ ﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ﴾ اور جب زمین کو پھیلا

دیا جائے گا۔ ﴿وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ﴾ اور نکال دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے اور خالی ہو جائے گی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَاوَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا﴾ [الزلزلة:۳] (اور زمین اپنے (اندر) کے بوجھ نکال ڈالے گی، اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوا ہے؟)۔ سارے مرے ہوئے مدفون انسان، خزانے اور قیمتی اشیاء جو زمین کے اندر محفوظ تھے باہر نکل کر منظرِ عام پر ظاہر ہو جائیں گے، مگر ان کی طرف دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ﴾ [التكوير:۴] (اور جب بیانے والی اونٹیاں بے کار ہو جائیں گی)۔ زمین اپنے تمام خزانوں کو اگل کر باہر پھینک دے گی۔

﴿وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ﴾ ان خزانوں کے پھینکنے اور ظاہر کرنے میں وہ اپنے ربّ کے حکم کی تعمیل میں مجبور اور فرمانبردار ہے۔ حضرت امام الانبیاء ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "أنا أول من تنشق عنه الأرض"۔ [مسلم] قیامت کے روز سب سے پہلے میری قبر شق ہو کر کھل جائے گی، اور یہ بھی فرمایا: "فأكسى الحلّةَ من حلل الجنة"۔ [ترمذي] اس وقت مجھے جنت کا لباس پہنایا جائے گا۔ صحیح حدیث بخاری میں وارد ہے کہ حشر کے میدان میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا، کیونکہ کفار نے آپ علیہ السلام کو رسیوں سے باندھ کر برہنہ کر کے آگ میں ڈالا تھا، تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر آپ علیہ السلام پر ظلم ہوا، اس اعزاز میں تمام اہلِ محشر میں پہلے ان کو خلّت کا لباس پہنایا جائے گا۔ حضور اقدس ﷺ کی پوشاک بہت پہلے پہنائی جائے گی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بعد میں میدانِ محشر میں، تو حدیثوں میں تعارض نہیں رہا، مقام اور وقت مختلف ہوئے۔

دوسری روایات میں ہے کہ آپ ﷺ کے بعد جنۃ البقیع کے لوگ، پھر مکۃ المکرمہ کے لوگ اور درمیانی لوگ قبروں سے باہر نکلیں گے، پھر تمام زمین سے لوگوں کا نکلنا شروع ہو جائے گا، اور یہ زمین دوسری سفید زمین کے ساتھ تبدیل ہوگی، حساب و کتاب اس دوسری زمین پر شروع ہو جائے گا۔ ﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ﴾ [إبراهيم:۴۸] (جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی)۔ اس درمیانی وقفے میں لوگ پل صراط کے کنارے پر ہوں گے۔ [ابن ماجة، تذكرة، قرطبي]

﴿يَا اَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحاً فَمُلٰقِيْهِ﴾ اے انسان! بیشک تم تکلیف اٹھانے والے ہو اپنے ربّ کی طرف تکلیف اٹھانا، پس تو اس سے ملنے والے ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ [البلد:۴] (بیشک پیدا کیا ہم نے انسان کو مشقت میں)۔ انسان کی ساری زندگی مشقتوں کی

ہے، ابتداء آفرینش سے اس کا سفر شروع ہوا، پوری زندگی مشقتوں میں گزری، بالآخر اپنے ربّ کے پاس پہنچا۔ دراصل اس پورے سفر میں عروج وترقی کرتے کرتے ربّ کے حضور پیش ہو کر اب جواب دینا ہے اور اپنے کئے کا انجام خیر یا شر کو پا کر سفر ختم کرنا ہے، اگر یہ سفر اور عروج وترقی ربّ کے حکموں کے مطابق، توحید وایمان، طاعات و عبادات کے ساتھ وابستہ رہا تو زہے قسمت، آج بڑی ترقی اور عروج کے اعلیٰ منزل جنت تک رسائی ہوگی، اگر یہ سفر مشقتوں والا، بے دینی، کفر ومعصیتوں کی نذر رہا تو تنزل اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا، اسفل السافلین کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے برباد وتباہ ہوگا، نتیجہ صاف واضح ہے کہ اسلامی سفر بھی مشقتوں میں گزرا، مگر دینی اقدار اور فطرت کے مطابق، اسی طرح کافرانہ سفر بھی مشقتوں میں طے ہوا، مگر گمراہی وضلالت اور فطرت کے خلاف نتیجہ خراب نکلا۔ تو پہلا سفر ترقیوں کا ہوگا، جس کا نتیجہ جنت ہے۔ دوسرا سفر تنزل اور پستیوں کا رہا، جس کا نتیجہ دوزخ ہے۔

اب اسی پر تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، پہلے گروہ کا پہلے بیان:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ﴾ جسے نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا گیا وہ کامیاب ہوا۔ یہ واضح ہے کہ اہل توحید، ایماندار، عبادت گزار، کتاب وسنت پر عمل کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں کہ راست باز اور راستی پر چلنے والے، صاف وستھرے، متقی لوگ دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال حاصل کریں گے۔ پوری تفصیل سورۃ الحاقۃ میں گزر چکی، وہاں دیکھا جائے۔

﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ عنقریب اب ان سے آسان حساب (بدوں مناقشہ) لیا جائے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بخاری میں روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”من نوقش الحساب هلك“۔ جس کے حساب میں مناقشہ ہوا وہ ہلاک ہوگیا۔ اُم المؤمنین نے عرض کیا: حضور! ﴿حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حساب وکتاب کا اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوجانا ہی عرض ہے، اور یہی حساب یسیر ہے، پس اگر کسی سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور یہ کام کیوں نہیں کیا؟ یہ مناقشہ ہے، یہ بہت باریک اور سخت حالت ہے، ایسا شخص کیسے بچ سکتا ہے؟ پس تباہی ہی تباہی ہے۔ حساب یسیر میں عرض وپیشی ہے، مناقشہ نہیں، پس جان خلاص، قصہ ختم۔

حدیث میں ارشاد ہے: فإنما عليك البلاغ و علينا الحساب۔ تمہارا کام (ہمارے احکام کا) پہنچا دینا ہے، اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔ اسی طرح: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ [الغاشية: ۲۶] (بیشک ان کا حساب

ہمارے ذمہ ہے)۔تو آنحضرت ﷺ دعاء میں فرماتے تھے: "اللّٰهم حاسبني حساباً يسيراً"۔[مستدرک] اے اللہ پاک! ہم سے آسان حساب لینا۔ یہ اُمت کی بیداری اور تعلیم کی خاطر فرمایا، اُمت کے وہ لوگ جو بغیر حساب وکتاب کے جنت میں داخل ہوں گے وہ بڑے خوش قسمت ہوں گے۔علماء کرام نے فرمایا کہ وہ ستر ہزار لوگ ہوں گے، پھر ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار لوگ شامل ہوجائیں گے، پس یہ اعداد وحساب چار ارب نوے کروڑ تک پہنچ سکتا ہے۔[بدور السافرۃ] اللہ ربّ العزّت ہمیں اپنے فضل وکرم سے شامل فرما۔آمین

﴿وَّيَنۡقَلِبُ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا﴾ وہ اپنے گھر (جنت) کی طرف خوش ہوکر لوٹے گا، کیونکہ اس نے صحیح فطری ترقی والا عمل اختیار کیا، نامہ اعمال دائیں ہاتھ، جنت دائیں طرف، عمل راستبازی والا، حساب آسان، یہ سب توحید وایمان اور اعمالِ صالحہ کا انعام وبرکت ہے۔اس کے بعد دوسرے بائیں ہاتھ والے گروہ جن کی فطرت غلط استعمال ہوکر انہیں حبس دائمی میں رکھا وہ یہ ہیں:

﴿وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهۡرِهٖ﴾ اور جس کا نامہُ (اعمال) اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا۔ دوسری جگہ فرمایا:﴿اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ﴾ مطلب دونوں کا ایک ہے، ان کی تذلیل کی حد نہیں، تب ہی تو نامہُ اعمال پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا، وہ بھی بائیں ہاتھ میں، یہ بے انتہا رسوائی وذلت کی نشانی ہوگی۔

﴿فَسَوۡفَ يَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا﴾ وہ موت کو پکارے گا، اس پر انہیں کہا جائے گا، جیسے کہ ارشاد ہے: ﴿لَا تَدۡعُوا الۡيَوۡمَ ثُبُوۡرًا وَّاحِدًا وَّادۡعُوۡا ثُبُوۡرًا كَثِيۡرًا﴾ [الفرقان:۱۴] (آج ایک ہی موت کو نہ پکارو، بہت سی موتوں کو پکارو)، آج تمہارے لئے ایک ہلاکت نہیں، بلکہ بہت سی ہلاکتیں ہیں، ہر جرم کے عوض اسی جرم کے مطابق ہلاکت ہوگی، بیشمار جرائم کی بے شمار ہلاکتیں۔دوسری جگہ فرمایا:﴿فَيَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِىۡ لَمۡ اُوۡتَ كِتٰبِيَهۡ وَلَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِيَهۡ يٰلَيۡتَهَا كَانَتِ الۡقَاضِيَةَ﴾ [الحاقة:۲۷] (اور جس کا نامہُ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا: اے کاش! مجھ کو میرا (اعمال) نامہ نہ دیا جاتا، پہلی موت سے میرا خاتمہ ہوجاتا، اور دوبارہ زندہ نہ ہوتا، اب مجھے موت آجائے کیا اچھا ہوگا)۔

﴿وَّيَصۡلٰى سَعِيۡرًا﴾ اور جہنم میں داخل ہوگا، کیونکہ: ﴿اِنَّهٗ كَانَ فِىۡۤ اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا﴾ وہ دنیوی زندگی میں اپنے گھر میں عیش وطرب کے ساتھ رہا، دارِ آخرت پر دنیا کو اور نعیم مقیم پر چند روزہ رہنے والی لذّتوں کو ترجیح دیتا رہا، اور داعیانِ حق کی تکذیب پر کمر بستہ رہا، فطری ترقی کو عبث اور مشکوک کہتا رہا، اصلی فطرت کو ضائع کر کے حبِ

عاجلہ میں مستغرق رہا، دینی اقدار پر تمسخر و مذاق کرتا رہا، اور یہاں تک دلیری کی کہ کہتا تھا: ''قیامت وحساب کچھ نہیں''۔

﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنۡ لَّنۡ يَّحُوۡرَ﴾ اور خیال کرتا تھا کہ (خدا کی طرف) پھر کر نہ جائے گا، وہ فاسد العقیدہ رہا، توحید کا منکر، قیامت کا منکر، حق والوں کا بدخواہ، تکذیب کرنے والا رہا۔ ﴿بَلٰىۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيۡرًاؕ﴾ ہاں ہاں! اس کا پروردگار اس کو دیکھ رہا تھا، قیامت برحق ہے، اللہ تعالیٰ کے پاس سب کو پلٹ کر جانا ہے اور پوری زندگی کے ہر ذرہ عمل کا حساب دینا ہے، حساب لینے والا ہر عمل سے باخبر نگراں دیکھنے والا ہے، اس سے نہ کوئی چھپ سکتا ہے، نہ بھاگ کر بچ سکتا ہے، نہ کوئی ذرہ برابر عمل چھپا سکتا ہے، وہ قادر مطلق ربّ ہے، وہ علیم بذات الصدور ہے، ظاہری اعمال کیا، وہ تو دلوں کے بھید اور سارے ارادوں پر باخبر ہے۔

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِۙ ۝۱۶ وَالَّيۡلِ وَمَا وَسَقَۙ ۝۱۷ وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَۙ ۝۱۸ لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍؕ ۝۱۹ فَمَا لَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَۙ ۝۲۰ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيۡهِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا يَسۡجُدُوۡنَ ۝۲۱ بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُكَذِّبُوۡنَۖ ۝۲۲ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُوۡعُوۡنَۖ ۝۲۳ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍۙ ۝۲۴ اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۝۲۵

ترجمہ: پس میں قسم اٹھاتا ہوں شفق کی ۝۱۶ اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو رات اپنے اندر سمیٹتی ہے ۝۱۷ اور قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے ۝۱۸ البتہ تم ضرور ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی پر چڑھو گے ۝۱۹ پس ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟ ۝۲۰ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ نہیں کرتے ۝۲۱ بلکہ وہ لوگ جو کافر ہیں وہ جھٹلاتے ہیں ۝۲۲ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں ۝۲۳ تو انہیں عذاب الیم کی خوشخبری سنا دیجئے ۝۲۴ مگر جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال انجام دیئے ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر وثواب ہے ۝۲۵

معارف ومنازل

انسان تین قسم کی زندگی یا تین قسم کی منزلوں کے ساتھ وابستہ ہے: اول: موجودہ زندگی۔ دوم: آنے والی

برزخی زندگی۔سوم: برزخی زندگی کے بعد آخرت کی ابدی زندگی۔اللہ تعالیٰ نے ان چند چیزوں پر قسم اٹھا کر مسئلہ کی وضاحت فرمائی ہے، جس سے موجودہ زندگیوں کے ساتھ جو مناسبت ہے وہ بھی واضح ہے، تو یوں فرمایا:

﴿فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ﴾ (مجھے شفق کی قسم) شفق بطور اشتراک غروب شمس کے بعد کی سرخی اور سفیدی دونوں کو کہتے ہیں۔نماز مغرب کے سلسلے میں دیگر تمام ائمہ نے شفق سے سرخی مراد لی ہے (سرخی کی موجودگی تک نماز مغرب ادا کرنے کا فتویٰ دیا ہے، جبکہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک شفق سے مراد سفیدی ہے، جو سرخی کے بعد ہے، اور تقریباً غروب کے بعد سوا گھنٹہ تک رہتی ہے، اس سفیدی تک مغرب کا وقت برقرار ہے۔البتہ شفق کے بعد پھر مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے، اور پوری رات تاریکی رہتی ہے۔تو مطلب یہ ہوا کہ جس طرح غروب آفتاب پر شفق پیدا ہوتی ہے، اسی طرح انسانی زندگی کا سورج جب غروب ہوتا ہے، تو اس پر تین قسم کی حالتیں پیش آتی ہیں۔

مرنے کے بعد انسان کی تین حالتیں:

پہلی حالت:

انسان کی موت کے فوراً بعد شفق کی حالت پیش آتی ہے، اور شفق کا وقفہ دن کا حصہ ہوتا ہے، اور دن کے ساتھ ملا ہوا ہے، جب تک سرخی یا سفیدی قائم رہتی ہے وہ دن کے حکم میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح مرنے کے بعد کچھ قلیل مختصر عرصہ تک میت کو دنیا کے حالات کے ساتھ مناسبت رہتی ہے، دنیا کے ساتھ اس کا تعلق جلدی منقطع نہیں ہوتا ہے، جس طرح کچھ عرصہ کے لیے شفق کو دن کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے، اسی طرح مرنے والے کی نسبت اس دنیا کے ساتھ قائم رہتی ہے، اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کسی نیک شخص کو دفن کیا جاتا ہے اور قبر میں سوال و جواب کی نوبت آتی ہے تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے، اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سورج غروب ہو رہا ہے، وہ فرشتوں کو کہتا ہے: دعوني أصلي العصر (ذرا مجھے مہلت دے دو میں عصر کی نماز پڑھ لوں) نماز کا وقت جا رہا ہے، گویا کچھ عرصہ کے لیے، چالیس روز یا کچھ زیادہ عرصہ تک مرنے والے کا رخ اس دنیا کی طرف ہوتا ہے۔[ابن ماجة]

اسی لئے فقہاء وعلماء فرماتے ہیں کہ ایسے وقت میں میت کے لیے دعا، استغفار، نوافل، صدقات ایصال ثواب بہت مفید ہوتا ہے، کیونکہ اس کا رخ دنیا کی طرف ہوتا ہے، لہٰذا جتنا ممکن ہو ورثاء اسے ہر قسم صدقات کے ذریعہ فائدہ پہنچائیں، جب شفق کا وقت ختم ہوتا ہے، تو رات کی تاریکی چھا جاتی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے شفق کے بعد رات کی قسم کھائی، فرمایا: ﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴾ اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو رات اپنے اندر سمیٹتی ہے۔

دوسری حالت:

اسی طرح میت پر دوسرا دور عالم برزخ کا آتا ہے، جو کہ رات کی طرح تاریک بھی ہے اور لمبا بھی (بہ نسبت مختصر وقت شفق کے) پہلے شفق کے وقت میت کا رخ دنیا کی طرف زیادہ تھا، اب رات ہوگئی اور اس کا تعلق دنیا سے کٹ کر برزخ کے ساتھ قائم ہوگیا۔ اس بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ایسا عرصہ ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے نیک و بد اعمال کے مطالعہ میں مصروف ہوتا ہے، دنیا میں کئے گئے تمام اعمال اس کے سامنے ہوتے ہیں، اور وہ ان کا تجزیہ کرتا ہے، اور وہاں اس کو راحت اور دکھ پہنچتا رہتا ہے، چنانچہ جب وہ اپنے اعمال کا مطالعہ مکمل کرلے گا اور سمجھ لے گا کہ میرے اعمال یہی ہیں، ان کے علاوہ اور کچھ نہیں، اسی روز حشر برپا ہوگا۔ [تفسیر عزیزی]

تیسری حالت:

انسان کی تیسری حالت روز محشر کے دن کا ہے اور حشر کی مثال واضح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ﴾ اور قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہوجائے۔ شروع ماہ میں وہ باریک ہلال تھا، پھر بتدریج بڑھتے بڑھتے چودھویں تاریخ کو مکمل ہوجاتا ہے اور بدر کہلاتا ہے، تو مرنے والے انسان کی تیسری حالت کی یہی مثال ہے، جس طرح چاند پورا ہوجاتا ہے، اسی طرح انسان بھی باقی منازل طے کرکے تیسرے مرحلے پر حشر میں پہنچ جاتا ہے، اور اس کا محاسبہ شروع ہوجاتا ہے، گویا مرنے کے بعد انسان پر یکے بعد دیگرے تین حالات گزرتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا:

﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقاً عَنْ طَبَقٍ﴾ تم ایک سیڑھی سے دوسری پر چڑھو گے، یا ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوں گے۔ جس طرح اس دنیا کے مختلف مراحل سے گزرے، اسی طرح مرنے کے بعد کئی منازل طے کرنا ہوں گی، انسان کی پیدائش اور اس کی مختلف کیفیات خود قرآن کریم نے مختلف مقامات میں مختلف انداز میں بیان فرمائیں۔

وہ ابتداء میں ﴿لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا﴾ [الدھر: ۱] (یہ انسان کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا) اسے رحمِ مادر میں قطرۂ آب کی شکل میں داخل کیا، پھر چالیس روز تک اس میں تبدیلیاں آئیں، چالیس روز کے بعد علقہ بنا، تیسرے چالیس کے بعد مضغہ بنا، پھر جسم وصورت روح اور ہڈیوں کا مرحلہ آیا، پھر رزق کا فیصلہ ماں کے خون سے ہوا، پھر چار چیزوں کا فیصلہ صادر ہوا: مرد وعورت، رزق وروزی، اجل وعمر، سعادت وشقاوت لکھے گئے۔ پھر شکمِ مادر

سے باہر آیا، دوسال تک اعلیٰ خوراک موافقِ مزاج، چھاتی کا دودھ پیتا رہا، پھر بچپن کا زمانہ، پھر آہستہ بتدریج شعور کا زمانہ، پھر نوجوانی، علم وادب شادی، بیوی بچے، سسرال، تجارت، صنعت، حرفت، مالداری سرمایہ، مکان، بڑی بڑی دیگر ذمہ داریاں، پھر شیخوخت و بڑھاپا اور ضعف و کمزوری، طرح طرح کے امراض و آلام، پھر موت اور اختتامِ حیات کے مراحل آئے۔

پھر زمین کی سپردگی اور شفق کا مرحلہ، برزخی لمبی مدت، پھر حشر ونشر، حساب و کتاب، پل صراط وغیرہ، پھر آخری مرحلہ، یا ابدی جنت وراحت، یا ابدی دوزخ وعذاب یہ مسافر کہاں سے چلا کہاں پہنچا، ازل سے سفر شروع کیا تھا، ابد تک پہنچ کر سفر کا اختتام ہوا، دنیا اس کی منزل و مستقر نہیں تھی، وہ محض راہ گزر وانتظار گاہ تھی، مگر بیوقوف اور ناداں نے اسے آخری منزل سمجھ کر سب کچھ کھویا اور ناکام رہا، جبکہ موحد مؤمن نے انبیاء علیہم السلام کے کہنے پر عمل پیرا ہو کر ایسا نہیں کیا، دنیا کو آخری منزل نہیں کہا، آخرت کو آخری مستقر سمجھ کر سب کچھ تیاری کی اور سعادت پائی۔ **اللّٰھم اجعلنا منھم۔ آمین**

نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح انسان اپنی زندگی میں کئی طبقات عبور کر کے موت سے ہمکنار ہوتا ہے، اسی طرح وہ موت کے بعد کئی طبقات و مراحل سے گزر کر اپنی آخری منزل تک پہنچتا ہے، اور مؤمن انسان کی آخری منزل بہشت ہے، جبکہ کافروں کی آخری منزل دوزخ ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ موت سے پہلے تمام مراحل، نطفہ سے لے کر موت تک جسمانی نشوونما اور تدریجی بدنی ترقی سارے تکوینی اور غیر اختیاری ہیں، جن میں مؤمن و کافر ہر قسم کے حیوانات وغیرہ شامل ہیں، کیونکہ یہ سب تخلیقی امور ہیں، مگر ان کے ساتھ چند ایک روحانی اور ایمانی بنیادی طبقے ہیں، جن کی ابتداء کلمہ طیبہ سے ہے اور اختتام بھی، یہ سارے طبقے دراصل عقلی اور روحانی اختیاری ہیں، اور انسان کو انہی مدارج کی تحصیل کے لیے مکلف بنا کر اسے کہا گیا ہے کہ: ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الکھف:۲۹] (تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے)، پس آخری منزل کی سعادت اور شقاوت کا مدار صرف انہیں روحانی اقدار کے ساتھ مربوط ہے۔

اس کی ابجد **كلّ مولود يولد على الفطرة (أي فطرت أزليه)** فطرتِ ازلی پر رکھا ہوا ہے، جس کی ترقی و عروج اور تنزل و پستی دونوں انسانِ مکلف کی مرضی اور اختیار پر ہیں، جو کوئی اس فطرتی استعداد پر رہے گا اور اس کی ترقی پر کوشاں رہے گا، اس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اسے جنت (اس کی آخری منزل) کی

سے باہر آیا، دو سال تک اعلیٰ خوراک موافقِ مزاج، چھاتی کا دودھ پیتا رہا، پھر بچپن کا زمانہ، پھر آہستہ بتدریج شعور کا زمانہ، پھر نوجوانی، علم وادب شادی، بیوی بچے، سسرال، تجارت، صنعت، حرفت، مالداری سرمایہ، مکان، بڑی بڑی دیگر ذمہ داریاں، پھر شیخوخت و بڑھاپا اور ضعف و کمزوری، طرح طرح کے امراض و آلام، پھر موت اور اختتامِ حیات کے مراحل آئے۔

پھر زمین کی سپردگی اور شفق کا مرحلہ، برزخی لمبی مدت، پھر حشر و نشر، حساب و کتاب، پل صراط وغیرہ، پھر آخری مرحلہ، یا ابدی جنت و راحت، یا ابدی دوزخ و عذاب یہ مسافر کہاں سے چلا کہاں پہنچا، ازل سے سفر شروع کیا تھا، ابد تک پہنچ کر سفر کا اختتام ہوا، دنیا اس کی منزل و مستقر نہیں تھی، وہ محض راہ گزر وانتظار گاہ تھی، مگر بیوقوف اور ناداں نے اسے آخری منزل سمجھ کر سب کچھ کھو یا اور ناکام رہا، جبکہ موحد مؤمن نے انبیاء علیہم السلام کے کہنے پر عمل پیرا ہو کر ایسا نہیں کیا، دنیا کو آخری منزل نہیں کہا، آخرت کو آخری مستقر سمجھ کر سب کچھ تیاری کی اور سعادت پائی۔ **اللّٰھم اجعلنا منھم۔ آمین**

نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح انسان اپنی زندگی میں کئی طبقات عبور کر کے موت سے ہمکنار ہوتا ہے، اسی طرح وہ موت کے بعد کئی طبقات و مراحل سے گزر کر اپنی آخری منزل تک پہنچتا ہے، اور مؤمن انسان کی آخری منزل بہشت ہے، جبکہ کافروں کی آخری منزل دوزخ ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ موت سے پہلے تمام مراحل، نطفہ سے لے کر موت تک جسمانی نشوونما اور تدریجی بدنی ترقی سارے تکوینی اور غیر اختیاری ہیں، جن میں مؤمن و کافر ہر قسم کے حیوانات وغیرہ شامل ہیں، کیونکہ یہ سب تخلیقی امور ہیں، مگر ان کے ساتھ چند ایک روحانی اور ایمانی بنیادی طبقے ہیں، جن کی ابتداء کلمہ طیبہ سے ہے اور اختتام بھی، یہ سارے طبقے دراصل عقلی اور روحانی اختیاری ہیں، اور انسان کو انہی مدارج کی تحصیل کے لیے مکلف بنا کر اسے کہا گیا ہے کہ: ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الکھف: ۲۹] (تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے)، پس آخری منزل کی سعادت اور شقاوت کا مدار صرف انہیں روحانی اقدار کے ساتھ مربوط ہے۔

اس کی ابجد کلّ مولود یولد علی الفطرة (أي فطرت أزليه) فطرتِ ازلی پر رکھا ہوا ہے، جس کی ترقی و عروج اور تنزل و پستی دونوں انسانِ مکلف کی مرضی اور اختیار پر ہیں، جو کوئی اس فطرتی استعداد پر رہے گا اور اس کی ترقی پر کوشاں رہے گا، اس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اسے جنت (اس کی آخری منزل) کی

طرف روانہ کیا جائے گا۔اس کے برعکس جو مکلف انسان اپنی فطرت کو ضائع کر کے اس کی ترقی کی بجائے ایک کافرانہ تنزل وبدبختی اور پستی کی طرف گامزن ہوگا اور وہ جانوروں کی چراہ گاہ میں داخل ہوجائے گا، تو اس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ یا پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا اور اسے دوزخ (آخری منزل) کی طرف روانہ کیا جائے گا۔

﴿وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنِ﴾ [الذاریات:۲۱] (اور خود تمہارے نفوس میں، تو کیا تم دیکھتے نہیں؟)۔

اللہ تعالیٰ کی ان تمام نعمتوں کے باوجود گمراہ انسان ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت اختیار کرتا ہے، تو شکوہ ہو رہا ہے:

﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے؟ یہ ان کے کیسے غلط اور سراسر نادانی کے فیصلے ہیں کہ خیر محض کو چھوڑ کر شرِ محض کا انتخاب کر رہے ہیں، ان کی فطرت کا تقاضا ہرگز یہ نہیں کہ خالص توحید و ایمان کو چھوڑ کر منعمِ حقیقی سے بغاوت پر ڈٹے رہیں، ناشکری کی انہوں نے حد کر دی، اور اپنی قیمتی جانوں اہل وعیال سے دُشنی مول لی اور جہنم خرید کر عظیم الشان جنت فروخت کر دی۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جہنمیوں کو حسرت کی خاطر جنت کا منظر دکھا کر ان سے کہا جائے گا: اے بدبختو! ذرا یہ منظر دیکھو! اگر تم ایمان پر کفر کو اختیار نہ کرتے تو یہی تمہارا ابدی ٹھکانا ہوتا، اسی طرح مؤمنوں کو دوزخ کا منظر دکھا کر انہیں کہا جائے گا: دیکھو! یہ قبیح منظر اور شکر کرو کہ اگر تم ایمان کی دولت اختیار نہ کرتے تو تمہارا ابدی ٹھکانا یہی جہنم ہوتا، پس مؤمن شکر الحمد للہ اور حمد وثنا شروع کریں گے، اور کفار کے زخموں پر نمک پاشی ہوگی، وہ ویل وحسرت میں چیخ رہے ہوں گے۔ [مشکوٰۃ]

﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ﴾ جب ان کے سامنے صحیفۂ رحمت (جو کہ جنتی ضمانت ہے) قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے، تو عاجزی نہیں کرتے، اپنے محسن ومنعم جل مجدہٗ کے حضور سجدہ نہیں کرتے ہیں، اسی سجدہ سے انکار نے تو ان کے سربراہ کو ابدی راندۂ درگاہ بنا دیا، چاہئے کہ وہ عبرت حاصل کریں۔

قران کریم کیا ہے؟ سرچشمہ ہدایت ہے، زندگی کا اصل معیاری رہنما ہے۔ أخذه سعادة و تركه شقاوة و حسرة طوبى لأمة تتكلم به و طوبى لا لسنة تتلوه و لقلوب أدركوه و فهموه، وهو النور المبين و الصراط المستقيم، و من تلاه ناجي الملك الجبار و من حفظه أمن من عذاب القبر و من سعير النار بشرى لنا معشر الإسلام أن لنا من العناية ركنا غير منهمدم، فالحمد لمن نزّله والشكر لمن أنزله و الصلوٰة والسلام على من أخذه و حفظه و بلغه وأدّى حقه والرحمة والرضوان على من قرأة و نشره و

عمل بہ فنعم العالم ھُو بہ۔

آن کتابِ زندہ قرآن حکیم ☆ حکمت او لایزال ست وقدیم
حرف او را ریب نے تحریف نے ☆ معنی اش شرمندہ تاویل نے
صد جہاں زندہ درآیات او ☆ عصرہا پیچیدہ در آنات او
نوع انسان را پیام آخرین ☆ حامل او رحمۃ للعلمین
(اقبال)

قرآن پاک کے چودہ مقامات ایسے ہیں کہ جب سجدہ کی آیت کی تلاوت کی جائے تو تالی اور سامعین پر سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتی ہے، خواہ سامعین سماع کا قصد کریں، یا نہ کریں، البتہ بروقت سجدہ ضروری نہیں ہے، اگرچہ بہتر ہے، بعد میں اس کی ادائیگی ضروری ہے، کیونکہ سامعین بسا اوقات بے وضوء بھی ہوتے ہیں۔

مسئلہ سجدہ تلاوت اور اس کی فضیلت:

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سجدۂ تلاوت نماز وتر کی طرح واجب ہے، بصورتِ موت، میت کی طرف سے دوسری نمازوں کی طرح فدیہ واجب ہے۔ حضرات ائمہ ثلاثہ رحمۃ اللہ علیہم اس کو سنت اور اختیاری اور مستحب کہتے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سجدۂ تلاوت کے لیے وضوء کو شرط نہیں مانتے، سجدہ کی تعریف یہ ہے کہ بارادۂ عبادت اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لیے اس کے حضور میں پیشانی عاجزی کے ساتھ زمین پر رکھنا۔ یہ بڑے لطف اور تقرب کی عبادت ہے، اس میں بہت بڑا ذخیرۂ ثواب کا رکھا ہوا ہے۔

ایک صحابی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت میں آپ کی معیت و رفاقت کا سوال کیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ سوال چھوڑ دو، کوئی اور سوال یا مطالبہ کرو، کہنے لگے: یارسول اللہ! بس یہی سوال ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: **فاعنّي علیٰ نفسک بکثرۃ السجود۔** (تم میری مدد کرو اپنے نفس کے ساتھ زیادہ سجدہ کرنے میں) یعنی کثرت سے نماز اور کثرت سے سجود کا اہتمام کرو، اس سے میری مدد ہو جائے گی، کیونکہ میرا پروگرام یہ ہے کہ کثرت سے زیادہ سجدہ کروں اور کثرت سے لوگوں میں سجدہ کی عادت ڈالدوں، جب آپ کثرت سے سجدہ کریں گے تو میری مدد ہو جائے گی، اور میں آپ سے راضی رہوں گا، یہی میری رضا جنت میں آپ کے لیے میرے قرب و رفاقت کا سبب بنے گا۔ [فتح الباري جلد: ۱۴۔ مشکوۃ]

حدیثِ شفاعت کے تحت لکھا ہے کہ آپ ﷺ قیامت میں دس قسم کی شفاعت کریں گے: دو عمومی اور آٹھ خصوصی، ہر شفاعت میں آپ ﷺ سجدہ کریں گے، بسا اوقات آپ ﷺ کا ایک سجدہ ایک ہفتہ کا ہوگا، اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ایک ہی سجدہ جاری رہے گا، تب فرمان ہوگا: یا محمد! ارفع راسک۔ معلوم یہی ہوا کہ سجدہ ایک عظیم عبادت ہے، اور حصول رضاء الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ وسبب ہے، پس خوش قسمت لوگ وہ ہیں جو رغبت ورہبت کے ساتھ کثرت سے سجدہ کرتے ہیں، اور جو لوگ سجدہ کے منکر ہیں وہ ابدی محروم رہیں گے، اور جو مسلمان کم سجدہ کرتے ہیں، یا سرے سے نماز اور سجدہ سے محروم رہتے ہیں تو وہ رفعِ درجات اور عالی مقامات تک رسائی حاصل نہیں کرسکیں گے۔

سورۃ القلم میں گزرا کہ میدانِ حشر کے موقع پر کشفِ ساق کے ساتھ مخلص سجدہ کنندگان سجدہ کریں گے، اور بدقسمت محروم ہی رہیں گے۔ ایک ولی کامل سے پوچھا گیا کہ بلندئ درجات کا نسخہ وعمل بتاؤ، کہنے لگے: چار ہیں، کثرتِ رکوع، کثرتِ سجود، تلاوتِ قرآن، صلوٰۃ وسلام علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت، ربّ کریم نے سورۃ المرسلات میں بدنصیب لوگوں کا تذکرہ فرما کر کہا ہے: ﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ ارۡكَعُوۡا لَا يَرۡكَعُوۡنَ﴾ [المرسلات: ۴۸] (اور جب ان سے کہا جائے کہ رکوع کرو تو رکوع نہیں کرتے)۔ اور یہاں سورۂ انشقاق میں فرمایا:

﴿وَاِذَا قُرِئَ عَلَيۡهِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا يَسۡجُدُوۡنَ﴾ تو اہل حق اور اہل جہنم کی تمیز ہوگئی کہ رکوع وسجدہ جنتیوں کی صفت قرار پائی اور رکوع وسجدہ سے انکار، یہ دوزخیوں کی صفت قرار پائی۔ اس مسئلے پر تفصیل گزر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ: ''جب ابن آدم سجدہ کرتا ہے تو شیطان الگ کھڑے ہوکر اپنے سر پر مٹی ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ آدم کے بیٹے کو جب سجدہ کا حکم ملا وہ سجدہ کرکے کامیاب ہوگیا اور قرب الٰہی حاصل کیا، مگر افسوس کہ مجھے سجدہ کا حکم ہوا تو میں نے انکار کردیا، لہٰذا میں رجیم ومردود ہوا''۔ [ترمذي] شیطان یہ کچھ کہتا ہے تو حسد وحسرت کی بناء پر کہتا ہے، نہ کہ توبہ کے طور پر، بلکہ اس کی توبہ کا مسئلہ ہی ختم ہوچکا ہے، اسے توبہ کے لیے نہ آمادگی ہے اور نہ ہی قبولیت۔ ''قد جف القلم في حقه ولا يتوب ولا يقبل أبداً''۔

حدیث شریف میں آتا ہے: أقرب ما يكون العبد إلى الله وهو ساجد۔ [مشکوٰۃ] حصولِ قرب الٰہی کے لیے سجدۂ عبادت ایک اکسیری عمل ہے، سارے حیوانات اپنی خوراک، دانہ پانی حاصل کرنے کے لیے غذا کی

طرف سر جھکا کے کھاتے رہتے ہیں، یہی ان کے لیے مقرر ہے، مگر انسانی تخلیق میں یہ راز مضمر ہے کہ یہ مکلف سوائے رب العلمین کے کسی اور چیز پر نہ جھکے، اس کا اعزاز و برتری سجدہ میں رکھی گئی ہے، اور کھانے پر جھکنے سے اسے بچا کر ہاتھوں کی مدد سے بصد احترام کھانے لگا ہے۔ آگے حرمان عن السجدۃ کی شناعت بیان ہوگی۔ فرمایا:

﴿بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ بلکہ جو کافر ہیں سجدہ سے منکر و محروم ہیں۔ یاد رہے کہ یہ لوگ اگر سجدہ نہیں کرتے تو صرف محسنِ حقیقی کے حضور سجدہ نہیں کرتے، اگر دیکھا جائے تو ہر قبر و مزار پر ہر شجر و حجر، ہر بے جان پتھر کے تراشیدہ بتوں پر، ہر ستارہ و شمس و قمر کے حضور صبح و شام بے دریغ سجدہ ریز ہو رہے ہیں، یہ کتنے احمق، بے شعور، و بے عقل ہیں؟

﴿یُکَذِّبُوۡنَ﴾ یہ صرف حق اور سجدوں کے حقدار کو جھٹلاتے ہیں۔

﴿وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُوۡعُوۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ جو کچھ یہ اپنے دلوں میں جمع کر رہے ہیں۔ یعنی برے عقائد، غلط اعمال، حرام و معاصی اور تکذیبِ حق و انکار عن القرآن والسجدۃ، غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام سیئات و معاصی سے باخبر اور عالم ہے، روزِ جزاء یہ عذاب سے نہیں بچ سکتے۔

﴿فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ﴾ تو ان کو دکھ دینے والے عذاب کی خبر سنا دو۔ ہاں! جو لوگ ان کی طرح نہیں تو فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ﴾ ہاں! جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔ جن لوگوں نے ایمان قبول کیا، نورِ توحید کو اپنے دلوں میں استوار کیا، تمام ایمانیات کی تصدیق کی، ارکانِ خمسہ پر عمل پیرا ہوئے، قرآن و حدیث کو مشعل راہ بنایا، اعمالِ صالحہ پر عامل رہے، معاصی، شرک و بدعات سے اجتناب کیا اور پوری زندگی اسلامی گزاری، حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے کئے، ان کے لیے غیر منقطع، یعنی نہ ختم ہونے والا اجر ثواب ہے۔ ﴿اُدۡخُلُوۡہَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیۡنَ﴾ [الحجر:۴۶] (جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، بے خوف و خطر ہو کر) یہ لوگ ہمیشہ ابد الآباد سرمدی جنت کے وارث بنیں گے۔ الحمد للہ رب العلمین

سُورَةُ الْبُرُوج

مكيةٌ آياتها ٢٢ ركوعها ١

سورۂ بروج مکی ہے، اس میں بائیس (۲۲) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

سورت کا نام سورۃ البروج ہے، اس کی پہلی آیت میں البروج کا لفظ مذکور ہے اسی سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔ بروج جمع ہے بُرج کی، بعضوں نے کہا کہ اس سے مراد ستارے ہیں، ﴿ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ بمعنی ذات الکواکب۔ مشہور یہ ہے کہ بروج سے مراد وہ منزلیں اور راستے ہیں جن پر چاند و سورج روزانہ کے حساب اور ماہوار کے حساب سے رواں دواں چلتے رہتے ہیں۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، سورۃ الشّمس کے بعد مکہ میں نازل ہوئی۔

تعداد آیات، کلمات اور حروف:

اس کی بائیس (۲۲) آیات، ایک سو نو (۱۰۹) کلمات اور چار سو اڑتیس (۴۳۸) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

ماقبل کی طرح یہ سورت بھی قیامت کے بارے میں ہے، سابق سورت فطری تقاضوں پر اثباتِ قیامت پر حجت ودلیل ہے، یہ سورت ظلم وزیادتیوں کے ازالے اور قیامِ عدل وانصاف کی بنیاد پر قیامت پر ثبوت ودلیل کے طور

پر ہے۔

مختصر موضوع:

شروع سورت میں چند قسمیں بیان ہوں گی، پھر اصحاب الاخدود کے ظلم وزیادتیوں کا تذکرہ ہے، اہلِ ایمان کے عزم واستقامت کا بیان ہوگا، جنتی اور دوزخی دونوں کی عاقبت اور انجام کا بیان، حضرت باری تعالیٰ کی مخصوص صفات اور قرآن کریم کی حقانیت کا تذکرہ، اور گزشتہ نافرمان تباہ شدہ اقوام اور ان کی تباہی وبربادی کا بیان ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ﴿۱﴾ وَالۡيَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشۡهُوۡدٍ ﴿۳﴾ قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۴﴾
النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ﴿۵﴾ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ﴿۷﴾ وَ
مَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَتُوۡبُوۡا فَلَهُمۡ
عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِيۡقِ ﴿۱۰﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ جَنّٰتٌ
تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡكَبِيۡرُ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: قسم ہے ستاروں والے آسمان کی ① اور اس (قیامت) کے دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے ② اور قسم ہے حاضر ہونے والے (جمعہ کے دن) کی، اور قسم ہے اس (عرفے کے دن) کی جس کے پاس حاضری ہوتی ہے ③ کھائیوں والے مارے گئے ④ وہ ایندھن والی آگ تھی ⑤ بلکہ وہ (ظالم) اس آگ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے ⑥ اور اہل ایمان کے ساتھ جو زیادتیاں کررہے تھے (ان کو اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے تھے ⑦ اور انہوں نے نہیں عیب پایا، ان ایمان والوں میں سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے جو غالب اور تعریفوں والا ہے ⑧ وہی اللہ تعالیٰ جس کی حکومت تمام آسمانوں اور زمین پر ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے ⑨ بیشک جن لوگوں نے ایماندار مردوں اور ایماندار عورتوں کو فتنے میں ڈالا، پھر (اس ظلم سے) توبہ نہ کی، تو ایسے لوگوں کے لیے جہنم کی سزا ہے، اور ان

کے لیے سخت جلانے والی سزا مقرر ہے⑩ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے ان کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ بہت بڑی کامیابی ہے⑪

معارف ومنازل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز میں سورۂ بروج، سورۂ طارق اور سورۂ اعلیٰ تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ [مسند أحمد]

بروج سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا﴾ [الفرقان:٦١] حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بروج وہ ہیں جن میں حفاظت کرنے والے فرشتے رہتے ہیں۔ حضرت ابن خیثمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بروج سے مراد سورج اور چاند کی منزلیں (راستے) ہیں جو کہ بارہ ہیں، سورج ہر ماہ کسی ایک میں چلتا رہتا ہے، اور چاند ان میں سے ہر ایک میں دو دن اور ایک تہائی دن چلتا ہے، تو یہ اٹھائیس دن ہوئے اور دو رات وہ پوشیدہ رہتا ہے۔ [ابن کثیر] عام مفسرین بروج سے ستارے مراد لیتے ہیں۔

شاهد، مشهود اور يوم موعود:

﴿يَوْمِ الْمَوْعُوْدِ﴾ سے مراد قیامت ہی ہے، شَاهِد سے بعضوں نے ذات باری تعالیٰ مراد لی ہے، جیسے: ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ شاہد سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جیسے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ [الأحزاب: ۴۵] (اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے)۔ حدیث شریف میں ہے کہ شاہد سے مراد جمعة المبارک کا دن ہے۔ [ترمذي] یہی اکثر علماء تفسیر کا قول ہے، اور مَشْهُوْد سے مراد یوم عرفہ ہے، رواه أحمد وغيره من حديث أبي هريرة وغيره من الصحابة رضي الله عنهم۔ [ابن كثير]

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ قسم ہے ستاروں والے آسمان کی۔ یہ سارے ستارے دیکھ رہے اور گواہی دے رہے ہیں کہ کس قدر بے انتہا ظلم ہو رہا ہے کہ ستر ہزار معصوم بے گناہ پاکیزہ مؤمنوں کو گڑھوں میں آگ لگا کر ڈال دیا گیا، اور جس بے رحمی کا سلوک ہوا شاید آسمان اور اس کے ستارے پھٹ جائیں، تو وہ اس کے حقدار ہیں۔

﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ﴾ قیامت کے دن کی قسم۔ جہاں اعمال کی خاک چھانی ہوگی اور ظالموں کو ان کی

زیادتیوں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور مظلوموں کی دادرسی ہوگی، اسی لئے تو قیامت کی آمد ضروری ہے، تاکہ ہر ایک مظلوم کی حق رسی ہو اور ہر ایک ظالم سے انتقام ہو۔

﴿وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ﴾ قسم ہے جمعۃ المبارک کی (جو کہ سید الایام ہے)، اور قسم ہے یومِ عرفہ مبارکہ کی، جس کے بڑے بڑے مناقب وفضائل ہیں کہ جہاں ساری خلقت جمع ہو کر اپنے ربّ کے حضور دعا واستغفار وغیرہ اور نیک اعمال میں مشغول ہوتی ہے۔ یہ دونوں اجتماعی دنوں کو قیامت کے دن کے ساتھ ایک جزوی مشابہت بھی ہے۔

﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ﴾ تباہ وبرباد ہوئے خندقوں والے لوگ۔ ﴿النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ﴾ وہ ایک آگ تھی ایندھن والی۔ أخدود، خد کی جمع ہے، بمعنی خندق، گڑھے۔ وقود معنی ایندھن، جس سے آگ جلائی گئی ہو، جیسے فرمایا: ﴿وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ [التحریم:۶] (جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہے)۔

اصحاب الاخدود کون ہیں؟

یہ اصحاب الاخدود کون لوگ ہیں؟ یہ کس سرزمین کا واقعہ ہے؟ اور یہ کب ہوا؟ اس سلسلے میں بہت سے تاریخی واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک واقعہ بخت نصر کے زمانے میں ''موصل'' عراق میں واقع ہوا، جہاں اہل ایمان مؤمنوں کو زندہ آگ کی خندقوں میں ڈالا گیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ یہ خندقوں والے اہل فارس والے لوگ ہیں، جنہوں نے اسلام سے قبل بنی اسرائیل کے مسلمانوں کو خندقوں میں آگ بھر کر سزا دی اور جلا دیا۔ یہ دونوں واقعے اپنی جگہ صحیح اور مستند تاریخی واقعات کے حصے ہیں، مگر یہاں جن اصحاب الاخدود کا تذکرہ ہے، یہ ملکِ یمن صوبہ نجران کا واقعہ ہے، یہ صوبہ آج کل سعودی عربیہ کا حصہ ہے، جو کسی وقت یمن میں شامل تھا۔

یہ جان گداز اور دردناک واقعہ ملکِ یمن کے صوبہ ''نجران'' میں بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ستر سال پہلے پیش آیا، یہ واقعہ صحیح مسلم، جامع ترمذی اور مسند احمد میں موجود ہے، دیگر کتب احادیث وتفسیر میں بھی کہیں مطول، اور کسی جگہ مختصر طور پر موجود ہے۔

اصحاب الاخدود کا واقعہ:

کہتے ہیں کہ یمن میں ''ذونواس'' نامی ایک بت پرست بادشاہ تھا۔ بعضوں نے اسے مجوسی کہا ہے، مگر پہلا قول راجح ہے کہ وہ بت پرست اور مشرک کافر تھا، اس کے مقربین اکثر جادوگر اور کاہن ہوتے تھے، ان میں سے ایک جادوگر بہت بڑا مقرب بارگاہ تھا، جس سے اکثر وبیشتر امور مملکت میں مشورہ لیا جاتا تھا اور اسے ان امورِ سلطنت میں

دخیل مانا جاتا تھا، کیونکہ اس زمانے میں اکثر ایسے لوگوں کو بادشاہوں کا قرب حاصل رہتا تھا، چنانچہ یہ ساحر جب ضعیف وکمزور عمر رسیدہ ہوگیا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور میری موت کا وقت قریب ہے، مجھے کوئی ہوشیار، سمجھدار بچہ سونپ دیا جائے کہ اسے اپنا فن سکھادوں، چنانچہ اسے ایک ذہین لڑکا سونپا گیا، اور اس نے تعلیم سکھانا شروع کی۔ لڑکا اس کے پاس جاتا تو راستے میں ایک راہب کا مکان پڑتا، جہاں وہ عبادت وذکر میں مشغول ہوتا، یہ بھی کھڑے ہوکر مطالعہ کرتا اور طرز وطریق دیکھتا رہتا اور اثر قبول کرتا رہتا، آتے جاتے یہاں روزانہ رکتا جاتا، ادھر جادوگر، ادھر ماں باپ سے مار کھاتا رہتا، کیونکہ وہاں بھی دیر سے پہنچتا، یہاں بھی دیر سے آتا۔

ایک دن لڑکے نے راہب سے شکایت کی، راہب نے اُسے کہا کہ اگر جادوگر تجھ سے پوچھے: کیوں دیر سے آئے؟ تو کہنا کہ ماں باپ نے روک لیا تھا، ایک عرصہ اسی میں گزرا، یہاں دین الٰہی سیکھتا رہا، وہاں جادوگر سے جادو سیکھتا رہا، دونوں تعلیم برابر جاری رہی۔

ایک دن دیکھتا ہے کہ راستے میں ہر طرف سے لوگ جمع ہیں، ایک خطرناک اژدھے (سانپ) نے راستہ روکا ہوا ہے، ادھر کے لوگ، ادھر نہیں جاسکتے، اس طرف کے لوگ ادھر نہیں آسکتے، اس نے اپنے دل میں سوچا کہ آج موقع ہے کہ میں امتحان لے لوں کہ راہب کا دین برحق ہے، یا جادوگر کا۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر اس پر پھینکا کہ اے اللہ تعالیٰ! اگر راہب کا دین تجھے پسند ہے تو اس پتھر سے اس بلا کو ہلاک کردے۔ پتھر کے لگتے ہی وہ جانور مرگیا، اور راستہ کھل گیا، لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی، اور لوگ اس واقعہ سے بڑے متاثر ہوئے۔ لڑکے نے جاکر راہب کو تمام ماجرا سنایا، تو راہب نے کہا: بیٹا! تم مجھ سے افضل ہو، مگر یاد رکھنا! تیری سخت آزمائش ہوگی، اگر ایسا موقع آیا تو کسی کو میرے متعلق خبر نہ دینا، پھر کیا ہوا کہ اس بچے کے پاس لوگوں کا ہجوم ہوکر تانتا لگ گیا، ہر طرف سے حاجت مند آتے رہے اور مایوس العلاج مریض صحت یاب ہوتے رہے۔

یہ آواز بادشاہ کے ایک نابینا وزیر کے کان میں پڑگئی، وہ بڑے تحفے تحائف لے کر حاضر ہوا اور شفاء کی درخواست کی۔ لڑکے نے کہا کہ شفاء میرے ہاتھ میں نہیں، وہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے قبضۂ قدرت میں ہے، تم اس کی وحدانیت کا اقرار کرو، میں دعا کرلوں گا، تو وزیر نابینا ایمان لایا اور اس کی آنکھیں تندرست ہوگئیں۔

اس واقعہ سے پورے علاقے میں اسے بے پناہ شہرت ملی، جب وزیر بادشاہ کے پاس گیا تو بادشاہ نے متعجب ہوکر پوچھا کہ تجھے آنکھیں کس نے دیں؟ اس نے کہا کہ میرے رب جل شانہ نے، بادشاہ نے کہا: ہاں! میں

نے ۔وزیر نے کہا: نہیں نہیں، میرا اور تیرا، بلکہ سارے جہاں کا ربّ اللہ تعالیٰ ہے،جس پر بادشاہ غصہ ہوا اور اسے سزا دینا شروع کی، طرح طرح کی تکلیفیں اور ایذائیں پہنچانے لگا، اور پوچھا کہ تمہیں یہ تعلیم کس نے دی؟

بالآخر وزیر نے اس لڑکے کا نام بتادیا، پھر بادشاہ نے اس لڑکے (عبداللہ بن تامر) کو بلاکر کہا: اب تم جادو میں بڑے ماہر کامل ہوکر اندھوں اور نابینا لوگوں کو تندرست کرنے لگ گئے ہو،لڑکے نے کہا: ہرگز نہیں! یہ سب کچھ اللہ ربّ العزّت کی کرشمہ سازی ہے۔بادشاہ نے کہا: ہاں! یعنی میرے ہاتھ میں یہ سب کچھ ہے، اس نے کہا: ہرگز نہیں! یعنی تو کچھ نہیں، یہ تیرے اور میرے اور سارے جہاں کے ربّ کے ہاتھ میں ہے، پھر ظالم بادشاہ نے اس کو طرح طرح کی سزائیں دینا شروع کیں، یہاں کہ بیچارے راہب کا پتہ بھی معلوم کرا کے اس کو حاضر کردیا، اور اس سے توحید ومذہب چھوڑنے کا کہا، اور سزا دینی شروع کی۔

راہب نے مذہب چھوڑنے سے انکار کیا، تو اسے آرے سے چیر دیا اور دو ٹکڑے کر کے پھینک دیا، اسی طرح وہ وزیر بھی مارا گیا، پھر لڑکے سے کہا کہ تم بھی مذہب چھوڑ دو، جب اس نے انکار کیا تو بادشاہ نے اسے سپاہیوں کے حوالے کر کے کہا کہ: اسے فلاں بلند وبالا پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا کر ہلاک کردو۔فوجی وہاں پہنچے، سپاہیوں نے اسے دین چھوڑنے کا کہا، بصورت دیگر اسے وہاں سے نیچے لڑھکانے کی دھمکی دے دی، اس نے دعا کی: **اللّٰھمّ اکفنیھم بما شئت**۔ (اے ربّ! جس طرح چاہو مجھے ان کے شر سے نجات دے)۔ جب یہ دعا پوری ہوئی سارے سپاہی پہاڑ کے ہلنے کے ساتھ لڑھک کر ہلاک ہوئے اور وہ سلامت رہا، وہاں سے اتر کر ہنسی خوشی بادشاہ کے پاس آکر ماجرا بیان کیا کہ میرے اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی، تیرے سارے سپاہیوں کو ہلاک کیا۔

بادشاہ بڑا پریشان ہوا اور کچھ دوسرے سپاہی بلوا کر ان سے کہا کہ اسے کشتی میں بٹھا کر فلاں جگہ دریا میں پھینک دو، دریا میں پھینک کر غرق کردو، یہ سب لوگ کشتی میں وہاں پہنچے اور اسے گہرے سمندر میں پھینکنا چاہا، اس نے پھر وہی دعا پڑھی تو دریا میں موج اٹھی، سارے سپاہی غرق ہوئے، صرف وہ سلامت رہا، وہاں سے بخیر وخوشی روانہ ہوکر ظالم کے پاس پہنچے اور پورا قصہ بیان کر کے اسے ششدر کردیا۔

پھر بادشاہ سے کہا کہ تم تمام تر تدبیریں استعمال کرو، مگر تم مجھے ہلاک نہیں کرسکو گے، اور یہ تیری ہمت میں ہرگز نہیں، ہاں! جس طرح میں کہوں اگر تم اس پر عمل کرو تو شاید میں ہلاک ہوجاؤں، وہ تدبیر یہ ہے کہ تم تمام لوگوں کو ایک میدان میں جمع کرو (لوگوں میں ان تمام حقائق کی پہلے سے شہرت ہوچکی تھی، اور ہزاروں مرد وعورت اسلام قبول

کرچکے تھے) اور کھجور کے تنے پر مجھے سولی چڑھاؤ، پھر میرے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر میری کمان پر چڑھا کر بسم اللہ رب ھذا الغلام (یعنی اس اللہ کے نام سے جو اس بچے کا ربّ ہے) کہہ کر وہ تیر مجھے مارو، وہ مجھے لگے گا، اس سے میں شہید ہو جاؤں گا، چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا، ہزاروں لوگوں کے مجمع نے یہ سارا مشاہدہ کیا، وہ تیر اس کی کنپٹی میں پیوست ہوا اور وہ اپنا ہاتھ اس زخم پر رکھ کر شہید ہو گیا۔ ؎

کشتگان خنجر تسلیم را ☆ ہر زمان از غیب جانے دیگر است

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف ☆ بامید آن کہ روزے بشکار خواہی آمد

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سر دوستان سلامت گر تو خنجر آزمائی

جب اس بندۂ تابندہ، شہید حق وصداقت نے اپنے ربّ کریم کی توحید پر جان کی قربانی دے دی تو پورا مجمع چیخ اٹھا، چاروں طرف سے اسلام وایمان اور غیر اختیاری توحید کے نغمے بلند ہوئے، ہزاروں لوگوں نے ایمان قبول کیا، ظالم اور اس کے ساتھی یہ حال دیکھ کر گھبرائے اور بادشاہ سے کہنے لگے کہ اس لڑکے کی ترکیب وتدبیر ہم لوگ سمجھے ہی نہیں، دیکھیں! اس کا اثر یہ ہوا کہ تمام لوگوں نے بیساختہ اس کے مذہب کو قبول کیا، ہم تو اسی مقصد کے لیے اسے قتل کرنا چاہ رہے تھے کہ اس کا مذہب عوام میں پھیل نہ جائے، لیکن اس خوف وڈر نے تو سیلاب کی طرح آ کر پورے ملک کو گھیر لیا، اب اس کا تدارک ہونا چاہئے۔

ظالم بادشاہ نے وسیع وعریض میدان میں خندقیں کھودنے کا حکم دیا اور کہا کہ انہیں لکڑیوں سے بھر کر آگ لگادو، فوج کو حکم ہوا کہ مسلمانوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لاؤ، جو اس دین سے پھر جائے تو اسے چھوڑ دو اور جو نہ مانے اس کو خندقوں کی آگ میں ڈال دو، جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو غیب کی مخفی محبت نے مسلمانوں کی صفوں میں آ کر انہیں جنتی راحتوں اور لذتوں کا مشاہدہ کرایا، اب کیا دیکھتے ہیں کہ لوگ دھڑا دھڑ کلمہ طیبہ پڑھتے اور آگ کے شعلوں میں چھلانگ لگا رہے ہیں، اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی سنت پوری کر رہے ہیں، ظاہراً آگ ہی نظر آ رہی ہے، اندر بردسلام کا پیغام استقبال کر رہا ہے۔

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ﴾ سب کو گواہ بنایا جا رہا ہے کہ دیکھو! کیسا منظر دلفریب ودلنواز سامنے ہے۔ ؎

بجرم عشق توام مے کشند غوغائیست ☆ تو نیز بر سر بام آ چہ خوش تماشائیست

اس ظالمانہ اور قیامت خیز ظلم و بربریت کا شکار ہو کر جو مسلمان مرد وعورت، بچے، بوڑھے شہید ہوئے، اپنے پیارے محسن ربّ العزّت کے دین پر قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، تقریباً ان کی تعداد ستر ہزار کے قریب ہے، عین اس ظلم و تعدّی کے بھیانک لمحات میں اس آگ نے اپنے بے رحمانہ شعلوں کے ساتھ خندقوں سے نکل کر تماشائیوں کا تعاقب کیا، بادشاہ اور اس کے ہمنوا وزراء، امراء، سپاہی، عسکر وفوج سب کو گھیرے میں لے کر پوری سلطنت کو خاکستر کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا، یہ ہے: ﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ کا خلاصہ ومقصد۔ جو دوسروں پر رحم نہیں کرے گا وہ پکڑا جائے گا، اور ہر طرح رحم سے محروم رہے گا۔ [فتح الرحمن، موضح القرآن، ابن كثير، مظهري، روح المعاني، معالم التنزيل، تفسير حسيني وغيرهم]۔

اصحاب الاخدود کے واقعہ میں چند حیران کن عجوبے:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت میں کسی ضرورت کے تحت اس جگہ کی کھدائی ہوئی جہاں وہ شہید بچہ ''عبداللہ بن تامر'' مدفون تھا، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ وہ قبر میں صحیح سلامت، تازہ بدن کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور ہاتھ پیشانی (کنپٹی) پر رکھا ہوا ہے، جب اس کے ہاتھ کو وہاں سے ہٹاتے ہیں، تو کنپٹی کے زخم سے خون جاری ہوتا ہے، اور جب ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں، تو ہاتھ خود بخود اسی جگہ (زخم) پر واپس چلا جاتا ہے۔ جب یمن کے حاکم نے یہ واقعہ تحریری طور پر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو بھیجا، تو انہوں نے اسے حکم دیا کہ اس کو وہاں اس کی قبر میں لوٹا دو اور دفن کرا دو۔ [ترمذي، مظهري]

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ ایک ایماندار عورت بھی لائی گئی، جس کی گود میں شیر خوار معصوم بچہ تھا، آگ کے شعلے دیکھ کر اس نے جھجک محسوس کی، تو شیر خوار بچے نے ماں کو تسلی دی اور صبر کی تلقین کی، بلا خطر آگ میں کود کر داخل ہونے کی ترغیب دلائی، اور جنت کی بشارت سنائی۔ مولانا رومیؒ بیان کرتے ہیں:

یک زن با طفل آورد آن جہود ☆ پیش آن بت آتش اندر شعلہ بود
گفت ای زن پیش این بت سجدہ کن ☆ ورنہ در آتش بسوزی بے سخن
بود آن زن پاک ودین مؤمنہ ☆ سجدۂ بت می نکرد آن موقنہ
طفل از وبستیدہ در آتش فگند ☆ زن بترسید ودل از ایمان بکند
خواست تا او سجدہ آرد پیش بت ☆ بانگ زد آن طفل کانی لم امت

اندر آ ای مادر اینجا من خوشم ☆ گرچہ درظاہر میان آتشم

اندر آما درببین برہان حق ☆ تا بہ بینی عشرت خاصان حق

اندر آ و آب بین آتش مثال ☆ از جہانی کاتش ست آبش مثال

اندر آ اسرار ابراہیم بین ☆ کہ درآتش یافت وردو یاسمین

مادرش انداخت خودرا نزداو ☆ دست او بگرفت طفل مہر جو

مادرش ہم زان نسق گفتن گرفت ☆ دُرِّ وصف لطف حق سفتن گرفت

خلق خودرابعدازان بےخویشتن ☆ می فگندند اندرآتش مردوزن

بچے نے آگ میں سے چلا چلا کر اپنی ماں کو آگ میں کودنے کی رغبت دلائی، جب اس کی ماں نے آگ میں چھلانگ لگائی اور ابدی سعادت حاصل کر لی تو باقی خلقت کو آگ میں آنے کی دعوت دے کر کہنے لگی: ارے لوگو! کیوں دیر کرتے ہو؟ یہ وہ ابدی راحت وسرور والا باغ ہے، جس میں ہر قسم کی نعمتیں تمہارے انتظار میں ہیں، بلا توقف اس میں چھلانگ لگا کر ابدی زندگی حاصل کر لو۔ بس اتنا کہنا ہی تھا کہ بے ساختہ بڑی بیتابی کے ساتھ مرد و عورت اور پوری خلق نے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں دیر نہیں کی، آناً فاناً سارے لوگوں نے آگ میں داخل ہو کر سکون وراحت حاصل کر لی۔

ادھر ظالم بادشاہ اور اس کا عملہ سراسیمگی اور حیرانی میں ڈوب کر ماجرا دیکھتا رہا، اور ایک دوسرے کو دیکھتے تکتے رہے۔ یہ قدرت باری تعالیٰ کے عجائبات میں سے ایک جنتی انعام و پیغام تھا، جو ظاہر ہوا۔ پھر اسی کے ساتھ آگ نے خندقوں سے نکل کر بادشاہ اور اس کے پورے لشکر کا تعاقب کر کے انہیں تہ و بالا کر کے خاکستر کر دیا۔

﴿قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ﴾ تباہ و برباد ہوئے کھائیوں والے، وہ ایندھن والی آگ ہے، جس کو جلایا گیا، وہ سارے ظالم اس آگ کے پاس بحیثیت تماشا بین بیٹھے ہوئے تھے۔

﴿وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ﴾ وہ اہل ایمان کے ساتھ کئے جانے والے ظلم وزیادتی کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے، اور محظوظ ہو رہے تھے، اور اسے اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے، اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا: ﴿وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ﴾ اہل ایمان سے کس چیز کا بدلہ لیا جارہا تھا؟ ان کا جرم کیا تھا؟

﴿اِلَّا اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ﴾ (مگر محض اس لئے کہ انہوں نے ایمان لایا اس ذات پاک پر جو کہ عزیز وحمید ہے، اسی جرم کی پاداش میں وہ آگ میں ڈالے گئے۔

دراصل ہر زمانے میں یہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا کہ کفر وشرک کے حامی اہل ایمان کے ساتھ زیادتیاں کرتے رہتے ہیں، صرف مذہب کی بنیاد پر، دیکھیں! انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین مؤمنین کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ ابلیسی شیطانی طاقتیں ان کے ساتھ بڑی زیادتیاں کرتی ہیں اور کر رہی ہیں، تو یہاں اہل مکہ کو یہی سمجھایا جارہا ہے کہ تم بھی ﴿اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ﴾ کے نقش قدم پر چل کر مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کر رہے ہو، وہ محض ان کے ایمان اور توحید کی بناء پر، ورنہ یہی لوگ چند دن پہلے تمہارے ہاں قابلِ احترام لوگ ہوتے تھے، آج اگر تمہیں ان کے ساتھ بغض ونفرت ہے تو محض ان کے ایمان کی وجہ سے ہے، شاید تمہارا انجام بھی اسی طرح ہوگا جو اصحاب الاخدود کا رہا، یہ نجران والے تم سے دور نہیں، چند مراحل کے فاصلے پر آباد تھے، آج ان کا کوئی نام ونشان نہیں، سنت اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں یہی رہی ہے کہ مجرمین کو تباہ وبرباد کیا جائے گا۔

﴿الَّذِيۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ وہ عزیز حمید عزّ اسمہ جو کہ مالک اور حکمران ہے، تمام آسمانوں زمینوں میں اس کی سلطنت و بادشاہت ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ شَهِيۡدٌ﴾ وہ ہر چیز پر گواہ ہے، وہ دیکھنے والا حاضر وناظر، سب کچھ اس کے علم ومشاہدہ میں ہیں، کوئی ذرہ اس سے مخفی پوشیدہ نہیں، مگر کتنا حلیم وبردبار ہے؟

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَتُوۡبُوۡا فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِيۡقِ﴾ جن لوگوں نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو تکلیفیں دیں، اور توبہ نہ کی ان کو دوزخ کا (اور) عذاب بھی ہوگا اور جلنے کا عذاب بھی ہوگا۔ جن لوگوں نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو فتنہ وابتلاء میں ڈالا ان پر ظلم کیا، دین سے انہیں ہٹانا چاہا اور گمراہ کر کے دوبارہ انہیں کافر بنانا چاہا، مگر ان کے ربّ نے انہیں صبر واستقامت سے نوازا، انہیں جنت اور نعمتوں سے نوازا اور ان کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کے لیے سخت جلانے والی دوزخ کی آگ مقرر فرمائی، جو لوگ مسلمانوں کو ایک ساعت کے لیے آگ میں جلائے، وہ اس ظلم کی پاداش میں کھربوں پدموں سال جہنم کی آگ میں جلیں گے اور آگ کا ایندھن بنیں گے۔

﴿ثُمَّ لَمۡ يَتُوۡبُوۡا﴾ سے واضح فرمایا کہ میری بخشش ورحمت بے مثال ہے، اگر یہ ظالم اپنے جرم کا اقرار کر کے توبہ اور پشیمانی ظاہر کرتے تو ہوسکتا ہے کہ میری رحمت ومغفرت ان کے پہاڑوں جتنے ظلم وزیادتی سے بھی

درگزر کرتی اور یہی میری شان ہے۔ یہ ربّ العزت کے حلم و بردباری کا ایک مثالی ثبوت ہے کہ اس کی بخشش ہر وقت مجرموں کی تلاش میں رہتی ہے، وہ کبھی نہیں چاہتا کہ اس کا کوئی بندہ جہنم کا شکار بنے، اسی وجہ سے وہ ساری رات خود اعلان کراتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت مانگنے والا کہ میں اس کو معافی دے کر نوازوں؟ عام طور پر حاجت مند بڑے لوگوں کے دروازوں پر جا کر صدا دیتے ہیں، مگر یہاں معاملہ برعکس ہے، بڑے دروازے والا ہر فقیر، محتاج اور مجرم کے دروازہ پر صدا لگوا کر سب کچھ دینے پر آمادہ ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِیْرُ﴾ (اور) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہ بڑی کامیابی ہے۔ سبحان اللہ! جس ذات پاک کی عادت دشمن نوازی ہو اس کی دوست نوازی اور ایمان و اعمالِ صالحہ کی قدردانی کا کوئی اندازہ لگا سکتا ہے؟ ؎

ما پروریم دشمن ما میکشیم دوست ☆ کس را مجال چون و چرا در قضاء ما

فرمایا: ایمان و توحید والے، عقائدِ حقہ کے پیروکار، اور اعمالِ صالحہ و اخلاقِ فاضلہ و حسنہ کے پیروکار، حقوق اللہ و حقوق العباد انجام دینے والے، اپنے ربّ کے فرمانوں پر جان و مال قربان کرنے والے، رکوع و سجدہ سے لطف اٹھانے والے، کتاب حکیم کو سینے سے لگانے والے، سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر بڑے ذوق و شوق سے عمل کرنے والے اپنے ربّ رحمن و رحیم کی مغفرتوں سے مالا مال ہو کر بلند و بالا جنتوں کے مستحق ہوں گے، بے شمار مشروبات اور جنتی نہروں سے محظوظ رہیں گے، اور فوز کبیر و فلاح عظیم کے اندر شاداں و خوشحال رہیں گے، اور ابدی سعادتوں کے مالک بنیں گے۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَ یُعِیْدُ ﴿۱۳﴾ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ
الْمَجِیْدُ ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴿۱۶﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِیْنَ
كَفَرُوْا فِیْ تَكْذِیْبٍ ﴿۱۹﴾ وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِیْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ ﴿۲۱﴾ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: بیشک تیرے ربّ کی پکڑ البتہ سخت ہے ﴿۱۲﴾ بیشک وہ وہی ذات ہے جو ابتداء میں پیدا کرتا ہے اور پھر دوبارہ لوٹائے گا ﴿۱۳﴾ اور وہی معاف کرنے والا اور محبت کرنے والا ہے ﴿۱۴﴾ عرش کا مالک، بزرگی والا ہے ﴿۱۵﴾ وہ اپنے

ارادے سے جو چاہے کرتا ہے⑯ کیا آپ کے پاس ان لشکروں کی بات آئی ہے؟⑰ فرعون اور (قوم) ثمود کی⑱
بلکہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ تکذیب میں (لگے ہوئے) ہیں⑲ اللہ تعالیٰ انہیں ہر طرف سے گھیرنے والا ہے⑳
بلکہ یہ تو قرآن ہے بڑی بزرگی والا㉑ (یہ) لوح محفوظ میں (درج) ہے㉒

معارف ومنازل

ربّ کی پکڑ:

بطش کے معنی پکڑ اور گرفت کے ہیں، اکثر وبیشتر یہ عذاب کے معنی میں مستعمل ہے، اگر دنیا میں انسانوں کی طرف سے کسی مجرم کو پکڑا جائے گا تو اس کی رہائی اور خلاصی کے بہت سارے اسباب ہوتے ہیں، مثلاً: پکڑنے والے سے اوپر کی کوئی ہستی اسے چھڑالے، یا پکڑنے والا باوجود جدوجہد کے اپنے مطلوب شخص کو پکڑ نہ سکے، یا ایک نے پکڑا دوسرے نے چھڑالیا، جیسے عام دنیوی شخصیتوں یا دنیوی عدالتوں میں مروج ہے، یا رشوت وسفارش کی وجہ سے چھوٹ جائے، یا پکڑا ہوا شخص کسی حیلہ وبہانہ سے بھاگ جائے، الغرض دنیوی گرفت جتنے مضبوط ہوں، مگر پھر بھی کمزور اور ناقص ہی کہلائیں گے، یہ شخصی مجرم کے بارے میں امکانات ہیں پس قومی ومجموعی گرفت بہت ہی زیادہ ناقص ہوتی ہے۔

مگر ربّ العزّت کی پکڑ نہایت اور بہت ہی سخت ہے، اس میں ان بیان شدہ نقائص میں سے ایک بھی نہیں؟ گزشتہ طاقتور، نہایت محکم ومضبوط اقوام پر جو عذاب اور گرفت نازل ہوئی اس سے اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت نہایت محکم ہے، جب سارا جہاں ایک "کن" کے حکم سے وجود پاسکتا ہے اور پورا عالم روزِ قیامت ایک حکم سے تہہ وبالا اور درہم برہم ہوسکتا ہے، تو ایسے قادر مطلق، فعال لما یرید، علی کل شئی قدیر کی پکڑ اور گرفت کا اندازہ لگانا عقلِ انسانی کے دائرہ سے باہر ہی ہوگا، کیونکہ جہاں طاقت کا اندازہ مشکل ہوگا تو وہاں گرفت وپکڑ کا اندازہ لگانا بطریق اولیٰ مشکل ہوگا۔ شیخ سعدیؒ نے درست فرمایا:

اوست سلطان ہر چہ خواہد آن کند ☆ عالمے را در دمے ویران کند
تو میدانی کہ یک حرفے زحکمش ☆ جہاں راز یروبالا خاک گردد
زحکمش دو نیم ست دریائے نیل ☆ بمرغان کشد فیل واصحاب فیل

تو غیر محدود قدرت کی پکڑ بھی غیر محدود ہوتی ہے، انسانی پکڑ کی انتہا زیادہ سے زیادہ موت تک ہو سکتی ہے، جب مجرم پر موت طاری ہوگئی تو سزا مکمل ہوگئی، پھر کوئی شخص مجرم کو دوبارہ نہ زندہ کر سکتا ہے، نہ مزید سزا دے سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے ساحرین نے فرعون کی دھمکی کے جواب میں بھی یہی کہا تھا: ﴿فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا﴾ [طٰه:۷۲] (تو تم نے جو حکم دینا ہو دے دو، بیشک تم صرف اسی دنیا کی زندگی میں حکم دے سکتے ہو)۔ تم زیادہ سے زیادہ ہماری دنیوی زندگی ختم کر سکتے ہو، آگے تمہاری دسترس میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔

کہتے ہیں حجاج بن یوسف ثقفی کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا: تمہارا کیا ہوا؟ کہنے لگا: جتنے لوگ میں نے بلا وجہ قتل کرائے ہر شخص کے عوض مجھے سزائے موت دے کر پھر زندہ کیا گیا، ہر شخص کے مقابلے میں قتل ہوتا رہا، مگر سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے عوض سو مرتبہ قتل ہوتا رہا۔ یہ ایک خواب ہے، حجت نہیں، مگر اللہ تعالیٰ آخرت میں ایسے مجرموں کو جنہوں نے کروڑوں انسانوں کو قتل کرایا ہے کروڑوں مرتبہ زندہ کرے گا اور قصاص میں مار ڈالے گا، یہی روزِ جزاء کے اندر اس کے عدل وانصاف کا تقاضا ہوگا۔ بہر حال! اللہ عز وجل کی پکڑ مختصر ہو یا طویل، دنیوی ہو یا اخروی، کسی ایک معمولی جزوی گناہ پر ہو یا عمومی، ہر حال میں سخت ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ مکہ مکرمہ کے مشرکین میں سے ایک کافر نے رسول انور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر بطور استہزا اپنا منہ ٹیڑھا (کج) کر کے طنز کیا، بس اتنا ہی تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس کا منہ ٹیڑھا (کج) ہی رہا۔ [سیرۃ النبیؐ] یہ ہے خدا کی گرفت، مگر نہایت مختصر، لیکن سخت بایں معنی کہ کوئی اس کی تبدیلی پر قادر نہ ہو۔

آن دہان کج کرد واز استہزاء بخواند ☆ مر محمد را دہانش کج بماند

(مثنوی رومی)

مطلب یہ کہ ایک شخص نے براہِ تمسخر و مذاق منہ ٹیڑھا کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لیا، تو اس کا منہ ٹیڑھا کا ٹیڑھا رہ گیا، گویا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ تھا، یہ شخص نضر بن حارث تھا جو غزوہ بدر میں مارا گیا۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ﴾ وہی ذات ہے جس نے ابتداء میں اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ پیدا فرمایا، پھر نفخۂ دوم کے بعد اسی سابق وجود کے ساتھ دوبارہ لوٹا کر تمہیں پیدا فرمائے گا، اس کے لیے کوئی چیز مشکل نہیں، صرف ایک حرف کا فرمان ہے، البتہ مضبوط پکڑنے اور گرفت کرنے کے باوجود، بے حد بخشنے والا صاحب مغفرت ہے، توبہ

کرنے پر خوش اور راضی ہوتا ہے، مزید بخشش وانعامات سے نوازتا ہے، ودود (بہت زیادہ محبت کرنے والا) ہے، اپنی مخلوقات کے ساتھ پیار ومحبت رکھتا ہے۔ کہتے ہیں دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرنے والی ہستی ماں ہے، ماں کی محبت نہایت عمیق ہوتی ہے، اگر دنیا کی تمام ماؤں کی محبت جمع ہوں تو ربّ العزّت کی محبت کے مقابلے میں ان کی حیثیت ایک ذرہ کی ہوگی، بمقابلہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کے، مطلب کالعدم کی حیثیت ہی صحیح۔

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ﴾ عرشِ عظیم کا مالک اور عظمت و بزرگی کا مالک، اتنا بزرگ و برتر کہ اس کی صفات کا احاطہ ہی ممکن نہیں، سارا جہاں قیامت تک اس کی تسبیح تحمید وتقدیس اگر بیان کرے سمندر کے ایک قطرہ جتنا بھی شاید پورا نہ ہو۔

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ فعّال مبالغہ کا صیغہ ہے، جو چاہے کرنے والا، بلکہ جو ارادہ فرمائے مکمل ہوجائے۔ ہاں! اس کی مشیت وارادہ اگرچہ غیر محدود ہے، مگر حکمت ہر ارادہ کا ستون ہے، اس کی ہر کوئی صفت انسانی عقل وسوچ کے دائرہ سے باہر ہے، اور اس کی حکمتوں کا نہ کوئی احاطہ کرسکتا ہے اور نہ اس کی حکمتوں کا کوئی ادراک کرسکتا ہے۔

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ﴾ کیا آپ کے پاس نافرمان قوموں کے لشکروں کی بات نہیں آئی؟ مثال کے طور پر فرعون کا جرار لشکر ثمود جیسی طاقتور، دیوہیکل قوموں کے لشکر، جو تیرے ربّ کی پکڑ کے ساتھ صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹا دیئے گئے اور ستر لاکھ مسلح چاق وچوبند ہر قسم کے ساز وسامان سے لیس فرعونی لشکر دریائے نیل کی نذر ہوئے، فرعون کا لشکر ستر لاکھ نفوس پر مشتمل تھا۔ [مظهري]

زحلمش دو نیم ست دریائے نیل ☆ بمرغان کشد فیل واصحاب فیل

(نظامی)

نمرود کی پوری فوج کو مچھروں سے، اور ابرہہ اشرم کے لشکر کو پرندوں سے تباہ کیا گیا۔ مزید اس کی تفصیل ان شاء اللہ سورۃ الفجر کے ضمن میں آنے والی ہے۔

﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ﴾ لیکن کافر (جان بوجھ کر) تکذیب میں (گرفتار) ہیں، بلکہ کفار و مشرکین مکہ جو تکذیب کرنے والے ہیں انہیں بتلایا جائے کہ تم فرعون وثمود کے عشر عشیر میں بھی نہیں ہو۔

﴿وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ﴾ اور خدا (بھی) ان کو گرداگرد سے گھیرے ہوئے ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ﴾ [السجدة: ۵۴] (بیشک اللہ ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے) کوئی بھی ادنیٰ سے

لے کراعلیٰ چیز تک اس کے دائرۂ قدرت سے خارج نہیں، پس کسی پر تباہی و بربادی محض اس کی مخفی حکمت کے تحت مؤخر ہو سکتی ہے، فقط۔

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ﴾ بلکہ یہ باعظمت و بزرگی والا قرآن ہے جو سارے جہاں کے لیے سبب بقاء و حیات بھی ہے اور تذکرہ و نصیحت بھی ہے۔ ﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ [عبس: ۱۴] (وہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو بڑے مقدس ہیں، اونچے رتبے والے ہیں، پاکیزہ ہیں) کے تحت اس کی فضیلت و برتری کا مختصر بیان گزرا ہے۔ ﴿فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ لوح محفوظ میں۔

لوح محفوظ کیا ہے؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ لوح محفوظ حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر ہے۔ عبدالرحمٰن بن سلمان فرماتے ہیں: دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوگا وہ سب لوح محفوظ میں لکھا ہوا موجود ہے، اور لوح محفوظ حضرت اسرافیل علیہ السلام کی دونوں آنکھوں کے سامنے ہے، لیکن جب تک انہیں اجازت نہ ملے وہ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لوح محفوظ کی پیشانی پر یہ عبارت ہے: ''کوئی معبود نہیں، بجز اللہ تعالیٰ کے، وہ اکیلا ہے، اس کا دین اسلام ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے ہیں اور اس کے رسول ہیں، جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اس کے وعدے کو سچا جانے، اور اس کے رسولوں کی تابعداری کرے، اللہ جل شانہ اسے جنت میں داخل کرے گا''۔

فرماتے ہیں کہ یہ لوح محفوظ سفید موتی کی ہے، اس کا طول آسمان و زمین کے درمیان کے برابر اور اس کی چوڑائی مشرق و مغرب کے برابر ہے، اس کے دونوں کنارے موتی اور یاقوت کے ہیں، اور اس کے دونوں پٹھے سرخ یاقوت کے ہیں، اس کا قلم نور ہے، اس کا کلام عرش الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے، اس کی اصل فرشتہ کی گود میں ہے۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوح محفوظ اللہ تعالیٰ کے عرش مجید کے دائیں طرف ہے۔ طبرانی میں ہے کہ حضور انور سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے لوح محفوظ کو سفید موتی سے پیدا کیا، اس کے صفحے سرخ یاقوت کے ہیں، اس کا قلم نور کا ہے، اس کی کتابت نور ہے، اللہ تعالیٰ ہر دن تین سو ساٹھ مرتبہ اسے دیکھتا ہے، وہ پیدا کرتا ہے، روزی دیتا ہے، مارتا ہے، جلاتا ہے، عزت دیتا ہے، ذلت دیتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے۔ [ابن کثیر]

الحمد للہ رب العٰلمین والسلام والصلوٰة علی سید المرسلین وآلہ وصحبہ أجمعین

سُورَةُ الطَّارِقِ

مكية آياتها ١٧ ركوعها ١

سورۂ طارق مکی ہے، اس میں سترہ (۱۷) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام:

سورت کا نام الطارق پہلی آیت میں الطَّارِقِ کے لفظ سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، سورۃ البلد کے بعد نازل ہوئی۔

تعداد آیات، کلمات اور حروف:

یہ سورت سترہ (۱۷) آیتوں، اکسٹھ (۶۱) کلمات، اور دو سو انتالیس (۲۳۹) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط و مناسبت:

سورۃ البروج میں نوعِ انسانی میں پائی جانے والی بدامنی کے پیش نظر قیامت اور جزائے عمل کا مسئلہ بیان ہوا، ساتھ ساتھ قرآن کریم کی حقانیت کا بھی بیان ہوا، اس سورت میں بھی قولِ فصل کے ساتھ حقانیتِ قرآن اور انسانی تخلیق کے بیان کے ضمن میں وقوعِ قیامت اور بعث بعد الموت کا تذکرہ ہے۔

مختصر موضوع:

تخلیقِ انسانی، بعث بعد الموت، مدارجِ تخلیق، منکرینِ قیامت اور منکرینِ قرآن اور منکرینِ جزاءِ اعمال

وغیرہ پر تردید مذکور ہے، اور اس کے ساتھ امہال المجرمین کا بھی بیان ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾ اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا
عَلَيۡهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾ فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾ يَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ
وَالتَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾ يَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنۡ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ؕ﴿۱۰﴾ وَ
السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ۙ﴿۱۱﴾ وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ۙ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ ؕ﴿۱۴﴾
اِنَّهُمۡ يَكِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيۡدُ كَيۡدًا ۚۖ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الۡكٰفِرِيۡنَ اَمۡهِلۡهُمۡ رُوَيۡدًا ﴿۱۷﴾

ترجمہ: قسم ہے آسمان کی اور رات کو (اندھیرے میں) آنے والی کی ① اور آپ کو کس نے بتلایا کہ طارق کیا ہے؟ ② وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے ③ کوئی نفس ایسا نہیں مگر اس پر محافظ (فرشتہ) مقرر ہے ④ پس انسان کو غور کرنا چاہئے کہ اس کی تخلیق کس چیز سے ہوئی ہے؟ ⑤ انسان اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے ⑥ جو پشت اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے ⑦ بیشک وہ (اللہ تعالیٰ) اس کے دوبارہ لوٹانے پر قادر ہے ⑧ جس دن تمام پوشیدہ راز ظاہر کئے جائیں گے ⑨ پس نہ ہوگی اس (انسان) کے لئے کوئی طاقت اور نہ اس کا کوئی مددگار ⑩ اور قسم ہے (بارش کے ساتھ) بار بار گردش کرنے والے آسمان کی ⑪ اور قسم ہے (بار بار) پھٹنے والی زمین کی ⑫ بیشک یہ قرآن کریم فیصلہ کن بات ہے ⑬ اور یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے ⑭ بیشک وہ (کافر لوگ قرآن کے خلاف) طرح طرح تدبیر کررہے ہیں ⑮ اور میں بھی طرح طرح سے تدبیر کرتا ہوں ⑯ پس آپ کافروں کو ڈھیل دے دیں، اور انہیں تھوڑی سے مہلت دے دیں ⑰

معارف ومنازل

عرب کے عرف میں رات کے آنے والے مسافر کو طارق کہتے ہیں، اور ستاروں کو بھی اسی مناسبت سے طارق کہتے ہیں کہ وہ دن کو نظر نہیں آتے، رات کو مہمان کی طرح ظاہر ہوجاتے ہیں، اس کی تعریف ﴿النَّجْمُ

﴿الثَّاقِبُ﴾ سے اسی معنی کے ساتھ ہے۔

آنحضرت ﷺ کی مشہور دعا میں بھی یہی معنی مراد ہے، فرمایا: "أعوذ بوجه الله الكريم، وبكلماته التامات التي لا يجاوزهن برّ ولا فاجر من شر ما ينزل من السماء، ومن شر ما يعرج فيها، ومن شر ما ذرأ في الأرض، ومن شر ما يخرج منها، ومن فتن الليل والنهار، ومن طوارق الليل والنهار إلا طارقا يطرق بخير يا رحمٰن"۔ [موطأ] اسی طرح حدیث صحیح میں ہے: "نهى النبي صلى الله عليه وسلم أن يطرق الرجل أهله طروقا، أي ياتيهم فجاة بالليل"۔ مسافر کو چاہئے کہ بغیر اطلاع اچانک رات کی تاریکی میں اپنے گھر نہ آئے، اور اسی طرح دوسرے عزیز کے گھر بغیر اطلاع نہ جائے، اس میں حکمت ومصلحت مضمر ہے۔ [بخاري]

﴿النَّجْمُ الثَّاقِبُ﴾ روشن ستارہ۔ جمہور علماء نے نجم سے خاص ستارہ 'ثریا' یا 'زحل' مراد لیا ہے۔ حسن بصریؒ اور قتادہؒ کے نزدیک معنی عموم یعنی تمام ستارے مراد ہیں، کیونکہ طارق کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہر موقع پر آسمان، زمین، ستارے اور نجوم وغیرہ پر قسم کھانے کا مطلب واضح ہے، کیونکہ یہ تمام ستارے غریب وعجیب اور مختلف کیفیتوں کے ساتھ قائم ہیں، اور ہر قسم کی حرکات وسکنات ودیگر خوبیوں کے ساتھ متصف ہیں، اور یہ سب کچھ حضرت حق سبحانہ کے حکم وارادے کے تابع ہیں، پس جس ذات واحد نے انہیں جس طرح پیدا کیا ہے یہ اس کی قدرت وعظمت کی دلیل وثبوت ہے، اور ان کے تغیر وتبدل اثباتِ قیامت کی واضح نشانی ہے۔

﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾ کوئی متنفس نہیں جس پر نگہبان مقرر نہیں۔ ہر انسان پر اللہ تعالیٰ بذات خود نگہبان ہے، جیسے فرمایا: ﴿فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا﴾ [یوسف: ٦٤] (سو خدا ہی بہتر نگہبان ہے)۔ ﴿وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ﴾ [سبأ: ٢١] (اور تمہارا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے)، پس یہ اولاً وبالذات کے معنی میں ہوگا۔ یا یہ مراد ہے کہ ہر نفس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے محافظ اور نگران ونگہباں مقرر ہیں، جو کہ انسان کے اعمال وافعال، حرکات وسکنات کی نگرانی پر مامور ہیں، جیسے کرام کاتبین یا دیگر قسم کے فرشتے جو انسانوں کی حفاظت پر مامور ہیں، شب وروز ہر قسم کے مصائب وآفات سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً﴾ [الأنعام: ٦١] (اور اللہ تم پر بھیج دیتا ہے حفاظت کرنے والے فرشتے)۔ پھر فرمایا:

﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ﴾ حالانکہ تم پر نگہباں مقرر ہیں، یا یوں فرمایا: ﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ [الرعد: ١١] (اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں جو خدا کے حکم سے

اس کی حفاظت کرتے ہیں)۔ یہ فرشتے باری باری انسان کی حفاظت کرتے رہتے ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ ہر انسان کی حفاظت پر تین سو ساٹھ (۳۶۰) فرشتے مقرر ہیں، اس کے ہر ہر عضو کی حفاظت پر ایک ایک فرشتہ مقرر ہے، اور اس کی آنکھوں کی حفاظت پر سات فرشتے مقرر ہیں، یہ فرشتے انسان کی اس طرح نگہبانی اور حفاظت کرتے ہیں، جس طرح کوئی شہد سے بھرے ہوئے برتن کی مکھیوں سے حفاظت کرے، اگر یہ حفاظت پر مامور فرشتے نہ ہوتے تو جنات و شیاطین انہیں اچک لیتے ہلاک کرتے۔ [قرطبي و معارف]

﴿فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾ تو چاہئے کہ انسان غور کرے کہ کس چیز سے بنایا گیا؟ انسان غور و فکر کر کے دیکھے کہ وہ کس حقیر ذلیل و ناتواں قطرۂ آب سے پیدا ہے، وہ قطرۂ آب اللہ تعالیٰ کی اور اس کے فرشتوں (موکل بالرحم) کی حفاظت و نگرانی میں کتنے عجیب و غریب انقلابات اور تبدیلیوں کے بعد کہاں سے کہاں پہنچا، اور اس میں کتنے مخفی اور غیبی راز نمودار ہوئے، پھر پانی سے گوشت، پوست، ہڈیاں، اعصاب، عروق، معدہ، جگر، تلی، گردے، مثانے، دماغ، قلب، اور گودے، کیسے کیسے پیارے انداز میں تکمیل پائے، اور روح ڈال کر ایک زندگی (بعد از موت) کی نعمت وجود میں آئی۔

حقیر قطرۂ آب سے انسان کی تدریجی تخلیق:

یہ حقیر قطرۂ آب، ہزاروں ماکولات و مشروبات (جو کہ زمین کے اندر منتشر تھے) سے جمع کر کے بنایا گیا، یہ بے شمار ذرات سے پیدا شدہ قطرہ، انسانی وجود کا سبب بنا، تو جو ربّ خالق حقیقی ہزاروں ذرات سے قطرہ اور قطرہ سے ایک خوبصورت انسان پیدا کر سکتا ہے تو کیا مرنے کے بعد پھر ان منتشرہ ذرات کو جمع کر کے دوبارہ اسے پیدا نہیں کر سکتا؟ بلاشبہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

﴿خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾ یعنی انسان کو پیدا کیا گیا ہے ایک بے قرار، اچھلنے والے پانی سے جو خارج ہوتا ہے مرد کی پشت اور عورت کے سینے کے درمیان سے۔ یعنی بدن کے تمام اعضاء کے مرکزی حصے (پشت و کمر و صدر) کی ہڈیوں کے درمیان سے، اس پانی کی پیدائش کا تعلق بدن کے تمام حصوں میں سے برابر کے شریک ہیں، قوت عقلیہ، دماغ اور دیگر اعضائے لطیفہ، شریفہ، سب اس کی پیدائش میں شریک ہیں، حتی کہ قوت ہاضمہ جاذبہ، قوت مولدہ اور قوت دافعہ تمام کی نگرانی میں یہ نطفہ پیدا ہوتا ہے، جو مردانہ انڈوں اور زنانہ بیضوں میں جمع ہوتا ہے، پھر مخصوص حالت میں کمر اور حرام مغز اور پستانوں کی تحریک سے خروج کر کے مخصوص

نالیوں کے راستے رحمِ مادر میں قرار پاتا ہے، اور نطفہ امشاج کی حیثیت حاصل کر کے ایک انسانی شکل وصورت کی طرف پلٹیاں کھاتے ہوئے ﴿یُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ [آل عمران: ٦] (وہی تو ہے جو (ماں کے پیٹ میں) جیسا چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے) کی منظوری کے بعد ﴿فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ﴾ [الانفطار: ٨] (پس اس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضا کو) ٹھیک کیا، اور (تیرے قامت کو) معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا)، پھر اس کے بعد ﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾ [عبس: ٢٠] (پھر اس کے لیے راستہ آسان کر دیا) کے مرحلہ سے گزر کر ﴿فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ [التین: ٤] (ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔

یہ مردہ کتنے انقلابات کے بعد زندہ ہوا، پھر زندگی کے مختلف نشیب وفراز مرحلوں کو طے کیا، پھر ﴿فَاَمَاتَهٗ﴾ [عبس: ٢١] (پھر اسے موت دی) کا مزہ چکھا، پھر ﴿ثُمَّ اِذَا شَاۗءَ اَنْشَرَهٗ﴾ [عبس: ٢٢] (پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا) کے میدان میں قدم رکھا اور حساب وکتاب کی منزل طے کر کے "إما إلى الجنة وإما إلى النار" کا راہی بنا۔ یہ ہے انسان کی مختصر تاریخی وتدریجی سرگزشت۔ پس ارشاد ہوا:

﴿اِنَّهٗ عَلٰي رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ﴾ بیشک خدا اس کے اِعادے (یعنی پھر پیدا کرنے) پر قادر ہے، دوبارہ اسے بعد از موت وانتشار اعضاء اور پورے بدن کے انتشار وریزہ ریزہ ہونے کے بعد اسے لوٹا دینا اور پہلی حالت پر زندہ کرنا کونسا مشکل ہے؟ خاص کر وہ قادر مطلق جس کے ایک حکم کے ساتھ ساری کائنات کا وجود وابستہ ہو، یا آسمانوں کی عظیم تخلیق متعلق ہو، یہ بیچارہ پانچ چھ فٹ کا ضعیف انسان کسی شمار میں نہیں۔ اب اس دوم تخلیقِ کے لیے نظام الاوقات مقرر ہے، اس کا بیان فرمایا:

﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَاۗىِٕرُ﴾ جس دن سارے سربستہ ومخفی راز پوشیدہ کردار اور چھپے ہوئے اعمال سے اخفاء کا پردہ برائے ابتلاء وامتحان اٹھایا جائے گا، اور ہر چیز کی قلعی کھل جائے گی، جب یہ سارے مخفی راز کھل کر سامنے آجائیں گے تو بہت سارے شیر بہادر لوگ غم وپریشانی میں ڈوب کر ﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى﴾ [الحج: ٢] (اور تو لوگوں کو دیکھے گا جیسے نشہ میں ہیں) کے عالم میں اپنے عزیز ومحبوب، لختِ جگر، اہل واولاد کو بھی بھول جائیں گے، وغیر ذلک من الهموم۔

﴿فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ﴾ پھر انسان کو اپنی کوئی قوت نہ ہوگی جو اپنی مدافعت کرے، اور خود کو گرفت

سے بچائے اور نہ کوئی حمایتی ومددگار ہوگا جو اسے کام آئے، نہ اسے مال ہوگا جسے وہ فدیہ کے طور پر پیش کر سکے۔ مطلب یہ ہے کہ نجات کا کوئی ذریعہ و وسیلہ نہیں ہوگا، سارے ذرائع مسدود ہوں گے، ﴿اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴾[الشعراء:۸۹](ہاں! جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا) یعنی ایمان صادق کا دروازہ مسدود نہیں ہوگا، کھلا رہے گا۔

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾ قسم ہے آسمان کی، جس سے پے در پے موسلا دار بارش ہوتی ہے، اور قسم ہے زمین کی، جس میں سبزہ اگنے کے ساتھ شق پیدا ہوتی ہے، یعنی تخم وبیج نکلنے کے ساتھ پھٹ جاتی ہے، بیشک قرآن ضرور فیصلہ کی بات ہے اور کوئی ہنسی کی بات نہیں۔

آسمان کی بارش مثال ہے قرآن حکیم کی، جس سے زمین زندہ ہو کر سبزہ کے ساتھ پھٹ جاتی ہے، یہ مثال ہے قلب مؤمن متقی کی۔

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ﴾ گزشتہ سورت میں ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ﴾[البروج: ۲۱] فرمایا، اب اس کا تتمہ بیان فرماتے ہوئے: ﴿لَقَوْلٌ فَصْلٌ﴾ کہا کہ یہ قرآن مجید حق و باطل کا فیصلہ کرنے والا ہے، اور یہ خالص تذکرہ ونصیحت ہے، یہ سارے جہاں کے لیے روحِ حیات اور قاضی ہے، یہ عدالتوں کے لیے آئین انصاف ہے، یہ کوئی بے مقصد کلام نہیں، یہ کوئی ہنسی مذاق کی چیز نہیں، یہ ہر قسم کی بیہودگیوں اور نقائص سے مکمل پاک ہے۔

کتاب اللہ قولِ فیصل ہے:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے سید عالم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! آگاہ ہوجاؤ، ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس فتنہ کے شر سے بچنے اور نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کتاب اللہ، اس میں تم سے پہلی امتوں کے عبرت آموز واقعات ہیں، اور تمہارے بعد کی اطلاعات (دنیوی اور اخروی ثمرات جو اعمال واخلاق کے سلسلے میں ظاہر ہونے والے ہیں)، اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن کریم میں ان کا حکم اور فیصلہ موجود ہے (یعنی حق وباطل کے متعلق) اور یہ قول فیصل ہے، فضول بات اور بے مقصد نہیں، جو جابر وسرکش اسے چھوڑے گا یا اسے نہیں مانے گا تو اللہ تعالیٰ اسے توڑ کر رکھ دے گا، اور جو کوئی قرآن کے بغیر حق تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف گمراہی ہی آئے گی، وہ ہدایت سے سراسر محروم ہی رہے گا''۔

قرآن حکیم ہی اللہ ربّ العزّت سے تعلق کا مضبوط وسیلہ و ذریعہ ہے، اور محکم نصیحت نامہ ہے، وہی صراط مستقیم ہے، اور وہی حقِ مبین ہے، جس کی اتباع سے عقائد وخیالات کجی سے محفوظ رہتے ہیں، اور زبانیں اس کو گڑبڑ نہیں کرسکتیں، (جیسے کہ پہلی کتابوں میں تورات، وانجیل وزبور کے ساتھ ان کے ماننے والوں نے کیا) اور علم والے عالم اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے، (یعنی ہر زمانے میں بے شمار نئے نئے معارف انہیں معلوم ہوں گے) اور قرآن کریم کثرتِ مزاولت اور بار بار پڑھنے سے کبھی پرانا نہیں ہوتا، بلکہ جتنا پڑھو گے زیادہ لطف حاصل ہوگا، اس کے عجائبات وحقائق کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

قرآن حکیم کی شان یہ ہے کہ جنّات نے جب اس کو سنا تو بے اختیار بول اٹھے: ﴿اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾ [الجن: ۲] (ہم نے ایک عجیب قرآن سنا کہ بھلائی کی راہ بتاتا ہے، تو ہم اس پر ایمان لائے)۔ جس کسی نے قرآن حکیم کے مطابق بات کہی اس نے سچی بات کہی، اور جس نے قرآن حکیم پر عمل کیا وہ اجر وثواب کا مستحق ہوا، اور جس نے قرآن مجید کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل وانصاف کیا، اور جس نے قرآن حکیم کی طرف دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت نصیب ہوگئی۔ [ترمذي، دارمي]

﴿قَوۡلٌ فَصۡلٌ﴾ یہ وہ عالمگیر قانونِ الٰہی ہے جس کے برابر کی پوری کائنات میں کوئی کتاب نہیں، یہ وہ صحیفۂ رشد وہدایت ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے، یہ دونوں جہانوں کی رہنمائی کرنے والی کتاب ہے، جس کا فیض وبرکت عالم دنیا، عالم برزخ اور عالم آخرت سب کے لیے عام ہے، یہ اوراق وکاغذوں کا ہرگز محتاج نہیں، یہ مرد وعورت، بالغ ونابالغ، تندرست ومریض، امیر وغریب، ہر قسم کے مؤمنوں کے سینوں اور قلوب کی زینت ہے، اور قلوب المؤمنین کے اندر محفوظ ہے۔ کوئی بادشاہ، وزیر، امیر اور سرمایہ دار وغیرہ قرآن کریم کی سرپرستی وتحفظ اور اسے چاردانگ عالم میں تشہیر وپھیلانے اور اس کی تعلیمات کو عام وشائع کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

یہ ربّ العزّت عزّ شانہ کی حفاظت کے ساتھ روزِ اول سے آج تک، پھر قیامِ قیامت تک تکوینی طور محفوظ رہے گا، اور غرباء ومساکین، بے سروسامان علماء وطلباء کے سینوں، قلوب اور دماغ کا نور وبرکت رہے گا۔

جس طرح کمزور مکڑی اور ضعیف کبوتروں کے ذریعہ صاحب قرآن کی غارِ ثور میں حفاظت ہوئی، اور قبلہ قرآن، یعنی کعبۃ اللہ شریف کا تحفظ کمزور مخلوق ابابیل کے ذریعہ ہوا، جہاں ننھے ننھے پرندوں نے ہاتھی والے جرار لشکروں کو تباہ وبرباد کیا، اسی طرح یہ بے سہارا یتیموں، نانِ شبینہ کے محتاج، بے سروسامان علماء وطلباء کے ذریعہ قرآن

پاک کا قیامت تک ان شاء اللہ تحفظ ہوتا رہے گا۔ "فطوبیٰ للغرباء"۔

ہست مستغنی زشاہان جہان ☆ واز امیر واز وزیر وخسروان

درحیات او بقاء عالم ست ☆ از بہارش روشنی عالم ست

دشمن ہر طرح کے مکروفریب اور ہتھکنڈوں سے اس کی آواز کو دبانے اور خاموش کرنے کے حیلے بہانے اور تدبیروں میں مصروف رہا ہے، اور اس نورِ مبین کی معطر چمک دمک کو بجھانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے، اور کوئی سعی و محنت میں کمی کرنے کا بھی نہیں سوچا اور کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، مگر یہ نورِ مبین مسلسل ترقی کناں اور ضوء افشاں نظر آرہا ہے، اور اپنے متبعین کے قلوب کو روشن کناں ہے۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ☆ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

یہ مضمون قرآن کریم میں متعدد مقامات میں بکثرت موجود ہے، اور مجرمین کی شرارتوں پر جابجا تردید وگرفت کا اور ان کی حماقتوں پر صبر کی تلقین ہے، نیز ان کے عزائم وارادوں کو خاک میں ملانے اور قرآن پاک کے نور کو عام کرنے کا وعدہ ہے، اور ﴿إِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ [ابراھیم:۴۶] (گو ان کی تدبیریں ایسی غضب کی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں) کا تسلی نامہ ہے، اور آپ ﷺ سے کہا جارہا ہے: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ﴾ [النمل:۷۰] (اور صبر ہی کرو اور تمہارا صبر بھی خدا ہی کی مدد سے ہے، اور ان کے بارے میں غم نہ کرو، اور جو یہ بداندیشی کرتے ہیں اس سے تنگدل نہ ہوں)۔ آپ صبر فرمائیں، انہیں مہلت دیں، تنگدل نہ ہوں، انجام خیر آپ کے لیے اور روز بد اور خواری وذلت آپ کے مخالفین کے نصیب میں لکھا ہوا مقرر ہے۔

یعنی یہ شرارت اور کافروں کی چھپی ہوئی تدبیریں کوئی نئی بات نہیں، آپ سے پہلے جتنے انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے تو ان کے خلاف عقل کے اندھوں نے مسلسل ناروا ہتھکنڈے استعمال کئے، قرآن حکیم نے حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف شرارتوں کا یوں بیان فرمایا: ﴿وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا﴾ [نوح:۲۲] (اور انہوں نے بڑے بڑے مکروفریب کئے)۔ اور جہاں جہاں کفر کی ظلمتوں کے خلاف اور نورِ توحید کے پھیلانے کی خاطر جب بھی پیغمبروں علیہم السلام نے آواز بلند کی تو مخالف قوموں نے ان کے آگے مکروفریب کے بند باندھنے کی ناپاک کوششیں شروع کیں، مگر تیرا رب عزّ اسمہ کا ارشاد برحق اور فیصلہ نہایت محکم واٹل ہے کہ: ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ [الفجر:۱۴]

(بیشک تیرا ربّ گھات میں ہے) وہ ہر قسم کی تدبیروں کو خاک میں ملانے پر قادر ہے، دشمنوں نے پہاڑوں جتنے مکر وفریب گڑھ لئے، اور حیران کن تدابیر لے کر میدان میں اترے، مگر تیرے ربّ نے پہاڑوں کے برابر مکر وفریب کو ایک لمحہ میں زمین بوس کر کے رکھ دیا۔

آئندہ قیامت تک اسلام حق اور قرآن کے خلاف جہاں جہاں ملحدین، فاسق وفجار جب بھی اس قسم کے مکر وفریب، ناروا ہتھکنڈے استعمال کریں گے تو سنت اللہ یہی برقرار رہے گی کہ ربّ العزّت کی انتقامی تدبیر اور قہر وغضب ہر میدان میں ان کا تعاقب کرے گا، اور ان کے تمام عزائم وتدبیروں کو ناکام بنا کر خاک میں ملائے گا۔ ﴿وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ﴾ [الأنفال: ١٩] (اور اگر پھر (نافرمانی) کرو گے تو ہم بھی پھر تمہیں عذاب دیں گے) کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، اور دشمنوں کی تدبیریں الٹی ہو کر ان کے گلوں کو کاٹ کر رکھ دیں گی۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ [إبراهيم: ٤٦] (اور انہوں نے بڑی بڑی تدبیریں کیں، اور ان کی (سب) تدبیریں خدا کے ہاں (لکھی ہوئی) ہیں، گو وہ تدبیریں ایسی غضب کی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں)۔

اقوامِ عالم کی تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں کفار ومعاندین نے انبیاء ورُسل علیہم السلام کے خلاف اونچے اونچے اور بڑے بڑے پہاڑوں جتنے مکر وحیلہ اور ناکام تدبیریں گڑھی ہیں اور غلط منصوبے تیار کئے ہیں، مگر ربّ العزّت سبحانہ نے الٹا ان کی تدبیروں کو ان کے گلے اور سینے میں اتار کر انہیں تباہ کر لیا ہے۔ فللّٰہ الحمد والمنة

سُورَةُ الْاَعْلٰی

مكية آياتها ١٩ ركوعها ١

سورۂ اعلیٰ مکی ہے، اس میں انیس (۱۹) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

سورۃ الأعلیٰ کا نام پہلی آیت میں لفظ الْاَعْلٰی سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اور سورۃ التکویر کے بعد نازل ہوئی ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت انیس (۱۹) آیتوں ہیں، بہتر (۷۲) کلمات اور دو سو چوراسی (۲۸۴) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

اس سے پہلی سورت میں ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ﴾ [الطارق:۹] کا بیان ہوا کہ روزِ قیامت رازوں کے کھلنے سے گناہگار اور مجرم شرمندگی اور نقصان میں ڈوب کر تباہ ہوجائیں گے۔ اس سورۂ اعلیٰ میں تعلیم وترغیب ہے، اور ایمان، تقویٰ، ذکر وتسبیح اختیار کرنے کا بیان ہے، اور لوگوں کو آخرت کی شرمندگی اور ناکامیوں سے بچنے کی تحریض ہے کہ ایمان واعمالِ صالحہ والے لوگ کامیاب ہوکر فلاح پائیں گے۔

☆☆☆

مختصر موضوع:

(۱) تسبیح وتحمید کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرتوں اور دلائل توحید کا بیان ہے۔ (۲) آنحضرت ﷺ کے لیے خصوصی تعلیم۔ (۳) سعادت مندوں اور بدبختوں کا تذکرہ ہے۔ (۴) آخر میں صحفِ ابراہیم علیہ السلام وصحفِ موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت کا تذکرہ ہے۔

فضیلت:

یہ سورت بہت بڑی بابرکت ہے، حضور انور ﷺ بہت کثرت کے ساتھ اس کی تلاوت فرماتے تھے، اور سلف وبزرگانِ دین سے بکثرت اس کی تلاوت منقول ہے، اس کے فیوض وبرکات بہت زیادہ شمار ہوئے ہیں، حضور انور ﷺ صلوٰۃ الوتر کی پہلی رکعت میں اکثر اس کی تلاوت فرماتے رہے۔ [ترمذي، مسند أحمد، تفسير عزيزي]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَہٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ؕ﴿۵﴾ سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ اِنَّہٗ یَعۡلَمُ الۡجَہۡرَ وَ مَا یَخۡفٰی ؕ﴿۷﴾ وَ نُیَسِّرُکَ لِلۡیُسۡرٰی ۚ﴿ۖ۸﴾ فَذَکِّرۡ اِنۡ نَّفَعَتِ الذِّکۡرٰی ؕ﴿۹﴾ سَیَذَّکَّرُ مَنۡ یَّخۡشٰی ﴿ۙ۱۰﴾ وَ یَتَجَنَّبُہَا الۡاَشۡقَی ﴿ۙ۱۱﴾ الَّذِیۡ یَصۡلَی النَّارَ الۡکُبۡرٰی ﴿ۚ۱۲﴾ ثُمَّ لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَ لَا یَحۡیٰی ﴿ؕ۱۳﴾ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ﴿ۙ۱۴﴾ وَ ذَکَرَ اسۡمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ﴿ؕ۱۵﴾ بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿۫ۖ۱۶﴾ وَ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی ﴿ؕ۱۷﴾ اِنَّ ہٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی ﴿ۙ۱۸﴾ صُحُفِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اے پیغمبر! اپنے ربِ جلیل الشان کے نام کی تسبیح بیان کرو ① جس نے انسان کو بنایا پھر اس کے اعضاء کو درست کیا ② اور جس نے اس کا اندازہ ٹھہرایا پھر اس کو راستہ بتادیا ③ اور جس نے چارہ اگایا ④ پھر اس کو سیاہ رنگ کا کوڑا کردیا ⑤ ہم تمہیں پڑھا دیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے ⑥ مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے وہ کھلی بات کو بھی جانتا ہے اور چھپی ہوئی کو بھی ⑦ ہم تم کو آسان طریقے کی توفیق دیں گے ⑧ اور جہاں تک نصیحت کے نافع ہونے کی امید ہو

نصیحت کرتے رہو⑨ جو خوف رکھتا ہے وہ نصیحت تو پکڑے گا⑩ اور بے خوف بدبخت پہلو تہی کرے گا⑪ وہ قیامت کو بڑی تیز آگ میں داخل ہوگا⑫ پھر وہاں نہ مرے گا نہ جئے گا⑬ تحقیق کامیاب ہوا وہ شخص جس نے تزکیہ حاصل کیا⑭ اور اپنے ربّ کا نام یاد کیا، پھر اس نے نماز بھی پڑھی⑮ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہو⑯ حالانکہ آخرت کی زندگی بہتر اور دائمی ہے⑰ بیشک یہ قرآنی مواعظ پہلے صحیفوں میں بھی ہیں⑱ صحیفے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے⑲

معارف ومنازل

مسند احمد میں ہے کہ عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آیت: ﴿فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ﴾ [الواقعة: ۷۴] (پس پاکی بیان کرو اپنے پروردگار کے بڑے نام کی) اُتری، تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے تم رکوع میں رکھو''، اور جب: ﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى﴾ اُتری تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے تم اپنے سجدے میں کرلو''۔ ابو داؤد وغیرہ میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى﴾ پڑھتے تو کہتے: "سبحان ربي الأعلى"، اور جب سورۃ القیٰمۃ کی آیت: ﴿اَلَيۡسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنۡ يُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰى﴾ [القيامة: ۴۰] (کیا وہ ذات اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے؟) پڑھتے تو "سبحانک وبلٰی" کہتے۔ [رواه عليٌ وابن عباس]

﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى﴾ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ بلندیوں والے اپنے پرورش کرنے والے ربّ کے نام کی پاکیزگی اور تسبیح بیان کرو، یعنی اپنے دل میں بھی یہ اعتقاد رکھو اور عملاً بھی اس پر قائم رہو اور اپنی زبان سے بھی اعتراف واقرار کرو کہ میرا پروردگار ہر عیب ونقص سے منزہ و پاک ہے، ہر چیز پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے، اور ہر قسم کے اختیارات کا مالک ہے، اور وہ ہر قسم کی پاکیزہ صفات اور تمام خوبیوں کے ساتھ متصف وموصوف ہے، اور وہ ہر قسم کی تسبیح وتقدیس کا لائق وحقدار ہے۔

بحیثیت ذات اور باعتبار اسماء وصفات، قرآن کریم میں سو سے زائد مقامات پر تسبیح وتقدیس کے مختلف انداز میں تذکرہ و بیان ہے، کبھی تسبیح کا متعلق ذات پاک ہے، جیسے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ﴾ [الحديد: ۱] (جو چیز آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے سب خدا کی تنزیہ کرتی ہے)۔ اور کبھی تسبیح کا متعلق اسمِ

باری تعالیٰ ہے، جیسے کہ اسی آیت میں ہے۔

تو مطلب واضح ہے کہ تسبیح اسم کے لیے ہو یا مسمّٰی کے لیے ہو ہر دو معنی مقصود و مطلوب ہوں گے، جس طرح آپ کی ذات قابلِ احترام اور سزاوار تسبیح وتقدیس ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسماء وصفات بھی اسی قابل وحقدار ہیں، "فیکون التسبیح و التقدیس للاسم والمسمّٰی جمیعا"۔ [میزان] اور یہ معنی اس معنی کے ساتھ نہایت عمدہ ہے، اور ﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ﴾ میں کلمہ "اسۡمَ" کو زائد ماننے کی حاجت بھی نہیں، جیسے کہ بعض حضرات کا قول ہے، اور اس میں ایک لطیف اشارہ ونہایت عمدہ مطلب بھی واضح ہوگا، جس کا خلاصہ اختصاراً یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے بہت سے بے شمار نام ہیں جو کہ تقریباً چار ہزار کے قریب ہیں، اور یہ اسماء حسنی مبارکہ تورات، انجیل، زبور، صحف انبیاء علیہم السلام، قرآن وسنت میں مختلف زبانوں کے مختلف الفاظ ومعانی کے ساتھ موجود ہیں، اور یہ سارے صفاتی نام ہیں، جبکہ ﴿اللہ﴾ ذاتی نام ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث میں جن ننانوے (۹۹) اسماء حسنی کا تذکرہ ہے وہ حصر کے لیے نہیں، اللہ ربّ العٰلمین کے سارے مبارک نام توقیفی ہیں، یعنی ان میں زیادتی وکمی، ترمیم وتبدیلی کی ہرگز اجازت نہیں، تو:

﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَی﴾ میں تسبیح کے معنی تنزیہہ وتقدیس اور پاک رکھنے اور پاکی بیان کرنے کے ہیں، تو مطلب یہ ہوگا کہ اپنے ربّ کے نام کی تعظیم وتکریم کیجئے، اور اس کے ناموں کو بصد ادب واحترام، خشوع وخضوع کے ساتھ یاد کیجئے، جس طرح اس کی ذات پاک، بے انتہاء اور حد سے زیادہ قابل احترام وتعظیم ہے، اسی طرح اسماء وصفات بھی۔ ایک صاحب دل نے کہا: ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ☆ ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "روحِ جہاں اسم ذات باری تعالیٰ ہی ہے، جب دنیا میں کوئی ایک شخص اللہ کہنے والا باقی رہے گا اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، قیامت اس وقت آئے گی جب پورے عالم میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا کوئی ایک آدمی باقی نہیں رہے گا۔ یہی مضمون صحیح حدیث کا بھی ہے۔ یہی نام مبارک وہ خزانۂ رحمت ہے جو ہر مؤمن کے قلب پر لکھا ہوا ہے، اور اس کا نور وفیض ہر قلب کے اندرونی گہرائیوں میں بطور لطیفہ صادقہ موجزن ہے۔ زہے سعادت۔ ان مؤمنوں کے لیے جو ہر وقت اس کو اپنے باطن میں مستحضر یقین کرتے ہوئے تمام ممنوعات ونفسانی خواہشات اور ملعون دنیا کی محبت سے پرہیز کرتے ہیں۔ تفصیل سورۂ فاتحہ کی تفسیر اور سورۂ

اعراف کے آخر میں دیکھیں۔

باطن کی اصلاح:

دراصل یہ لذّت اس وقت محسوس ہوگی جب قلب غیر اللہ کے ہر تصور سے خالی ہو، کیونکہ قلوب میں جب تک غیر اللہ کا عمل دخل رہے گا اس وقت تک لطائف رحمانی وفیوض یزدانی کا وہاں ورود نہیں ہوگا۔ اللہ پاک جس طرح غفور ورحیم ہے اسی طرح وہ صمد وبے نیاز اور غیور بھی ہے، اس کی غیرت کا تقاضا ہے کہ جو مکان اس کے لیے مخصوص ہو اس میں کسی غیر کی شرکت اور ورود کا شائبہ نہ ہو، وہ تو ہر قسم کے شریکوں سے منزہ پاک ہے، اس کے انوار وتجلیات کا ورود اُن پاکیزہ قلوب کے لیے مخصوص ہے جہاں غیر اللہ کا گزر نہ ہو۔ اگر کسی قلب میں ہوس دنیا ہو، یا اتباعِ خواہشات یا شہواتِ نفسانیہ اور عقائدِ باطلہ کا گزر ہو، وہاں ربّ العزّت کے انوار وتجلیات کا ورود اس لئے ممکن نہیں کہ وہ قلب نجاستوں میں لت پت ومستغرق ہے۔ لطیف وخبیر سبحانہ کے لطائف کے نزول کی پہلی شرط طہارت ظاہر وباطن کا مکمل حصول ہے، اور وہ ترکِ دنیا اور ترکِ لذّات شہوات پر موقوف ہے۔

ایک شخص نے عالم صاحب سے مسئلہ پوچھا، کہنے لگا کہ حضرت! گھر کے کنویں میں کتا گر گیا ہے اور مر گیا ہے، کنویں کی صفائی کی کیا صورت ہوگی؟ عالم صاحب نے فرمایا: ''کنویں کا سارا پانی نکال دو، بس صاف وپاک ہوگا، اس شخص نے پانی تو سارا نکال دیا، مگر کتے کو نکالنا بھول گیا، دوبارہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ حضرت! پانی سارا نکال دیا، کیا اب کنواں پاک ہے؟ عالم نے کہا کہ کتا نکال کر کہاں پھینکا؟ کہنے لگا: حضرت! کتا ابھی تک تو اندر ہے، عالم نے ارشاد فرمایا کہ بھائی صاحب! کنویں کی صفائی کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ کتے کو نکال باہر کرو، اس کے ہوتے ہوئے کنواں ہرگز پاک نہیں ہوسکتا۔

کچھ لوگ اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ ہم مسلسل نماز پڑھتے ہیں، حج وزکوٰۃ، صوم وصلوٰۃ پر پابندی کرتے ہیں، تبلیغی چلہ لگاتے ہیں، اجتماعات میں شرکت کرتے ہیں، قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں، تہجد واشراق، صلوٰۃ الحاجت، صلوٰۃ التسبیح ادا کرتے ہیں، سہ روزہ لگاتے ہیں، یا علم حاصل کرتے ہیں، درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے ہیں، تالیف وتصنیف کے عمل اور خطبہ وتبلیغ، درس قرآن وحدیث کرتے دیا کرتے ہیں، کبھی صدقات وخیرات بھی دیتے ہیں، وضع وقطع، اور خورد ونوش، قیام وطعام اور لباس شرعی طریقے پر ہیں، ماشاء اللہ مراقبہ، اذکار، تسبیحات، وظائف اور اوراد پر عامل رہتے ہیں، بس یہی دین ہے، اور یہی شریعت وطہارت ہے۔

الحمدللہ دین بھی مکمل ہے اور دنیا بھی، اللہ تعالیٰ نے دونوں نعمتوں سے نوازا ہے، حالانکہ ایسے قسم کے لوگ حقوق العباد کی ادائیگی میں صفر ہیں، معاملات میں بالکل ختم، دیکھنے کے قابل نہیں۔ حبِ دنیا میں اتنے مستغرق ہیں کہ مشتبہ مال بجائے خود حیلہ وتدبیروں کے ذریعہ صاف صاف محرّمات وغیرہ میں منہمک رہتے ہیں۔

دل کی گہرائیوں میں دنیا کے کتوں کو بٹھا کر ایک غرور میں مبتلاء ہیں، ان کے قلوب و باطن اس قابل ہیں کہ ان میں انوار وتجلیات رحمانی اور فیوض سبحانی کا ورود ہو؟ شاید ایسا نہیں ہوگا۔ [الكشف والتبيين في غرور الخلق أجمعين۔إختصار اللغزالي] جس دل میں حبِ دنیا ہو اس پر سبحانی برکات وتجلیات کا ورود حرام ہے، فرماتے ہیں: اگر کائنات کے ذرات سارے نیکیاں بن جائیں، ربّ العزّت کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، اور اگر کائنات کے سارے ذرات معاصی ہوں ربّ العزّت کی مملکت میں کوئی نقصان وکمی نہ ہوگی، پھر مثال دے کر فرماتے ہیں کہ ایک عاشق اپنے محبوب کو بہت چاہتا تھا اور محبوب بھی عاشق پر فریفتہ تھا، چند دنوں کے بعد محبوب ایک دو اور عاشقوں کے نرغہ میں آیا، اب یہ مشترکہ محبوب بن گیا، جبکہ پہلے بلاشرکت غیر ایک ہی عاشق کا ہوتا تھا، جب عاشق کو معلوم ہوا تو اس نے اس بات کو اپنی غیرت کا منافی سمجھ کر اس سے محبت کا رشتہ قطع کر کے کہا:

واترک حبه من غير بغض	★	و ذاک لكثرة الشركاء فيه
وتجتنب الأسود ورود ماء	★	إذا كان الكلاب ولغن فيه

میں محبوب کو اس وقت تک چاہتا رہا جب وہ اکیلا ہمارا رہا، جب اس نے ہماری دوستی میں دوسروں کو شریک کیا تو وہ اکیلا ہمارا نہیں رہا، اور ہم بھی اس کے نہ رہے کہ یہی غیرت کا تقاضا ہے۔

پس اللہ پاک غیور عزّ شانہ کس طرح اس بندہ کا رہے گا جس نے اللہ تعالیٰ کے گھر (بندہ کا دل و باطن) میں دوسروں کو (محبت دنیا) جگہ دیدی ہو، اور دنیا کے کتوں کو اپنے دل میں رکھا اور پالا ہو؟ شیر (جنگل کا بادشاہ) بڑا خوددار اور غیرت مند ہے، اس کی غیرت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے مخصوص احاطہ اور جنگل میں کبھی کسی دوسرے شیر کو نہیں چاہتا، یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اس کے اقتدار میں شریک ہو۔ دوم وہ کسی دوسرے جنگلی جانور کے پس خوردہ کو استعمال نہیں کرتا، وہ بھوک وپیاس کی شدت میں مرنا پسند کرتا ہے، مگر کسی کے پس خوردہ کھانے یا پینے پر زندہ رہنا پسند نہیں کرتا، جنگلی چشموں کی جس گھاٹی پر کتوں کا گزر ہو شیر ہرگز ایسی گھاٹیوں پر پانی پینے کے لیے وارد نہیں ہوتا۔

جب ایک غیرت مند شیر جو کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اس کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ کتوں کی گھاٹی پر وارد

نہیں ہوتا تو یہ ناقص العقل اور ناعاقبت اندیش انسان خالق کائنات کے بارے میں نہیں سوچتا کہ قلوب و باطن اتنے بہت گندے ناپاک ہوں، حبِ دنیا (تمام ناپاکیوں کی جڑ) میں لت پت ہوں اور دیگر منہیات و معاصی میں شرابور ہوں، پس ربّ العزّت کے انوار و برکات اور تجلیات کا وہاں کیسے گزر ہوگا؟

جو شخص خدائی انوار و تجلیات کے ورود اپنے قلب باطن پر چاہتا ہو اور اس کے ورود کا شوق رکھتا ہو، تو چاہئے کہ اپنے باطن کی اصلاح کرے۔ یہ شرم کی بات ہے کہ اپنے ناپاک باطن میں اپنے پاکیزہ ربّ کو اتارنے کی کوشش کرتا ہے، اگر کسی بہت بڑے معزز ہستی کی دعوت کرتے ہیں تو اسے صاف ستھرے پاکیزہ گھر میں اتارتے ہیں، یہ میزبان بندہ کتنا بے حیاء ہے کہ خالق کائنات کی تو میزبانی کرتا ہے، مگر منزل ورود کی طہارت کا اہتمام نہیں کرتا؟ تلک بتلک۔ آج اگر اپنے ربّ کو پاکیزہ ماحول میں آنے کی دعوت دے گا، تو کل قیامت کے دن ربّ العزّت اسی کی ضیافت کے عوض اس کا میزبان بن کر اس کو پاکیزہ جنت کی ضیافت خانے میں اتارے گا۔ **اللّٰھم ارزقنا أنوارک و ضیافتک۔ آمین**

تخلیق کائنات کی نیرنگیاں:

﴿اَلَّذِیۡ خَلَقَ﴾ ربّ اعلیٰ جل وعلا کی صفات کا مختصر ذکر ہو رہا ہے، جو تخلیق کائنات میں اس کی قدرتِ قاہرہ اور حکمتِ بالغہ کے مشاہدہ سے متعلق ہیں، ان میں پہلی صفتِ خلق ہے، خلق کسی صنعت گری یا محض کسی ایجاد کا نام نہیں، بلکہ عدم سے بغیر مثال و مادہ یا اسباب و علل کے کسی چیز کو وجود میں لانا ہے۔ یہ کام ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اور یہ کسی مخلوق کی دسترس سے باہر ہے، یہ صرف حضرت باری تعالیٰ شانہ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ ہے کہ بغیر محنت اور بغیر کسی سابق مادہ کے جب چاہتے ہیں اور جس چیز کو چاہتے ہیں عدم سے وجود میں لے آتے ہیں، اس بے مثال تخلیق کے ساتھ دوسری صفت:

﴿فَسَوّٰی﴾ ہے بمعنی ''برابری'' جو تسویہ سے مشتق ہے، اور برابر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز کو جو وجود عطا فرمایا اس کی جسامت، طول و عرض، شکل و صورت اور اعضاء و اجزاء کی وضع و قطع اور ہیئت میں ایک خاص تناسب ملحوظ رکھ کر یہ وجود بخشا گیا ہے، اس طرح کی تخلیق جو حکمتِ بالغہ کے تقاضوں کے بعد نہایت موزوں و مناسب انداز میں ٹھیک استوار ہو یہ اس قدیر و حکیم کا کارنامہ ہوگا، اور ہر مخلوق کے لیے جو شکل و صورت منتخب ہوگی یا ہوگئی اس سے بہتر شکل و صورت کا تصور ممکن نہیں ہوگا۔

انسان اور ہر جانور کو اس کی ضروریات کے مناسب اعضاء دیئے گئے، اور پھر ان اعضاء کی جسامت اور وضع وہیئت اس کی ضروریات کے مناسب بنائی گئی ہیں، ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کے پوروں میں ایسے جوڑ رکھے اور ایسی قدرتی اسپرنگ لگائیں کہ وہ ہر طرف موڑے، کھینچے اور تہہ کئے جاسکتے ہیں، گردن اور کمر میں، نیز آنکھوں میں ایک مڑنے والے مادہ اس قسم کا رکھا گیا ہے جو ہر سمت گھوم سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے ہر عضو کو دیکھیں! یہ حیرت انگیز تناسب خود انسان کو خالق کائنات کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ پر ایمان لانے کے لیے کافی ہے، بشرطیکہ اس کی فطرت صحیح ہو۔

ڈاکٹروں، سائنسدانوں اور انسانی بدن اور اس کے اعضاء پر ریسرچ اور تحقیق کرنے والے بغیر کسی چون و چرا کے تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ تخلیق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا ثمرہ ونتیجہ ہے، یہ پیوندکاری کسی مخلوق کے دائرۂ قدرت سے باہر ہے، اور سائنسدان آج تک جتنی مشینری ایجاد کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں، وہ اکثر وبیشتر انہی خدائی مشین کو سامنے رکھ کر نقل اتار چکے ہیں، اسی طرح دیگر طرح طرح کے ایجادات اسی خدائی ایجادات وتخلیقات سے ماخوذ ہیں۔

﴿وَالَّذِیْ قَدَّرَ﴾ اور جس نے (اس کا) اندازہ ٹھہرایا۔ یہ تیسری صفتِ مختصہ ہے، تقدیر کے معنی ہیں: کسی چیز کو خاص اندازے پر بنانا، قضاء وقدر کو تقدیر کہتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ اول تقدیر لکھ دی گئی، پھر اس کے موافق دنیا میں لایا۔ [موضح] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''آسمان وزمین کی آفرینش سے پچاس ہزار سال پہلے ساری مخلوق کے مقدرات کو مقرر فرمادیا گیا تھا، اس وقت عرشِ الٰہی پانی پر تھا، پھر فرمایا کہ تقدیر میں ہر چیز مقدر ہے، یہاں تک کہ بے نہی اور ہوشیاری بھی''۔ [مسلم]

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی چیزوں کو صرف پیدا کر کے اور بنا کر نہیں چھوڑا، بلکہ ہر چیز کو کسی خاص کام کے لیے پیدا کیا، اور اس کے مناسب اس کو وسائل مہیا کئے اور اسی کام میں اس کو لگا دیا۔ غور کیا جائے تو یہ بات کسی خاص جنس یا نوع مخلوق کے لیے مخصوص نہیں، ساری کائنات اور مخلوقات ایسی ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے خاص خاص کاموں کے لیے بنایا ہے اور ان کو اسی کام میں لگا دیا ہے۔ ہر چیز اپنے ربّ کی مقرر کردہ ڈیوٹی پر لگی ہوئی ہے، آسمان اور اس کے ستارے برق وباران سے لے کر انسان وحیوانات اور نباتات وجمادات تک سب میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جس کو جس کام پر خالق تعالیٰ نے لگا دیا ہے وہ اس پر لگا ہوا ہے، اپنی ڈیوٹی پورا کر رہا ہے۔

ابر و باد و ماہ و خورشید و فلک درکاراند ☆ تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمان بردار ☆ شرط انصاف بناشد کہ تو فرمان نہ بری
(سعدی)

مولانا رومی فرماتے ہیں: ؎

خاک و باد و آب آتش بندہ اند ☆ با من و تو مردہ با حق زندہ اند

خصوصاً انسان اور حیوان کے ہر نوع وصنف کو ربّ العزّت نے جس خاص خاص کاموں کے لیے پیدا فرمایا ہے، وہ سب قدرتی طور پر اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، ان کی رغبت وشوق اسی کام کے گرد گھومتا ہے۔ ؎

ہر یکے را بہر کارے ساختند ☆ میل اورا در دلش انداختند

چوتھی چیز یہ فرمائی: ﴿فَهَدٰى﴾ پھر اس کو راستہ بتایا۔

ہدایت عامہ وفطری تعلیم:

یعنی خالق کائنات نے جس چیز کو جس کام کے لیے پیدا فرمایا اس کو اس کی ہدایت بھی فرمادی کہ وہ کس کس طرح اس کام کو انجام دے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ہدایت تمام کائنات ومخلوقات کو شامل ہے، آسمان اور آسمانی مخلوقات ہوں، یا زمین اور اس کی مخلوقات اور بحری ودریائی مخلوقات ہوں، کیونکہ ایک خاص قسم کا عقل وشعور اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی دیا ہے، گو وہ انسان کی عقل وشعور سے کم ہو، جیسا کہ قرآن نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ [طٰہٰ: ۵۰] (اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وجود بخشا پھر اس کو اس کے متعلقہ کام کی ہدایت کردی)۔

اسی ہدایتِ عامہ کا اثر ہے کہ آسمان وزمین، ستارے اور سیارے، پہاڑ اور دریا سب کے سب جس خدمت پر اوّلین خلقت سے مامور کردیئے گئے ہیں اس خدمت کو ٹھیک اسی طرح بغیر کسی کمی وکوتاہی اور سستی کے بجالاتے ہیں، خصوصاً انسان اور حیوانات جن کا عقل وشعور ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ان میں بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر نوع اور وہر صنف، بلکہ ہر ہر فرد کو حق تعالیٰ نے اپنی اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے اور مخالف چیزوں کو دفع کرنے کے لیے کیسے کیسے دقیق وباریک ہنر سکھائے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

انسان تو سب سے زیادہ عقل وشعور والا ہے، جنگل کے جانوروں، درندوں، پرندوں، کیڑے مکوڑے، حشرات الارض کو دیکھیں کہ ہر ایک کو اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے اور رہنے بسنے اور اپنی انفرادی اور جنسی

ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کیسے کیسے ہنر سکھائے ہیں، اور یہ سب بلا واسطہ تعلیم صرف خالق کائنات کی طرف سے ہیں، انہوں نے کسی تعلیمی ادارے میں رہ کر یا کسی استاد سے یہ ہنر نہیں سیکھا، بلکہ یہ سب اسی ہدایت عامہ اور فطری تعلیم اور تلقین ربانی کے ثمرات ہیں، جس کا ذکر آیت کریمہ: ﴿أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ﴾ [طٰہٰ:۵۰] (اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وجود بخشا پھر اس کو اس کے متعلقہ کام کی ہدایت کردی) میں، اور اس سورت کے: ﴿وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ﴾ میں فرمایا ہے۔ [معارف]

دیکھیں! سانپ اور بچھو کا زہر اس کے لیے مضر نہیں، حالانکہ یہ زہر شب و روز اس کے بدن میں ہے، جوں ہی یہ زہر اس کے بدن سے الگ ہوکر کسی جانور کے بدن میں داخل ہوگا تو تباہی برپا کرے گا اور ہلاکت کا سبب بنے گا۔

وحی کی بحث میں ہم نے بتایا تھا کہ وحی فطری (پیدائشی ہدایت) یہ انسانوں کے ساتھ خاص نہیں، یہ ہدایت و شعور جانوروں کو بھی حاصل ہے، حتی کی چیونٹیوں اور ان سے بھی کم درجے کے کیڑے مکوڑوں کو بھی حاصل ہے۔ یہ شعور و ہدایت من جانب اللہ تمام مخلوقات کے لیے خزانہ غیب سے مقرر ہے۔ اللہ ربّ العزّت عزّ شانہ کی صفتِ خالقیت نے انہیں پیدا فرمایا، اور صفتِ رحمانیت نے انہیں تحفظ دے کر باقی رکھا، صفتِ ہدایت نے انہیں ہر نفع و نقصان پر رہنمائی فرمائی۔

اگر ہم حشرات الارض اور معمولی کیڑے مکوڑوں کی زندگی اور ان کی مختلف انواع واقسام اور ان کی نسل و خوراک اور طرز زندگی کا بغور مطالعہ کریں تو بے شمار عجائبات اور قدرتی مناظر کا مشاہدہ کریں گے، ایک ادنیٰ اور معمولی مکڑی اور اس کا بنا ہوا خیمہ نما جالا جسے وہ ہوا، مٹی اور گرد وغبار سے اپنے لعاب کے ذریعہ ترتیب دے کر بناتی ہے، اگر بڑے ماہر انجینئر ایک عرصہ تک ان چیزوں پر محنت کریں تو شاید وہ بھی یہ جالا نہ بنا سکیں اور عاجز ہوکر چھوڑ دیں، مگر مکڑی ضعیف و ناتواں اسے صرف تین روز میں ترتیب دے کر مکمل کرتی ہے۔ یہ الہامی سوچ اسے ربّ العزّت نے مہیا کی ہے اس کی مثال نہیں، اور پھر اس کی بناوٹ اور اس کے اندر کی سڑکیں طرح طرح کے راستے اور اس کے دروازے اور اس کے انڈوں کا پنجرہ وغیرہ۔ اگر ملاحظہ کریں تو بے ساختہ کہنے لگیں: "**سبحان الهادي كلّ مخلوق إلى منافعه و مضاره**"۔

جب مرغی کا بچہ انڈے میں پیدا ہوتا ہے تو اسے قدرت کی طرف سے ہدایت ملتی ہے کہ چونچ مار مار کر انڈے کے پوست کو سوراخ کرکے توڑ دو اور قید خانہ سے نکلو، اور نکلتے ہی چونچ کے ذریعہ خوراک کھانا شروع کردو،

اگر آپ چار پانچ انڈے مرغی کے اور اسی طرح بطخ کے ایک مٹی کے برتن میں رکھو، تین ہفتہ بعد وہ اکٹھے، بیک وقت جب پیدا ہوں، تو سامنے تھالی پانی سے بھر کر رکھ دو، تو بطخ کے بچے فوراً پانی میں کھود جائیں گے، اور مرغی کے بچے پانی سے ہٹ جائیں گے، یہ سب فطری ہدایات ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی ہر نوع کے لیے الہام فرمائی ہیں، ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الغافر: ٦٤] (پس برکت والا ہے اللہ جو مخلوقات کا پروردگار ہے)۔

حضرت انسان تمام مخلوقات کا سرخیل ہے، اس کے سر پر خلافت کا تاج ہے، ساری کائنات اس کے لیے ہے، وہ سب کا بادشاہ و حکمران ہے، اس کی نزاکتیں، خواہشات، شکل، حسن و جمال سب سے افضل و بہتر اور ممتاز ہیں، وہ محض شعور و ادراک کا مالک نہیں، بلکہ اسے عقل کی نعمت و دولت سے نوازا گیا ہے، اس کے پاس عقل و ہنرمندی، کردار و جذبات کا خزانہ ہے، اس کے پاس بیس قسم کے حواس ہیں، جن میں سے پانچ ظاہری اور پندرہ حواس باطنی ہیں، اصل ہدایت اور ہدایت کے تمام چشمے اسی سے جاری ہیں، گویا کہ وہ ہدایت کی منڈی کا مختار و مالک ہے، اگر کبھی نفس و شیطان کی شرارت اور شکوک و شبہات کی وجہ سے اس کی فطرت گھٹنے ٹیک دیتی ہے، اور اس کی ابدی سعادت خطرے میں پڑ جاتی ہے، تو معلّمِ فطرت، ہادی برحق فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور اسے گمراہی کے کنویں سے نکالنے کا انتظام و تدبیر کر کے اس کی رہنمائی کے لیے ایک خارجی ہدایت، یعنی وحی الٰہی، پیغامِ رسالت، ارسالِ رُسل علیہم السلام و انزالِ کتب کا اعلیٰ و مکمل و منظّم سلسلہ جاری کرتا ہے۔

یہ وحی الٰہی تمام شیطانی فریب کاریوں کا قلع قمع کر کے اس کو صراط مستقیم پر چلنے کا قابل بنا دیتی ہے، اور اسے اراءۃ الطریق کے درجے سے اوپر اٹھا کر بلند و بالا درجہ ایصال الی المطلوب تک رہنمائی اور دستگیری عطا کرتی ہے، یہی مطلب ہوگا: ﴿وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ کا۔ واللہ اعلم

مسئلہ اتمامِ حجت:

جب انسان کو اللہ تعالیٰ الہادی جل شانہ نے عقل و شعور تمام مخلوقات سے زیادہ اور کامل عطا فرمایا، اور اس کو مخدومِ کائنات بنا دیا، کائنات کی اکثر مخلوقات کو مسخر فرما کر اس کے قدموں میں ڈالا، تمام زمینی مخلوقات، دریا، کوہ، جبال، صحراء و جنگلات اور ان میں پیدا ہونے والی اشیاء کو انسان اور اس کی خدمت کے لیے مقرر فرمایا، اور سارے زمینی خزانوں تک اس کی رسائی آسان بنا دی، اور تمام چیزوں سے نفع و فائدہ اٹھانے کی اسے دسترس و قدرت مہیا فرمائی، اور پھر اسے ایک ایسی بخشش و دولت عطا فرمائی جس کے ذریعہ کائنات کے اکثر و بیشتر چیزوں پر کمند ڈال کر وہ

سب کچھ اپنی خواہشات کا تابع بنا کر آگے ترقی کرے، اور واقعی یہ ثابت کرے کہ وہ مالک ومختار ومخدوم کائنات ہے۔

وہ چیز عقل و ہنر اور کائنات کی اشیاء میں حسب منشا ردو بدل، جوڑ توڑ، صنعت و ایجاد اور کاریگری و استادی ہے، اگر وہ مٹی کو پتھر بنا دے تو یہ اس کی مرضی، اگر وہ پتھر کو ریت بنائے، یا میدہ کر کے ہزاروں دھاتوں میں شامل کرے تو کرے، پتھر سے سونا، چاندی، پیتل، ایلومونیم یا کچھ اور نکالنا چاہے تو اس کی مرضی، جہاز، راکٹ، میزائل، ٹیلیفون، موبائل، ٹرین، کمپیوٹر، الغرض ہزاروں قسم کی مصنوعات کا ایجاد کرے تو اس پر پابندی نہیں۔ روزِ اول سے انسانی ایجادات کا محیر العقول سلسلہ جو چلا ہے سو چلتا رہے گا، اللہ جانے یہ سلسلہ شاید قرب قیامت تک بلا توقف جاری رہے گا، یہ تمام سائنسی ایجادات انسانی عقل و ہنر اور علم و ایجادات کی مصنوعات کہلائیں گی۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسان ان چیزوں کا خالق ہے؟ جواب، ہرگز نہیں، یہ ساری مصنوعات جن مادوں (مواد) سے بنتی ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ شانہ کی پیدا کردہ ہیں، سائنس میں کسی مخلوق کو پیدا کرنے کی صلاحیت کہاں؟ ہاں! اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں جو مخفی فوائد رکھے ہیں اور مخلوقات میں بطور انفعال جو پوشیدہ استعداد پیدا کی ہے، زیادہ سے زیادہ سائنس نے ان مخفی رازوں کا انکشاف کر کے انہیں سب کے سامنے ظاہر کیا، اور چند مفردات کو ترتیب دے کر جمع کیا، اور ان کی ترکیب سے ایک خاص منفعت پر راہنمائی ہوئی۔

مثال کے طور پر آپ پانی، چائے، پتی، دودھ، چینی، ان چار ایٹموں کو ملا کر جوش دیں، تو مرکب کا نام چائے ہوگا، تو کیا اس چائے کے بنانے والے پر چائے کے خالق کا اطلاق ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، کیونکہ چاروں مادے پہلے سے تیار ہیں، خالق اسے کہتے ہیں جو بغیر مادہ اور سابقہ نمونہ کے، بغیر محنت کوئی معدوم چیز کو وجود بخشے، یہ خاصۂ خداوندی ہے، یہ کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔

چونکہ یہ مصنوعات عارضی اور غیر یقینی ہیں، ان میں شر و فساد کا مادہ زیادہ ہے، خیر و صلاح کا پہلو کم ہے، خیر و شر کا تعین عقل سے ہرگز نہیں ہوسکتا، سعادت و شقاوت کے تعین سے عقل سراسر عاجز ہے، تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسی پختہ و یقینی چیز کی ضرورت اور انتظار ہو جو سعادت و شقاوت کا یقینی طور پر تعین کر سکے، اسی کا نام ہے: وحی الٰہی، آیت کریمہ ﴿فَهَدٰى﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے، اور اسی کے ذریعہ مخلوقات پر اتمامِ حجت کا دارومدار ہے۔

﴿وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى﴾ اور جس نے چارہ اُگایا۔ ربوبیت کی پانچویں صفت یہ ہے کہ زمین سے تمہارے لئے اور تمہارے جانوروں کے لیے چارہ نکالا۔ دوسری آیت میں ہے: ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾

[عبس: ۳۲] (یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چار پایوں کے لیے سامان ہے)۔

یہ سبزے، درخت، جڑی بوٹیاں، طرح طرح کے پودے، مختلف رنگ و ذائقہ کی بوٹیاں موسم بہار میں ان کا منظر قابلِ دید اور جاذبِ نظر ہوتا ہے، بغیر کسی مالی کے زمین کا طول و عرض، ہر خطہ، سبزہ زار نظر آتا ہے، لہلہاتے پھول منقش قالینوں کی طرح گل و گلشن کا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے، مگر کچھ عرصہ بعد وہ منظر مرجھا ہوا نظر آتا ہے، تمام سبزے اور پھول خشک ہو کر پیلے اور پھر سیاہ ہو کر ریزہ ریزہ اور زوال پذیر ہو جاتے ہیں، پس تم اپنی زندگی کو اسی پر قیاس کرو، متاعِ دنیا اور دنیا کی رونقوں پر غرہ ہو کر ابدی زندگی آخرت کو بھول نہ جاؤ، جس کی رونقیں، شادیاں اور خوشحالیاں ابدی ہیں، جن پر:

﴿غُثَآءً اَحْوٰی﴾ کا ہرگز نزول نہیں ہوگا، اس کے حصول کا راستہ بتا کر ارشاد فرمایا:

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى﴾ ہم آپ کو یہ پیغام لازوال خود پڑھائیں گے، جسے آپ فراموش نہیں کریں گے، کیونکہ اس کی بہار دائمی ہے، اس پر کبھی خزاں کا حملہ نہیں ہوگا، یہ تازہ اور رطب پیغامِ الٰہی دخولِ جنت تک سرسبزی کا منظر پیش کرتا رہے گا، اس کے حافظ قاری سے کہا جائے گا کہ پڑھتے جاؤ اور درجات جنت پر چڑھتے جاؤ، جہاں تمہاری تلاوتِ مرتلۃ کا اختتام ہوگا وہیں تمہارا ابدی ٹھکانا ہوگا۔

قرآن کریم کا معلم جب خود ذات باری تعالیٰ ہو اور اس کی تعلیم و یادداشت اور مطالب و معانی تمام احکام سمجھانے اور حضور انور ﷺ کے سینہ اطہر میں جمع کرانے کی ذمہ داری اٹھائی ہو، تو ﴿فَلَا تَنْسٰۤى﴾ کا مطلب یہی ہوگا کہ الفاظ و معانی اور مطالب و اغراض سارے محفوظ ہو گئے، البتہ نسخ کا امکان باقی رہا، جسے ﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ سے واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اگر ایک حکم صادر کرتا ہے تو مصلحت کے تحت جب وہ نافذ ہوتا ہے، تو پھر دوسری مصلحت کے تحت اسے واپس بھی لے سکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ کوئی حکم باقی نہ رہے تو وہ خود اسے بھلا دے گا، مگر اس کا قانون یہ ہے: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا﴾ [البقرۃ: ۱۰۶] (ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے، یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں)۔ اسی طرح: ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ [الرعد: ۳۹] (خدا جو چاہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہے قائم رکھتا ہے، اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے)۔ تو اس قانون کے تحت اگر خود اللہ تعالیٰ کسی حکم کی منسوخی چاہیں گے تو اسے بھلا دیں گے، ورنہ تو قرآن پاک کی ہر ہر آیت اور ہر حکم و مطلب کا پڑھنا اور محفوظ رکھنا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے۔

قرآن مجید کی ایک خاصیت:

دراصل یہ تیسرا موقع ہے جہاں سرور عالم ﷺ کو وحی اخذ کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے، اس سے پہلے کے دو مواقع سورۂ طٰہٰ اور سورۂ قیامۃ میں گزر چکے ہیں۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم جس طرح بطور معجزہ حضور ﷺ پر نازل کیا گیا تھا اسی طرح معجزے کے طور پر اس کو لفظ بہ لفظ آپ ﷺ کے حافظہ میں محفوظ بھی کر لیا گیا تھا، اور اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا گیا تھا کہ آپ ﷺ اس میں سے کوئی چیز بھول جائیں، یا اس کے کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہو جائے، یہ بات کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں، خواہ وہ آسمانی کتاب ہو یا غیر آسمانی۔

پس وحی متلو میں کلام اور عبارت دونوں اللہ تعالیٰ کے ہیں، اور وحی غیر متلو (حدیث پاک) میں بات اللہ تعالیٰ کی اور کلام سید الانبیاء ﷺ کا ہے، تو قرآن پاک پیغام خدا ہے بالفاظِ خدا تعالیٰ، اور حدیث پاک کا مضمون خدا ہے بالفاظ سید الانبیاء ﷺ۔ حدیث پاک کی تعداد سات لاکھ پچاس ہزار ہے، اگر یہاں بھی پیغامِ خدا بالفاظِ خدا ہوتا تو وہ بھی قرآن ہوتا، تو کرۂ ارض پر ایک حافظ بھی موجود نہ ہوتا اور تحریف شروع ہو جاتی، اس لئے مہماتِ کو دین قرآن میں ذکر کر دیا تاکہ امت کے لیے قرآن کا حفظ آسان ہو، اور حدیث پاک سے اس کی وضاحت وتشریح ہو۔

﴿اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے خواہ وہ ظاہر ہو یا مخفی، اور اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر ایک سے معاملہ کرے گا۔ یوں تو یہ الفاظ اور حکم عام ہے، لیکن جس سیاق میں یہ بات ارشاد فرمادی گئی، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ جو قرآن جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ پڑھتے جا رہے ہیں اس کا بھی اللہ تعالیٰ کو علم ہے، اور بھول جانے کے جس خوف کی بناء پر آپ ﷺ ایسا کر رہے ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اس لئے آپ ﷺ کو یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ آپ اسے بھولیں گے نہیں۔

بہرحال! آپ ﷺ کا بار بار اور زور زور سے پڑھنا جو ظاہر ہے اور بھول جانے کا خدشہ، جو مخفی ہے وہ سب ہمیں معلوم ہے، آپ مطمئن رہئے! آپ بھولیں گے نہیں۔ رہا یہ کہ ایک حکم نازل کرنے کے بعد پھر اس کو منسوخ کرنے کے کیا معنی؟ سو اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا کوئی احاطہ کر سکتا ہے، اسی کو معلوم ہے کہ کونسی چیز ہمیشہ باقی رکھنی ہے اور کونسی چیز ہنگامی اور وقتی ہے۔ [أنوار القرآن]

☆☆☆

ایک اہم نکتہ:

﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى﴾ یہاں ﴿يُسْرٰى﴾ سے مراد اسلامی شریعت ہے، مقتضائے مقام یہ تھا کہ یوں فرمایا جاتا کہ ہم اس طریقہ اور شریعت کو آپ کے لیے آسان کردیں گے، مگر فرمایا یہ جارہا ہے کہ ہم آپ کو اس طریقہ کے لیے آسان (تیار) کردیں گے۔ راز اس کا یہ بتلانا معلوم ہوتا ہے کہ ہم آپ کو فطری اور طبعی طور پر ایسا بنادیں گے کہ شریعت اسلامیہ آپ کی فطرت وطبیعت بن جائے، اور آپ شریعت کے سانچہ میں ڈھل جائیں، قرآن کریم کو یاد رکھنے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت وعبادت اور معاملات سب آسان اور سہل کردیئے جائیں گے، اور تمام مشکلات حل کردی جائیں گی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ کے خلق کا پوچھا گیا تو انہوں نے جواب ارشاد فرما کر کہا کہ: "كان خلقه القرآن۔ [بخاري] آپ ﷺ کا خُلق قرآن ہی تھا، قرآن پر عمل آپ ﷺ کی فطرت اور طبیعت بن گیا تھا۔ آپ ﷺ قرآن کے عملی نمونہ تھے، قرآن کریم کو مطالعہ کرنے والا اور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے والا یہی محسوس کرے گا کہ آپ ﷺ کی عملی زندگی قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔ تمام قرآن پاک آپ ﷺ کی زندگی اور وجود مسعود میں ایسا جاری ساری محسوس ہوتا ہے جیسے کہ گلاب کے شگفتہ پھول میں اس کا عطر و خوشبو جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کے جواب کا یہی مطلب ہے۔

﴿فَذَكِّرْ﴾ تو تم نصیحت فرماؤ، یعنی اللہ نے جب آپ پر اس قدر احسانات فرمائے ہیں تو ان کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس فیضان کو عام کریں، اور دوسروں کی اصلاح کی فکر کریں۔ ﴿اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾ اگر نصیحت کام دے۔ ایک دعوت وتبلیغ ہوتی ہے، یعنی احکام کا پہنچانا اور تعمیل کی صورت میں مستحق ثواب اور نافرمانی کی صورت میں مستحق عذاب ہونے کو بتلانا، خود ہر ایک پر ضروری ہے، اس میں نفع کی قید اور شرط نہیں ہے، اگرچہ الفاظ یہاں شرط کے ہیں، مگر مقصود درحقیقت کوئی شرط نہیں، بلکہ اس کا تاکیدی حکم دیا جارہا ہے، جیسے ہمارے یہاں محاورے میں کہا جاتا ہے کہ: "اگر تو آدمی ہے تو نیک بن کر دکھاؤ، یا اگر تو فلاں کا بیٹا ہے یہ کام کرکے دکھاؤ"۔ ظاہر ہے کہ ان جملوں میں تاکید مقصود ہوتی ہے، اسی لئے لغت کی کتاب قاموس میں ہے کہ ﴿اِنْ نَّفَعَتِ﴾ میں اِن بمعنیٰ قَدْ ہے۔

یہاں بھی یہ مطلب ہے کہ نصیحت وتبلیغ کا نافع اور مفید ہونا تو متعین ومتیقن ہے، لہٰذا آپ اس کو کسی حال میں نہ چھوڑیں، کیونکہ یہاں نصیحت بھی فائدے سے خالی نہیں ہے، ناصح کے لیے تو اجر وثواب یقینی ہے، اور جس کو نصیحت

کی جائے، اس کے لیے بھی نہ معلوم کونسا کلمہ اور کونسی گھڑی ہو کہ وہ سنور جائے۔

البتہ نصیحت کے لیے مؤثر ہونے اور کارگر ہونے میں کہا جاسکتا ہے کہ صلاحیت واستعداد شرط ہے، ورنہ نااہل پر نصیحت ''گوئے برگنبدان'' کا مصداق ہوتی ہے۔

حاصل یہ کہ نصیحت ہر حال میں کرنی چاہیے، اور اگر مخاطب کے قبول کرنے کا گمان غالب ہو تب تو نصیحت و تذکیر لازمی ہو جاتی ہے، اور جملہ ﴿اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾ کو اگر پہلے جملہ ﴿نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى﴾ کے ساتھ مربوط کیا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم آپ کو تبلیغِ دین کے معاملہ میں مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ جن کی فطرت مسخ ہو چکی آپ انہیں سمجھائیں اور راہ پر لائیں، بلکہ آسان طریقہ متعین کئے دے رہے ہیں، اور وہ یہ کہ جو سننے کے لیے تیار ہو اسے سنایئے، اور جو ماننے کے لیے تیار ہو اسے منوایئے، اب یہ کون اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے اور کون نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا اندازہ عام تبلیغ ہی سے ہو سکتا ہے، اس لئے عام تبلیغ تو جاری رکھی جائے، مگر اس میں آپ کا مقصود ان لوگوں کی تلاش ہونا چاہئے جو فائدہ اٹھانے کے جوہر رکھتے ہوں، اور فی الحقیقۃ ایسے ہی لوگ لائق التفات ہوتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کے پیچھے پڑنا جن کے متعلق تجربہ سے واضح ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت قبول کرنا نہیں چاہتے، اکثر اوقات لاحاصل رہتا ہے، کیونکہ ازلی بدقسمت چشمۂ رحمت سے نہ فیضیاب ہو سکتا ہے اور نہ ہی پیاس بجھانے کا حقدار بن سکتا ہے۔

﴿سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى﴾ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہی نصیحت قبول کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کو جو شخص واحد لاشریک لہٗ مانتا ہے اور اس کے رسولوں علیہم السلام پر ایمان لاتا ہے، روز قیامت اور حساب و کتاب، نیز جنت و دوزخ پر یقین رکھتا ہے، اور اللہ پاک کے حضور حاضری اور حساب سے خوفزدہ رہتا ہے، پس ایسے لوگ قرآن کریم پر یقین رکھتے ہیں، حسنات اور اعمالِ صالحہ پر پابندی کرتے ہیں، شرک و معاصی و دیگر گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں، تو یہی لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے کہلاتے ہیں، فرمایا: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ [الرحمٰن: ۴۶] (اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے اس کے لیے دو باغ ہیں)۔

﴿وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى﴾ اور نصیحت و قرآن سے جو لوگ دور بھاگتے ہیں وہ بڑے بدنصیب و بدبخت ہوتے ہیں، انہیں قیامت اور قرآن کے احکام و فرمودات پر یقین نہیں ہوتا، وہ ازلی بدبخت اور شقی ہیں، وہ لذات و

شہوات میں منہمک رہتے ہوئے، آخرت کے منکر ہیں، وہ عنقریب دوزخ میں داخل ہوں گے، فرمایا:

﴿الَّذِیْ یَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى﴾ یہ جہنم کی بڑی آگ میں داخل ہوگا، جو دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ تیز اور سخت ہے، وہاں اس کی حالت یہ ہوگی: ﴿ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰى﴾ وہاں اسے زندگی بھی نصیب نہیں کہ کچھ سکون وراحت حاصل کرے، اور نہ مردوں میں شمار ہوگا کہ اس کا خاتمہ ہو جائے اور عذاب سے بچ جائے، نہ عذاب سے چھوٹ جائے گا اور نہ کسی قسم کا سکون وراحت پائے گا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۱۶﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فلاح وکامیابی کے اصول بہت سے ہیں، مگر یہاں چار اصول کا بیان ہے، اگر کوئی ان اصولِ اربعہ پر کاربند ہوگا تو اس کی کامیابی یقینی ہوگی۔

اصلِ اول:

پہلا اصول ترکِ دنیا واقبال علی الآخرۃ ہے۔ جب تک کوئی اس اہم شق پر عمل نہیں کرے گا اس وقت تک اس کے اعمال میں نہ جان آئے گی، نہ قوت، دنیا پرست اور محبت دنیا میں سرشار انسان کبھی اعمالِ حسنہ کا ذوق ولذت نہیں پائے گا۔

اصلِ دوم:

تزکیہ وطہارت ظاہری وباطنی دونوں کے حصول اور تعاون سے جو تزکیہ نفس تزکیہ عمل وتزکیہ عقیدہ حاصل ہوگا وہی فلاح وکامیابی کا معیار ہوگا۔ اگر ظاہری طہارت وصفائی ہوگی مگر قلبی وروحی اور باطنی تزکیہ وطہارت نہ ہو، تو یہ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگا، یہ ظاہری طہارت کبھی غیر مسلموں میں بھی پائی جاتی ہے، تو کیا وہ مسلمان اور کامیاب کہلائیں گے؟

اصل طہارت تزکیہ نفس وباطن کی ہے، جسے فلاح وسعادت کا معیار حاصل ہے، اکثر وبیشتر دیکھا جاتا ہے کہ ظاہری طہارت بدن وجسم کا حصہ ہوتی ہے، اور روحانی طہارت کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے، جب تک روحانی طہارت نہ ہو اور تمام روحانی امراض اور بیماریوں سے کنارہ کشی اور دوری نہ ہو، تو ہرگز تزکیہ حاصل نہ ہوگا۔

اصل سوم:

ذکر اللہ تعالیٰ خواہ ذکر لسانی ہو، یا ذکر قلبی، بہر حال اس کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ قران کریم میں ارشاد ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا﴾ [الأحزاب: ۴۲] (اے اہل

ایمان! خدا کا بہت ذکر کیا کرو، اور صبح اور شام اس کی پاکی بیان کرتے رہو)۔ ذاکرین اللہ تعالیٰ کے جلیس وہم نشین ہوتے ہیں، یہ مقام نہایت اونچا ہے۔

اصل چہارم:

نماز ہے۔ نماز دین کا ستون ہے، اور سارے اعمالِ حسنہ وافعالِ خیر کی سربراہ و پیشوا ہے، اسی نماز کی بدولت صبح وشام چوبیس گھنٹے مخلص بندوں کا رابطہ و تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم رہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جس عظیم ذمہ کے قیام کا بندہ کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے وہ نماز ہی کی بدولت ہے، وہ رشتہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک بندہ ترکِ صلوٰۃ کی وجہ سے اسے خود ختم نہ کرے۔ اگر ان اصولِ اربعہ پر پابندی حاصل ہو تو فلاح یقینی ہوگی۔

حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ چار بنیادی اصول ایسے ہیں جو کسی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئے، یہ دائمی ابدی اصول ہیں، پہلی شریعتوں میں موجود اور محمود و پسندیدہ اور معمول بہا رہے ہیں۔

(۱) طہارت یعنی ظاہری و باطنی، ہر قسم کی طہارت۔ (۲) عجز و نیاز، خشوع و خضوع اور ترکِ غرور۔ (۳) خسیس اور رذیل اعمال کا ترک۔ (۴) عدل وانصاف اور ترکِ ظلم وزیادتی۔ یہ چاروں اصول تمام آسمانی شریعتوں میں پسندیدہ رہے ہیں۔ [حجۃ اللہ البالغۃ]

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی﴾ بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ دوسرے مقام پر نہایت تفصیل ہے اور تزکیہ سے متعلق تمام اہم اور ضروری اعمال کا تذکرہ ہے، یعنی: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾ [المؤمنون: ۱] (بیشک مراد کو پہنچے ایمان والے)۔ ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىهَا﴾ [الشمس: ۹] (جس نے اپنے نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا)۔

یہ تزکیہ اصلی بنیادی چیز ہے، جس کی تکمیل کے لیے رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ فرمایا: ﴿وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَیُزَکِّیۡهِمۡ﴾ [البقرۃ: ۱۲۹] (جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے، اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے، اور ان (کے دلوں) کو پاک صاف کیا کرے)۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو سارے اسلامی اعمال کا خلاصہ اور اجمالی تعبیر کا نام یہی تزکیہ ہے، جس طرح کفر و نفاق یہودیت، نصرانیت، صابئیت، بدھ مت، ہندومت وغیرہ تمام ادیانِ خبیثہ باطلہ کا مختصر مجموعی اجمالی نام خباثت ونجاست ہی ہے، ان سب کے مقابلے میں اسلام اور اسلامی اعمال کا مختصر اجمالی تعبیر تزکیہ وطہارت ہی ہے، اسی لئے فرمایا: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىهَا﴾ اور متصل

﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ [الشمس:۱۰] (اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا)۔ اسی لئے فرمایا: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ [التوبة:۲۸] (مشرک تو پلید ہیں، پس مشرک اس برس کے بعد خانہ کعبہ کا پاس نہ جانے پائیں)۔

منافق اور خبث باطن والوں کے لیے فرمایا: ﴿إِنَّهُمْ رِجْسٌ وَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ﴾ [التوبة:۹۵] (وہ ناپاک ہیں، اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے)۔ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے: "**ألا! لا يحجن بعد هذا العام مشرك ولا يطوفن بالبيت عريان**"۔ [بخاري] پس تزکیہ وطہارت باطن ہی اسلام کا مرکز اور اعمال کی قبولیت کے لیے ضروری اور شرط ٹھہری، اور اسی پر فلاح وسعادت مرتب ہوئی اور بڑے سے بڑے عمل مثلاً نماز، علم، شہادت، سخاوت وغیرہ بدونِ تزکیہ وباطنی طہارت کے قبولیت کی شرط سے محروم ہوگا، اور فلاح وجنت حاصل نہ کرسکے گا۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ پاک ہے اور پاکیزہ اعمال کے بغیر کسی بھی عمل کو قبول نہیں کرتے، خواہ وہ پہاڑوں جتنا بڑا کیوں نہ ہو۔ [مشكوٰة، ترمذي، مسند أحمد] تزکیہ کی پوری تفصیل سورۃ البقرۃ میں گزر چکی ہے۔

﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔ وہ اہم بنیادی بات جس کے بجالانے سے رحمت وعنایت کے سارے دروازے کھلتے ہیں وہ ذکر الٰہی ہے جس کا مرکز قلب اور ترجمان زبان ہے۔ من أحب شيئاً أكثر ذكره۔ جب کسی قلب میں محبت الٰہی کی تڑپ ہو اور اشتیاق الی اللہ کی رغبت موجزن ہو اور بندگی کے اظہار کا ذوق وشوق ہو، تو بار بار خوشی، غمی، تنہائی، مجمع، غرض زندگی کے ہر نشیب وفراز میں "دست بکار دل بہ یار" کا مصداق سامنے ہوگا۔

یہ طالب محبتِ حق اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، زبان وقلب سے اپنے محبوب پروردگار کے حقیقی اور سچے تصور کے ساتھ اس کو پاکیزہ ناموں اور برگزیدہ صفات کے ساتھ یاد کرتا رہے گا، اور سکون وروحانی لذتوں کے ساتھ سرشار رہے گا، ساتھ ساتھ نماز ورکوع، سجدہ وتسبیحات والتحیات وصلوٰۃ کا لطف حاصل کرتا رہے گا، وجعلت قرة عيني في الصلوٰة کے منظر کے ساتھ آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا مزہ اور لذّت سمیٹتا رہے گا، لقمان حکیم نے بیٹے کو وصیت کر کے کہا تھا کہ بیٹا! خود کو اگر کبھی بھول جاؤ تو حرج نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی یاد جاری رکھنا اور اسے کبھی بھول نہ جانا کہ تمہارا بڑا نقصان ہوگا، کیونکہ اجابت کے اوقات منتشر ہیں، شاید نگاہے کند آگاہ نباشی۔

یک چشم زدن غافل ازان شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی
میری زندگی کا مقصد یہ نماز وذکروزاری
میں اسی لئے مسلمان میں اسی لئے نمازی

سرور عالم ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! فرض نماز سے کبھی غافل نہ رہنا، اور ہرگز ترکِ نماز کا مرتکب نہ رہنا، اس لئے کہ جو شخص عمداً ترکِ صلوٰۃ کا مرتکب ہوگا تو اللہ ربّ العزّت کا رشتہ اس سے کٹ کر منقطع ہوجائے گا۔ نعوذ باللہ [مشکوٰۃ]

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا﴾ بلکہ دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہو، یہ تمہاری حماقت اور نادانی نہیں تو اور کیا ہے؟ فانی زندگی کو باقی زندگی پر، عارضی ناقص کو دائمی کامل زندگی پر، مٹی کو سونے پر، علیٰ ہذا القیاس۔ ہزاروں عیوب ونقائص والی زندگی کو دائمی ابدی نعمتوں اور راحتوں والی زندگی پر ترجیح دینا ناعاقبت اندیش، ناپاک و بے عقل لوگوں کا کام ہے، اگر کوئی دنیوی زندگی کے نقائص اور برائیوں کو حساب کرے شاید ایک ہزار ورق کا رجسٹر تیار ہو، اسی طرح اگر آخرت کے فوائد وکمالات اور خوبیوں پر قلم اٹھائے تو شاید ہاتھ رک جائے اور خوبیاں حساب نہ ہوں۔ دراصل دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایک مزبلہ (کچرہ دان) سے بھی کم ہے، اس لئے فرمایا:

﴿وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی﴾ آخرت کی زندگی درحقیقت ایک بہتر اور پائیدار زندگی ہے، دنیا کی زندگی اس کے مقابلے میں زندگی ہی نہیں، بلکہ بازیچہ اطفال لہو ولعب ہے، لہٰذا عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اصولِ اربعہ مذکورہ کو اپنا کر عالمِ آخرت کا انتخاب کیا جائے، اور دنیوی زندگی کو ایک راہ گزر جانتے ہوئے اسے آخرت پر قربان کیا جائے۔ یہ کوئی آج کی وعظ ونصیحت کا پیغام نہیں، سارے انبیاء کرام علیہم السلام و مصلحین خلق خدا کے خیر خواہوں کا پیغام ہے، اس لئے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی﴾ یہ باتیں پہلے آسمانی صحیفوں میں بھی مذکور ہیں۔

﴿صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی﴾ وہی صحیفے جو حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئے۔

اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے ساتھ منسلک ہے، جیسے قرآن کریم نے ارشاد فرمایا: ﴿مِلَّۃَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ [الحج:۷۸] (تمہارے باپ ابراہیم کی ملت، انہوں نے

تمہارے اوپر مسلمان کا نام رکھا ہے)۔

پھر ماقبل کی آیتوں میں نماز کا تذکرہ ہوا، اسی مناسبت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے صُحُف کا تذکرہ ہوا، انہی موسیٰ علیہ السلام نے لیلۃ المعراج میں پچاس فرض شدہ نمازوں میں کمی کا مشورہ دیا تھا، اس لئے آخری امت پر ان کا بھی بڑا احسان ہے۔ ویسے تو سارے انبیاء کرام علیہم السلام مصلحین خیر خواہ گزرے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں جو مرتبہ و شان عطا کیا ہوا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہوتا ہے کہ ساری انسانیت کی بھلائی اور خیر خواہی ہو۔ صلوات اللہ و سلامہ علیهم أجمعین

قرآن حکیم تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی آسمانی کتابوں اور ان کی مقدس تعلیمات کی شارح اور امین ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جا بجا اور ہر موقع پر گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کو بطور تذکیر بیان کرتا رہتا ہے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں بکثرت انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی تعلیمات، نیز ان کی ہدایات پر گامزن نیک و صالح اُمتیوں کے عجیب و غریب تذکروں اور واقعات کا تفصیلاً تذکرہ و بیان ہے، خاص کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے۔ دراصل اسلام دین محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین وملت کی تشریح اور بیان ہی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ﴾ [الحج:۷۸] (تمہارے باپ ابراہیم کی ملت، انہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے)۔ ملتِ ابراہیمی ایک اجمالی دین الٰہی کا نام ہے، جس کی شرح و تفصیل دین اسلام اور شریعتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہے۔ مفصل وضاحت سورۃ البقرۃ میں دیکھیں۔

سُورَةُ الْغَاشِيَةِ

مكيةٌ آياتها ۲٦ ركوعها ۱

سورۂ غاشیہ مکی ہے، اس میں چھبیس (۲٦) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

سورۃ الغاشیہ کا نام پہلی آیت میں اَلْغَاشِيَةِ کے لفظ سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، سورۃ الذاریات کے بعد نازل ہوئی۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت چھبیس (۲٦) آیتوں، بیانوے (۹۲) الفاظ اور تین سو اکیاسی (۳۸۱) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

سابقہ سورتوں کی طرح اس میں بھی قیامت کا ذکر ہے، گزشتہ سورت میں جنتی اور دوزخی، سعداء واشقیاء دونوں گروہوں کا بیان تھا اس سورت میں دونوں گروہوں کے بیان کے ساتھ ان کے جزاء اعمال، جنت ودوزخ کی نعمتوں اور نقمتوں کا قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔

مختصر موضوع:

قیامت کی ہولناکی اور شدت کا بیان، جہنم کے عذاب اور اس کی سختی کا بیان، پھر جنت اور اس کی مسرتوں اور

خوشحالیوں کا تذکرہ، جنتیوں کے بارونق تروتازہ چہروں اور دوزخیوں کے پژمردہ چہروں کا تذکرہ، جنتی راحتوں اور نعمتوں کے بیان کے ساتھ دلائل توحید اور تبلیغ رسالت اور اس کی برکتوں و عظمتوں کا تذکرہ، اور حساب قیامت کا بیان، اور چند ایک عظیم ومنظم ومحکم مخلوقات کی پیدائش سے دلائل توحید واثبات قیامت کا دلچسپ تذکرہ وبیان۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ الۡغَاشِيَةِؕ ۱ وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۲ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۳ تَصۡلٰى نَارًا حَامِيَةً ۴
تُسۡقٰى مِنۡ عَيۡنٍ اٰنِيَةٍؕ ۵ لَيۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ ضَرِيۡعٍ ۶ لَّا يُسۡمِنُ وَلَا يُغۡنِىۡ مِنۡ جُوۡعٍؕ ۷
وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۸ لِّسَعۡيِهَا رَاضِيَةٌ ۹ فِىۡ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۱۰ لَّا تَسۡمَعُ فِيۡهَا لَاغِيَةًؕ ۱۱ فِيۡهَا عَيۡنٌ
جَارِيَةٌ ۱۲ فِيۡهَا سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ ۱۳ وَّاَكۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ ۱۴ وَّنَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ ۱۵ وَّزَرَابِىُّ مَبۡثُوۡثَةٌؕ ۱۶

ترجمہ: کیا آپ کے پاس ڈھانپ لینے والی (قیامت) کی بات نہیں پہنچی؟ ① اس دن بہت سے چہرے ذلیل ہوں گے ② بڑی خواری کرنے والے تھکے ہوئے ہوں گے ③ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے ④ انہیں کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلایا جائے گا ⑤ ان کے لیے کھانا نہیں ہوگا مگر کانٹے دار جھاڑی ⑥ نہ تو وہ جسم کو موٹا کرے گا اور نہ بھوک سے بچائے گا ⑦ بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے ⑧ وہ اپنی کوشش پر خوش ہوں گے ⑨ اونچے درجے کے بہشت میں ⑩ تم وہاں کسی قسم کی لغو بات نہیں سنو گے ⑪ اس میں بہنے والے چشمے ہوں گے ⑫ اس میں اونچے تخت ہوں گے ⑬ اور آبخورے (قرینے سے) رکھے ہوں گے ⑭ اور تکیے صف بہ صف لگے ہوں گے ⑮ اور نہایت عمدہ قسم کے قالین جگہ جگہ پھیلائے ہوں گے ⑯

معارف ومنازل

﴿حَدِيۡثُ الۡغَاشِيَةِ﴾ حدیث بمعنی: بات، قصہ اور واقعہ، جیسے: ﴿هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى﴾ [طٰہٰ: ۹] (کیا آپ کے پاس موسیٰ کا واقعہ پہنچا ہے؟)، یا ﴿هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ ضَيۡفِ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ﴾ [الذاریات: ۲۴] (کیا آپ کے پاس ابراہیم کے قابلِ احترام مہمانوں واقعہ پہنچا ہے؟)، یا ﴿هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ

﴿الْجُنُوْدِ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ﴾ [البروج: ١٨] (کیا آپ کے پاس لشکروں کا واقعہ پہنچا ہے؟ فرعون اور ثمود کے)۔

﴿الْغَاشِيَةِ﴾ غشاء سے اسم فاعل واحد مؤنث کا صیغہ ہے، بمعنی چھپانے والی، ڈھانکنے والی، چھا جانے والی، مگر یہاں وصفی معنی مراد نہیں، بلکہ مراد قیامت ہے کہ جس کی ہولناکیاں علویات، سفلیات اور پورے عالم پر چھا جاتی ہیں، کائنات کی کوئی چیز اس کی دہشت اور شدّت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ قرآن کریم نے ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ﴾ [الحج: ١] (بیشک قیامت کا بھونچال بڑی چیز ہے) فرما کر اس کی شدت کو عظیم فرمایا۔ کبھی ﴿الْحَاقَّةُ﴾ سچ مچ ہونے والی، کبھی ﴿الْقَارِعَةُ﴾ کھڑکھڑانے والی، کبھی ﴿الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰی﴾ بڑی آفت، کبھی ﴿الصَّآخَّةُ﴾ وغیرہ ناموں سے یاد فرمایا۔

علّامہ جلال الدین السیوطیؒ نے "البدور السافرة" میں قیامت کے اَسی (٨٠) نام ذکر کیے ہیں، ان تمام ناموں سے غیظ وغضب، قہر وجلال کے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ سرور عالم ﷺ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک صحابیہ عورت کی قرآن پڑھنے کی آواز آئی، آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر سماعت فرمائی، جب وہ یہی آیت پڑھنے لگی: ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ﴾ تو حضور اقدس ﷺ نے جواب میں فرمایا: "نعم قد جاءني"۔ [ابن کثیر]

مطلب یہ کہ تجھے قیامت، یعنی ڈھانپ لینے والی چیز کی خبر پہنچی ہے؟ اس وقت ساری قرابتیں، دوستیاں اور رشتے ناطے ختم ہو جائیں گے، وطنیت، قومیت، زبان اور رنگ ونسل کی تفریق مٹ جائیں گی، اور صرف اعمال کا محاسبہ ہوگا، ساری خلقت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی، یا جنت یا دوزخ، صرف یہی دو گروہوں کا راج ہوگا۔ تو فرمایا:

﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ﴾ اس روز بہت سے منہ والے ذلیل ہوں گے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَوُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌ﴾ [القیامة: ٢٤] (اور بہت سے منہ اس دن اداس ہوں گے)۔ پھر فرمایا: ﴿خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾ [المعارج: ٤٤] (ان کی آنکھیں جھک رہی ہوں گی اور ذلت ان پر چھا رہی ہوگی)۔

اسی طرح فرمایا: ﴿وَوُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ﴾ [عبس: ٤١] (اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی اور سیاہی چڑھ رہی ہوگی)۔ یہ سب جہنمیوں کے چہروں پر چھائے ہوئے، مختلف اوقات میں مختلف اعمالِ سیئہ کے مختلف احوال ہوں گے، یا ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیرات ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن مجید واحادیث میں مزید تعبیرات اور کیفیات کا بھی ذکر اور بیان موجود ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ فریق اول کافروں کے چہرے سیاہ ہوں

گے، خوار وذلیل اور شرمندہ ہوں گے، اوران کی آنکھیں پست، غبار آلود، وغیرہ بری کیفیتوں میں مبتلا رہیں گی، زندگی بھر اپنے مولا وخالق کا نافرمان اوراس کے انبیاء ورسل علیہم السلام کا مقابلہ کرنے والا باغی اوراس کے احکام کا مذاق اڑانے والا، میدان حساب وکتاب میں کس منہ اور کن آنکھوں سے حاضر ہوگا، اور دیکھنے کی کیا جرأت کر سکے گا؟

﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ سخت محنت کرنے والے تھکے ماندے۔ یہ کیفیت کہ محنت کرنے والے اور تھکے ہوئے چہرے کے ساتھ میدانِ محشر میں پیش ہوں گے تو اِس کی وجہ وہی خاشعة والی کیفیت ہے، اور یہ اس ماقبل جملہ کی تشریح ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ شرمندہ انسان کو جب اپنا مستقبل تاریک معلوم ہوگا تو وہ پریشانی کے عالم میں ڈوب کر خستہ حال تھکا ہوا اور نڈھال معلوم ہوگا، اور دیکھنے والے اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ محنت کر کے تھکا ہوا ہے۔

یہ کفار کی دنیوی حالت کا بیان ہے کہ بہت سے لوگ عبادت کے نام سے دنیا میں زہد وعبادت اور کثرت سے ریاضت کرتے ہیں، چلہ کشی کرتے ہیں، دنیا کے لذائذ ونعمتوں سے محروم رہتے ہیں، شادیاں تک نہیں کرتے، رہبانیت اختیار کرتے ہیں، جیسے کہ یہود ونصاریٰ کے راہب یا ہندو، بدھ مت مذہب کے پیرو کار یا کچھ دیگر قسم کے لوگ ہیں، وہ یہی سمجھتے ہیں کہ رضاء الٰہی ہمیں حاصل رہے گی، مگر چونکہ بنیادی عقیدہ اور اتباعِ حق سے وہ سراسر محروم ہیں اس لئے غیر شرعی زہد وریاضت انہیں کام نہیں آئے گا، تو ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ﴾ [الحج:۱۱] (دنیا اور آخرت کھو گیا) کے سوا ان کو کچھ حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ تمام اعمال کی قبولیت عقیدہ وایمان پر موقوف ہے، جب ایمان نہ ہو تو سب کچھ بے سود رہے گا۔

ایک نصرانی عابد کی محنت، مگر بلا فائدہ:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ملک شام تشریف لے گئے تو ایک نصرانی راہب (جو بہت بوڑھا تھا) آپ رضی اللہ عنہ کے بلانے پر آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، کثرتِ ریاضت وزہد کی وجہ سے نہایت کمزور، ضعیف اور خستہ حال معلوم ہوتا تھا، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اسے دیکھ کر رونے لگے (آپ کو اس پر رحم آیا)، لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا، تو حضرت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس کی ذلت وخواری اور خستہ حالی دیکھ کر اس پر رحم آیا کہ اس بیچارے نے اپنے خیال وعقیدے کے مطابق بڑی محنت وجانفشانی کی ہے، مگر اسے رضاء الٰہی کیا حاصل ہو، جب عقیدہ درست نہیں، یہ سب تھکاوٹ بلا فائدہ اور بلا مقصد رہا''۔ اس پر حضرت رضی اللہ عنہ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً﴾ [ابن کثیر]

صحت عقیدہ واخلاص کی اہمیت:

رضائے الٰہی عزّ شانہ اور دخولِ جنت کے لیے کثرتِ اعمال اور زہد وریاضت شرط نہیں، بلکہ صحتِ عقیدہ و اخلاص شرط ہے۔ اعمال کی قبولیت حسنِ عقیدہ پر موقوف ہے، ہزاروں لوگ رضائے الٰہی اور جنت اپنے محض ایمان کی بنیاد پر حاصل کریں گے، جبکہ ان کے اعمال محدود ہوں گے اور بے شمار لوگ پہاڑوں جتنے اعمال اور ہر قسم کی ریاضتوں کے ہوتے ہوئے جنت سے محروم رہیں گے، باعتبارِ شرک وباطل عقیدے کے۔

ہر زمانہ میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں کہ رات دن عبادات، طاعات، صدقات، نوافل ودیگر اعمالِ صالحہ میں مستغرق رہتے ہیں، مگر ان کے عقائد درست نہیں، شرک کی وجہ سے یا دوسرے مہلک عقائد واعمال اور معاصی کی وجہ سے، جیسے کہ رشوت یا حرام یا سودی کاروبار، تو ایسے لوگوں کی ریاضتیں اور زہد وطاعات کا خدا حافظ، قیامت کے دن یہ ساری تھکاوٹیں اور محنت رائیگاں جائیں گی، کیونکہ صحت عقیدہ واخلاص تمام طاعات کی قبولیت کے لیے موقوف علیہ اور شرط ہے۔ واللہ المستعان۔ اس مضمون کی تفصیل آیت کریمہ: ﴿يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ وَّيُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ﴾ [القلم: ۴۲] کے تحت گزر چکی ہے، وہاں مطالعہ کیا جائے۔

﴿تَصۡلٰى نَارًا حَامِيَةً تُسۡقٰى مِنۡ عَيۡنٍ اٰنِيَةٍ﴾ داخل ہوں گے بھڑکتی ہوئی آگ میں اور کھولتے چشمے کا پانی پئیں گے اور پلائے جائیں گے۔ جب چاروں طرف سے جہنم کی بھڑکتی آگ انہیں ستائے گی، تو پانی پانی کرکے پکاریں گے، جب مدت دراز کے بعد انہیں پانی پیش کیا جائے گا تو پناہ بخدا! وہ پانی نام کا ہوگا، وہ گرمی کے آخری درجے پر پہنچا ہوا ہوگا؛ جس کے اوپر گرمی کا کوئی درجہ نہ ہو، اگر دنیا کے پہاڑوں پر اس کا ایک قطرہ گر جائے تو پہاڑ پگھل جائیں۔ [مظهري] جس کے منہ پر لگتے ہی ہونٹ گر جائیں گے اور اندر سے آنتیں ٹکڑے ٹکرے ہو کر گر جائیں گی اور فوراً دوبارہ ٹھیک ہو جائیں گی، اور یہ سلسلہ دائمی وابدی جاری رہے گا۔ نعوذ باللہ [عثماني]

﴿لَيۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ ضَرِيۡعٍ﴾ یعنی دوزخیوں کو ضریع کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔ "ضریع" عرب میں ایک مشہور، خاردار گھاس (بوٹی) ہے، جو زمین پر پھیلتی ہے، کوئی جانور اس کے پاس نہیں جاتا، بدبودار، خاردار، زہریلی کانٹوں والی ہے۔ [قرطبي]

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

شبہ: گھاس اور درخت آگ میں جل جانے والی چیزیں ہیں، پھر جہنم میں یہ کیسے رہیں گی؟

جواب: جس ربّ العزّت خالق و مالک نے ان کو دنیا میں پانی اور ہوا سے پالا ہے، اس کو یہ قدرت بھی مکمل طور پر حاصل ہے کہ جہنم میں ان کو آگ سے پالے اور زندہ رکھے، جیسے شیاطین کی پیدائش آگ سے ہے اور انہیں جہنم کی آگ کے ساتھ عذاب ہوگا۔ دراصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چیزوں میں جو خاصیت رکھی ہے وہ اس خاصیت کو جب چاہے ہٹا دے یا اس کو متضاد کسی دوسری خاصیت کے ساتھ تبدیل کر دے۔ یہ چیزیں انسانوں کے لیے اگر مشکل ہوتی ہیں تو معقول ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہیں، وہ اگر پانی کو آگ میں اور آگ کو پانی میں تبدیل کرے تو کوئی بعید نہیں۔ انسان ذرا اپنی پیدائش پر غور کرے، جیسے گزر گیا۔

﴿اِلَّا مِنۡ ضَرِيۡعٍ﴾ میں (اِلَّا) حصر کے لیے نہیں، کیونکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ غِسۡلِيۡنٍ﴾ [الحاقة:٣٦] (اور کوئی کھانا نہیں ہوگا سوائے غسلین کے)۔ تیسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ﴾ [الدخان:٤٣] (بیشک زقوم کا درخت گناہگاروں کا کھانا ہوگا) علیٰ ہذا القیاس۔ مفسرین حضرات نے اس کی دو توجیہیں بیان کی ہیں:

پہلی توجیہ:

یہ ہے کہ یہی تینوں چیزیں جہنمیوں کو باری باری سے کھلائی جائیں گی، کبھی زقوم، کبھی غسلین، کبھی ضریع، جیسے کہ دنیا میں وہ مختلف چیزوں کو مختلف اوقات میں کھایا کرتے تھے۔

دوسری توجیہ:

دوسری توجیہ یہ ہے کہ جہنمیوں کے عذاب کے درکات مختلف ہوتے ہیں، کسی طبقے میں زقوم کی خوراک چلے گی، اور دوسرے طبقے میں غسلین کی، تیسرے میں ضریع کی علیٰ ہذا القیاس، کیونکہ سارے دوزخیوں کا عذاب ایک جیسے نہیں ہوگا، کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ فرعون و نمرود کا عذاب ایک عام جہنمی کے عذاب کے برابر ہوگا؟ ہر گز نہیں۔

﴿لَّا يُسۡمِنُ وَلَا يُغۡنِىۡ مِنۡ جُوۡعٍ﴾ جو نہ فربہی لائے اور نہ بھوک میں کچھ کام آئے۔ ترمذی اور بیہقی نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”دوزخیوں پر ایسی بھوک مسلط کی جائے گی جو اس سارے عذاب کے برابر ہوگی، جس میں وہ مبتلا ہوں گے“۔ [مظهري] کھانے کے مقصد عموماً دو ہی ہیں: پہلا مقصد بھوک سے نجات حاصل کرنا۔ دوسرا مقصد بدن میں قوت و ہمت پیدا کرنا، یعنی تقویت بدن، جیسے

لوگ اکثر مقوی بدن خوراک کھایا کرتے ہیں، مگر دوزخیوں کا یہ کھانا دونوں مقصد سے خالی ہے۔

﴿لَا يُسْمِنُ﴾ بدن کو طاقت نہیں دیتا، فربہی پیدا نہیں کرتا۔ ﴿وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ﴾ نہ ہی بھوک سے نجات دیتا ہے، بلکہ مزید اسے تیز کرتا ہے، پس یہ غذا نہ ہوئی، الٹا عذاب بن گیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ زقوم ''تھوہر کا درخت'' دوزخیوں کی خوراک ہوگی، جس کا مزہ اس قدر کڑوا اور بدبودار ہوگا کہ اگر اس کا ایک ڈول بھر کر دنیا میں پھینک دیا جائے تو دنیا کی کوئی چیز کھانے پینے کی قابل نہ رہے۔ [ترمذي]

اس مقام پر جس ضریع کا ذکر ہے، وہ بھی اسی طرح کڑوا بدبودار اور خبیث چیز ہے، ﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ﴾ یہ طعام نہ جسم کو مفید ہوگا، نہ بھوک مٹائے گا، ربّ العزّت کے نافرمان باغیوں کی یہی خوراک ہوگی، وہ رحمٰن ورحیم نے ہرگز اپنی مخلوق کے لیے اسے پسند نہیں فرمائی، مگر بدقسمت مخلوق نے بخوشی اس کا انتخاب کیا۔

نافرمان دوزخی گروہ کے بعد فرمانبردار جنتیوں کا تذکرہ ہے، جنہوں نے دنیا کو آخرت پر قربان کرکے سعادت پائی:

﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ بہت سے چہرے اس دن تروتازہ (نورانی) ہوں گے۔

﴿لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ﴾ اپنی کوشش پر خوش ہوں گے، کیونکہ انہوں نے ایمان قبول کرلیا، پھر بحمدہٖ تعالیٰ استقامت کے ساتھ قائم رہے، پھر ﴿عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کے پیغام پر لبیک کہتے ہوئے زندگی بھر اپنے ربّ کے احکام پر چلتے رہے، دنیا کی تمام فانی نعمتوں پر آخرت کی ابدی نعمتوں کو ترجیح دے کر ہر قسم کے مصائب پر صبر اور نعمتوں پر شاکر رہے، اور شرک وکفر و دیگر معاصی سے بچتے رہے، آج وہ ضرور اپنے اعمالِ صالحہ ونیکیوں پر خوش ہوکر چمکدار چہروں کے ساتھ ابدی نعمتوں میں خوش وخرم راضی رہیں گے، اور اپنے کئے پر راضی ہوں گے۔

﴿فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ﴾ اونچی بلند و بالا جنتوں میں استقرار پائیں گے۔ ﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ﴾ [الحجر: ۴۶] (جنت میں داخل ہوجا سلامتی اور امن کے ساتھ) فرشتے انہیں نہایت عزّت واحترام کے ساتھ جنت کے محلات وقصور اور موتیوں کے خیموں میں داخل کریں گے۔ غلمان وجنتی حوران کا استقبال کرکے انہیں خوش آمدید کہیں گے۔ یہ جنتیں اتنی بلند و بالا اونچی ہیں جیسے کہ ارشاد ہوا کہ جنتوں کے سو درجے ہیں، ہر درجہ دوسرے درجے سے اتنا اونچا و بلند ہے جتنا زمین سے آسمان۔ سب سے اوپر والی جنت کا نام جنت الفردوس ہے، اور اس کے اوپر عرش الرحمن ہے۔ [ترمذي]

یہ خوش قسمت جنتی معزز و محترم مہمان ہوں گے، ان کا میزبان ذات پاک جل شانہ ہوگا، جس کے حضور جنتیوں نے روزانہ پانچ مرتبہ سجدے کیے اور اس کے احکام بجا لائے۔ فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [الزخرف: ۷۲] (یہ ہے وہ جنت جس کے تم مالک کر دیے گئے ہو، تمہارے اعمال کا صلہ ہے)۔

﴿لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً﴾ نہیں سنیں گے کوئی لغو بیہودہ بات۔ جنت میں داخلہ سے پہلے دنیوی غل وغش، حسد، کینہ، بغض، غیبت، بہتان، بدگمانی، افتراء، جھوٹ، غرور و کبر، غرض یہ کہ تمام بد اخلاقی اور روحانی امراض ان کے قلوب سے نکال دیئے جائیں گے، بشری عیوب ونقائص ختم ہوں گے، فرشتوں کی سیرت اور تمام پاکیزہ اقدار قلوب میں مستحکم ہوں گے، سب جنتیوں کے قلوب قلبِ واحد کی طرح ایک ہی قالب میں رضامندی کا ماحول، یعنی صاف ستھرا بنیں گے، پس بیہودہ مذاق، تمسخر، بد اخلاقی، گالم گلوچ وغیرہ امور کا نام ونشان نہیں رہے گا، ہر طرف ''سلام سلام'' کا عالم ہوگا، اگر دنیا کے کسی ہال میں بیس ہزار، تین سالہ بچوں کا اجتماعی جشن ہو تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں خیالات کا تفرقہ اور عناد ہے؟ ہرگز نہیں! پاک ماحول ہوگا، ہر طرف پاکیزگی کا دور دورہ ہوگا۔

ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک موقعہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا: ''ہے کوئی کمر باندھے، تہبند چڑھائے، جنت کے لیے تیاری کرلے؟''۔ یعنی اس جنت کی جس کی لمبائی چوڑائی بے حساب ہے۔ ربّ کعبہ کی قسم! وہ ایک چمکتا ہوا نور ہے، وہ ایک لہلہاتا ہوا سبز باغ ہے، وہاں بلند وبالا محلات ہیں اور بہتی ہوئی نہریں اور چشمے ہیں، وہ بکثرت ریشمی حلیے لباس ہیں، وہ پکے پکائے تیار اور عمدہ پھل ہیں، وہ ہمیشگی والی جگہ ہے، وہ سراسر میوہ جات سبزہ، راحت اور نعمت ہے، وہ تر و تازہ بلند وبالا جگہ ہے۔ اس پر سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بول اٹھے کہ ہم سب اس کے خواہشمند ہیں اور اس کے لیے تیاری کریں گے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سب ان شاء اللہ تعالیٰ کہو، تو سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان شاء اللہ تعالیٰ کہا۔ [ابن کثیر]

﴿فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ﴾ اس میں چشمہ ہے جاری۔ جنتی چشمے بے شمار ہیں، انہیں دنیوی چشموں پر کسی طرح بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا، جب ''ما لا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر على قلب بشر''۔ [ترمذي]

یہاں جنت کے بے شمار چشمے مراد ہیں، یا سلسبیل کی طرح کا خاص چشمہ مراد ہے، دونوں صحیح ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ: ''جنت کے دریا (چشمے) مشک کے پہاڑ سے

پھوٹ کر نکلتے ہیں"۔ [حاكم، بيهقي، طبراني، ابن حبان]

﴿فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ﴾ اس میں اونچے اونچے تخت بھی ہیں بچھے ہوئے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دونوں طبقوں کے فرشوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوگا جتنا کہ آسمان و زمین کا فاصلہ ہے"۔ اور ترمذی کی حدیث میں پانچ سو سال کا فاصلہ مذکور ہے۔ [ترمذي، ابن ماجة، أحمد]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ان تختوں کے تختے سونے کے ہوں گے، جن کا کنارہ زمرد، موتی اور یاقوت سے آراستہ ہوگا، وہ نہایت اونچے ہوں گے، لیکن جنتی مؤمن جب بیٹھنا چاہے گا تو وہ نیچے ہو جائیں گے، پھر اٹھ جائیں گے اور اپنے مقام پر چلے جائیں گے۔ [مظهري]

کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ موجودہ زمانے کے انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے لفٹ سسٹم نے تو سارے شکوک وشبہات کو دور کر دیا۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تک جنت کے احوال ومناظرِ دنیا میں نمونہ کے طور پر ظاہر نہیں ہوں گے اسی وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی۔

﴿وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ﴾ آبخورے ہوں گے، ساغر کے سامنے چنے ہوئے ہوں گے، جب پینے کو جی چاہے دیر نہ لگے، اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی کہ طلب کر کے منگوائیں، وہاں ہر چیز خود بخود تیار ہو کر آئے گی۔

﴿وَّنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ﴾ قالین، صوفے اور مسندیں قرینہ اور ترتیب سے بچھے ہوئے حد نگاہ تک، گاؤ تکیے لگے ہوئے مختلف رنگوں اور پھولوں کی سجاوٹ ہوگی، جو خوبصورتی کے ساتھ ہر وقت، ہر مرتبہ، تازہ بتازہ، نئے اور جدید ہوں گے۔ ﴿وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ﴾ قالین، بسترے، مخمل کے نہالچے اور عمدہ فرش ہوگا۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ ﴿زَرَابِيُّ﴾ زرب کی جمع ہے بمعنی "قالینچے اور فرش"، یا ہر وہ چیز جو بچھائی جائے اور اس پر تکیہ لگایا جائے۔ [لغات القرآن] بہشتی چیزیں اتنی بے مثال پاکیزہ اور عمدہ ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں، کیونکہ ان پر رضاء الٰہی کی مہر لگ چکی ہے، دنیوی نعمتیں اور آسائشیں فانی اور رضاء الٰہی سے سراسر محروم ہیں۔ خوب سمجھ لیں۔

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾
وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾ فَذَكِّرْ إِنَّمَا

اَنۡتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ ﴿٢٢﴾ اِلَّا مَنۡ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ
الۡعَذَابَ الۡاَكۡبَرَ ﴿٢٤﴾ اِنَّ اِلَيۡنَاۤ اِيَابَهُمۡ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا حِسَابَهُمۡ ﴿٢٦﴾

ترجمہ: کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کئے گئے ہیں؟﴿١٧﴾ اور آسمان کی طرف کہ وہ کس طرح بلند کیا گیا ہے؟﴿١٨﴾ اور پہاڑوں کی طرف کہ انہیں کس طرح نصب کیا گیا ہے؟﴿١٩﴾ اور زمین کی طرف کہ اسے کس طرح بچھایا گیا ہے؟﴿٢٠﴾ پس آپ ان کو نصیحت کریں، بیشک آپ نصیحت کرنے والے ہیں ﴿٢١﴾ آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں ﴿٢٢﴾ مگر جس نے روگردانی کی اور کفر کا راستہ اختیار کیا ﴿٢٣﴾ پس اللہ تعالیٰ اس کو بڑی سزا دے گا ﴿٢٤﴾ بیشک ان لوگوں نے ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ﴿٢٥﴾ پھر ان لوگوں کا حساب کتاب لینا بھی ہمارے ذمے ہے ﴿٢٦﴾

معارف ومنازل

منکرین توحید، کفار و فجار کو دلائلِ قدرت میں غور کرنے کی دعوت دی جارہی ہے کہ اندھے مت بنو، ذرا دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھو! تمہارے پاس قریب سے قدرت کی نشانیاں تمہیں دعوت دے رہی ہیں، یہ خشکی کا سفینہ جس پر محض سواری نہیں، بلکہ اس کے بل بوتے زندہ ہو، اور خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہو، تمہارے ہر مالدار کے پاس سینکڑوں کی تعداد میں یہ اونٹ موجود ہیں، ذرا اس کی خلقت اور بے شمار منافع پر غور کر کے فیصلہ کرو کہ یہ دیوہیکل جانور کس کی تخلیق ہے؟ اور خالق جل شانہ نے اس کو کن کن بے شمار جدتوں کے ساتھ پیدا فرما کر تمہاری تسخیر میں رکھا ہے، یہ پہلوان اور بڑا جانور کتنا قوی و مضبوط ہے، تمہارا چھوٹا بچہ یا بچی اس کی نکیل پکڑ کر اسے جدھر چلانا چاہتا ہے، یہ اس کی خواہش پر چلتا رہتا ہے۔

اگر بیٹھنے کو کہو تو بیٹھ جاتا ہے، اٹھنے کا اشارہ کرے تو حکم کی تعمیل کر کے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اگر کوئی اور حکم ہو پورا کرتا ہے سر مو انحراف نہیں کرتا، بوجھ لادے گا اٹھا کر اطاعت کرتا ہے، کبھی انکار کا نام نہیں لیتا، جو کھلاؤ جو پلاؤ جدھر کھینچ کر لے جاؤ تمہارا ساتھ دیتا ہے، سینکڑوں میلوں تک سفر کرو، سواری کرو، سامان لاد کر لے چلو بصد خوشی و فرمان برداری کرتا ہے، خدمت اور اطاعت کا یہ حال ہے کہ سارا دن خدمت لے لو پھر جنگل میں چھوڑ کر اسے جو بھی میسر ہو کھاتا رہے گا، دس دن تک پانی نہ پلاؤ صبر کر کے گزارہ کرے گا۔ اس کے پشم، دودھ، گوشت وغیرہ کے فوائد اس کے علاوہ ہیں، سواری کے وقت بٹھاؤ اور اس پر بیٹھ کر کھڑا کر دو، ایسا لگتا ہے کہ جنت کے تختوں کی طرح نیچے اوپر ہونا سیکھا

ہوا ہے۔ یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو کیفیت وخاصیت جنتی تختوں کی بنائی ہے، اسی پر اونٹ کو پیدا فرمایا ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ جانور کتنا بڑا جفاکش اور فرمانبردار ہے، اگر اسی کو دیکھ کر تم لوگ اپنے خالق و مالک کی فرمانبرداری کرو تو تم فلاح پا کر ابدی سعادت حاصل کرو گے۔

﴿وَاِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ﴾ آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے؟ اگر ربّ العزت کی پختہ کاری اور قدرت کاملہ دیکھنا چاہو تو ذرا او پر صاف شفاف نیلگوں بلند و بالا آسمانوں کو دیکھو کہ بغیر شہتیر اور کھمبے کے کتنی اونچائی پر کھڑے نظر آتے ہیں، اربوں کھربوں ستاروں کی روشنی، چاند وسورج کی ضوء افشانی کے ساتھ بلندی پر تمہارے سروں پر سائباں ہیں، ہزارہا صدیاں بیت چکی ہیں اس سائباں کو دیکھتے ہوئے بتاؤ کسی شکست وریخت کا کوئی نشان اس میں نظر آتا ہے؟ کہیں کوئی سوراخ یا کوئی جھول معلوم ہوتا ہے؟ اتنی محفوظ ومضبوط چھت اور کوئی تیار کر سکتا ہے؟ جب جواب نفی میں ہے تو پھر کس چیز نے تمہیں ایمان لانے سے روکا ہوا ہے؟ پھر بھی عبرت سے بیگانہ اور منکر ہو۔

﴿وَاِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ﴾ اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں؟ ذرا اس سلسلہ کوہ وجبال کی طرف دیکھو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کیل کی طرح انہیں قطار در قطار سبز، پیلا، سرخ، سیاہ وسفید مختلف جاذب نظر چھوٹے بڑے اندازے کے ساتھ زمین میں گاڑ دیا گیا ہے، تاکہ ان کے وزن وجحم سے کرۂ زمین کی اضطراری حرکت تھم جائے۔

اس کے علاوہ ان پہاڑوں میں تمہارے لئے بے شمار فوائد ومنافع پیدا کئے ہیں، پس جو ذات پاک ان قطار در قطار ان گنت جاذب نظر اور مختلف رنگ کے پہاڑ پیدا کر سکتا ہے تو کیا جنتوں میں صوفے، تخت، قالین ومخمل کے بے شمار گاؤ تکیے نہیں بچھا سکتا؟ بیشک اس کی قدرت لامحدود وغیر متناہی ہے۔

﴿وَاِلَى الۡاَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ﴾ اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی؟ حد نگاہ تک پھیلی ہوئی سرسبز وزرخیز زمین اور لہلہاتے کھیت، ابلتے چشمے، اس کے علاوہ دیگر بے شمار منافع سے معمور زمین، یہ کس کی خلقت و پیدائش ہے؟ ذرا انصاف کی نظر سے اس زمین کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھو! اور تعصب سے بالاتر ہو کر سوچو کہ یہ کس کی آفرینش اور کارنامہ ہے؟ جو واحد لاشریک عزّ شانہ اتنی بڑی وسیع زمین ہر طرح کی نشوونما کے ساتھ پھیلا سکتا ہے تو کیا وہ جنتوں میں جنتیوں کے لیے ریشم اور قیمتی گدیلے، قالینوں کا رنگ برنگ فرش نہیں بچھا سکتا؟ بیشک وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اور جو کچھ چاہے اسے پورا کر سکتا ہے۔

تفسیر مدارک میں لکھا ہے کہ جب آیت ﴿سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ﴾ نازل ہوئی تو سرور عالم ﷺ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: ''جنتی تختوں کی بلندی اتنی اتنی ہوگی، اور ﴿اَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ﴾ کی تشریح میں فرمایا: ''وہ بیشمار ہوں گے، اور تکیوں کا طول اور مسندوں کی عرض حضور ﷺ نے جب بیان فرمایا تو کافروں نے تکذیب کردی اور کہنے لگے کہ ان تختوں پر چڑھنا کیسے ممکن ہوگا؟ اور اتنی کثرت سے کوزے، آبخورے اور اتنے لمبے تکیے اور اتنی چوڑی مسندوں کا فرش کیسے ہوگا؟ دنیا میں تو ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ [مظهري]

﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو، تم ان پر داروغہ نہیں ہو، دلائل قدرت انہیں سمجھا دیں، اپنا فریضہ ادا کرتے رہئے، ان کو خواب غفلت سے بیدار کیجئے، کیونکہ آپ کا کام اور فریضہ یہی نصیحت کرنا ہے، پس اگر یہ ہدایت قبول نہ کریں اور آپ کی نصیحت پر عمل نہ کریں تو آپ فکر مند اور پریشان نہ ہوں، ہم نے آپ کو داروغہ اور ذمہ دار نہیں ٹھہرایا کہ اگر یہ ایمان نہ لائیں تو آپ سے باز پرس ہو، تبلیغ رسالت کے علاوہ آپ پر کچھ نہیں۔

﴿اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ﴾ استثناء منقطع ہے۔ اِلَّا لکن کے معنی میں ہے۔ لیکن جس نے ایمان سے انحراف کیا، منہ پھیرا اور اللہ تعالیٰ کا انکار کر کے کفر اختیار کیا، تو اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اسے سزا دے۔

﴿فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ﴾ تو خدا اس کو بڑا عذاب دے گا۔ یعنی روگردانی اور کفر کرنے والوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ بڑی سزا دے گا۔ گزشتہ سورت میں فرمایا: ﴿يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى﴾ [الأعلى: ۱۲] (بڑی آگ میں داخل ہوگا)، بڑی آگ جہنم ہے جو کہ دنیا کی آگ سے ستر گنا سخت اور تیز ہے۔

﴿اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ﴾ بے شک ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [یونس: ۵۶] (اور تم لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)۔ اسی طرح: ﴿وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ [التغابن: ۳] (اور اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے) وغیرہ۔ جب یہ ہمارے پاس آئیں گے تو:

﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ ان لوگوں کا حساب کتاب ہمارے ذمہ ہے، یہ اپنے دنیوی اعمال کے ساتھ جب ہمارے پاس آئیں گے تو ذرہ ذرہ کا حساب لیا جائے گا۔

اہل حق کے اوصاف واعمال:

فرماتے ہیں کہ اونٹ کی طرح وفادار، فرمانبردار، محنتی، جفاکش، صابر، خدمتگار بننا صالحین کا طریقہ ہے۔

آسمان کی طرح بلند عزم و ہمت، بلند نگاہ، بلند اخلاق، بلند حوصلہ والا بننا پیغمبروں علیہم السلام کا طریقہ ہے۔ پہاڑوں کی طرح مستقل مزاج، مضبوط عزم وارادہ، محکم عقل کا مالک بننا یہ بھی عمدہ ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ ہے۔ زمین کی طرح وسیع الظرف، فراخ سینہ، منکسر المزاج، عاجز و خاکسار بننا نبیوں علیہم السلام کا شیوہ ہے۔ صوفیاء کرام، اصحاب باطن حضرات نے ان چاروں معارف و حقائق کو تصوف کی بنیاد قرار دیا ہے، اگر کسی میں یہ چاروں اصحاب باطن کے اوصاف موجود ہوں گے، تو ان شاء اللہ ہر میدان میں کامیاب رہے گا، بصورت دیگر ہر محاذ پر ناکامی سے ہمکنار ہوگا۔

سُورَۃُ الْفَجْرِ

مکیۃٌ آیاتہا ۳۰ رکوعہا ۱

سورۂ فجر مکی ہے، اس میں تیس (۳۰) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃالفجر ہے، یہ نام پہلی آیت میں اَلْفَجْرِ کے لفظ ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول سورۃ اللیل کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت تیس (۳۰) آیتوں، ایک سو سینتیس (۱۳۷) کلمات اور پانچ سو ستانوے (۵۹۷) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورتوں کی طرح اس سورت کے آخری حصے میں قیامت کے محاسبے کا ذکر ہے، درمیانی حصے میں کامیابی اور ناکامی کے اسباب کا بیان ہے، نیز دونوں گروہوں کے انجامِ نیک وبد کا تذکرہ ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت میں موحد اور جانفروش مسلمانوں کے لیے حوصلہ افزائی اور تسلی کا بیان وسامان ہے، اور انہیں

اطمینان دلایا جارہا ہے کہ کفار مکہ کی بے رحمانہ اور سنگدلانہ حرکات کوئی نئی بات نہیں، آج سے پہلے ہر زمانہ میں ایسا ہوتا رہا ہے، بڑے زور آور، جاندار اور طاقتور مجرمین نے اور بے رحم وسنگدل حکمرانوں اور سرداران نے اپنے تمام وسائل اور پوری قوت کے ساتھ اہل حق پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے ہیں، اور طرح طرح سے اہل ایمان کا آواز دبانے اور انہیں خاموش کرنے کی کوششیں کی ہیں، لیکن وہ اپنے تمام تر منصوبوں میں ناکام ہوکر واحد القہار جل جلالہ کے عذاب و بطش میں نیست ونابود ہوکر تباہ ہوئے ہیں۔

اگر کفار مکہ نے اپنی روش نہ بدلی اور اپنے ناخلف اسلاف کا رویہ اپنایا، تو وہ دن دور نہیں کہ ان کا انجام بھی عاد، ثمود اور فرعون جیسے ہوجائے گا، انہیں سنۃ اللہ اور گرفتِ ایزدی سے سبق سیکھنا چاہئے، پھر جب عذاب الٰہی کا ان پر نزول ہوگا تو کوئی انہیں نہیں بچاسکے گا، ان کا انجام کہیں زیادہ المناک ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک غلط وبے بنیاد نظریہ کا بطلان بھی بیان ہوگا کہ اس میں اکثر جہال ناعاقبت اندیش، خدا فراموش لوگ مبتلا نظر آتے ہیں، ان کا اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم خوشحالی اور عزت ووقار کی زندگی بسر کررہے ہیں، تو ہم اللہ تعالیٰ کے منظور نظر ہیں۔ وہ اپنے مال ودولت کو خدا تعالیٰ کی رضا کی سند جانتے ہیں، اور اپنے آپ کو قرب الٰہی کا مستحق گردانتے ہیں، اور جو مسلمان کمزور اور ضعیف ہیں، کسمپرسی کی حالت میں فقر وفاقہ پر گزارہ کررہے ہیں، یہ گمراہ کافران کا مذاق اڑاکر انہیں طعنہ دیتے ہیں، اور انہیں خدا کی نظروں سے گرے ہوئے تصور کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا تو ان کی یہ حالت ضرور بدل جاتی، تو قرآن حکیم نے سختی سے اس نظریے کی تردید وابطال کرکے اپنے ماننے والوں کی حوصلہ افزائی کی، اور کفار کی تردید فرمائی، بلکہ انہیں صاف بتادیا کہ مال ومنال تمہارے لئے ایک آزمائش ہیں اور تمہاری ہلاکت کے اسباب بھی جس کا نتیجہ وانجام دوزخ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۙ﴿۳﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ ۚ﴿۴﴾ ہَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ﴿۵﴾
اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ ۪ۙ﴿۶﴾ اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۪ۙ﴿۷﴾ الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُہَا فِی الۡبِلَادِ ۪ۙ﴿۸﴾ وَثَمُوۡدَ
الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۪ۙ﴿۹﴾ وَفِرۡعَوۡنَ ذِی الۡاَوۡتَادِ ۪ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ ۪ۙ﴿۱۱﴾ فَاَکۡثَرُوۡا فِیۡہَا

الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: قسم ہے فجر کی ① اور قسم ہے دس راتوں کی ② اور قسم ہے جفت اور طاق کی ③ اور قسم ہے رات کی جب وہ چلتی ہے ④ کیا اس میں قسم ہے عقلمندوں کیلئے؟ ⑤ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے کیا سلوک کیا قوم عاد کے ساتھ؟ ⑥ عاد ارم کے ساتھ جو لمبے ستونوں والے تھے ⑦ نہیں پیدا کیا گیا ان کی مثل شہروں میں ⑧ اور قوم ثمود کے ساتھ؟ جنہوں نے تراشا چٹانوں کو وادی میں ⑨ اور کیا آپ نے میخوں والا فرعون کو نہیں دیکھا؟ ⑩ جنہوں نے سرکشی کی شہروں میں ⑪ اور ان میں بہت زیادہ فساد برپا کیا ⑫ تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا ⑬ پس بیشک تیرا رب گھات میں لگا ہوا ہے ⑭

معارف ومنازل

جب مکہ اور اس کے اطراف میں دعوتِ توحید اور مسئلہ قیامت اور احیاء بعد الموت کا عقیدہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جذبہ وجوش سے شروع فرمایا، تو کفر کے ایوانوں میں پوری قوت کے ساتھ ایک ہلچل پیدا ہوگئی اور روز بروز مشرکین مکہ کی مخالفتوں میں اضافہ ہوتا رہا، اور وقوعِ قیامت وحیات بعد الموت پر طرح طرح کے اعتراضات ہونے لگے اور قیامت کو محال، ناممکن اور خلاف عقل گمان کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کا اور انہیں ایذا رسانی کا بازار گرم ہوتا رہا۔

یہ سورت ایسے موقع پر ان کے شکوک وشبہات کے ازالہ کے لیے نازل ہوئی، اس میں پانچ قسموں کے ساتھ مسئلہ قیامت کی حقانیت ثابت ہوجائے گی، اور مسئلہ قیامت کی عین حکمت معلوم ہوجائے گی، اور شرپسندوں نافرمانوں سے کہا جارہا ہے کہ یاد رکھو! ہر غم کا نتیجہ راحت ہے اور ہر شام سحر ہوتی ہے، قیامت کا دن آنے والا ہے، اس وقت تمہاری آنکھیں کھلیں گی اور ہوش وحواس ٹھکانے پر آئیں گے، مگر بے سود۔

البتہ قدسی صفات والے اور پاکیزہ لوگ، جنہوں نے توحیدِ الٰہی کو سینے سے لگایا تھا، جب وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر میدانِ محشر میں قدم رکھیں گے تو بڑی پذیرائی سے ان کا خیر مقدم واستقبال ہوگا، اور انہیں جوارِ رحمت اور ابدی سعادتوں کا مژدہ سنایا جائے گا۔ اللّٰھمّ اجعلنا منھم

جب کائنات کا خالق ومالک حق سبحانہ وتعالیٰ ہے، ایک حد تک تو تم لوگ بھی اس کے معترف ہو، اور ربّ

تعالیٰ دانا، بینا اور حکیم مطلق ہے، اس کا کوئی فعل حکمتوں سے خالی نہیں، تو اس نے جب انسانوں کو ہزاروں قوتوں اور بے مثال عقل وفہم اور طرح طرح کے مخفی اور ناگزیر استعدادوں سے نوازا اور مسلح کیا ہوا ہے، تو کیا وہ انہیں یوں ہی شتر بے مہار کی طرح چھوڑے گا؟ اور ان سے باز پرس نہیں کرے گا؟ کہ تم نے میری بے مثال اور بے شمار نعمتوں اور قوتوں کو کس طرح استعمال کیا؟

یہ بات اس کی حکمتوں کے سراسر خلاف ہے کہ جن لوگوں نے اس کی قوت کو صحیح اور برحق استعمال کیا اور اس کے حقوق اور اس کی مخلوقات کے حقوق پورے کئے، نیکی اور اعمالِ صالحہ، نیز اخلاقِ حسنہ کی آبیاری کی، ان کو تو کوئی اجر وانعام نہ ملے، اور ان کی کوششوں پر انہیں شاباش وآفرین حاصل نہ ہو، اور جنہوں نے ان قوتوں کو ضائع کیا اور نعمتوں پر ناشکری کی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، خلقِ خدا کی تباہی وبربادی پر کمربستہ رہے، فسق وفجور اور دیگر معاصی اور گناہوں کو عروج بخشا، اور دنیا میں طرح طرح کے معاصی عام کئے اور انہیں پروان چڑھایا، تو ان کو ان کے کرتوتوں اور خرمستیوں کی کوئی سزا نہ دی جائے، تو یہ سراسر حکمتوں اور مصلحتوں کے خلاف ہوگا، پس قیامت انہیں اقدار کا نام ہے کہ نیکیوں کی پذیرائی ہو اور برے لوگوں پر گرفت وباز پرس ہو۔

﴿وَالْفَجْرِ﴾ قسم ہے فجر کی۔ ائمۂ تفسیر کے اس کے متعلق تقریباً آٹھ نو مختلف اقوال ہیں کہ فجر سے مراد کیا ہے، اور یہاں کونسی فجر مراد ہے؟ مگر بہتر یہی ہے، جیسے کہ پہلے کئی دفعہ اس کی مثال گزر چکی ہے کہ فجر سے بجائے کسی خاص فجر کے مطلق (غیر معین) فجر مراد ہو، یعنی روزانہ جس کے طلوع کے ساتھ رات کی تاریکی چھٹ جاتی ہے، اور پورے عالم پر روشنی کے ذرات پھیل جاتے ہیں، پس انسان، حیوانات، چرند پرند، تمام مخلوقات رات بھر کے تعطل و استراحت اور خاموشی سے نکل کر اپنے اپنے کاموں اور اعمال واشغال میں مصروف ہوجاتے ہیں، تو فجر کی روشنی اتنی عالمگیر ہے کہ رات کے جمود کو توڑ کر، ایک نئی ہلچل اور تحریک پیدا کرتی ہے، یہی اسلام اور قرآنی تعلیمات کی خاصیت ہے، جہاں اس کے آنے سے تمام کفر وشرک اور جہالت کی طلسم ٹوٹ کر پوری کائنات پر اسلامی روشنی پھیل گئی، اور بے دینی کی ظلمتوں کا قلع قمع اور خاتمہ ہوگیا۔ الحمد للہ

﴿وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ اور اس مقدس دس راتوں کی قسم۔ یہ مقدس دس راتیں کونسی ہیں؟ اس کے متعلق اور ان کے تعین کے بارے میں چھبیس اقوال ہیں، جن میں مشہور قول تین ہیں:

(۱) پہلا قول یہ ہے کہ رمضان المبارک کی آخری دس راتیں، جن میں عظیم اور بابرکت لیلۃ القدر کی رات

متوقع ہے، اور نزولِ قرآن حکیم بھی انہیں راتوں میں ہوا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ماہ ذوالحجہ کی اول دس راتیں مراد ہیں، حج بیت اللہ الحرام انہیں راتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ محرم الحرام کا اول عشرہ مراد ہے، جس میں بہت سارے اہم واقعات رونما ہوئے ہیں، اور اسلامی سن ہجری کی ابتداء بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ واللہ أعلم

﴿وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ﴾ قسم ہے جفت اور طاق کی۔ اس جفت اور طاق کے بارے میں نو سے زائد اقوال ہیں، ائمہ تفسیر نے سب کو جمع کیا ہوا ہے۔ تفسیر روح المعانی اور ابن کثیر وغیرہ نے سب کو جمع کئے ہیں، مگر مشہور اور پسندیدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفع سے مراد مخلوقات اور ان کی صفات وحالات، اور وتر سے مراد خالق جل شانہ اور اس کی صفات واسماء ذات ہے۔

حضرت ابو سعید خدری، امام مجاہد اور امام عطیہ رضی اللہ عنہم اور چند دیگر جلیل القدر ائمہ تفسیر نے اسی کو ترجیح دی ہیں، اور اس سلسلے میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ ساری مخلوقات اور اکثر ان کی صفات جفت ہیں، دو دو چیزوں پر مشتمل ہیں، نر ومادہ، اوپر نیچے، نیک و بد، مؤمن و کافر، سردی وگرمی، خوشی وغم، علم و جہالت، ہدایت وضلالت، جنت و دوزخ، سعادت وشقاوت، رات و دن، روشنی وتاریکی، دریا وخشکی، شمس وقمر، جن وانس، زندگی وموت، قوت وضعف، خوبصورتی وبدصورتی، عزّت وذلت، ثروت وفقر، علیٰ ہذا القیاس اور خالق تعالیٰ اپنی ذات وجمیع صفات میں وتر اور یکتا ہے، وہاں صرف وحدت ہے کثرت نہیں، اسی طرح صرف علم وحکمت ہے، اس کی ضد نہیں، حیات ہے موت نہیں، قوت وقدرت ہے، ضعف نہیں، عزّت ہے، ذلت نہیں، غرض یہ کہ ذات وصفات، تمام میں وہ واحد ولاشریک اور یکتاء ویگانہ ہے، لآ إلٰہ إلا ھو۔

﴿وَالَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ﴾ قسم ہے رات کی جب وہ رخصت ہوکر چلی جاتی ہے۔ اس کی مثال ونمونہ کفر اور جہالت ہے، جس طرح نور قرآن نے جہالت کی تاریکیوں کا خاتمہ کردیا، اسی طرح فجر کی روشنی سے رات کی ظلمتوں کا مکمل خاتمہ ہوگیا۔ اس سے پہلے سورۃ المدثر میں فرمایا تھا: ﴿وَالَّيۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحۡدَى الۡكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيۡرًا لِّلۡبَشَرِ ﴿۳۶﴾﴾ [المدثر] (اور رات کی جب پیٹھ پھیرنے لگے۔ اور صبح کی جب روشن ہونے لگے۔ بیشک قیامت بڑی باتوں میں سے ایک ہے۔ جو تمام انسانوں کو خبردار کررہی ہے)۔

اسی طرح سورۃ التکویر میں فرمایا: ﴿وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ﴾ [التکویر: ۱۸] (اور رات کی قسم جب ختم ہونے لگتی ہے)۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ رات دنیا کی مثال ہے، اور صبح سے مراد آخرت ہے۔ دنیا ایک تاریک جہاں ہے، اس میں نیکیوں اور برائیوں کے نہ منفعت و فائدے نظر آتے ہیں اور نہ برائیوں کے نقصان ومضرت، بخلاف دن کے، یعنی قیامت کے کہ وہاں ہر ہر ذرہ اور عمل کا فائدہ بھی نظر آئے گا اور نقصان بھی، اس لئے قرآن حکیم میں جا بجا دونوں پر قسم کھانے کا بیان ہے۔

﴿هَلۡ فِيۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيۡ حِجۡرٍ﴾ کیا ان چیزوں کی قسم اہل عقل کے نزدیک کافی قسم ہے؟ صاحب مظہری فرماتے ہیں کہ هَلۡ یہاں استفہامِ سوالیہ کے لیے نہیں، بلکہ مراد استفہامِ تقریری ہے، اور قَسَمٌ میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی بلاشبہ (بیشک) اشیاء مذکورہ کی قسم، عظیم الشان کافی قسم ہے، کیونکہ جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے وہ بہت بڑی ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عجوبہ کاری اور حکمت کی ندرت کا ان سے پتہ چلتا ہے۔ [مظهري]

حِجۡر کے معنی ہیں: روکنا، اور عقل کو حجر اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اپنے صاحب کو مضرت اور ہر قسم کے نقصان سے روکتی ہے۔

﴿اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ﴾ استفہامِ تقریری تعجب کے لیے ہے، رؤیت بمعنی یقین کے ہے، یعنی کیا تم یقین نہیں رکھتے، یعنی تم کو اس بات کا ضرور یقین ہے کہ تمہارے ربّ نے قوم عام کی کیا حالت کر دی؟

﴿اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ﴾ یہ عطف بیان یا عاد سے بدل ہے۔

عاد کے دو قبیلے: (عاد اولیٰ، عاد اخریٰ)

قوم عاد کے دو لقب ہیں: عاد اور اِرم۔ کیونکہ یہ قوم عاد بن عاص بن ارم بن سام بن نوح (علیہ السلام) کی اولاد تھی، اس کو کبھی باپ کے نام پر عاد اور کبھی پردادا کے نام پر ارم کہہ دیتے ہیں۔ اور ثمود بن عابر بن ارم کی اولاد ثمود کے نام سے مشہور ہے، تو عاد و ثمود، دونوں ایک ایک واسطہ سے ارم میں جا ملتے ہیں، یہاں عاد کے ساتھ ارم اس لئے بڑھا دیا کہ قوم عاد میں دو طبقے تھے:

① ایک متقدمین کا، جن کو عاد اولیٰ کہتے ہیں، قران حکیم نے فرمایا: ﴿وَاَنَّهٗۤ اَهۡلَكَ عَادَا ۨالۡاُوۡلٰى وَثَمُوۡدَا۠ فَمَاۤ اَبۡقٰى﴾ [النجم: ۵۱] (اور یہ کہ اسی نے عاد اول کو ہلاک کر ڈالا اور ثمود کو بھی، غرض کسی کو باقی نہ چھوڑا)۔

② دوسرا طبقہ متاخرین کا ہے، جنہیں عاد اخریٰ کہا جاتا ہے۔ لفظ اِرم بڑھا کر اشارہ کر دیا گیا کہ یہاں

متقدمین، یعنی عاد اولیٰ مراد ہیں، کیونکہ قرب اور واسطوں کی قلت کی بناء پر اِرم کا اطلاق عاد اولیٰ پر ہوگا، کچھ تفصیل سورۃ الحاقہ میں گزر چکی ہے۔ عاد اولیٰ کا تعلق ''حضر موت'' یمن کے ساتھ ہے۔ ''عاد اخریٰ'' ثمود کا تعلق ''وادی القریٰ'' مقامِ حجر کے ساتھ ہے، جو کہ حجاز اور تبوک کے درمیان، مدائن صالح کے نام سے مشہور ہے، ان دونوں کے درمیان دوسو سال کا فاصلہ ہے، یعنی عاد اولیٰ کی تباہی ثمود کی تباہی سے دوسو سال پہلے ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اِرم اس قوم (عاد اولیٰ) کی بستی کا نام بھی تھا (یعنی ارم بستی) اور یہ بستی یمنی بندرگاہ ''عدن'' کے قریب تھی، جس میں یہ قوم عاد اولیٰ آباد تھی۔ بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے اس بستی میں اپنے دادے کے نام پر ایک بہت بڑی عمارت اُسی منزلہ نہایت پختہ، عجیب وغریب اور بے مثال تعمیر کرائی تھی۔

قوم عاد کی قدوقامت:

قوم عاد کو ''ذات العماد'' اس لئے کہا گیا کہ ان کے قدوقامت بڑے طویل تھے، اور یہ قوم اپنے ڈیل ڈول اور طاقت وقوت میں دوسری سب قوموں سے ممتاز تھی، اس کے امتیاز کو خود قرآن حکیم نے بڑے واضح الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا:

﴿لَمۡ يُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِي الۡبِلَادِ﴾ ان جیسے قدآور لوگ دنیا میں پیدا نہیں کئے گئے۔ قرآن کریم نے ان کے طول وقامت اور ڈیل ڈول کو دنیا کی ساری قوموں سے زائد ہونا تو بیان فرمادیا، مگر ان کی کوئی پیمائش ذکر کرنا ضرورت سے زائد کام تھا، اس لئے اس کو چھوڑ دیا۔ اسرائیلی روایات میں ان کے قدوقامت اور قوت کے متعلق عجیب وغریب اقوال مذکور ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل رحمہ اللہ سے ان کا طول قامت بارہ ہاتھ، یعنی اٹھارہ فٹ منقول ہے۔ بظاہر یہ روایت بھی اسرائیلی ہے۔ صاحب مظہری نے اسے بیان کیا ہے، اس کے علاوہ اور بھی روایات ہیں۔ واللہ أعلم

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ان میں سے کم از کم قد کا آدمی بارہ گز کا ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحاقہ میں جب ان کی ہلاکت کا بیان کیا، تو فرمایا: ﴿فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ﴾ [الحاقة:۷] (وہ زمین پر ایسے مرے ہوئے پڑے تھے جیسے کھجور کے اکھاڑے ہوئے تنے ہوں، اتنے بڑے قدرآور تھے)۔

﴿ذَاتِ الۡعِمَادِ﴾ کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ بڑی بڑی ستونوں والی عمارتیں اور گنبد بناتے تھے، جیسے ''قصر

عمدان" ان کے بادشاہ کا محل تھا، اسی منزلوں والا تھا، ہر منزل کا درمیانی فاصلہ چالیس فٹ تھا، اس حساب سے اس عمارت کی بلندی سطح زمین سے تین ہزار دو سوفٹ، مگر عذاب الٰہی سے تباہ ہوا۔

شہرارم یا کوہ عدن کے دامن میں شداد بن عاد کی جنت:

مورخین لکھتے ہیں کہ قوم عاد میں دو بڑے زبردست طاقتور بادشاہ گزرے ہیں: ایک شدید دوسرا شداد۔ یہ دونوں عاد کے بیٹے تھے۔ شداد نے اپنے بھائی "شدید" کے مرنے کے بعد سلطنت کو کمال عروج پر پہنچایا تھا کہ دنیا کے چار سو سے زائد بادشاہ اس کے مطیع وفرمانبردار تھے۔

کہتے ہیں کہ دنیا میں چار بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے، ان میں دو مسلمان: ایک حضرت ذوالقرنین علیہ السلام۔ دوسرے حضرت سلیمان علیہ السلام۔ کافروں میں ایک یہی شداد بن عاد۔ دوسرا نمرود بن کنعان، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا، اور شداد سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد ہے۔

یہ شداد بن عاد اتنا طاقتور تھا کہ روئے زمین کے کسی بادشاہ کو اس سے مقابلہ کی طاقت نہ تھی، اس لئے مغرور و متکبر ہو کر (موجودہ امریکہ کی طرح) اس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اس زمانہ کے علماء وصلحاء نے اس کو بہت سمجھایا اور اللہ تعالیٰ کا خوف دلایا، اللہ کی عبادت کی ترغیب دلائی، مگر وہ کہاں مانتا تھا، اور کہتا تھا کہ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، میں کسی خدا کی عبادت سے کیا حاصل کروں؟ اس سے کہا گیا کہ دنیا کی یہ دولت وسلطنت چند روزہ ہے، فانی ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت سے ایسی جنت ملے گی جو ہمیشہ رہنے والی ہے اور کبھی فنا نہیں ہوگی، اور وہ دنیا کی تمام سلطنتوں سے بہتر ہوگی۔

اس نے پوچھا: اس جنت کی خوبیاں کیا ہیں؟ چنانچہ انہوں نے جنت کی خوبیاں اور اس کی حقیقت بیان کی، اس نے کہا: مجھے اس جنت کی ضرورت نہیں، میں تو دنیا میں اپنے لئے ایسی جنت بنا سکتا ہوں، چنانچہ اس نے اپنے سو معتبر اور فن تعمیر کے ماہرین کو جنت کی تعمیر پر مقرر کیا اور ہر ایک کے ساتھ ہزار ہزار آدمی مقرر کئے اور حکم دیا کہ سونے چاندی کی کانوں سے مال نکالو اور ان کی اینٹیں تیار کرو، اور سارے دفینے خزانے نکالو، اور "کوہ عدن" کے قریب ایک چالیس میل (بعض نے لکھا چالیس کوس) مربعہ زمین پر جنت ارم (شہرارم) کی بنیاد رکھو اور تعمیر شروع کرو، چنانچہ حکم کی تعمیل پر کام شروع ہوا۔

کہتے ہیں کہ اس کی بنیادیں اتنی گہری کھودی گئیں کہ پانی کے قریب پہنچ گئی تھیں، اور ان کو سنگِ سلیمانی سے

بھر وادیا تھا، جب بنیادیں زمین کے برابر ہوگئیں تو اوپر سونے چاندی کی اینٹوں سے تعمیر کی گئی، اور دیواروں کی بلندی پانچ سو گز تک تعمیر ہوگئی، جب سورج طلوع ہوتا تو دیواروں کی روشنی اور چمک سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں، پھر اس چار دیواری میں ہزار محل اور ہر محل میں ہزار ستون تعمیر کئے گئے، اور ہر ستون کو قیمتی جواہرات، موتیوں سے مرصع کیا گیا اور درمیان شہر میں ایک نہر جاری کی گئی، اور ہر ہر مکان میں حوضیں بنائی گئیں۔ اس نہر سے ہر مکان تک ایک چھوٹی نہر جاری کی گئی، جن سے وہ حوضیں لبالب بھری رہتیں، اور ہر مکان میں فوارے اچھلتے رہتے تھے۔ ان نہروں کی پڑیاں یاقوت، زمرد، مرجان اور نیلم سے سجائی گئی تھیں، نہروں کے کناروں پر درخت لگائے گئے تھے، جن کی جڑیں شاخین اور پتے زمرد کے اور پھول پھل موتیوں اور یاقوت کے تھے۔

محلات کی دیواروں پر مشک، زعفران، عنبر اور گلاب کی لپائی پلستر کی گئی تھی، اور سونے چاندی کے پانی سے ترائی کرائی گئی تھی، یاقوت و جواہرات کے خوبصورت اور خوش آواز پرندے بنا کر درختوں پر بٹھائے گئے تھے، شہر کے ارد گرد سونے کے ہزار بلند و بالا مینار تعمیر کرائے تھے، جن پر حفاظتی فوجی اور محافظ بیٹھتے تھے۔

جب شہر ارم بن کر تیار ہوا تو شداد نے حکم دیا کہ پورے شہر میں عمدہ قالین اور ریشمی فرش بچھا دیئے جائیں، سونے کے برتنوں سے محلات کو سجایا جائے، کئی نہریں مثلاً دودھ، شہد، شربتؔ وغیرہ کے جاری کئے جائیں، دکانوں اور بازاروں کو کم خواب و زربفت لباس سے سجایا جائے، اور سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ جائیں اور شہر کے باشندوں کو انواع و اقسام کی خوراک پھل میوے اور عمدہ کھانے پہنچائے جائیں، بارہ برس میں (تفسیر حقانی لکھتے ہیں کہ تین سو برس میں) یہ شہر ارم تعمیر ہوا، اور حکم ہوا کہ تمام امراء اور رؤساء اور ارکانِ دولت اس شہر میں جا کر آباد ہوں، اور خود بڑے غرور کے ساتھ اپنے لشکروں اور فوجوں کے ساتھ اپنی جنت کے افتتاح کے لیے روانہ ہوا، اور واعظوں سے کہا کہ اس جنت کے لیے مجھے کہتے ہو کہ میں کسی کے سامنے ذلیل و خوار بنوں اور اپنا سر کسی (ربّ العزّت) کے سامنے جھکا کر اس کی خوش آمد کروں۔

میری شان و شوکت والی جنت، میری بے نیازی اور دولت و ثروت کا تم کھلی آنکھوں سے اچھی طرح مشاہدہ اور نظارہ کرلو، جب وہ بڑے رعب و دبدبہ اور غرور کے ساتھ اپنی جنت کے قریب پہنچا تو لوگ غول در غول شہر ارم (جنت) کے دروازوں کے قریب آئے اور زر و جواہرات نچھاور کرنے لگے اور جوش و خروش، بگل باجوں پر بیخودی کے عالم میں رقص کرنے لگے، اور اپنے بادشاہ کے استقبال کا انتظار کرتے رہے۔

جب وہ اپنی خود ساختہ جنت کے مرکزی دروازہ پر پہنچا تو ایسی حالت میں کہ اس کی سواری کا ایک قدم دروازہ کے اندر اور دوسرا قدم باہر تھا اچانک آسمان سے ایک ایسی خوفناک کڑک (سخت آواز) آئی کہ وہ سب کے سب میلوں رقبہ پر پھیلے ہوئے لوگ ہلاک ہوگئے، اور ساری خلقت اپنے بادشاہ کے ساتھ تباہ ہوگئی اور وہ خود دروازہ کے چوکاٹ پر گر کر مر گیا، اور اپنی بنائی ہوئی جنت کے دیدار کی حسرت وارمان بھی اپنے دل میں لے گیا، اور جہنم رسید ہوگئے، اور پوری جنت اسی طرح تباہ ہوگئی کہ نام ونشان باقی نہ رہا۔

کہتے ہیں کہ پورا شہر زمین میں دھنس گیا، اور تحت الثریٰ زمین کے اندر غائب ہوگئی، جیسے گزرا ہوکل (کأمس الذاهب) فاعتبروا یا أولی الأبصار۔ فصدق اللہ تعالیٰ

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ﴾ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیا کیا؟ (جو) ارم (کہلاتے تھے اتنے) دراز قد کہ تمام ملک میں ایسے پیدا نہیں ہوئے تھے۔

بعض کتابوں میں آیا ہے کہ ملک الموت سے اللہ تعالیٰ نے یہ پوچھا کہ کسی کی روح قبض کرتے ہوئے تجھ کو کسی پر کبھی رحم آیا ہے؟ عرض کیا دو شخصوں پر رحم آیا، اگر آپ کا حکم نہ ہوتا تو میں ہرگز ان کی روح قبض نہ کرتا: ایک تو جب سمندر میں کشتی الٹ گئی اور ایک بچہ اپنی ماں کے ساتھ ایک تختہ پر رہ گیا تھا، اور مجھے حکم ملا کہ اس کی ماں کی روح قبض کرلوں، اس وقت اس بے آسرا بچہ پر مجھے رحم آیا تھا۔ دوسرا وہ بادشاہ جس نے دنیا میں اپنے لئے ایک عالیشان جنت تعمیر کروائی تھی اور وہ وہاں جاکر اس کا افتتاح کرنا تھا، مگر مجھے حکم ملا کہ میں اس کو بمع لشکر فوج وحشم ختم کردوں، مجھے اس پر بہت رحم آیا کہ وہ اپنی جنت کو ایک نظر بھی دیکھ نہ سکا۔

حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا: یہ بادشاہ وہی بے آسرا بچہ ہی تو تھا، اس کو ہم نے اپنی قدرت و عنایت سے پالا اور ظاہری بے مثال نعمتوں سے نوازا اور بادشاہت عطا کی، جاہ وجلال اور سلطنت دیدی، مگر اس نمک حرام نے ہماری نعمتوں کا انکار کیا، خدائی واُلوہیت کا دعویٰ کیا، عبادت اور توحید سے منحرف ہوکر، ناشکری پر اتر آیا، پس ہماری گرفت کا حقدار بنا، ﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ [البروج: ۱۲] (تیرے ربّ کی پکڑ سخت ہے) ہماری دعا ہے کہ ہمارے زمانے کے شدادوں کو ربّ العزت اسی طرح تباہ کردے۔ آمین

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے زائد تفصیل لکھی ہے، وہاں دیکھا جائے۔ حضرتؒ نے فرمایا

کہ معتبر تفسیروں میں لکھا ہے کہ جب یہ کافر بادشاہ اور اس کا لشکر آسمانی کڑک سے ہلاک ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس شہرِ ارم کو دنیا والوں کی نگاہ سے چھپا دیا (جیسے کہ سدّ ذوالقرنین دنیا کی نظر سے پوشیدہ ہے)، مگر کبھی کبھی عدن کے گرد ونواح کے لوگوں کو اس کی روشنی اور جھلک اس جگہ محسوس ہوتی ہے، یہ اس کی دیواروں کی روشنی ہے۔

حضرت عبداللہ بن قلابہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اتفاق سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا گزر اس طرف کو ہوا، وہاں جا کر ایک اونٹ بھاگ گیا، جب لوگ اس کی تلاش میں نکلے تو اس شہر کو دیکھا، یعنی اس شہر کے میناروں اور دیواروں کو دیکھا اور حیران ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ تو اس جنت کا نمونہ ہے، جس کی خبر ہم کو سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، انہوں نے سوچا شاید یہ خواب ہے، جب اندر پہنچے دیکھا کہ بہت خوبصورت شہر ہے، مگر اندر کوئی آدمی نہیں، میدان میں جواہرات یاقوت پڑے ہوئے بکھرے ہیں، تو اپنی چادر بھر لی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پورا واقعہ بیان کیا۔

انہوں نے پوچھا: تم نے یہ خواب میں دیکھا ہے یا بیداری میں؟ انہوں نے کہا: صاحب! بیداری میں دیکھا ہے، اس شہر کی تفصیلات بتاتے ہوئے وہ جواہرات ویاقوت بھی پیش کئے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بڑا تعجب ہوا اور اہلِ علم حضرات سے معلوم کیا کہ دنیا میں کوئی ایسا شہر بھی ہے؟ علماء کرام نے آیت ﴿اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ پڑھ کر بتا دیا کہ یہی شہر ارم ہے جو کہ دنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت میں سے ایک شخص وہاں جائے گا، جس کا حلیہ یہ ہوگا، یعنی کوتاہ قد اور سرخ رنگ کا ہوگا اور اس کی آبرو وگردن پر دو تل کے نشان ہوں گے، اور وہ اپنے اونٹ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے گا، جب دیکھا گیا تو یہ سب نشانیاں اس شخص میں ثابت اور موجود پائی گئیں۔ [ملخص عزیزی]

﴿وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ (اور آپ کے ربّ نے قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا جنہوں نے وادی القریٰ میں چٹانیں تراشی تھیں) یہ لوگ عرب کے شمال میں رہتے تھے، مقامِ حجر سے وادی القریٰ تک ان کی بستیاں تھیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی بستیوں کی تعداد سترہ سو لکھی ہے، حجاز کے متصل وادی القریٰ ان کا مسکن تھا، غزوۂ تبوک کے موقع پر تبوک جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا: سروں پر چادر ڈال کر استغفار کرتے ہوئے روتے اور عبرت لیتے ہوئے یہاں سے گزرو، چند لوگوں نے وہاں کے پانی سے آٹا گوندا مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آٹا پکا کر

مت کھاؤ، بلکہ اونٹوں کو کھلاؤ، یا پھینک دو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

آج کل یہ علاقہ سعودیہ میں واقع ہے، اور ''مدائن صالح'' کے نام سے مشہور ہے، ملک شام اور اردن جاتے ہوئے یہ راستے میں پڑتا ہے، بڑا عجیب وغریب علاقہ ہے، بڑے بڑے پہاڑوں میں ان کے وسیع وعریض محیر العقول چٹانوں سے تراشیدہ مکانات، نشست گاہیں، مقبرے اور مہمان خانے ابھی بھی اس حالت میں موجود ہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے مقامات اور وہ مشہور پانی کا کنواں ابھی بھی موجود ہے، یہ لوگ قوم عاد کے بھائی کہلاتے ہیں، قومِ عاد کی ہلاکت کے دوسو سال بعد ان پر تباہی آئی اور ہلاک ہوگئے، یہ بڑے قدر آور تنومند، مضبوط اعصاب کے صناع (انجینئر) تھے، پہاڑوں کی کھدائی اور ان میں سوراخ کرنا اور عجیب وغریب نقشوں اور پیمانوں پر کھوٹھی تیار کرنا ان کا مشغلہ تھا۔

بدنصیب لوگ بت پرست، کٹر مشرک اور منکر توحید تھے، انہوں نے ''طوفانِ نوح'' اور ''عادارم'' کی تباہی سے عبرت وسبق نہیں سیکھا، بس اپنے فنِ سنگ تراشی پر مغرور رہے، حتیٰ کہ عذاب الٰہی نے تین دن کے عرصہ میں ان کا نام ونشان مٹا کر رکھ دیا۔ نعوذ باللہ من غضبہ وعقابہ۔ کچھ تفصیل سورۃ الحاقۃ کے ضمن میں گزر گئی ہے۔

﴿وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ﴾ اور آپ کے ربّ نے (میخوں والے فرعون کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟) وہ معاملہ سب کو معلوم ہے، اور جا بجا تذکیر وعبرت کی خاطر قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں بکثرت مذکور ہے۔ أوتاد، وتد کی جمع ہے، یعنی میخ والے۔

فرعون کو میخوں والا کہنے کی کئی وجوہات ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس اور محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اوتاد سے مراد پختہ ومضبوط عمارتیں ہیں۔ یہ فنِ تعمیر مصریوں کا خانہ زاد اور خصوصی فن ہوتا تھا، چنانچہ اہرامِ مصر جو کہ آج بھی اپنی ندرت وپختگی اور بلندی ومضبوطی کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں اور دنیا کے عجائبات میں ان کا شمار ہوتا ہے، بلکہ صف اول کے عجائبات میں ہیں، تو خاندانی پیشے کی وجہ سے فرعون کو ''ذُوالْأَوْتَادِ'' کہا۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ فرعون رسیوں اور میخوں سے کوئی خاص کھیل کھیلتا تھا، اس لئے ''ذُوالْأَوْتَادِ'' اس کا لقب ہوا۔

(۳) بعض کہتے ہیں کہ ہاتھیوں، اونٹوں، خچروں اور گھوڑوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ یہ سب

میخوں میں باندھے جاتے ہیں۔

(۴) درمنثور میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، مقاتل، کلبی سعید بن جبیر، مجاہد، حسن بصری، سدی رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ فرعون جس کو سزا دیتا تھا چاروں ہاتھ پاؤں میں لوہے کی میخیں گاڑ دیتا اور سانپ بچھو چھوڑ دیتا تھا۔ قتادہ اور عطاء نے کہا کہ فرعون کے اپنے خزانچی ''حضرت حزقیل'' (یہ حضرت حزقیل وہی شخص ہے جس کے متعلق قرآن حکیم نے وضاحت کی ہے: ﴿وَ جَاءَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَكْتُمُ اِیْمَانَهٗۤ﴾ [غافر: ۲۸] (اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مؤمن شخص جو اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا آیا)...... کہنے لگا: کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو، جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے......)، قران حکیم کی ''سورۃ المؤمن'' اسی خوش قسمت کے نام پر موسوم ہے) کی بیوی کو چومیخا کر کے سزا دی تھی۔

امام بغویؒ نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما لکھا ہے کہ حزقیل اور اس کی بیوی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ حزقیل کی بیوی فرعون کی بیٹی کی مشاطہ (بالوں میں کنگھی کرنے والی) تھی، ایک روز اس کے ہاتھ سے کنگھی گر گئی، اس نے بسم اللہ پڑھ کر اٹھائی، فرعون کی بیٹی نے کہا: یہ بسم اللہ کیا ہے؟ مشاطہ نے کہا: یہ ہمارے ربّ کا نام نامی اور اسم گرامی ہے۔ لڑکی نے کہا کہ میرے باپ کے علاوہ تیرا کوئی معبود ہے؟ مشاطہ نے کہا: ہاں! میرا اور تیرے باپ کا اور زمین و آسمان کا ساری خلقت کا ربّ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ لڑکی نے فوراً جا کر اپنے باپ فرعون کو ماجرا بتایا، فرعون نے مشاطہ کو بلا کر اس سے پوچھا، مشاطہ نے صاف کہہ دیا کہ تم ایک عاجز بندے ہو، سارے جہاں کا اور تیرا ربّ حقیقی، حق سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے، وہی ہمارے سب کا معبود ہے۔

فرعون نے غصے میں آ کر کہا: اگر تم باز آ تو تمہاری معافی ہو سکتی ہے، اگر نہیں تو تجھے مسلسل عذاب کا سامنا کرنا ہوگا، وہ کہنے لگی: اگر تو ستر مہینے تک مجھے عذاب دیتا رہے گا تب بھی میں اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں کروں گی اور ایمان نہیں چھوڑوں گی، فرعون نے مشاطہ کے روبرو اس کی بڑی لڑکی کو ذبح کرایا اور کہا کہ اپنے ایمان سے باز آ جاؤ ورنہ تیری دوسری چھوٹی لڑکی کو بھی تیرے سامنے ذبح کروں گا۔ یہ چھوٹی لڑکی سات مہینے کی شیر خوار بچی تھی، مشاطہ نے کہا کہ اگر روئے زمین کے سارے لوگوں کو میرے سامنے ذبح کرو گے تب بھی میں ایمان نہیں چھوڑوں گی، تم جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔

پس جب بچی کو لے کر اوندھا لٹایا گیا اور قاتلوں نے اسے ذبح کرنا چاہا تو ماں پر بے صبری اور خوف طاری

ہو گیا، لیکن حضرت حق سبحانہ نے فوراً بچی کو قوت گویائی عطا فرما کر اس کی زبان کھول دی، بچی نے اپنی والدہ سے کہا: اماں جان! مت گھبراؤ! تم بھی جلدی ذبح ہو کر پہنچو کہ یہ عذاب نہیں، بلکہ رحمت اور ابدی سعادتوں والی جنت ہے، پس مشاطہ مع بچیوں کے ابدی جنت کے نظاروں میں پہنچ گئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج اس مشاطہ اور اس کی بچیوں کی ابدی خوشحالیوں اور ان کے بڑے درجات و انعامات کا ملاحظہ فرمایا۔ [شرح سراج المنیر، جامع الصغیر العزیزی: ج۳ص۱۵]

فائدہ:

چھوٹے شیر خوار بچے اگر کسی حق بات پر گواہی دیں اور خرق عادت کے طور پر بات کرنا شروع کر دیں تو یہ ایک عجیب وغریب برہان ہوگا، صحیح احادیث میں اس قسم کے واقعات بکثرت ہیں۔

قرآن حکیم نے سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور سورۂ یوسف میں ایک شیر خوار بچے کی گواہی کا تذکرہ فرمایا ہے، اس کے علاوہ صحیح احادیث میں دیگر چند شیر خوار بچوں کے کلام و گواہی کے بہت سے واقعات مذکور ہیں۔ حضرت سیوطی رحمۃ اللہ علیہ انہیں (مجموعہ) دس کی تعداد میں ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہیں:

تکلم فی المھد النبی محمد ★ ویحیی وعیسیٰ والخلیل المکرم
ومبری جریج ثم شاھد یوسف ★ وطفل لدی الاخدود یرویہ مسلم
و طفل علیہ مُربالامۃ التی ★ یقال لھا تزنی ولا تتکلم
وماشطۃ فی عھد فرعون طفلھا ★ و فی زمن الھادی المبارک یختم

[حوالہ بالا]

جب مشاطہ کی ہمت وایمان اور اس کی بچی کا پیغام دیکھا اور سنا تو حضرت آسیہ بنت مزاحم جو کہ فرعون کی بیوی تھیں اور کافی دنوں سے اسلام قبول کر چکی تھیں اور اپنے ایمان کو فرعون سے مخفی و پوشیدہ رکھا تھا، اس زرین اور عجب منظر سے متاثر ہو کر اس نے اپنے پختہ ایمان کا اعلان واظہار فرمایا، فرعون نے ہر چند اسے منت سماجت کر کے سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود، آخر کار میخوں والا عذاب اس پر بھی مسلط ہوا۔ آنکھیں اوپر اٹھا کر جنت کا حقیقی منظر دیکھا اور روح مبارک پرواز کر گئی اور بہشت کی ابدی سعادتوں پر پہنچ گئی۔ قرآن کریم نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ﴾ [التحریم:۱۱] (اس

نے خدا سے التجاء کی کہ اے میرے پروردگار! میرے لئے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال (زشت) سے نجات بخش اور ظالم لوگوں کے ہاتھ سے مجھ کو مخلصی عطا فرما)۔

بجرم عشق تو این میکشند غوغائیست ☆ تو نیز برسر بام آ چہ خوش تماشائیست

شپرو زاغ وزغن زیبائے قید و بند نیست ☆ این سعادت قسمت شاباز وشاہین کردہ اند

حافظ ابن کثیر نے سورۃ التحریم کی تفسیر میں بھی اسی طرح لکھا ہے کہ حضرت آسیہ بنت مزاحم کے ایمان کا اصلی سبب حضرت مشاطہ رضی اللہ عنہا کا ایمان بنا، ان دونوں خوش قسمتوں نے ساری مصیبتوں اور شدید سے شدید عذابوں کو خندہ پیشانی اور ہنسیوں میں برداشت کرلیا، مگر ایمان پر استقامت کے ساتھ ڈٹ کر جنت کے بالا خانوں میں پہنچ گئیں، اور مزید یہ بھی لکھا ہے کہ آخری وقت سارے حجاب اور پردے ہٹا دیئے گئے، انہوں نے جنت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر عالمِ بالا کی سیر کے ساتھ وفات پائی۔

مرنے سے کچھ قبل فرعون اس کے عذاب کا نظارہ کرنے جب وہاں پہنچا تو آسیہ جنت کی سیر کر رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں، بدبخت فرعون نے کہا کہ یہ پاگل ہوئی ہے، اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے، اتنے شدید عذاب میں بھی ہنس رہی ہے۔ دراصل یہ ظاہری طور پر عذاب معلوم ہوتا تھا، باطنی طور پر لطیف وخبیر کی طرف سے بلا وا ہو رہا تھا اور وہ بیچاری اسی ذوق وشوق کی لذتوں میں ہنس رہی تھیں، یہی وہ راز و نیاز ہے کہ جس کا علم کرام کاتبین کو بھی نہیں ہوتا۔

جب جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تو وہاں بھی یہی فرعون ''ذوالاوتاد'' نے انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے اور پھیرنے کی دھمکی دی، اور طرح طرح کے عذابوں کا بندوبست کیا۔ یہ لوگ ہماری طرح کے موروثی مسلمان نہیں تھے، اور چند سال سے پہلے کے مسلمان نہیں تھے، بلکہ نومسلم تھے، ابھی ابھی اسلام قبول کرچکے تھے، مگر استقامت کے پہاڑ ثابت ہوئے، مجال نہیں کہ ان کے قدموں میں جنبش اور دلوں میں اضطراب ہو، بطیب خاطر ہنسی وخوشی میں اپنی ارواح ونفوس کی قربانی پیش کی اور عالمِ بالا کی سیر کو اوپر پہنچ گئے۔ ذرا اگر غور سے دیکھا جائے تو سورۃ الواقعہ کی آیت: ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ﴾[الواقعة: ۴۰] (بہت سے پہلے لوگوں میں سے ہوں گے۔ اور بہت سے بعد والوں میں سے ہوں گے) کی تفسیر آسانی کے ساتھ سمجھ آجائے گی، یہ کہ اصحاب الأخدود اور اسی قسم کے دوسرے اہل ایمان بہت ہی آگے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔

☆☆☆

ربّ العزت سبحانہ وتعالیٰ کی بے نیازی:

آنرا بری از صومعہ در دار گبران افگنی	☆	این راکشی از بت کدہ سرحلقہ رندان کنی
چون وچرا با کارتو عقل زبون راکے رسد	☆	اے قادر مطلق توئی ہر آنچہ خواہی آن کنی

حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی بے نیازی پر قربان! جلیل القدر پیغمبروں حضرت نوح وحضرت لوط علیہما السلام اپنی بیویوں کے گلے میں اسلام کا زرین طوق نہ ڈال سکے، مگر فرعون نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بیوی کے گلے سے اسلام کا زرین طوق نہ اتار سکا۔ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اپنے باپ کو، حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کنعان کو، سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچاؤں اور پھوپھیوں کو اسلام کا راستہ نہ دکھا سکے، یہ کیا بے نیازی اور کیسا استغناء ہے کہ اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے اپنے رشتہ دار لوگ تو دوزخ میں اور عام مساکین چرواہے جنت کے بالا خانوں میں، فاعتبروا یا أولی الأبصار۔ اے ربّ العلمین! ہم سب پر رحم فرما۔ آمین

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ: ''رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردوں میں صاحب کمال بہت سارے ہوئے ہیں، لیکن عورتوں میں سے صاحب کمال صرف آسیہ بنت مزاحم ہیں، جو فرعون کی بیوی تھیں اور مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد ہیں، اور حضرت عائشہ صدیقہ کی فضلیت عورتوں پر ایسی ہے جیسے سالن میں چوری ہوئی روٹی (ثرید) کی فضلیت دوسرے کھانوں پر۔ [متفق علیہ]

﴿الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ﴾ جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی۔ مذکورہ تینوں نافرمان لوگوں نے شہروں اور ملکوں میں سرکشی کی، ظلم وستم اور ہر قسم کی شرارت اور کبر وغرور اختیار کیا، سب سے بڑی سرکشی یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے انکار کر کے بت پرستی اور شرک اختیار کر کے اپنا منہ کالا کیا، یا اُلوہیت کا دعویٰ کیا، جیسے فرعون۔

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ پس آپ کے ربّ نے ان پر عذاب کا کوڑا (چابک) برسایا، اور سب کو صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ صَبَّ پلٹانے اور بارش کی طرح عذاب کو کہتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ثُمَّ صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا﴾ [عبس:٢٥] (بے شک ہم ہی نے پانی برسایا)۔ یعنی بارش کی طرح ان پر عذاب برسا کر انہیں تباہ کیا گیا، کوئی مجرم ظالم یہ خیال نہ کرے کہ میں آزاد ہوں، جس طرح کروں مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ﴿وَمَا اللهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرۃ:٨٥] (اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں) تم سمجھتے ہو کہ ہمیں کوئی نہ دیکھتا ہے اور نہ ہم سے کوئی باز پرس کرے گا، ہرگز نہیں۔

بلکہ ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ﴾ بیشک تیرا ربّ گھات (مورچہ) میں ہے۔ سارا جہاں اس کی نظر میں ہے، وہ دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی اور مسلسل نگرانی بھی کرتا ہے۔ مِرۡصَاد (مرصد گاہ اور انتظار گاہ کو کہتے ہیں) جہاں شکاری شکار کے اور فوجی اپنے دشمن اور سائنسدان سیارچوں کے انتظار میں رہتے ہیں، اور ان کی حرکات وغیرہ معلوم کرتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے اعمال، حرکات وسکنات ربّ تعالیٰ کی نظر میں ہیں، کوئی ادنیٰ ذرہ اس کے علم ونگہداشت سے پوشیدہ نہیں، اگر وہ تمہیں نظر آتا نہیں تو یہ اس کی صفت ہے، مگر تم ہر وقت اس کی نظر میں ہو۔

فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِ ؕ‏ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّاۤ اِذَا
مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ كَلَّا بَلۡ لَّا تُكۡرِمُوۡنَ الۡيَتِيۡمَ ۙ‏ ﴿۱۷﴾
وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ۙ‏ ﴿۱۸﴾ وَتَاۡكُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَكۡلًا لَّـمًّا ۙ‏ ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ
حُبًّا جَمًّا ؕ‏ ﴿۲۰﴾ كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الۡاَرۡضُ دَكًّا دَكًّا ۙ‏ ﴿۲۱﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ‏ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: لیکن انسان کا یہ حال ہے کہ جب اس کا ربّ اس کو آزماتا ہے، یعنی اس کو عزّت وانعام دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے ربّ نے مجھ کو عزّت دی ﴿۱۵﴾ اور جب اس کو یوں آزماتا ہے کہ اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے ربّ نے مجھے ذلیل کر دیا ہے ﴿۱۶﴾ ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم یتیم کی قدر نہیں کرتے ہو ﴿۱۷﴾ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو ﴿۱۸﴾ اور تم میراث کا سارا مال سمیٹ کر چٹ کر جاتے ہو ﴿۱۹﴾ اور تم لوگ مال سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہو ﴿۲۰﴾ ہرگز نہیں، جب زمین کو چکنا چور کر دیا جائے گا ﴿۲۱﴾ اور آپ کا ربّ اور جوق در جوق فرشتے آجائیں گے ﴿۲۲﴾

معارف ومنازل

رزق کی فراخی اور تنگی مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں:

﴿فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ﴾ یہاں انسان سے مراد کافر انسان ہے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جو چاہتا ہے خیال باندھ لیتا ہے، لیکن عام معنی کے اعتبار سے وہ مسلمان بھی اس میں شامل ہیں جو اس جیسے خیالات میں مبتلا ہوں اور وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو رزق میں وسعت، مال ودولت، فراخی، صحت وتندرستی سے نوازتے ہیں تو نفس وشیطان اس کو

دو باطل خیالوں میں مبتلاء کر دیتے ہیں:

(۱) یہ کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ میری ذاتی صلاحیت اور میری عقل وفہم اور سعی وعمل یا محنت وتعلیم کا نتیجہ ہے، جس طرح قارون نے کہا تھا: ﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾ [القصص:۷۸] (بولا کہ یہ (مال) مجھے میری دانش (کے زور) سے ملا ہے)۔ قارون نے اللہ تعالیٰ کی تمام بخششوں کو اپنے علم وفہم کا لازمی نتیجہ گمان کر کے کفر کیا تھا، اور یہ انسان بھی یہی سمجھتا اور کہتا ہے کہ میں ان نعمتوں کا بجا طور پر مستحق ہوں۔

(۲) یہ کہ ان چیزوں کے حصول سے وہ اس دھوکہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ اور مقبول ہوں، اگر غیر مقبول ومردود ہوتا تو وہ مجھے یہ نعمتیں کیوں دیتا؟ آج ہر شخص اسی مزعومہ میں سرشار اور مست نظر آتا ہے، حتیٰ کہ دیندار طبقہ کے لوگ، اِلَّا ماشاء اللہ، سارے اسی شیطانی ونفسانی دھوکے کے شکار ہیں۔

اسی طرح جب کسی انسان پر تنگی وتنگدستی، فقر وفاقہ، مرض وبیماری وغیرہ مصائب آجاتے ہیں تو وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردود وغیر مقبول ہونے کی دلیل خیال کرنے لگتا ہے۔ اور دوسرے لوگ بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ اگر اس شخص میں ذرہ بھر خیر کا مادہ ہوتا تو اس کا یہ حال نہ ہوتا، اور یہ شخص ان فقر وفاقہ اور مصائب پر اللہ تعالیٰ سے ناراض ہو جاتا ہے کہ میں تو اچھا آدمی ہوں، اکرام واعزاز اور انعام کا مستحق ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے بلا وجہ مجھے کیوں ذلیل کر دیا؟ اس قسم کے غلط خیالات کفار ومشرکین میں تو ہوتے ہی ہیں، اور قرآن کریم نے جابجا اس قسم کے خیالات کی تردید فرمائی ہے، مگر صدمہ وافسوس کی بات ہے کہ آج کل بہت سے مسلمان بھی اس گمراہی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

ربّ العزّت سبحانہ نے ان آیات میں سختی کے ساتھ ایسے باطل بے سروپا خیالات کی تردید فرما کر "کَلَّا" سے ان خیالات کی بیخ کنی فرما دی کہ تمہارے یہ خیالات باطل اور بے بنیاد ہیں کہ اس جہاں میں وسعتِ رزق، صحت وتندرستی مقبول عند اللہ ہونے کی علامت ہے، اور نہ تنگدستی ومرض مردود وذلیل ہونے کی علامت ہے، بلکہ اکثر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

دیکھیں! فرعون کو دعوائے خدائی کے ساتھ کبھی دردِ سر کا عارضہ پیش نہیں آیا، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردود وذلیل تھا، اور حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام؛ اسی طرح عباد اللہ الصالحین ہمیشہ فقیر وتنگدست رہے، اور بعض پیغمبروں علیہم السلام کو لوگوں نے شہید کیا، اور مقربانِ درگاہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کن کن بے سروسامانی میں زندگی گزاری، خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کس قسم کے فقر وفاقہ اور تنگی میں رہے، پیٹ پر پتھر باندھ رکھے۔

ایک مرتبہ چٹائی پر آرام کررہے تھے کہ جسم اطہر پہلو پر چٹائی کا نشان دیکھ کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رو پڑے اور کہنے لگے: قیصر و کسریٰ کمخواب کے بستروں پر عیش کررہے ہیں، اور آپ کا یہ حال ہے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابن خطاب! آپ شک میں پڑ گئے ہو، یہ دنیا ان کی جنت ہے، جبکہ ہماری جنت اگلے جہاں میں ہے۔[بخاري]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہاجرین حضرات جو مفلس ہیں وہ اغنیاء مہاجرین سے چالیس سال پہلے جنت میں چلے جائیں گے۔[مسلم] بعض دیگر روایات میں یہ ہے کہ امت کے نیک لوگ: فقراء و محتاج اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس بندہ سے محبت فرماتے ہیں اس کو دنیا (مال) سے ایسا بچاتے ہیں جیسا کہ تم اپنے بیمار کو پانی سے پرہیز کراتے ہو۔[أحمد، ترمذي، مظهري].

مطلب یہ ہے کہ مال و دولت، عزّت و مرتبہ اور کثرت دنیا مقبولیت عند اللہ کی علامت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اپنے نافرمان دشمنوں کو اتنا زیادہ مال دے دیتا ہے تاکہ ان پر سخت گرفت و عذاب کا بہانہ و اتمامِ حجت ہو، اسی طرح فقر و مسکنت یہ محرومی اور ذلت و مردود ہونے کی علامت نہیں، بلکہ یہ چیز بسا اوقات راحت و عزّت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

تنگدستی و فقر کو اہانت کا ہرگز سبب نہیں سمجھنا چاہئے، اگر یہ فقر و فاقہ و مصیبت اہانت کا سبب ہوتے تو انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء عظام بارگاہ الٰہی کے مقرب بندوں کو ہرگز نہ پہنچتے، حالانکہ ان کی خصوصیت اور شناخت انہیں چیزوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے دین میں ہے، پس جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے گا اس کو دین کا راستہ بتادے گا، دنیا اور مال اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض و ناپسندیدہ ہے، یہ مال و دنیا اللہ تعالیٰ مبغوض لوگوں کو دے گا۔[أحمد]

درحقیقت مال ہو یا فقر، مقصود دونوں میں ابتلاء و امتحان ہے، اگر افلاس و فقر کے ساتھ صبر و تسلیم و رضا بھی ہو، تو ایسا فقر نعمتِ عظمیٰ ہے، کیونکہ ہر نعمت کا عطا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ اور پسندیدہ بندوں کو وہی نعمت عطا کرتا ہے جو اس کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب ہو، وہ فقر ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں اکثر و بیشتر فقراء کو، اور جہنم میں عورتوں کو بکثرت دیکھا۔[ترمذي]

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے نیک بندوں، فرمانبردار اور برگزیدہ دوستوں کا انتخاب فرمایا، بعینہٖ اسی طرح ان کے لیے فقر کا انتخاب فرمایا، مال و دولت میں کچھ بھی نہیں رکھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت اسرافیل علیہ السلام تشریف لائے، حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلے سے موجود تھے، کہنے لگے: یا رسول اللہ! ربّ العزّت کا پیغام لے کر آیا ہوں، دو چیزوں میں سے اپنے لئے کسی ایک کا انتخاب کریں، وہ یہ کہ آپ پیغمبر اور بادشاہ بننا چاہتے ہیں، یا اپنے لئے نبی اور بندہ بننا پسند کرتے ہیں؟

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف دیکھا، گویا آپ ان سے مشورہ لینا چاہتے تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بندہ اور پیغمبر بننے کا اشارہ کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسرافیل علیہ السلام کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ نبی بندہ بننا چاہتا ہوں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کے جواب کو سراہا اور خوش ہوئے۔ [طبراني] بندگی دراصل فقر ہی کا نام ہے، کیونکہ بادشاہت کے مقابل اگر بندگی کا ذکر ہو تو اس سے مراد فقر ہی ہوگا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت و بندگی کو پسند فرما کر نبوت و بادشاہت کو پسند نہیں فرمایا۔ [أثمار التكميل]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دنیا کو تمام معصیتوں اور گناہوں کی جڑ قرار دیا تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب بندے دنیا سے محبت اور تعلق رکھیں؟ بلکہ عبادُ الرحمن کی پہلی مخصوص صفت یہی ہوتی ہے کہ وہ تارک الدنیا ہوتے ہیں، پس اگر یہ ترکِ دنیا کی صفت کسی شخص میں نہ ہو وہ ہرگز بندگانِ خاص کی فہرست میں شامل نہیں ہوسکتا۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا استغناء:

حکایت:

ملک سنجر سلجوقی بڑے دیندار متقی بادشاہ گزرے ہیں، انہوں نے قطب الاقطاب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اپنا وزیر روانہ کیا اور پیغام میں کہا کہ حضرت والا! میں نے اپنے ملک کے صوبہ نیمروز کی آمدن آپ کی خانقاہ، مسجد و مدرسہ اور فقراء پر وقف کر کے قاصد کے ہاتھ دستاویز روانہ کر چکا ہوں، آئندہ صوبہ نیمروز کا ماحصل آمدن آپ کا ہوگا، براہ کرم قبول فرمائیں۔ جب قاصد وزیر نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر شاہی فرمان سپرد کیا تو حضرت نے اسی دستاویز پر دو شعر لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ فرمایا۔ خلاصہ یہ تھا کہ جس کے پاس آہ سحر گاہی کا ترانہ ہو اُسے کسی شاہی بخشش کی ضرورت نہیں۔

وانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب ☆ من ملک نیمروز بدانگے نمی خرم

چون چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد ☆ دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم

معلوم ہوا کہ اہل اللہ کا فقر اختیاری ہوتا ہے وہ مال و دولت سے نفرت کرتے ہیں اور مال کے آنے پر بےقرار اور پریشان ہوجاتے ہیں، یہ دربار نبوت کے خوشہ چینوں کا حال ہے، تو پھر رسالت مآب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی اور حیاتِ طیبہ وسیرتِ عالیہ کا کیا کہنا، وہ سمجھ سے بالاتر ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: نِعْمَ الرَّفِيْقَانِ الْإِيْمَانِ وَ التَّقْوىٰ يَنْفَعَانِکَ وَ لَا يُفَارِقَانِکَ وَ بِئْسَ الرَّفِيْقَانِ الْمَالُ وَ الْجَاهُ لَا يَنْفَعَانِکَ وَ يُفَارِقَانِکَ۔ بہترین دوست ایمان اور تقویٰ ہیں، یہ دونوں آدمی کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور کبھی اس سے جدا نہیں ہوں گے، بدترین ساتھی مال اور اقتدار ہیں، یہ دونوں آدمی کو فائدہ ونفع نہیں پہنچاتے اور جلدی جدا ہوجاتے ہیں، آگے کی دنیا یعنی برزخ تک بھی ساتھ نہیں دیتے ہیں۔

﴿كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ﴾ (یعنی ہرگز ایسا نہیں کہ مال و دولت عزت کے سبب ہوں اور فقر و غربت ذلت کے سبب ہوں، بلکہ عزت و ذلت کا مدار اعمال پر ہے، خوشحالی وفراخی کے ساتھ بداعمالیاں، ذلت کا سبب ہیں اور تنگدستی کے باوجود نیک اعمال عزت کا باعث ہیں۔

کفار سے کہا جارہا ہے: اے بدبختو! تمہاری یہ بداعمالیاں اور بری خصلتیں جن کے تم عادی ہو تمہاری ذلت کا پیش خیمہ ہیں۔

اول: یہ کہ تم نادار یتیموں کی عزت وقدر نہیں کرتے ہو، حالانکہ وہ نادار، بے سہارا، مصیبت زدہ اور کم سن ہیں، ان کے سروں سے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے، وہ تمہاری شفقتوں کے بے حد محتاج ہیں۔

دوم: تم غریب ومسکین کو خود تو کیا کھانا کھلاتے، دوسروں کو بھی ترغیب نہیں دلاتے ہو، حالانکہ محتاجوں پر شفقت ورحم کرنا سارے انسانوں کے نزدیک مسلم ہے اور عمدہ نیکی و ہمدردی ہے۔

سوم: یہ کہ تم مردوں کا مال خود سمیٹ لیتے ہو، یتیموں، بیواؤں اور کمزور وارثوں کو نہیں دیتے ہو، اور اس مال کے ذریعے خود طرح طرح کی عیاشیاں کرتے ہو۔

چہارم: تم مال سے بے حد محبت کرتے ہو، جس کی وجہ سے تمہارے اندر ذلت کے اسباب: حرص، طمع، لالچ، کنجوسی اور کبر وغرور جیسے موذی امراض اور قساوت جیسے مہلک بیماریاں پیدا ہوگئی ہیں، اسی وجہ سے تم قتل،

غارتگری، حق تلفی اور بے رحمی جیسے کمینہ خصلتوں میں گرفتا ہو، دراصل ذلت کے اسباب یہی ہیں، نہ کہ فقر وتنگدستی۔

﴿كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ﴾ بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے۔ اس آیت میں منکرین قیامت کے یتیموں کی حق تلفی پر مذمت کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام بہت ضروری ہے، اور اس سلسلے میں صرف حقوق کی ادائیگی کافی نہیں، بلکہ ان کا اکرام واحترام بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو مال و اسباب اور وسائل عطا فرمائے ہیں عقلِ صحیح اور انسانیت کا تقاضا ہے کہ ان کے شکریہ میں یتیموں، محتاجوں اور بیواؤں کی پرورش کی جائے، اور ان کو حقارت وذلت کی نظر سے نہ دیکھا جائے، اور انہیں اپنے بچوں کے ساتھ مواہبات و نگہداشت میں برابر رکھا جائے۔

مشرکین مکہ ان تمام اقدار سے تہی دامن تھے، انہوں نے حق تلفی اور بے رحمی کی حد کردی، یہ بے رحمی اور حق تلفی کسی خاص فرد میں نہیں، بلکہ پورے معاشرہ میں عام رواج پذیر رہی، اس کی بڑی وجہ ان کا شرک اور کفر اور روز جزاء کے محاسبہ سے انکار تھی، کیونکہ جب قیامت کے قیام اور محاسبہ سے ذہن خالی ہوتا ہے تو سارے اعمال بگڑ جاتے ہیں، اور جب محاسبہ کا وقوع یقینی ہوتا ہے تو سارے اعمال سدھر جاتے ہیں۔

اسلام نے اپنے روشن اور زرین اصول کے ذریعہ جہاں پورے عالم سے شرک وکفر کی ظلمتوں کو ہمیشہ کے لیے مٹادیا، وہاں پورے معاشرے سے اس قسم کی بے انصافیوں اور حق تلفیوں کا خاتمہ کردیا اور یتیموں، ناداروں اور بیواؤں کی خاطر ایسے گرانقدر اصول وضع کئے جنہیں چشمِ فلک نے نہیں دیکھا تھا۔ قرآن وسنت نے یتیم پروری کے ایسے ایسے اجر وثواب اور انعامات بیان کئے جنہیں دیکھ اور سن کر ہر صاحب نظر غیر ارادی طور پر یتیم پروری پر کمربستہ ہوجاتا ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أنا وكافل اليتيم كهاتين يوم القيامة، وأشار بإصبعيه۔ [متفق عليه] (یتیم کی سرپرستی کرنے والا قیامت کے روز مجھ سے اتنا قریب ہوگا جیسے کہ ہاتھ کی یہ دو انگلیاں) (درمیانی انگلی اور انگشت شہادت)۔

﴿كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ خبردار! جب زمین کی بلندی کوٹ کوٹ کر پست کردی جائے گی۔ یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ قیامت کا پروگرام منسوخ ہو، اور تمہارے برے اعمال پر جزا وسزا مرتب نہ ہو، یقیناً قیامت برپا ہوگی اور وہ اس کیفیت کے ساتھ کہ صور پھونکنے کے ساتھ ایک بہت بڑا عالمگیر زلزلہ آئے گا تو زمین وآسمان اور سارے کوہ وجبال پوری طرح ریزہ ریزہ ہوکر بلندی وپستی کے سارے نشیب وفراز ہموار ہوجائیں گے، یہ جہاں ختم

ہو کر دوسرا جہاں پیدا ہوگا، اور سارے مردے قبروں سے باہر آئیں گے، تمام اوّلین و آخرین ملک یوم الدین کی عدالت میں حاضر ہو جائیں گے، اور فرشتوں کا نزول ہوگا، فرشتے صف بستہ، قطار در قطار کھڑے ہوں گے، واحد لاشریک، قہار و جبار، تخت پر جلوہ افروز ہوں گے، شہدا و گواہ بلائے جائیں گے، حساب و کتاب ہوگا، ذرہ ذرہ ظاہر ہوگا، پھر فیصلہ ہوگا، ہر شخص اپنے اپنے استحقاق کے موافق اپنے اعمال کا انجام جنت یا دوزخ پائے گا۔ واللہ اعلم

﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ﴾ اور تمہارا پروردگار جلوہ فرما ہوگا۔ یہ متشابہات میں سے ہے، کیفیت معلوم نہیں، حق سبحانہ و تعالیٰ کے آنے کی کیا شان، کیا کیفیت ہوگی، اس کو اللہ پاک کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہی مطلب ہے متشابہات کا کہ آنا تو معلوم ہے اور کیفیت غیر معقول و غیر معلوم ہے، البتہ فرشتوں کا جمع ہونا، صف بہ صف، قطار در قطار یہ معلوم اور معقول ہے۔ کیا عجیب و غریب منظر ہوگا؟ بعض حضرات کے نزدیک یہاں مضاف محذوف ہے: أي جاء أمر ربک۔ متشابہات پر پہلے کئی مقامات پر تفصیل کلام ہو چکا ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

ترجمہ: اور اس دن دوزخ کو لایا جائے گا، اس دن انسان کی سمجھ میں آجائے گا اور اس وقت سمجھنا بے سود ہوگا ﴿۲۳﴾ وہ کہے گا: اے کاش! میں اپنی زندگی کے لیے کچھ آگے بھیج دیتا ﴿۲۴﴾ پھر اس دن اس جیسے سزا دینے والا کوئی نہ ہوگا ﴿۲۵﴾ اور نہ اس جیسا جکڑنے والا کوئی اور ہوگا ﴿۲۶﴾ اے اطمینان والی روح! ﴿۲۷﴾ تو اپنے پروردگار کے پاس ایسی حالت میں چل کہ تو اس سے خوش ہے، اور وہ تجھ سے خوش ہے ﴿۲۸﴾ پھر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا ﴿۲۹﴾ اور میری جنت میں چلی جا ﴿۳۰﴾

معارف و منازل

﴿وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ﴾ اور دوزخ اس دن حاضر کی جائے گی۔ جنت و دوزخ دونوں برحق اور مخلوق ہیں، اور برزخی زندگی کا تعلق دونوں کے ساتھ مربوط ہے، مؤمنین برزخ میں جنتی نعمتوں سے محفوظ و سرشار ہوں

گے اور کفار و فجار جہنم کی مختلف اذیتوں اور عذاب میں گرفتار رہیں گے، اس وقت جنت ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے اور جہنم ساتوں زمینوں سے نیچے ہے، قیامت کے دن دونوں کا ظہور ہوگا، جب سارے پردے ہٹا دیئے جائیں گے تو جنت و دوزخ سامنے نظر آئیں گے، قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ﴾ [الشعراء: ۹۱] (اور قریب کر دی جائے گی جنت متقیوں کے لیے اور کھول دی جائے گی جہنم گمراہوں کے لیے)۔ اسی طرح متعدد سورتوں اور متفرق آیتوں میں جنت و دوزخ کی موجودگی اور نزدیک کر دیئے جانے کا ذکر ہے۔

زیر نظر آیات کریمہ میں اسی کا بیان ہے کہ جہنم کو ساتوں زمینوں کے نیچے سے کھینچ کر لایا جائے گا۔ اس کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، مگر ظاہر یہ ہے کہ جہنم کو زبردست بھڑکا کر میدانِ حشر میں حاضر کیا جائے گا۔ اس کی قدرے تفصیل پہلے سورۂ تکویر اور سورۂ تطفیف میں گزر چکی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میدانِ حشر میں جہنم کو لائے جانے کی کیفیت یہ ہوگی کہ فرشتے دوزخ کو ستر ہزار زنجیروں کے ذریعے کھینچ کر قریب لائیں گے، اور ہر زنجیر کو کھینچنے کے لیے ستر ہزار فرشتے مقرر ہوں گے، جو اسے اس طرح کھینچ کر میدانِ حشر کے قریب لائیں گے جس طرح کسی بڑی کشتی یا جہاز کو زنجیروں اور کرینوں کے ذریعے کھینچ کر لایا جاتا ہے۔ [مسلم]

تفسیر عزیزی میں لکھا ہے کہ دو سو سال کی مسافت سے جہنم کا جوش و غضب نظر آنے لگے گا، اور لوگ نفسی نفسی کہنا شروع کریں گے، اور دہشت کے مارے سب لوگ چیخ چیخ کر بیتاب ہو جائیں گے۔

تفسیر مظہری نے لکھا ہے کہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام اس موقعہ پر "نفسي نفسي" کہتے ہوئے نظر آئیں گے، لیکن حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ربّ العزّت سبحانہ کے حضور میں سجدہ ریز ہو کر بجائے "نفسي نفسي" کہنے کے "أمتي أمتي" کہنا شروع کریں گے، اور ربّ العزّت سبحانہ آپ کی شفاعت قبول کرتے ہوئے سجدہ سے سر اٹھانے کا حکم صادر فرمائیں گے۔ [مظهري]

﴿یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ﴾ (اس دن انسان اپنے کاموں کو یاد کرے گا) یہ الف ولام عہد کا ہے، اور تذکر سے سمجھنا مراد ہے، یعنی کافر انسان ﴿اَكْرَمَنِ﴾ اور ﴿اَهَانَنِ﴾ کہنے والا آج اس دنیوی غرور اور بے سمجھی کو چھوڑ کر اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں سراسر غلطی پر تھا، مگر یہ وقت سمجھنے کا نہیں، یہ دار الجزاء ہے: اگر یہ سمجھ اسے دار العمل (دنیا) میں حاصل ہو جاتی تو اس کا نتیجہ بہتر اور کار آمد ہوتا، اب وقت گزر گیا، کوئی فائدہ نہیں۔

تفسیر مظہری نے لکھا ہے کہ ﴿يَتَذَكَّرُ﴾ کے معنی ہیں: ''توبہ واستغفار کرنا''یعنی کافر اس روز اپنے گناہوں کو یاد کر کے توبہ واستغفار کرے گا۔

﴿وَأَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى﴾ مگر توبہ سے اسے فائدہ کہاں مل سکے گا۔ یہ استفہامِ انکاری ہے، یعنی اس یاد اور توبہ سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، قبولِ توبہ کی شرط تو ایمان بالغیب ہے، جب قیامت کے ظہور کے بعد ایمان بالغیب نہ رہا سامنے دیکھ کر تو ہر ایک کو ماننا ہی پڑے گا۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں معنوں کا مفہوم ایک ہی ہے کہ اس روز اپنی نادانی کا احساس جس طرح بے سود اور غیر مفید ہے اسی طرح توبہ و پشیمانی بھی بے مقصد اور غیر مفید ہے، کیونکہ ان دونوں کا تعلق دار العمل کے ساتھ ہے۔ آگے ﴿يَتَذَكَّرُ﴾ کی تفصیل ہے۔

﴿يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ﴾ کہے گا: کاش میں نے اپنی زندگی (جاودانی کے لیے) کچھ آگے بھیجا ہوتا۔ کافر تمنا کرے گا: کاش میں اچھے اعمال آگے بھیجتا تو آج ان مصائب سے جو کفر و شرک اور سرکشی کے نتائج سامنے آرہے ہیں دوچار و مبتلا نہ ہوتا، لیکن یہ تمنا عبث و فضول ہے۔ لِحَيَاتِيْ میں لام بمعنی وقت ہے، اور حیاۃ سے مراد دنیوی زندگی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کاش میں دنیوی زندگی کے زمانہ میں اعمالِ صالحہ پہلے ہی کرتا (یا ایمان لاتا، توبہ کر کے)۔ یا لام اجلیہ ہے اور حیاۃ سے مراد اخروی حیات ہے، یعنی کاش میں اپنی اخروی زندگی کے لیے اچھے اعمال بھیج دیتا، یا اخروی نجات کے لیے توبہ کر کے ایمان لاتا تو آج مجھے مصائب و عذاب کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ﴾ تو اس دن نہ کوئی خدا کے عذاب کی طرح کا (کسی کو) عذاب دے گا اور نہ کوئی ویسا جکڑنا جکڑے گا۔ ﴿عَذَابَهٗ﴾ اور ﴿وَثَاقَهٗ﴾ دونوں مفعول مطلق ہیں جو کہ بیانِ نوع کے لیے ہیں: أي كعذابه و كوثاقه۔ پھر دونوں کی ضمیر ''ہ'' میں بھی دو احتمال ہیں: (۱) فاعل، یعنی اللہ کی طرف راجع ہوں، (۲) یا مفعول، الانسان کی طرف راجع ہوں۔

اول صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جس طرح عذاب دے گا اور جکڑ بندی کرے گا دوسرا کوئی نہ کر سکے گا، کیونکہ ﴿وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ [الانفطار:۱۹] (اور اس دن سارا اختیار اللہ کو ہوگا)۔

دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ یا دوزخ کا مامور فرشتہ جیسا عذاب کافر انسان کو دے گا اور کسی دوسرے کو نہ دے گا، اور جیسی جکڑ بندی وہ کسی کافر کی کرے گا اور کسی عام مجرم کی نہ کرے گا۔

☆☆☆

اس سخت ترین عذاب کی وجوہات:

(۱) اس سخت ترین اور بے مثال عذاب کی پہلی وجہ شرک وکفر ہی ہے، باقی جرائم کا عذاب اتنا سخت نہ ہوگا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ عذاب روح اور بدن دونوں پر مسلط رہے گا، اس وجہ سے یہ سخت ہوگا۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ عذاب دائمی ہوگا، اس لئے یہ عذاب دوسرے عذابوں کی بہ نسبت سخت ہوگا۔

(۴) کفر ایک بغاوت ہے، اس لئے اس کا عذاب بھاری ہے۔

ترغیب وترہیب عام طور پر لازم وملزوم ہیں، قرآن کریم جا بجا ایک کے بیان کے بعد اکثر دوسرے کا بیان کرتا رہتا ہے، اس لیے مجرمین کے بعد صادقین کا بیان فرما کر ارشاد فرمایا:

﴿يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ اے اطمینان پانے والی روح! نفس انسانی اگر چہ ایک ہے مگر اپنی صفاتِ مختلفہ کی وجہ سے متعدد شمار ہوتا ہے:

(۱) اول نفس امارہ: نفس امارہ سب سے برا اور خبیث ہے۔ (۲) نفس لوامہ: نفس لوامہ خیر وشر کا مجموعہ ہے۔ (۳) نفس مطمئنہ: نفس مطمئنہ انبیاء کرام علیہم السلام، شہداء، صالحین، متقی اور پرہیزگار حضرات کے ساتھ مخصوص ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے لیے عطائی اور وہبی ہے، دوسروں کے لیے کسبی ہے جو ریاضت وزہد اور کثرتِ عبادات والتزامِ طاعات اور اجتناب عن المعاصی واتباعِ احکامِ شریعت کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ تفصیل سورۃ القیامۃ کے تحت گزر چکی ہے۔

حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من أحب لقاء الله أحب الله لقائه، و من كره لقاء الله كره الله لقائه“۔ (جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو پسند فرماتے ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند فرماتے ہیں)۔ [متفق علیہ]

یہ حدیث سن کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات تو موت ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے، اور موت کسی کو پسند نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ بات نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موت کے وقت مؤمن کو فرشتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی جنت اور اس کے انعامات کی خوشخبری سنائی جاتی ہے، جس کو سن کر یا دیکھ کر اس کو موت (اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے پاس حضور)

محبوب ومرغوب ہوجاتی ہے، اور جب کافر کو موت کے وقت عذاب وسزا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کو اس وقت موت سے بڑھ کر کوئی چیز بری اور مکروہ معلوم نہیں ہوتی۔ [مظهري، بخاري و مسلم]

﴿ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ﴾ لوٹ جاؤ اپنے ربّ کی طرف۔ لوٹنے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پہلا مقام بھی ربّ تعالیٰ کے پاس تھا، اب وہیں دوبارہ اسے جانے کا حکم مل رہا ہے۔ اس سے وہ روایت ثابت ہو رہی ہے جس میں آیا ہے کہ مؤمنین کی ارواح ان کے اعمال ناموں کے ساتھ علیین میں رہیں گی، اور یہ ساتوں آسمانوں کے اوپر جنت سے نزدیک عرش الرحمن کے سایہ میں ایک مبارک مقام ہے۔ كما مر في تفسير سورة المطففين۔

تمام مؤمنین کی ارواح کا مستقر وہی ہے، جس طرح ارواحِ کافرین کا مستقر ساتویں زمین کے نیچے دوزخ سے نزدیک مقام سجین میں ہے، وہاں علیین سے روح لاکر انسانی جسم میں ڈالی جاتی ہے اور پھر موت کے بعد مؤمن کی روح دوبارہ وہیں منتقل ہوجاتی ہے۔

﴿رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ یعنی یہ نفس اللہ تعالیٰ سے اس کے تکوینی اور تشریعی احکام پر راضی ہے، اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہے، کیونکہ بندہ کا اللہ تعالیٰ کے تقدیری احکام پر راضی ہونا ہی اس کی علامت وثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس سے راضی نہ ہوتا تو اس کو رضا بالقضاء کی توفیق ہی نہ ہوتی، اور اس کو نفس مطمئنہ کا مقام ہی حاصل نہ ہوتا، اور اعمالِ صالحہ وحسنہ تک اس کی رسائی بھی نہ ہوتی۔ یہ توفیقِ ایزدی دراصل رضاء الٰہی کا نتیجہ وثمرہ ہے۔ رزقنا الله و جميع المؤمنين و المؤمنت۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نفس جس طرح اللہ تعالیٰ سے راضی ہے تو اپنی موت پر بھی راضی وخوش ہے۔

﴿فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ﴾ تو میرے (ممتاز) بندوں میں شامل ہوجا۔ نفس مطمئنہ کو کہا جارہا ہے کہ میرے مخلص بندوں میں جاکر شامل ہوجا، اور میری جنت میں داخل ہوجا۔ پہلے اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں صالحین میں شامل ہونے کا حکم ہے، پھر جنت میں داخل ہونے کا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کے صالح مخلص بندوں کے زمرہ میں شامل ہو، ان سب کے ساتھ ہی جنت میں داخلہ ہوگا، پس عباداللہ الصالحین کی صحبت ورفاقت ہر مسلمان کے لیے ضروری ٹھہرا تاکہ دخولِ جنت کا راستہ ہموار ہو، عام مؤمنین کیا؟ انبیاء علیہم السلام ومرسلین بھی اسی نعمت عظمیٰ کے طالب رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا کی: ﴿وَاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ [یوسف:۱۰۱] (مجھے مسلمان اٹھا) اور اپنے نیک بندوں میں داخل فرما)۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی اور

کہا: ﴿وَاَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِكَ فِیۡ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیۡنَ﴾ [النمل: ۱۹] (اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما) توصحبت صالحین اور المرأ مع من أحب کے بموجب اکسیر کبیر ٹھہرا، جس کے طالب جب انبیاء کرام علیہم السلام رہے ہیں تو دوسروں کے لیے بطریق اولیٰ ضروری ہوا۔

ارواحِ مؤمنہ اور نفس مطمئنہ کو خطاب کب ہوگا؟

بعض ائمہ تفسیر کے نزدیک یہ پاکیزہ و بابرکت خطاب قیامت میں حساب وکتاب کے بعد ہوگا، چنانچہ اوپر کی آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اول مشرکین وکفار کے عذاب وسزا کا بیان ہے جو کہ یہ سب کچھ قیامت میں ہوگا، تو ان کے مقابلہ میں مؤمنین کے اجر وثواب اور دخولِ جنت کا بیان جو ذکر ہوا ہے، وہ بھی آخرت ہی میں ہوگا، کیونکہ تقابل کا یہی تقاضا ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ خطاب موت کے وقت دنیا ہی میں ہوتا ہے۔ بہت سے صحیح احادیث اس پر گواہ وشاہد ہیں، اس لئے حافظ ابن کثیرؒ نے فرمایا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ دونوں وقتوں میں مؤمنوں کی روح کو یہ خطاب ہوگا موت کے وقت بھی اور قیامت میں بھی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل وقت اس بشارت کا فزعِ اکبر کا وقت ہے، لیکن موت کے وقت بھی اس کا نمونہ وجھلک ظاہر ہوتا ہے۔ وہ احادیث جن سے اس خطاب کا موت کے وقت ہونا معلوم ہوتا ہے ایک تو عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی وہی حدیث ہے جو اوپر گزر چکی ہے، اور ایک طویل حدیث حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی مسند احمد، ابن ماجہ اور نسائی میں ہے، جس میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جب مؤمن کی موت کا وقت آتا ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑا (جنتی کفن) سامنے لاکر اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں: اخرجي راضية مرضية إلى روح الله و ريحانه۔ (یعنی بدن سے ایسی حالت میں نکل کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہے، اور یہ نکلنا اللہ تعالیٰ کی رحمت وجنت کی ابدی اور دائمی راحتوں کی طرف ہوگا۔ [الحدیث]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے آیت ﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ﴾ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھی تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مجلس میں موجود تھے کہنے لگے: یا رسول اللہ! یہ کتنا اچھا خطاب اور اکرام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سن لیجئے! فرشتہ موت کے ساتھ آپ کو یہ خطاب کرے گا۔ [ابن کثیر]

چند عجیب واقعات:

(۱) حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا انتقال طائف میں ہوا، جنازہ تیار ہونے کے بعد ایک عجیب وغریب پرندہ (کہ اس جیسا پرندہ کبھی نہیں دیکھا گیا تھا) نعش میں داخل ہو گیا، پھر کسی نے اس کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، جس وقت نعش قبر میں رکھی گئی تو قبر کے کنارے سے ایک غیبی آواز نے یہ آیت پڑھی: ﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ سب لوگوں نے تلاش کیا کہ یہ کون پڑھ رہا ہے؟ لیکن کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

(۲) امام طبرانی نے کتاب العجائب میں اپنی سند سے قتادہ بن رزین بن ابی ہاشم سے ان کا اپنا واقعہ نقل کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہمیں بلادِ روم میں قید کر کے وہاں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا، اس کافر بادشاہ نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اس کا دین اختیار کریں اور جو اس سے انکار کرے گا اس کی گردن ماردی جائے گی، ہم چند آدمی تھے ان میں سے تین آدمی تو جان کے خوف سے مرتد ہو گئے اور بادشاہ کا دین اختیار کیا، جب چوتھا آدمی پیش ہوا تو اس نے اس بادشاہ کا دین (کفر) اختیار نہیں کیا اور اس کا انکار کیا، پس اس کا سر کاٹ کر ایک قریبی نہر میں ڈال دیا گیا، اس وقت تو وہ سر پانی کی تہ میں چلا گیا، اس کے بعد پانی کی سطح پر ابھر آیا اور ان لوگوں کی طرف دیکھ کر ان کا نام لے کر آواز دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ اس کے بعد پھر پانی میں غوطہ لگا کر غائب ہوا۔

جب یہ عجیب واقعہ سب حاضرین نے دیکھا اور سنا اور وہاں کے عیسائی یہ دیکھ کر اور سن کر تقریباً سب ہی مسلمان ہو گئے، اور بادشاہ کا تخت ہل گیا، وہ تین آدمی جو مرتد ہو گئے تھے پھر مسلمان ہو گئے، پھر خلیفہ ابو جعفر منصور نے ہم سب کو اس کی قید سے رہا کرایا۔ [معارف بحوالہ ابن کثیر]

حضرت علامہ حافظ ابن کثیر نے حافظ ابن عساکر کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ دعا مانگنے کی تلقین فرمائی: اللّٰهم إني اسألك نفساً بك مُطمئنةً تؤمن بلقائك و ترضى بقضائك و تقنع بعطائك۔ (اے اللہ پاک! میں تجھ سے نفس مطمئنہ کا سوال کرتا ہوں، جو تیری ملاقات پر ایمان رکھتا ہو، جو تیری قضاء پر راضی ہو اور جو تیری عطاء پر قانع ہو)۔ یہ نہایت اہم بابرکت دعا ہے، حضرت علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے الحزب الاعظم میں نقل کیا ہے، پس ہر وقت اس دعا کو پڑھنا بہت ضروری اور فائدہ مند

ہے، اور اس کے فیوض وبرکات کا حصول یقینی ہے۔

علامہ سید شریف جرجانی نے ''الرسالة'' میں نفس مطمئنہ کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کی ہے: النفس المطمئنه هي التي تنورت بنور القلب حتى تخلت عن صفاته المذمومة و تحلّت بالأخلاق الحميدة۔ (یعنی نفس مطمئنہ وہ ہے جو نور قلب سے منور ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کی صفاتِ مذمومہ فنا ہوجاتی ہیں، اور وہ صفات اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ ومزین ہوجاتا ہے)۔ پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ تمام احکامِ شریعت پر چلنا اس پر آسان ہوجاتا ہے، اور کسی بھی شرعی عمل پر تعب واضطراب محسوس نہیں کرتا، حتیٰ کی پوری شریعت اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سارے کے سارے اسی نفس مطمئنہ کے زیور سے آراستہ تھے۔ رضوان الله عليهم أجمعين

سُورَةُ الْبَلَدِ

مكية آياتها ۲۰ ركوعها ۱

سورۂ بلد مکی ہے، اس میں بیس (۲۰) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ البلد ہے، یہ لفظ اس کی پہلی آیت میں مذکور ہے، اسی سے نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے، اس کا نزول سورۂ ق کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت مبارکہ ایک رکوع، بیس (۲۰) آیتوں، بیاسی (۸۲) کلمات اور تین سو بیس (۳۲۰) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت اور اس سورت دونوں میں یہ مضمون مشترک ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال وافعال سے پورا باخبر ہے، اور کوئی عمل وکردار اس کے دائرۂ علم سے باہر نہیں، نیز اطعامِ مساکین ویتیم وغیرہ کا دونوں سورتوں میں یکساں تذکرہ ہے، نیز فرمانبردار اور نافرمان لوگوں کا ذکر بھی ایک جیسا ہے، مزید یہ کہ معاندین پر گرفت کا بیان بھی دونوں جگہ مذکور ہے۔

مختصر مضامین:

﴿اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی﴾ مطالبِ عالیہ کی تشریح کے طور پر انسان کو تنبیہ کی جارہی ہے اور قسم کھا کر اسے بتایا جارہا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اور وہ انسان کے جسمانی اور روحانی دونوں فطری تقاضوں کی تکمیل پر یکساں توجہ مبذول کرتا ہے، نہ وہ انسان کو مادی لذتوں اور دینوی عیش وعشرت میں کھو جانے اور سرتاپا منہمک رہنے کی اجازت دیتا ہے، اور نہ اس سے کلیۃً قطع تعلق کر کے صرف روحانی اقدار و لطافتوں میں محو ہوجانے کی تلقین کرتا ہے۔

اس سورت میں ان اعضاء وجوارح کا ذکر کرنے کے بعد جو انسان کو اپنی استعداد اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مرحمت فرمائے گئے ہیں اسے بیدار اور تنبیہ کی جارہی ہے کہ تجھے عقاب وشہباز کی قوتِ پرواز اور بلندیوں پر چڑھنے کی صلاحیت دی گئی ہے، اس پر چلتے ہوئے تمہارا فرض ہے کہ اخلاقِ حمیدہ وصفاتِ جلیلہ کی بلندیوں کو سر کرنے کے لیے کوشاں رہو، اور اپنا لوہا منوالو! اور تمام پستیوں کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر ایوانِ افلاک کے کنگروں پر ہاتھ ڈالو، اس مقام تک پہنچنے کے لیے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے انہیں بطیب خاطر قبول و مہیا کرو، مثلاً:

اقرارِ توحید، اخلاص، غلاموں کو آزاد کرنا، اطعامِ مساکین، یتیموں اور محتاجوں کی سرپرستی اور ان پر شفقت اور صبر کرنا، دوسروں کو ایسے اعمال کی ترغیب و رغبت دلانا، اللہ تعالیٰ کی بندگی اور ایمان کے چراغ کو روشن رکھنا، یہ سارے اعمال صلاح اور فلاح والے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے ہیں، بصورت دیگر کفر وشرک اور ناشکری و کنجوسی وغیرہ کا انجام نہایت تلخ اور اندوہناک عذاب جہنم کا پیش خیمہ ہی ہوگا۔ نعوذ باللہ

دلا تا کے درین کاخ مجازی
کنی مانند طفلان خاکبازی
بیفشان بال و پر ز آمیزش خاک
بپر تا کنگر ایوان افلاک

جامی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ (۱) وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ (۲) وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (۳) لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ
فِیۡ كَبَدٍ (۴) اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ اَحَدٌ (۵) یَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ مَالًا لُّبَدًا (۶) اَیَحۡسَبُ اَنۡ
لَّمۡ یَرَهٗۤ اَحَدٌ (۷) اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَیۡنَیۡنِ (۸) وَلِسَانًا وَّشَفَتَیۡنِ (۹) وَهَدَیۡنٰهُ النَّجۡدَیۡنِ (۱۰) فَلَا
اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ (۱۱) وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ (۱۲) فَكُّ رَقَبَةٍ (۱۳) اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ (۱۴)
یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ (۱۵) اَوۡ مِسۡكِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ (۱۶) ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ
وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ (۱۷) اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَةِ (۱۸) وَالَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا هُمۡ اَصۡحٰبُ
الۡمَشۡـَٔمَةِ (۱۹) عَلَیۡهِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَةٌ (۲۰)

ترجمہ: میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی (۱) حالانکہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں (۲) اور قسم ہے باپ کی اور اس کی اولاد کی (۳) کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے (۴) کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کوئی قابو پا نہ سکے گا (۵) وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا ہے (۶) کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا ہی نہیں (۷) کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں (۸) اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے (۹) اور اس کو دونوں واضح راستے بھی دکھا دئے (۱۰) پھر بھی وہ گھاٹی میں داخل نہ ہوا (۱۱) اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی کیا ہے؟ (۱۲) گردن چھڑا دینا ہے (۱۳) یا فاقہ کے دن کھانا کھلانا (۱۴) کسی یتیم رشتہ دار کو (۱۵) یا کسی خاک نشین محتاج کو (۱۶) پھر وہ ان لوگوں میں سے ہوتا جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی تاکید اور رحم کی تاکید کرتے رہے (۱۷) وہی لوگ بڑے خوش نصیب دائیں ہاتھ والے ہیں (۱۸) اور جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ بدبخت بائیں ہاتھ والے ہیں (۱۹) ان پر آگ بند کردی جائے گی (۲۰)۔

معارف ومنازل

لغات:

نَجد کے معنی بلندی اور وقوت کے ہیں، یعنی ہدایت وضلالت کے روشن راستے جن کے سمجھنے اور ان پر چلنے میں کوئی ابہام وخفاء نہ ہو۔ یہ معنی جمہور علماء کے نزدیک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نَجۡدَیۡنِ سے مراد ماں کی چھاتیاں (پستان) ہی ہیں۔ [مظهري] لیکن مشہور معنی وہی ہے جسے جمہور نے بیان فرمایا۔

﴿مَقْرَبَةٍ﴾ قریبی رشتہ دار۔﴿مَسْغَبَةٍ﴾ تھکاوٹ کے ساتھ بھوک۔﴿مَتْرَبَةٍ﴾ تراب، مٹی میں پڑا ہوا فقیر، خاک آلود، یہ تینوں مصدر میمی ہیں۔﴿عَقَبَةَ﴾ دشوار گزار پہاڑی راستہ، یا وہ راستہ جو پہاڑ کی بلندی کی طرف جاتا ہو اور اسی کے ساتھ دو پہاڑیوں کے درمیان گھاٹی، جس میں آدمی دشمن سے چھپ کر پناہ لے لے۔

یہ حرف لَآ عموماً مخاطب کے خیالِ باطل کی تردید کے لیے قسم کے شروع میں لایا جاتا ہے، یعنی اے کفار مکہ! جو باطل عقیدہ اور بے سروپا خیالی تم نے باندھ رکھا ہے وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

﴿الْبَلَدِ﴾ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ کلمہ ''هٰذَا'' سے اسی کی طرف اشارہ ہے، جیسے کہ سورۃ التین میں ﴿وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ﴾ [التین:۳] (اور اس امن والے شہر کی قسم) سے مراد بھی ''مکہ مکرمہ'' ہے، جہاں کعبۃ اللہ شریف موجود اور جلوہ افروز ہے۔

بلدِ امین کی قسم کھانے کا راز:

مکہ مکرمہ اور والد و ولد کی جو قسمیں کھائی گئی ہیں اور اس کا جواب ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ [التین:۴] (یقیناً ہم نے انسان کو بہترین ڈھانچے میں پیدا کیا ہے) ہے۔ مناسبت یہ ہے کہ مکہ مکرمہ پر قسم جو کھائی گئی ہے وہ اس لئے کہ مکہ مکرمہ تمام روئے زمین کی اصل ہے، یہیں سے زمین پھیلائی گئی ہے، اور زمین سے انسان پیدا ہوا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی اور اس کی نسل (تمام اولاد) کی قیامت تک پیدائش مٹی سے ہے، یہ سورۃ الجن کی تفسیر میں پہلے بیان ہوا۔

مشقتوں اور برکتوں کی سرزمین:

حاصل یہ ہے کہ سرزمین مکہ مکرمہ انسان کے لیے اصل الاصول اور بنیاد ہے، اور چند وجوہات کی بنا پر یہ شہر انسانوں کے لیے مشقتوں اور برکتوں کا مرکز ہے:

(۱) سرزمین مکہ، وادی غیر ذی زرع، پہاڑوں، ریگستانوں اور سنگلاخوں پر واقع ہے، جہاں کوئی کھیتی اور زراعت نہیں ہوتی، زیرزمین پانی نہایت گہرائی میں ہے، اور قابل استعمال بھی نہیں، عرصہ دراز تک لوگوں کا گزارہ آب زمزم ہی سے رہا، حتیٰ کہ خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی حضرت زبیدہؒ نے اپنے خرچ سے ''نہر زبیدہ'' بنا کر طائف کے پہاڑوں سے عرفات، مزدلفہ اور منیٰ سے ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ کے لوگوں اور حجاج کے لیے پانی کا بندوبست کیا، جس کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔

(۲) مکہ مکرمہ کی گرمی نہایت سخت نا قابل برداشت رہی ہے، اسی وجہ سے عام طور پر عیاش لوگوں نے کبھی وہاں کا رخ نہیں کیا، اور قدیم زمانے میں کسی عیاش بادشاہ نے اسے فتح کر کے وہاں حکومت کرنے کا ارادہ بھی نہیں کیا، اور ہمیشہ بادشاہوں کے دست وبرد سے آزاد رہا، اسی وجہ سے عتیق کہلائے جانے لگا۔

(۳) پہلے کی طرح موجودہ زمانے میں بھی جو لوگ سال بھر حج وعمرہ کے لیے جاتے ہیں وہ مسلسل محنت و مشقت میں رہتے ہیں۔

(۴) بعثت نبوی کے ساتھ مسلمانوں پر جو ظلم وتعدی وہاں کے مشرکوں نے روا رکھی وہ اتنے جانگداز اور پریشان کن ہیں کہ تاریخ کے اوراق انہیں برداشت کرنے سے قاصر ہیں، ان اسباب مشقت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے شہر مکہ مکرمہ کی قسم کھا کر اس کی عظمت وشرافت اور عالمگیر افضلیت وحرمت کا اظہار فرمایا۔

سرزمین مکہ کی عظمت وشرافت:

پوری روئے زمین میں ایسا کوئی مقام وشہر نہیں جو مکہ مکرمہ کے برابر ہو، اس کے وجوہ واسباب میں سے چند یہ ہیں:

(۱) وہاں بیت اللہ شریف ہے، جس پر روزانہ عرش الٰہی سے تجلیات وانوار کا نزول ہوتا ہے۔

(۲) جہاں روزانہ ایک سو بیس رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، ساٹھ رحمتیں طواف کرنے والوں کے لیے، چالیس نمازیوں کے لیے اور بیس صرف نظارہ کرنے والوں کے لیے۔

(۳) وہ مقام امن ہے، ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ [آل عمران:۹۷] (اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن میں ہوگا)۔

(۴) وہ مرجع خلائق ہے، سالانہ لاکھوں مسلمان بغرض حج وعمرہ دنیا کے مختلف کونوں سے کشاں کشاں وہاں پہنچتے ہیں، اور وہاں کی حاضری کو سعادت سمجھتے ہیں۔

(۵) یہ تمام روئے زمین کے وسط (ناف) پر واقع ہے، اور عالم اسلام کا قبلہ ہے۔ ہزاروں میل دور سے نمازوں میں مکہ کی سمت رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور بول وبراز واستنجاء کے موقعوں پر احتراماً وہاں منہ کرنے سے اجتناب کرتے ہیں، بلکہ سوتے وقت وہاں پاؤں پھیلانے کو بھی ناجائز کہتے ہیں۔

(۶) وہ پوری دنیا کی سب سے پہلی بناء ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا﴾

[آل عمران:٩٦] (بیشک وہ پہلا گھر جس کو لوگوں کے لیے رکھا گیا ہے مکہ میں ہے برکت والا)۔

(۷) وہاں مقامِ ابراہیم واقع ہے۔(۸) وہاں زمزم ہے جس کی فضیلت حوضِ کوثر سے زیادہ ہے۔

(۹) وہاں جنت کا مبارک پتھر "حجرِ اسود" ہے۔(۱۰) وہاں صفا و مروہ اور جبل ابوقبیس ہیں۔

(۱۱) وہاں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش ہے۔(۱۲) وہاں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقام ہے۔(۱۳) وہاں نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، اور چھیاسی (۸۶) سورتیں مکہ شریف میں نازل ہوئیں۔(۱۴) وہاں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے ثواب کے برابر ہے۔

(۱۵) جہاں ہر طرف سے سجدہ جائز ہے۔(۱۶) مکہ مکرمہ کو "اُم القریٰ" اس لئے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے یہی ٹکڑا پیدا ہوا، پھر اسی کو قدرت نے چاروں طرف پھیلا کر باقی زمین کی تخلیق فرمائی۔

(۱۷) یہاں کے درخت جڑی بوٹیاں قابل احترام ہیں، ان کے توڑنے اور قطع کرنے پر پابندی ہے۔

(۱۸) یہاں کا شکار ہر طرح ممنوع ہے۔(۱۹) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ستر کے قریب انبیاء کرام علیہم السلام مدفون ہیں۔(۲۰) یہاں قرب قیامت مسیح الدجال ملعون کا داخلہ ممنوع ہے۔ ان کے علاوہ دیگر بے شمار فضائل ومناقب وارد اور ثابت ہیں جو کہ تواریخ مکہ وغیرہ کتب میں مذکور ہیں۔

﴿وَاَنْتَ حِلٌّ﴾ حِل اگر حلول سے ہو جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ [فاطر:۳۵] (وہ ذات جس نے ہمیں اپنے فضل سے رہنے کے گھر میں اتارا) تو بمعنی "مقیم، و دخول، اتارنا" وغیرہ۔ ترجمہ میں اسی کو لیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مقیم ہیں، اہل مکہ ہر چند آپ سے عذاب کا مطالبہ کریں، مگر ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ﴾ [الأنفال:۳۳] (اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں سے تھے انہیں عذاب دیتا)۔

اس صورت میں عذاب مانگنے والوں کا جواب ہوگا، اور اس کے ساتھ یہ معنی بھی ہوگا کہ مکہ مکرمہ کا شرف و عظمت آپ کے ہوتے ہوئے مزید زیادہ ہوگا، کیونکہ شرف مکان مکین کے شرف کے ساتھ زیادہ ہوتا ہی ہے، جیسے کہ ایک شعر میں اس کی وضاحت ہے: ؎

گفت معشوقے بعاشق اے فتا ☆ تو بغربت دیدۂ بس شہرہا
پس کدامین شہر زین ہا خوشتر ہست ☆ گفت آن شہرے کہ در وے دلبر ست

مکہ مکرمہ کے فضائل ہیں ہی بے شمار، مگر جب سید الاوّلین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم وہاں فروکش ہوں تو سونے پر سہاگہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجسم رحمت اور تمام حسین وخوبانِ عالم کے سردار ہیں، تو خلاصہ یہی ہوگا کہ جس چیز (مکہ مکرمہ) پر قسم کھائی گئی ہے وہ بھی عظیم اور آپ بھی عظیم، ان دونوں عظمتوں کے ہوتے ہوئے کوئی عذاب نازل نہیں ہوسکتا، بلکہ ان مشرکین کا عذاب و پکڑ مکہ مکرمہ کی سرزمین سے باہر میدانِ بدر میں ہوگا۔

حِلٌّ کا دوسرا مطلب ''حلت'' ہے جو کہ حرام کی ضد ہے، اس کے دو معنی ہوں گے:

(۱) یہ کہ کفار مکہ خود قائل ہیں کہ اس شہر میں ہر قسم کی ظلم و زیادتی حرام ہے، حتی کہ وہ یہاں کے شکار اور درختوں اور بوٹیوں کے قطع و برید کو حرام سمجھتے ہیں، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انہوں نے جو ظلم و ستم روا رکھا ہے، یہ انصاف اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے سراسر خلاف ہے، اس سے ان کے عقائد و نظریات کی کھلم کھلا نفی ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقدس حرم کی پاسبانی کے اہل نہیں ہیں اور اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔

(۲) حلت کا دوسرا معنی یہ ہوگا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہوگی کہ کسی زمانے میں حرمِ مکہ کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختصر وقت کے لیے قتال و جہاد کی اجازت ہوگی اور یہ قتال و جہاد بنظرِ ضرورت آپ کے لیے حلال ہوگا اور حرم کی حرمت مختصر وقت کے لیے موقوف ہوگی، جب فتح مکہ مکمل ہوگا پھر دوبارہ اس کی حرمت عود کر قیامت تک کے لیے برقرار ہوگی۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ ایک قرآنی پیشینگوئی ہوگی، جو بعد میں مکمل ہوگئی، اس آخری توجیہ کو اکثر اہل علم نے ترجیح دی ہے۔

﴿وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ﴾ اور باپ (یعنی آدم) اور اس کی اولاد کی قسم۔ وَالِدٍ سے حضرت آدم علیہ السلام مراد ہوں، اور مَا وَلَدَ سے قیامت تک آنے والی اس کی نسل مراد ہوں، یا مکہ مکرمہ کے ذکر کے ساتھ جو مناسبت ہے اور وَاَنْتَ حِلٌّ کے متصل بیان کا جو تقاضا ہے، نیز اہل مکہ جو خود کو اولاد ابراہیم علیہ السلام کہتے تھے، ان تینوں باتوں سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ وَالِدٍ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام معمار کعبۃ اللہ مراد ہوں، اور مَا وَلَدَ سے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہوں، جس کی طرف وَاَنْتَ حِلٌّ سے اشارہ ہے۔ رہا قریش، وہ اپنی نافرمانی کی وجہ سے یہاں سے خارج شمار ہوں گے، اور وہ لوگ کسی صورت اولاد ابراہیم میں شامل نہیں ہوں گے۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر از بر ہو ☆ پھر پسر وارث میراث پدر کیونکر ہو

(اقبالؒ)

جس کعبۃ اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید واخلاص کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی عظمت وتوحید کا گہوارہ بنایا تھا، مشرکین مکہ اور قریش کے نافرماں اور نالائق لوگوں نے اس کو تین سو ساٹھ بے جان بتوں سے بھر دیا، وہ کس منہ سے ابراہیم علیہ السلام کی نسل اور اولاد ہونے کا دعویدار ہو سکتے ہیں؟ حضرت باری تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا: ﴿يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ [ھود:۴۶] (اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں نہیں، بیشک اس کے کام بڑے نالائق ہیں) یہی جواب مشرکین مکہ پر حرف بحرف صادق ومنطبق ہے۔ واللہ اعلم

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ بیشک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابتداء حمل سے لے کر تا موت انسانی زندگی کے تمام اطوار طبقاً عن طبقٍ طرح طرح کی محنتوں اور مشقتوں کی نذر رہے، اگر چہ ان مشقتوں میں سارے حیوانات بھی انسان کے شریک ہیں، مگر قیامت کے حساب وکتاب وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ مٹی ہو جائیں گے، اور انسانی مشقتوں کا اختتام نہیں ہوگا۔ اکثریت جہنم کا ایندھن بنے گی، اور اقلیت جہنم سے نجات پا کر جنتوں میں داخل ہو جائے گی، یہی ہر زمانہ میں واضح طور پر دیکھا گیا ہے کہ اہل توحید اور ایماندار لوگ اقلیت میں ہوتے ہیں، اور کفار وفجار کی اکثریت ہوتی ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ قیامت کے روز حق سبحانہ وتعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے ارشاد فرمائیں گے: أخرج بعث النار (اے آدم! اپنی اولاد میں سے جہنم کا حصہ الگ کرو!) حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے: یارب! جہنم کا حصہ کیا ہے اور کتنا ہے؟ ارشاد ہوگا: ہزار میں سے نوسو ننانوے جہنم کا حصہ ہوگا، باقی جنت کا ایک حصہ ہوگا۔ [بخاری] دوزخیوں کو جنتیوں سے الگ کردو! وہ عرض کریں گے: یہ کیسے ہوگا؟ ارشاد ہوگا: ہزار میں سے جنت کے لیے ایک، دوزخ کے لیے نوسو ننانوے۔ الحدیث یہاں سے اندازہ ہوگا کہ جہنمی نہایت کثرت میں ہوں گے اور جنتی نہایت قلت میں۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

﴿اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ﴾ کیا نافرمان انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پاسکے گا۔ اکثر منکرین، جہال ومعاندین اسی غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی میں آزاد ہیں، ہم سے کوئی پوچھ گچھ اور سوال وجواب نہیں ہوگا، جب وہ بعد از موت زندگی اور قیامت پر یقین نہیں رکھتے ہیں، یا عیسائیوں یہودیوں کی طرح کفارہ پر یقین کرتے ہیں تو وہ اسی گھمنڈ میں مبتلا رہتے ہیں۔

﴿يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال فنا کر دیا۔ یہ نافرماں منکر حشر ونشر اور منکر

حساب وکتاب جوفخر وغرور کے ساتھ کہتا رہتا ہے کہ وہ اور لوگ تھے جو ہلاک کئے گئے ہیں، میں نے تو بہت مال خرچ کر کے اپنی حفاظت کے لیے تمام ممکنہ تدابیر، اسباب، وسائل اور اسلحہ جمع کیا ہے، میں کسی طرح بے یارومددگار نہیں رہوں گا، وہ اپنی فضول خرچیوں پر شاداں وغرہ ہے، اور یہ نہیں سوچتا کہ یہ مال مجھے اللہ پاک نے امتحان وابتلاء میں ڈال کر عنایت کیا ہوا ہے اور ایک دن مجھ سے باز پرس ہوگی کہ تمہارے پڑوس میں صدہا غریب، نادار، بیمار، محتاج، ضروریات زندگی کے لیے علاج ومعالجہ، پیٹ بھرنے، ستر چھپانے کے لیے ترستے رہتے تھے، اور تو نے ان کی طرف التفات تک نہیں کیا، اور اپنے نام ونمود کی خاطر غلط راستوں پر، دعوتوں پر، شادی بیاہ اور منگنیوں پر لاکھوں روپے پانی کی طرح بہاتا رہا، تجھے یہ خیال نہ آیا کہ یہ سب کچھ ربّ العزّت کا دیا ہوا انعام وروزی ہے، اس کے ذریعہ محتاجوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کروں، انہیں راضی کر کے ربّ العزّت کی رضاء وخوشنودی حاصل کروں، اور ابدی جنتوں کا وارث بنوں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہت سے لوگ دنیا میں خوشحالی اور ٹاٹھ باٹ مین زندگی گزار رہے ہوں گے، جبکہ بے عملی کی وجہ سے آخرت میں ننگے، بے ستر اور فاقہ کشی کا شکار رہیں گے، "رب كاسية في الدنيا عارية في الآخرة"۔ [بخاري] اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کیلئے حد مقرر کی ہے، جس سے تجاوز کرنا حرام ہے۔

آگے اس ناشکر انسان کو تنبیہ کی جارہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے عظیم وبے بہا اور بے بدل نعمتیں جو انہیں مفت بلا قیمت عطا فرمائی ہیں اگر وہ ان نعمتوں کی قدردانی کرے گا تو سو فیصد کامیاب ہوگا، ورنہ ابدی خوار وتباہ رہے گا۔

﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ﴾ کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے؟ اوپر کی آیات میں انسان کو اس کی غفلت پر تنبیہ تھی کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس پر حق تعالیٰ کو بھی قدرت نہیں، اور اس کے اعمال بد کو کوئی دیکھنے والا نہیں، وہ ہر طرح سے آزاد ہے، اس پر کوئی گرفت کرنے والا اور حساب لینے والا نہیں، وہ ہر قسم کے مؤاخذہ سے بالاتر ہے۔

چند عظیم نعمتیں:

مذکورہ دو آیتوں میں چند ایسی عظیم نعمتوں کا ذکر ہے کہ اگر یہ غافل وناعاقبت اندیش انسان ان ہی میں غور وفکر کرے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی بے مثال صنعت وحکمت، جود، وکرامت اور قدرت ورحمت کا نظارہ ومشاہدہ کھلی آنکھوں ظاہر ہو جائے۔

ان میں اول دو آنکھوں کا ذکر فرمایا، یہ پسندیدہ بادامی آنکھیں کیا ہیں؟ سارا جہاں ایک طرف اور یہ روشن آنکھیں ایک طرف، ایک ہی لحہ میں، ایک سیکنڈ میں ان کی رفتار آسمانوں تک پہنچتی ہے۔

ہر ایک آنکھ میں بارہ کروڑ بلب کی روشنی کی رو (طاقت بینائی) رکھی ہوئی ہے، جبکہ دونوں کی قوت بینائی کی روشنی چوبیس کروڑ بلب کے ساتھ برابر ہے، پھر آنکھ کے نازک پردے، نازک شرائین (رگیں) ان میں قدرتی روشنی، پھر ان کی بناوٹ وضع وہیئت اوران کی حفاظت کا سامانِ نگہداشت، پپوٹوں اور پلکوں کے ذریعہ جو خودکار (آٹو میٹک) مشین کی طرح آنکھوں کی ہمہ وقت حفاظت میں مصروف ہیں، جب کوئی ضرر رساں چیز سامنے آتی ہے تو یہ پردے بلا ارادہ وبلا اختیار خود بخود آنکھوں کو چھپالیتے ہیں، پلکوں کے بال ہر قسم کے گرد وغبار اور تنکوں سے آنکھوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

آنکھوں کے اوپر بھوؤں کے بال محافظ بھی ہیں اور سرمایۂ حسن وجمال بھی، تاکہ اوپر سے آنے والی چیز براہ راست آنکھوں میں داخل نہ ہو، پھر ان کو چہرہ میں اس طرح خوبصورتی کے ساتھ فٹ کیا گیا کہ ان کے چاروں طرف سے ہڈیوں کا ایک ایسا دائرہ بنادیا گیا کہ اگر انسان چہرے کے بل گرجائے، یا اس کے چہرہ پر کوئی چیز آپڑے، تو اوپر نیچے کی ہڈیاں آنکھوں کی محافظ بن کر انہیں نقصان سے بچائیں۔

اگر کوئی شخص سارے جہاں کے روشن ضمیر، دردمند وہمدرد، بادشاہ، امراء، سلاطین، سرمایہ دار، اغنیاء، روساء، اصحاب، احباب، انجینئر، دوست، اطباء، ڈاکٹر ورحماء اور رفقاء سے صرف ایک نصف آنکھ کی درخواست کرے اور زندگی بھر ان کی خدمت وغلامی اور کفش برداری کا عہد کرے، تو کیا اس کی حاجت برآری ہوسکتی ہے؟ اور کوئی اس پر قدرت رکھتا ہے؟ ربّ العزّت سبحانہ کے بے پایاں اور نہ ختم ہونے والے خزائن اتنے وسیع ہیں اور وہ قادر مطلق کتنا مہربان رحیم وکریم ہے کہ اشرف المخلوقات انسان تو درکنار ربّ العزّت نے ان دو آنکھوں کی دولت سے سارے حیوانات، چرند پرند، کیڑے مکوڑے، سب مخلوقات کو نوازا ہے، اور بعض جانوروں کو وہ خوبصورت تیز اور روشن آنکھیں عنایت کی ہیں کہ جن کے نظارے سے کوئی سیر نہیں ہوتا۔

﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ﴾ کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں نہ بنائیں۔ جس عظیم نعمت کو جتلایا جارہا ہے یہ کیا ہیں؟ یہ گدھے، کتے، گائے اور بھینس کی آنکھیں نہیں، جو محض اپنی خوراک کے لیے تڑپ رہے ہیں، یہ انسانی آنکھیں ہیں، یہ وہ حقیقت شناس آنکھیں ہیں جن کی رسائی ملک وملکوت کی وسعتوں کو پار کر کے پوری کائنات سے

آگے گزر کر عالم آخرت کے مشاہدے تک پہنچتی ہیں خوب سمجھنا چاہیے۔

قرآن حکیم نے چشمِ نابینا کے متعلق یوں فرمایا: ﴿وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا﴾ [الإسراء: ۷۲] (اور جو شخص اس (دنیا) میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا، اور (نجات کے راستے سے بہت دور)۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾ [طٰه: ۱۲۴] (اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا اس کی زندگی تنگ ہوجائے گی، اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے)۔

این دو چشم مورو مارے نازنین ☆ کے نگاہ دارد ز راز بالیقین

چشم فرعون است سیاہ و سرمہ گین ☆ چشم ساحر راز دار حق بہ بین

فرعون کی آنکھیں اگرچہ بینا اور زنگ آلود اور سرگین رہیں، مگر معرفتِ حق سے نا آشنا اور سیاہ رہیں۔ جادوگروں کی آنکھیں گرد وغبار میں اگرچہ بے رونق وسیاہ رہیں، مگر معرفتِ حق میں روشن اور بینا رہیں، چشمِ حق بین متقین کے ساتھ مخصوص ہیں، چیونٹی اور سانپ کی آنکھیں خوبصورتی کے باوجود معرفتِ حق سے خالی اور نابینا ہیں۔

دوسری چیز زبان ہے، یہ مخروطی گوشت کا ایک لمبا لوتھڑا ہے، جو کہ تمام حیوانات کو حاصل ہے، مگر حیوانات صرف اسے کھانے پینے کے لیے استعمال کرتے ہیں، قوتِ گویائی انہیں حاصل نہیں، یہ قوتِ گویائی ایک لطیفۂ ربانی اور برقی قوتِ جاذبہ ہے جو کہ اشرف المخلوقات کا خاصہ ہے، اور اس کے مکلف ہونے و بلوغ الی المقاصد کا راز دان اور علتِ تامہ ہے، یہ زبان ایک عجیب وغریب عضو ہے، یہ قلب و دماغ کا صحیح ترجمان ہے، تمام راز و نیاز اسی کے ذریعہ افشاں ظاہر ہوتے ہیں، یہ نفع ونقصان، خوشیوں، غموں، کامیابیوں، ناکامیوں کا خزانہ ہے، اگر صحیح استعمال ہو تو گنجینۂ رحمت ہے، غلط استعمال ہو تو مجموعۂ نفرت وعذاب ہے۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں بڑی تفصیل کے ساتھ آفات اللسان پر کلام کیا ہے، فلیراجع۔

انسان اگر اس پر اسرار اور خود کار مشین پر صحیح غور کرے تو یہ حیرت انگیز عضو قدرت وحکمت کا ایک بے مثال شاہکار معلوم ہوتا ہے، جب دل میں ایک خیال یا مضمون پیدا ہوا، دماغ نے اس پر غور کیا اس کے لیے عنوان والفاظ تیار کیے اور وہ عنوان والفاظ زبان سے نکلنے شروع ہوئے، اب دونوں نے آپس میں موافقت کی تو دماغ القاء کرتا رہتا ہے، اور زبان گھنٹوں تک مسلسل ترجمانی کرتی رہتی ہے، بسا اوقات یہ سلسلہ آٹھ دس گھنٹوں تک بغیر کسی وقفے کے

مسلسل جاری رہتا ہے، پھر سامعین کے پاس جو قوت سماعت قدرت نے ودیعت کی ہے، وہ سنتے رہتے ہیں، اور قلب ودماغ کے اشتراک سے یاد کرتے رہتے ہیں، ادھر سے بڑی سرعت وتیزی سے غور وفکر کے تعاون سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ تکلم وتلفظ ہو رہا ہے، ادھر افہام وتفہیم کے ساتھ ساتھ سماعت کا میدان گرم رہا ہے، اور ساتھ قوتِ حافظہ ومدرکہ میں ریکارڈ ہو رہا ہے۔ **فسبحان اللطیف الخبیر عزّ مجدہٗ**

یہاں مخفی اور پوشیدہ مشینوں کی رفتار اور کارگزاری قابلِ غور ومطالعہ ہے کہ بغیر گیس وتیل اور مصنوعی بجلی کے اور بغیر کسی پانی ودوسرے لوازمات کے اور بغیر کسی بجلی یا بیٹری چارجر کے ہر شخص کے پاس مفت بغیر تجارت وخرید کے یہ ساری مشینیں شب وروز ہر محاذ پر اپنے کام میں بلا روک وبندش محوسفر اور رواں دواں ہیں، پھر بھی ناشکرا انسان تخلیق وحکمت ربی سے منحرف اور بے خبر ہے، اس لئے تو وہ حیوانوں سے بدتر اور ابدی جہنمی ہے۔

تیسری چیز شَفَتَيْنِ ہیں کہ وہ صرف زبان کے چوکیدار نہیں، بلکہ تمام اشیاء خوردنی، ماکولات ومشروبات کے لیے معاون ومددگار ہیں۔ انسانی آواز حروف کے اشکال وترتیب وامتیاز سب ہی انہیں ہونٹوں کے مرہونِ منت ہیں، اور اسی کے ساتھ وہ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کے حصے ہیں، جہاں حسن وخوبصورتی اپنی نزاکتوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کرتی ہے، جہاں خوبصورت آنکھیں، شائستہ زبان میدانِ حسن میں قدم رکھتی ہیں، وہاں یہ سرخ کاغذی ہونٹ بھی میدان اور میلہ جیتنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں، اگر یہ ہونٹ نہ ہوں تو زبان بیکار ہوکر کسی گویائی پر قدرت حاصل نہیں کرسکتی، تجربہ شرط ہے۔

دراصل یہ زبان اور ہونٹ لازم وملزوم ہیں، انہیں کے اشتراک سے کلمہ طیبہ کا ورد جاری ہوتا ہے، جو کہ سبب حیات جاودانی ہے، اور انہیں کے اشتراک سے کلمہ کفر بھی وابستہ ہے، جو کہ شقاوت اور سبب ہلاکت ہے، ﴿ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ [الأعلى: ۱۳] (پھر وہاں نہ مرے گا اور نہ جئے گا)۔ فقہا کرام نے بعض مسائل میں جو اشارات کا اعتبار نہیں کرتے، بلکہ تلفظ کو لازمی شرط قرار دیتے ہیں، مثلاً: بیع وشراء، نکاح وطلاق، عتق وغیرہ، ان کی بنیاد بھی یہی ہے، گویا انسانی عروج وزوال انہی چیزوں پر موقوف ہے۔

سو سال کی دوستی اور صدیوں کی دشمنی اسی زبان وہونٹوں کی حرکت دینے سے بدل جاتی ہیں، جنت ودوزخ کی خرید ہو یا ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ کی رضا وسخط ہو دونوں کی چابی یہی عضو مخصوص ہے، تلاوت کلام اللہ ہو یا نماز واذکار ہوں، سب اسی پر موقوف ہیں، اسی بناء پر فقہاء کرام نے نماز میں تلفظ بالقراءت کو لازم قرار دیا ہے، اور دل دل

میں قراءت کو کافی نہیں سمجھتے۔ علماء کرام کہتے ہیں کہ زبان غیر محتاط رہتی ہے اور ضرورت سے زیادہ بولنے کی عادی ہے، کہیں لمحوں میں بیڑا غرق نہ کرے، اس لئے ربّ العزّت نے اس پر ہونٹوں کی روک لگائی اور بتیس دانتوں کا ہر طرف سے اس پر نگہبان و پہرہ دار بٹھادیا تاکہ اس پر ایک حد تک کنٹرول ہو۔

حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ نجات کس چیز میں ہے؟ ارشاد فرمایا: اپنی زبان بند کرلو اور اپنے گھر میں گوشہ نشینی اختیار کرو اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔ [ترمذي]

علماء کرام فرماتے ہیں: زبان ایک سانپ ہے اور انسان کا منہ اس کا سوراخ اور بل ہے، اگر یہ زبان سوراخ میں رہے تو سلامتی ہے، اگر باہر آیا تو ڈسنے اور تباہ کرنے کا خطرہ ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر معالم میں لکھا ہے کہ حدیث میں حضرت باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے ابن آدم! اگر تیری زبان تجھ سے ناجائز باتوں کے لیے کشاکش کرے، تو میں نے اس کے خلاف تیری مدد کے لیے دو ڈھکن (ہونٹ) تجھے دیدیئے ہیں، تو اسے ان ڈھکنوں میں بند کردے اور ناجائز بولنے سے پرہیز کرے، اگر تیری نگاہ تجھے ناجائز چیزوں کی طرف کھینچے تو میں نے تیری مدد کے لیے دو غلاف دیدیئے ہیں، تو ان غلافوں میں انہیں بند کردے اور غلط دیکھنے سے پرہیز کرے اور اگر تیری شرمگاہ تجھے ناجائز امور کی طرف لے جانا چاہے تو میں نے اس کے مقابلے میں تجھ کو دو پردے (پیر) دیدیئے ہیں، ان کے درمیان اس کو قید کردے۔ [مظهري]

جیسے دنیوی بادشاہوں، امیروں اور سرداروں کے ترجمان ہوتے ہیں، جو ان کی بات اور فرامین لوگوں تک پہنچاتے ہیں، اسی طرح زبان سلطان البدن دل کا ترجمان ہے، پھر جیسا بادشاہ ویسا ترجمان، دل اگر صحیح اور نیک ہوگا تو اس کا ترجمان بھی صحیح ترجمانی کرے گا، اور ہمیشہ درفشانی حکمت واخلاص کی گویائی میں مصروف ہوگا، اگر قلب مریض آفت زدہ ہوگا تو ترجمان بدگوئی اور نامناسب غلط باتوں کا اظہار کرے گا، یہ فرق ہر جگہ معلوم ہوتا رہے گا۔

﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ ہم نے اس کو خیر وشر، نفع ونقصان، ہدایت وضلالت اسی طرح جنت ودوزخ کے دونوں راستے بتادیئے۔ عام مفسرین حضرات نے یہی تفسیر بتادی ہے، اور یہی معنی عام بھی ہیں اور مشہور بھی، جب اللہ تعالیٰ شانہ نے تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں سے انسان کو نوازا، پھر عقل وعلم، قوت گویائی اور استعداد تامہ عنایت کی ہے تو جو چاہیئے تھا کہ وہ صراط مستقیم کا ازخود انتخاب کرکے شکر گزار بندوں میں شامل ہوجاتا، مگر وہ ایسا نہ کرسکا، تو مزید اس کی دستگیری فرماتے ہوئے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے اور آسمانی کتابیں نازل کیں، تاکہ اس ظلوم وجہول

اور دور افتادہ انسان کو راہ راست پر لانے کا سامان مہیا ہو، تو ان معالجین نے انہیں حصولِ صحت و ایمان کے لیے خیر و نیکی کے علاج بتادیئے، اور مضر صحت کفر و فجور سے پرہیز کا راستہ بھی بتلایا، پھر اتمامِ حجت کر کے اسے اس کے اپنے اختیار و صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

مزید برآں اسے بے یار و مددگار نہیں رکھا بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے نائبین ''علماء کرام و مصلحین'' نے قیامِ قیامت تک سبق پڑھانے اور خیر و شر کے تمام راستوں کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھایا، جو کہ ہر محاذ پر جاری و ساری ہے۔

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ فَلَا میں بعض کے نزدیک لَا اپنے اصلی معنی (نفی) میں نہیں، بلکہ هَلَّا کے معنی میں ہے، کیونکہ جب تک تکرار نہ ہو لا ماضی پر نہیں آتا، اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں مال اس نے کیوں خرچ نہیں کیا کہ اس کے ذریعہ گھاٹی کو عبور کر لیتا (زندگی کی یا جنت کی یا طاعت کی گھاٹی) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں مال خرچ کرنے سے اطاعت رسول میں مال صرف کرنا اس کے لیے ہزار درجہ بہتر ہو جاتا۔

بعض علماء نے کہا کہ اس جگہ لَا اپنے معنی نفی پر ہے، لَا کا مدخول اگر چہ لفظاً مکرر نہیں مگر معنوی تعدد ضرور موجود ہے، کیونکہ عقبہ کے (مرادی) معنی میں تعدد موجود ہے۔

عقبہ سے تین چیزیں مراد ہیں: (۱) فک رقبہ (۲) اطعام مسکین (۳) مؤمن ہونا۔ اصل کلام یہ ہوگا: ''فَلَا فَكَّ رَقَبَةٍ وَلَا اَطْعَمَ مِسْكِيْنًا وَلَا كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' (نہ اس نے کسی غلام کی گلوخلاصی کی، نہ مسکین کو کھانا کھلایا اور نہ مؤمنوں میں سے ہوا)۔ اول الذکر تقدیر پر اس جملہ کا عطف ﴿اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ پر ہوگا، اور مؤخر الذکر تقدیر پر جواب قسم پر عطف ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا: ہم نے انسان کو اوامر اور نواہی کے دکھ میں پیدا کیا، مگر وہ تعمیلِ احکام کی گھاٹی میں داخل ہی نہیں ہوا، اور نہ اس نے اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کیا یا۔ اگر ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا﴾ کے مضمون پر عطف ہوگا تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اس کی آنکھیں زبان اور دونوں ہونٹ بنائے اور دو راستے بھی اس کو بتادیئے، مگر وہ طاعت کی راہ میں داخل ہی نہیں ہوا کہ ان نعمتوں کا صرف ان کے مصرف میں ہو جاتا اور منعمِ حقیقی کے انعام کا شکر کچھ ادا ہو جاتا۔

﴿عَقَبَة﴾ اصل لغت میں پہاڑی راستہ کو کہتے ہیں، اقتحام کے معنی گھسنا، (یہاں مراد ہے اوامر و نواہی کی پابندی کی مشقت برداشت کرنا)۔ قتادہ اور بعض علماء نے کہا کہ اقتحام سے مراد ہے گھاٹی کو پار کر لینا اور اداء

واجب سے عہدہ برآ ہو جانا، کیونکہ گناہگار پر گناہ کرنے کا بار اور اداء واجبات کی ذمہ داری پہاڑی گھاٹی کے مشابہ ہے اور فرائض مذکورہ کو ادا کرنا گھاٹی کو عبور کر لینے سے مشابہت رکھتا ہے۔ [مظهري]

اس جگہ طاعات وعبادات کو ایک عقبة سے تعبیر فرمایا ہے کہ جس طرح عقبة دشمن سے نجات دلانے کا سبب ہوتا ہے اسی طرح اعمالِ صالحہ آخرت کے عذاب سے نجات کا ذریعہ بنتے ہیں، پھر ان اعمالِ صالحہ میں پہلے فَكُّ رَقَبَةٍ فرمایا، یعنی کسی غلام کو آزاد کرنا کہ یہ بہت بڑی عبادت اور کارِ خیر ہے، نیز ایک انسان کی زندگی کو بنا دینا ہے۔

دوسری چیز اطعام ہے کہ بھوکے لوگوں کو کھلانا بڑا ثواب ہے، اور کھانا کھلانا کسی کو بھی ہو ثواب سے خالی نہیں، مگر بعض لوگوں کو کھلانے سے دہرا ثواب شمار ہوتا ہے، اس لئے اس بڑے، دہرے ثواب کو حاصل کرنے کے لئے فرمایا:

﴿يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴾ یتیم رشتہ دار کو یا فقیر خاکسار کو۔ یعنی خصوصاً جب کھانا کسی ایسے یتیم کو کھلایا جائے جس کے ساتھ قرابت ورشتہ داری بھی ہو، تو اس میں دوہرا ثواب ہو گیا، ایک یہ کہ بھوکے کا پیٹ بھرنا، دوم رشتہ دار کی صلہ رحمی اور حق قرابت ادا کرنا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کسی نے مسلمان غلام آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے مقابل آزاد کرنے والے کے اسی عضو کو دوزخ سے آزادی عطا فرمائے گا، یعنی یہاں تک کہ اس کی شرمگاہ کے مقابل اس کی شرمگاہ کو آزادی دے گا۔ [متفق عليه] اس کے علاوہ بہت سے صحیح روایات اس سلسلے میں کتب حدیث وتفاسیر میں مروی ہیں۔

فَكُّ رَقَبَةٍ کے جو معنی مذکور ہوئے وہ عام طور پر علماء کرام کے اقوال کی روشنی میں بیان ہوئے، مگر بہت سے سلف علماء نے رقبہ کی آزادی سے یہ مراد لیا ہے کہ ہر مؤمن اپنے گناہوں اور خطاؤں سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کی گرفت سے اپنی جان چھڑائے اور گلو خلاصی حاصل کرے۔ یہی قول حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، غالباً یہ قول حبر الامۃ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ واللہ اعلم۔ [مظهري]

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے عمدہ اعمال دریافت کئے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کھانا کھلانا اور سب مسلمانوں کو سلام کرنا، خواہ ان سے جان پہچان ہو یا نہ ہو، اور رات کو جب لوگ سوئے پڑے ہوں نماز پڑھنا، یعنی صلوٰۃ اللیل نماز تہجد کی مواظبت۔ [متفق عليه]

☆☆☆

عبرت آموز واقعہ:

ایک شخص ملک شام میں اپنی اہلیہ کے ساتھ عمدہ کھانے پر بیٹھا تھا کہ فقیر نے دروازے پر خیرات کی صدا لگائی، فقیر کی یہ آواز اسے نہایت بری لگی، اسے جھڑک کر اپنے دروازے سے دھتکار دیا اور بھگا دیا، بیچارہ فقیر چلا گیا، عورت کو رحم آیا، وہ اپنے حصہ طعام اٹھا کر فقیر کے پیچھے بھاگ کر اسے دیدیا، جب واپس آئی تو خاوند نے اسے برا بھلا کہنا شروع کیا، عورت خاموشی اختیار کر کے بیٹھ گئی۔

گردشِ ایام دیکھیں کہ یہ شخص جو مالدار تھا فقیر ہو گیا، مال و دولت جاتا رہا، بیوی کو طلاق دیدی، اس نے کسی اور سے نکاح کر لیا، یہ دونوں میاں بیوی ایک دن اپنے گھر میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک فقیر نے صدا لگائی، شوہر نے کہا: یہ کھانا اسے دے آؤ، وہ کھانا دے کر واپس آئی تو رو رہی تھی، شوہر نے پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ تو کہنے لگی: یہ فقیر میرا سابقہ شوہر تھا، اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے رونا آیا اور اپنے سابقہ شوہر کا واقعہ سنایا، اس نے سائل کو جھڑک کر بھگا دیا، پھر میں جب اسے کچھ دے کر واپس آئی تو مجھے ملامت کرنا شروع کیا، اس کے موجودہ شوہر نے کہا: بخدا وہ فقیر میں ہی تھا۔ [رحمۃ للعالمین]

﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ پھر ان لوگوں میں بھی (داخل) ہو جو ایمان لائے اور صبر کی نصیحت اور (لوگوں پر) شفقت کرنے کی وصیت کرتے رہے۔ یعنی ان تمام چیزوں کے باوجود اس کو اہل ایمان کے زمرہ میں شامل ہونا ضروری ہے، کیونکہ ایمان ہی ایسی بنیاد ہے کہ جس پر تمام اعمالِ صالحہ کی عمارت قائم ہے، اور یہی ایمان ہی مدارِ نجات ہے، جس کے بغیر کوئی عملِ صالح قابلِ قبول نہیں۔

ثُمَّ یہاں تراخی زمانی کے لیے نہیں بلکہ تراخی رتبی کے لیے ہے، یعنی ثُمَّ ایمان کی عظمت و بلندی بیان کرنے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کا مرتبہ اعمال کی بہ نسبت انتہائی بلند و بالا ہے، کیونکہ کوئی عمل بغیر ایمان کے معتبر نہیں، کفار کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ [الفرقان: ۲۳] (اور جو انہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اُڑتی خاک کر دیں گے)۔

البتہ اگر زمانہ کفر میں کسی کافر نے اعمالِ صالحہ انجام دیئے اور بعد میں اسے ایمان کا شرف حاصل ہوا، تو وہ اعمال مقبول و معتبر ہو جائیں گے۔ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے مسلمان ہونے کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ

وسلم سے دریافت کیا: میں نے حالت کفر میں بہت سے نیک اعمال غلاموں کی آزادی وغیرہ انجام دیئے ہیں، کیا وہ مقبول ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے ایمان نے ان تمام اعمال کو مقبول بنادیا۔ [بخاري]

ان آیات شریفہ میں فک رقبہ، اطعام طعام اور ایمان واعمالِ صالحہ کے ساتھ تواصی بالصبر وتواصی بالمرحمة سے مترشح ہوتا ہے کہ اعلیٰ ایمان والے لوگ وہ ہیں جو اپنی تکمیل کے بعد دوسروں کو بھی تکمیل وکمال کی دعوت دیتے ہیں، کیونکہ اپنے کمال وتکمیل کے ساتھ جب دوسروں کے لیے خیر خواہی ہو تو یہ اصل سرمایہ اور یہی دعوت وتبلیغ ہے، جسے پیغمبرں علیہم السلام نے اور ان کے جانشینوں نے اپنایا اور عام کیا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے غزوۂ خیبر کے موقع پر فرمایا: اگر تمہاری وجہ سے کسی ایک آدمی کو ایمانی ہدایت حاصل ہوئی تو تمہارے لئے دنیا ومافیہا سے بہتر رہے گا، تو کاملین کو چاہئے کہ اپنے ایمان اور اعمال کی تکمیل پر مطمئن ہو کر اکتفاء نہ کریں، بلکہ دیگر مسلمانوں کی بھی خبر گیری کریں، اور انہیں صحیح راہ راست پر لانے کی تلقین وکوشش کریں، اور تمام خلق خدا کو ایسے نیک کاموں کی وصیت کرتے رہیں۔

﴿تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ وہ لوگ جو آپس میں صبر کی تاکید کرتے رہے۔ لفظ تَوَاصي وصیت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: کسی کو تاکید کے ساتھ مؤثر انداز میں نصیحت اور نیک کام کی ہدایت کرنا، اسی وجہ سے مسائل میراث کے متعلق ارشاد ربانی ہے: ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ﴾ [النساء:١١] (خدا تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے) اور یہ کلمہ قرآن مجید میں بہت سے مختلف مقامات پر اسی معنی میں مذکور ہے۔

صبر کی اقسام اور قرآن مجید میں ان کا ذکر:

اَلصَّبرُ هُوَ حَبسُ النَّفسِ عَلٰى مَا تَكرَهُ فَهُو علىٰ ثلاثةَ اَقْسامٍ، صَبر على الطاعةِ: اَیْ اَلِا ستقامةُ علىٰ الطاعةِ، و صَبر عن المعاصى: اَیْ الاجتنابُ عنها، وَ صَبر على البلايا: اَیْ اَلرِّضَا بالقضاء فی كلِّ مُصِيبة و بَلاء و تَرْكُ الجزع عندها۔ وفی الحديث من لم يصبر على بلائى ولم يرض بقضائى فليخرج من ارضى و سمائى و ليطلب رباً سوائى۔ یہ حدیث مشہور ہے، صحیح ہے، مگر اسناد ضعیف ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ نے صابرین کے لیے بڑے بڑے عواطف وانعامات مقرر کئے ہیں، ربّ العزّت کی توفیق اگر شامل حال ہو تو صبر کرنا آسان رہے گا، ورنہ سخت اور جانگداز ہے، نہایت ہی تلخ اور مشکل ہے۔

قرآن حکیم میں بہتر (۷۲) مقامات پر صبر کی تاکید وفضیلت مذکور ہے، صبر کی حقیقت اتنی ہے کہ آدمی خود کو

عقل وشرع کے تقاضوں پر ثابت قدم رکھے، مگران تین قسموں کے علاوہ جواوپر بیان ہوئے صبر مختلف معانی میں مستعمل ہے: (۱) صبر مطلق اس کی ضد اضطرار ہے۔ (۲) صبر بمعنی تحمل واستقلال، اس کا مقابل تردداور جزع وفزع ہے۔ (۳) وسعت حوصلہ اور بلند ہمت، اس کے مقابلہ میں کم ہمتی اور تنگدلی ہے۔ (۴) شجاعت و بہادری، اس کا مقابل جبن و بزدلی ہے۔ (۵) حلم و بردباری اس کی ضد طیش ہے۔ (۶) کتمانِ اسرار اس کی ضد اظہار ہے۔ (۷) امانت، اس کی ضد خیانت ہے۔ (۸) زہد وقناعت، اس کے مقابل طمع وحرص ہیں۔ (۹) رضا بالقضاء، اس کے مقابل عدمِ رضا وغیرہ ہے۔ (۱۰) عدالت، اس کی ضد استبداد اور ظلم ہیں (بے راہ روی)۔ یہ سارے معانی صبر کے ذیلی مقامات ومعانی ہیں۔

بعضوں نے کہا ہے کہ صبر کی دو قسمیں ہیں: جسمانی اور نفسانی، جسمانی صبر یہ ہے کہ جسم کو عقل وشرع کے تقاضوں پر استعمال کیا جائے، ان میں سستی اور کاہلی نہ ہونے پائے۔ نفسانی صبر یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو تین قوتیں (قوتِ عقلیہ، قوتِ شہوانیہ، قوتِ غضبیہ) دی ہیں، ان کو اعتدال پر قائم رکھے اور افراط وتفریط سے محفوظ رکھے، تاکہ اس کو حکمت وعفت اور شجاعت کے عمدہ واعلیٰ جواہرات حاصل ہوں، اور وہ عدالت کے مقام پر آ کر تقویٰ کی کرسی پر جلوہ افروز ہوجائے، جیسے: ﴿اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی﴾ [المائدۃ: ۸] (انصاف کرو، وہ پرہیز گاری سے زیادہ قریب ہے)، کیونکہ قوتِ عقلیہ کے افراط کو جز بزہ اور تفریط کو بلادت اور درمیانی درجہ کو حکمت کہتے ہیں، اور قوتِ شہویہ کے افراط کو فجور، تفریط کو عنۃ اور اعتدال کو عفت سے تعبیر کرتے ہیں، اور قوتِ غضبیہ کے افراط کو تہور، تفریط کو جبن اور درمیانی درجہ کو شجاعت کہتے ہیں۔

ان تینوں قوتوں کے افراط وتفریط دونوں مذموم ہیں، ان سے اخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں، اور ان کا توسط و اعتدال محمود ہے، ان سے اخلاقِ حمیدہ و صفاتِ محمودہ وجود میں آتے ہیں، اور وہ تینوں وصف (حکمت، عفت، شجاعت) تمام خوبیوں کے اصل الاصول ہیں، جو شخص ان تینوں اوصاف کا جامع ہو وہ مؤمن کامل، صاحب عدالت و تقویٰ کہلائے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مؤمن کی ساری زندگی صبر سے عبارت ہے۔ احکامِ الٰہی کی ادائیگی پر صبر، نواہی اور معاصی سے اجتناب پر صبر، مصائب وآلام پر صبر، محرومیوں، بیکسیوں پر صبر، فقر و فاقہ پر صبر، تہمتوں اور زیادتیوں پر صبر، انقلابات وتبدیلیوں پر صبر، جہاد ومعرکوں میں استقامت اور ثابت قدمیوں پر صبر، اقتدار واختیارات پر صبر، الغرض اگر دیکھا جائے اور پوری زندگی کے تمام گوشوں کو ملاحظہ کیا جائے تو کوئی پہلو اور مؤمنانہ زندگی کا کوئی ایسا

گوشہ نظر نہیں آئے گا جہاں صبر کا نور چمک دمک نہ رہا ہو، اور ہر جگہ یہی حکمِ ربانی موجزن ہے کہ شکر کرو اور صبر کرو، تیسرا گوشہ نظر نہیں آتا، اور یہی صبر اُولوا العزم پیغمبروں علیہم السلام اور مقرب ہستیوں کا خاصہ وما بہ الامتیاز رہا ہے اور رہے گا۔

﴿وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ اور (لوگوں پر) شفقت کرنے کی وصیت کرتے رہے۔ یہ وہ صفتِ عالیہ اور کمالِ مختصہ وحیدہ ہے، جو صرف مسلمان کے فکر وسوچ کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ یہ صفت تمام اقوامِ عالم کے بے رحم درندوں کی عقل وشعور میں قطعاً موجود نہیں، کیونکہ ربّ العزّت جل شانہ کے اسماء حسنیٰ مبارکہ میں رحمٰن ورحیم بھی ہیں، اور وہی ذات اقدس ہی أرحم الراحمین کی صفت کے ساتھ موصوف ہے۔

صرف انسان کیا یہ صفت تمام حیوانات اور کیڑے مکوڑوں تک کے حقوق کے تحفظ میں بھی پیش پیش ہے۔ کائنات اور اس کی تمام مخلوقات کے جو حقوق اسلام نے بتائے اور جمیع مخلوقات پر رحم وکرم اور حسن سلوک کی جو تعلیم سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے، ان گرانقدر ہدایات سے تمام غیر مسلموں کے دامن خالی ہیں، جس طرح صبر وشکر تمام اخلاقِ حمیدہ ایمانیہ کا سرچشمہ ہے، اسی طرح رحمت وشفقت ہزار ہا خصالِ حمیدہ کا رکن اعظم وسرچشمہ ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: الراحمون یرحمهم الرحمن ارحموا من في الأرض یرحمکم من في السماء۔ [ترمذي، أبو داؤد] (رحم کرنے والوں پر رحمٰن جل شانہ رحمت نازل کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا)۔ کتب حدیث میں ایک مستقل باب موجود ہے: "باب الرحمة والشفقة على الخلق"۔ یہ شفقت علی الناس نہیں، بلکہ شفقت علی الخلق ہے۔ اس سلسلے میں ہزاروں کی تعداد میں احادیث مذکور ہیں، نتیجہ ظاہر ہے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم قدم پر رحمت وشفقت کی سنہری تعلیم دی ہے، اور ہر قسم کی بے رحمی، ظلم اور استبداد سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب جانور ذبح کرو تو چھری کو تیز کرو تاکہ جانور کو عذاب نہ ہو، اور اس کی روح جلدی نکل جائے، اور حرام مغز پر چھری مت لگاؤ یہ تعذیب حیوان کا سبب بنے گا۔ [ترمذي]

کیا یہ نام نہاد ننگ انسانیت، دشمنانِ شرافت، یہود ونصاریٰ جو کروڑوں بے گناہ معصوم انسانوں کے قاتل ہیں، ایسی کوئی تعلیم یا اخلاق پیش کر سکتے ہیں کہ جس میں خلق خدا پر رحمدلی وشفقت کا یہ عالم ہو؟ امن وآشتی، شفقت ورحمت کا اگر کوئی علمبردار ہے تو وہ صرف اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ خوبصورت سنہری زرین تاج اسلام اور اس کے بانی کے سر کا تاج اور زینت ہے، جس سے پورے اقوام عالم نابلد اور ناآشنا ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ﴾ یہی لوگ صاحب سعادت ہیں۔داہنے والے بڑے نصیب والے لوگ ہیں، دوسری جگہ قران حکیم میں انہیں کو اصحابُ الیمین کہا گیا ہے۔ یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جن کو عہد اَلست کے دن حضرت آدم علیہ السلام کے داہنے پہلو سے نکالا گیا تھا، جو روزِ محشر عرش الٰہی کے داہنی جانب ہوں گے، اور ان کا اعمالنامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اور فرشتے ان کو داہنی طرف سے لیں گے، اور داہنی طرف سے جنت میں داخل کئے جائیں گے۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں دیکھا تھا کہ جب آدم علیہ السلام اپنی داہنی طرف دیکھ کر ہنستے ہیں، سو حضرت آدم علیہ السلام ان ہی خوش نصیب اور مبارک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ﴾ اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو نہ مانا وہ بدبخت ہیں۔ بائیں والے بڑے بدنصیب لوگ ہیں، دوسری جگہ قران کریم میں انہیں کو اصحابُ الشمال کہا گیا ہے، یہ وہ بدنصیب لوگ ہیں جن کو عہد اَلست کے دن حضرت آدم علیہ السلام کے بائیں پہلو سے نکالا گیا تھا، جو روزِ محشر عرش الٰہی کے بائیں جانب ہوں گے، اور ان لوگوں کا اعمالنامہ ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اور فرشتے ان کو بائیں طرف سے لے کر بائیں طرف دوزخ میں داخل کریں گے۔ آنحضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں دیکھا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی بائیں طرف دیکھ کر رو رہے ہیں، سو حضرت آدم علیہ السلام ان ہی بدنصیب اور برے لوگوں کو دیکھ کر رو رہے تھے۔

﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ﴾ ان پر ایسی آگ مسلط ہوگی جس کو ہر طرف سے بند کیا جائے گا۔ جہاں نہ کوئی دروازہ ہوگا نہ کھڑکی، نہ روشندان نہ کوئی سوراخ اور نہ ہی کوئی روشنی ہوگی۔ نعوذ باللہ من النار و من غضب الجبار

سُورَةُ الشَّمْسِ

مکیۃ آیاتھا ۱۵ رکوعھا ۱

سورۂ شمس مکی ہے، اس میں پندرہ (۱۵) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الشمس ہے۔ یہ نام پہلی آیت کے پہلے کلمہ الشَّمس سے ماخوذ ہے۔

نزول:

سورۃ الشّمس مکی ہے، اس کا نزول سورۃ القدر کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت پندرہ (۱۵) آیتوں، چون (۵۴) کلمات اور دوسو سینتالیس (۲۴۷) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

سورۃ البلد میں ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ [البلد: ۱۰] (اور ہم نے اسے دونوں راستے بتائے ہیں) کا بیان ہوا، اس سورت میں اسی کا تذکرہ ہے۔ ماقبل سورت میں أصحاب الميمنة و أصحب المشئمة کا تذکرہ تھا، یہاں بھی دونوں کا بیان ہے۔ سورۃ البلد میں آفتاب نبوت کا بیان ہوا، یہاں الشّمس آفتاب عالمتاب کا تذکرہ ہوگا۔

☆☆☆

مختصر موضوع:

شروع میں چند قسموں کا تذکرہ ہے جو کہ علویات وسفلیات کی بڑی بڑی دلائل قدرت وصفات وتوحید پر مشتمل ہیں، پھر فطرتِ انسانی کا تذکرہ ہوگا، اس کے ساتھ تزکیہ نفوس وتذلیلِ انسانیت کے اسباب کا بیان ہے، فرمانبردار ونافرمانوں کے بیان کے ساتھ ان کے عواقب وانجام اور توحیدِ باری تعالیٰ کا مختصر تذکرہ وبیان ہے، توحید کے علمبرداروں کے لیے ابدی سعادت اور منکرین کے لیے ابدی شقاوت کا تذکرہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالشَّمۡسِ وَضُحٰهَا ① وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ② وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ③ وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰهَا ④
وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ⑤ وَالۡاَرۡضِ وَمَا طَحٰهَا ⑥ وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ⑦ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَ
تَقۡوٰهَا ⑧ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَا ⑨ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا ⑩ كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِطَغۡوٰهَآ ⑪ اِذِ
انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا ⑫ فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقۡيٰهَا ⑬ فَكَذَّبُوۡهُ فَعَقَرُوۡهَا
فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِذَنۡۢبِهِمۡ فَسَوّٰهَا ⑭ وَلَا يَخَافُ عُقۡبٰهَا ⑮

ترجمہ: سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی ① اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے ② اور دن کی جب اسے چمکا دے ③ اور رات کی جب اسے چھپا لے ④ اور آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا ⑤ اور زمین کی اور اس کی جس نے اسے پھیلایا ⑥ اور انسان کی، اور اس کی جس نے اس کے اعضاء کو برابر کیا ⑦ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور نیکوکاری کی سمجھ دی ⑧ بیشک وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا ⑨ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا ⑩ قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب پیغمبر کو جھٹلایا ⑪ جب ان میں ایک نہایت بدبخت اٹھا ⑫ تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کی باری سے حذر کرو خبردار رہو ⑬ مگر انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا اور سب کو بیخ وبن سے ہلاک کر کے برابر کر دیا ⑭ اور اس کو ان کے بدلہ لینے کا کچھ بھی ڈر نہیں ⑮

☆☆☆

معارف ومسائل

اس سورت کے شروع میں سات چیزوں پر قسم آئی ہے، اور ساتوں چیزوں کے ساتھ ان کی حالتِ کمال کے ساتھ ان کے مناسب اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی قسم: ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾ یعنی آفتاب کی قسم جب کہ وہ وقت ضحیٰ میں ہو۔ ضحی سورج کے طلوع کے بعد اس کی روشنی خوب پھیل جانے کو کہتے ہیں (دن کے چڑھنے اور روشنی پھیلنے جسے چاشت کہتے ہیں) یہاں ضحی کو واوِ عطف کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، لیکن بقرینہ سیاق یہ الشَّمْسِ کا وصف ہے، کیونکہ روشنی اور حرارت آفتاب کی صفاتِ لازمہ ذاتیہ ہیں، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، پس معنی یہ ہوگا کہ قسم ہے سورج کی اور اس کی نور وحرارت کی۔

دوسری قسم: ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا﴾ قسم ہے چاند کی جبکہ وہ سورج کے پیچھے آجائے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب چاند سورج چھپنے کے بعد طلوع ہو، اور یہ مہینے کے درمیان میں ہوتا ہے، جبکہ چاند تقریباً مکمل ہوتا ہے، اور یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح چاشت (ضحیٰ) کے وقت آفتاب پورا دکھائی دیتا ہے اسی طرح جب چاند مکمل ہونے میں اس کے تابع ہوجائے۔

تیسری قسم: ﴿وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا﴾ قسم ہے دن کی جبکہ وہ سورج کو روشن کردے۔ اور یہ اسناد مجازی ہے، مطلب یہ ہوگا کہ دن پھیل جانے کے سبب سے آفتاب خوب روشن نظر آنے لگے۔

چوتھی قسم: ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا﴾ قسم ہے رات کی جب کہ وہ سورج پر چھا جائے۔ یعنی آفتاب کی روشنی کو چھپائے، یعنی خوب تاریک ہوجائے، یہ رات کی حالتِ کمال ہے، جس طرح خوب روشنی دن کے لیے حالتِ کمال ہے۔

پانچویں قسم: ﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا﴾ یعنی قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے کی۔ یہ مَا مصدریہ کے اعتبار سے ہے، اور اگر مَا بمعنی مَن کے ہو تو معنی یہ ہوگا کہ قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے والے کی۔

چھٹی قسم: ﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا﴾ قسم ہے زمین کی اور اس کے بچھانے پھیلانے کی۔ اگر مَا مصدریہ مراد ہو، اور اگر مَا بمعنی مَن کے ہو تو معنی یہ ہوگا کہ قسم ہے زمین کی اور اس کے بچھانے والے کی۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مَا کا مَن کے معنی میں آنا شائع ذائع ہے، کقولہ تعالیٰ:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ [النساء:۳] (توان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں)۔ اسی طرح: ﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ آبَاءُ كُمْ﴾ [النساء:۲۲] (اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح سے کیا ہو ان نکاح مت کرنا)۔

ساتویں قسم: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا﴾ اگر مَا بمعنی مَن ہو تو معنی یہ ہوگا کہ قسم ہے نفس انسانی کی اور اس کے درست (برابر) کرنے والے کی۔ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا۔ یہ ساتویں قسم کے ساتھ مربوط متعلق) ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے ساتھ خیر وشر، نیکی وگناہ دونوں کی قوت واستعداد ودیعت فرمادی، اور فجور وتقویٰ دونوں کا الہام کر دیا، یہ الہام کا لغوی معنی ہیں جو خیر وشر دونوں پر اس کا اطلاق ہوجاتا ہے، شرعی معنی میں الہام کا اطلاق صرف خیر پر ہوتا ہے، شر اس میں شامل نہیں، أي القاء الخير في قلب الغير (کسی کے دل میں خیر کا القاء کرنا) اس کی تفصیل وحی کے مباحث میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ تقدیر پر شبہ کا جواب:

جب اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی میں گناہ وطاعت دونوں کی استعداد وقوت ودیعت فرمائی، پھر انسان کو محض جمادات کی طرح بے اختیار نہیں رکھا، بلکہ اسے ایک خاص قسم کا مکمل اختیار عطا کیا کہ گناہ وطاعت کا وہ اپنے اختیار سے انتخاب کرے اور ثواب وعقاب کا مستحق بن سکے۔ یہ سب کچھ بے علمی وجہالت پر بھی نہیں چھوڑا، بلکہ انبیاء ورُسل علیہم السلام اور آسمانی کتابوں، نیز قوتِ علمیہ نظریہ وغیرہ کے بعد اُسے آزمایا اور امتحان میں ڈالا۔

اس سے یہ شبہ رفع ہوجاتا ہے کہ جب تخلیق انسانی میں خالق کائنات نے فجور وتقویٰ دونوں کی استعداد رکھ دی ہے تو وہ فجور کے ارتکاب پر مجبور ہے، اور کسی عذاب کا مستحق نہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ استحقاقِ عذاب کی وجہ اس کی فطرت واستعداد نہیں، بلکہ اس کا اختیار اور غلط انتخاب ہی ہے، جسے وہ جان بوجھ کر اپنے لئے انتخاب وپسند کیا ہوا ہے۔ یہ تفسیر ایک حدیث مرفوع سے مستفاد ہے، جس کو امام مسلم نے تخریج کی ہے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ بعض لوگوں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ تقدیر کے متعلق سوال کیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہی آیت تلاوت فرمائی تھی۔

اس آیت سے مسئلہ تقدیر پر شبہ کا جواب اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ ''الہامِ فجور وتقویٰ'' سے مراد یہ ہو

کہ رب العزت نے نفس انسانی میں فجور اور تقویٰ دونوں کے مادے اور استعدادیں رکھ دی ہیں، اور اختیار دے دیا ہے کہ وہ دونوں میں سے جس کو چاہے اپنا لے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم دونوں کی روایت میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت تلاوت فرماتے تو بلند آواز سے یہ دعا پڑھا کرتے تھے: اللّٰهمّ آت نفسي تقوها و زكها أنت خير من زكها أنت وليها و مولاها۔ (اے اللہ پاک! میرے نفس کو تقویٰ عطا فرمایئے، آپ میرے نفس کے مالک و مربی ہیں، اور میرے نفس کو پاک فرما دیجئے، اور آپ بہتر پاک فرمانے والے ہیں)۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ یہ ساتوں قسموں کا جواب ہے، یعنی اس شخص نے فلاح پائی اور کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ محروم و ناکام ہوا جس نے اپنے نفس کو گناہوں میں دھنسا دیا۔ تزکیہ کا مطلب پاکی و طہارت، زکوٰۃ کو زکوٰۃ بھی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے سے باقی ماندہ مال پاک و صاف ہو جاتا ہے، اور صاحب زکوٰۃ کو تزکیہ حاصل ہو کر وہ مزکّٰی (پاکی حاصل کیا ہوا) بن جاتا ہے۔

تزکیہ کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جیسے: ﴿بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ﴾ [النساء: ۴۹] (بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے پاکیزہ کرتا ہے) کیونکہ حقیقی فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور کبھی باعتبار واسطہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ [الجمعة: ۲] (جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے ہیں)۔ اور کبھی عبادت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے: ﴿وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً﴾ [مريم: ۱۳] (اور اپنے پاس شفقت اور پاکیزگی دی تھی اور پرہیز گار تھے)۔

زیر نظر آیت میں ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ میں بندہ کی طرف نسبت ہے، جبکہ اَفْلَحَ کا فاعل مَنْ ہوگا۔ بعض علماء نے اَفْلَحَ اور دسّٰها کا فاعل اللہ تعالیٰ کو بتایا ہے، اور مَنْ کو مفعول قرار دیا ہے، پس معنی یہ ہوگا کہ بیشک وہ شخص کامیاب ہوا جس کو اللہ پاک نے پاک کیا، اور وہ شخص ڈوب کرنا کام ہوا جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں دھنسایا۔ بہرصورت جو بھی مطلب ہو تزکیہ ایک اونچی اور گرانقدر صفت ہے، جس کی بدولت انسان تمام گناہوں اور معاصی سے پاک ہو کر ایمانیات، طاعات، عبادات، اتباعِ شریعت اور اخلاقِ حمیدہ سے موصوف ہو کر قرب الٰہی کا مستحق ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

جن ساتوں چیزوں پر جو قسم کھائی گئی، وہ بالترتیب یہ ہیں:

(١) سورج اور اس کی روشنی (٢) چاند اور اس کے فوائد (٣) دن اور اس کے فوائد (۴) رات اور اس کے فوائد (۵) آسمان اور اس کی بلندی وفوائدِ عامہ (٦) زمین اور اس کے فوائد و برکات (٧) نفس انسانی اور اس کے اعمال وخواص۔ ارواح ونفوس طیبہ اور نفوس وارواح خبیثہ کافرہ کی۔ واللہ اعلم

اس کے بعد ارواحِ خبیثہ کی ایک منفرد جزئی کا بطورِ تمثیل وعبرت تذکرہ ہے، تو فرمایا:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ﴾ قوم ثمود نے اپنی شرارت وطغیانی کے سبب حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ جب صالح علیہ السلام نے قوم سے فرمایا: ﴿اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾ [الشعراء] (میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، تم خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو)، تو قوم نے جواب دیا: ﴿مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [الشعراء: ١٥۴] (تم اور کچھ نہیں ہماری طرح آدمی ہو، اگر سچے ہو تو کوئی نشانی پیش کرو)۔

نافرمان قوم ثمود کا عبرت ناک انجام:

پس حضرت صالح علیہ السلام سے انہوں نے معجزہ طلب کیا اور ایک مخصوص پتھر سے دس ماہ کی گابھن اونٹنی برآمد کرنے کی خواہش ظاہر کی، حضرت صالح علیہ السلام کی دعا سے بروقت اسی جگہ اس پتھر سے ایک گابھن، طویل و عریض، عجیب خلقت کی گابھن اونٹنی برآمد ہوئی اور فوراً اس کے پیٹ سے اسی جیسا عجیب الخلقت بچہ پیدا ہوگیا، قوم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہمارا مطالبہ پورا ہوگیا تو ہم بلا چون وچرا ایمان لائیں گے، مگر وہ کہاں ایمان لانے پر آمادہ ہوتے، بلکہ وہ آپس میں طے کر کے ایمان لانے سے منحرف ہو گئے، صرف چند خوش قسمت لوگ سرِ تسلیم خم کر کے ایمان لانے پر تیار ہو گئے، جن کی تعداد چھ ہزار تھی، باقی پوری قوم پہلے کی طرح سرکشی اور عداوت پر اتر آئی اور پیغبر کو جان سے مارنے کی دھمکی دی، پس انہوں نے چند مفسدوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ رات کی تاریکی میں جا کر حضرت صالح علیہ السلام کو شہید کر دیں۔

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنے گھر کے قریب مسجد تعمیر کرائی تھی، جہاں وہ ساری رات عبادت ونماز میں مصروف رہتے تھے، یہ لوگ وہاں پہنچے تو حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں بددعا کی، وہ آٹھ نو آدمی سب کے سب اندھے ہوئے، پھر مر گئے، صبح قوم نے واویلا شروع کر کے حضرت صالح علیہ السلام کے خلاف لشکر کشی کا بہانہ بنایا،

جن چھ ہزار لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ فوری طور پر پیغمبر کی حفاظت وحمایت پر وہاں پہنچے، اسی طرح یہ کارزار دم توڑ گئی اور اندر اندر مخالفت کا بازار گرم ہو گیا۔

دوسری طرف صالح علیہ السلام نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ مخصوص جنگل جو اونٹنی کے چرنے اور گھاس کھانے کے لیے مقرر ہے، وہ اپنے مال مویشی وہاں نہیں اتاریں گے، اور جس مخصوص کنویں سے مویشیوں کو پانی پلایا جاتا تھا، ایک دن وہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلائیں گے اور ایک دن اونٹنی کے لیے مخصوص ہوگا، بصورتِ خلاف ورزی وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو جائیں گے، ابتداء میں قوم نے یہ فیصلہ تسلیم کیا، مگر رفتہ رفتہ وہ انکار پر اتر آئے۔ ادھر اونٹنی کا یہ حال ہے کہ وہ ایک دن میں سارا پانی پی جاتی ہے، جو ہزاروں اونٹوں کو سیراب کرتا۔

جب وہ لوگ اس مصالحت کے خلاف متفق ہو گئے اور اونٹنی کو مار ڈالنے کا مصمم ارادہ کر لیا، تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے، تو ایک مالدار فاحشہ عورت نے ''قدار بن سالف'' زانی بدمعاش کے ساتھ معاہدہ کیا کہ اگر تم نے اس اونٹنی کو ہلاک کیا تو میں تجھ سے شادی کروں گی۔ وہ خبیث النفس شریر اس پر آمادہ ہوا اور اپنے چند دیگر، ہمنوا ساتھیوں کو لے کر اس میدان میں پہنچا جہاں سے اونٹنی کو گزرنا تھا، جب صالح علیہ السلام نے انہیں طرح طرح سے سمجھایا اور عذاب الٰہی سے انہیں ڈرایا، یہ لوگ اور زیادہ بدمعاشی پر اتر آئے اور اونٹنی کے پیچھے کے پاؤں کی شہ رگوں کو تلوار سے کاٹ لیا، اس طرح وہ گر گئی اور مجرموں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے، اس کا گوشت تقسیم کر لیا۔

جب وہ اونٹنی پر وار کر رہے تھے، تو اس کا بچہ اپنی ماں کا یہ حال دیکھ کر جنگل کی طرف بھاگ نکلا اور غائب ہو گیا، پھر صالح علیہ السلام نے انہیں دوبارہ کہا کہ اگر تم لوگ اونٹنی کے بچے کو تلاش کر کے جنگل سے لے آؤ، تو پھر بھی عذاب سے بچ سکو گے، مگر وہ کہاں تیار ہوتے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے چند مسلمانوں کو جنگل روانہ کیا کہ اونٹنی کے بچے کو تلاش کر کے لے آئیں، جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو وہ بچہ انہیں دیکھ کر اسی پتھر کی طرف بھاگا جہاں اس کی والدہ کا مستقر تھا، جب وہاں پہنچا، تو اسی پتھر میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا، تب صالح علیہ السلام نے قوم کو عذاب الٰہی کی آمد کا حال سنایا اور اپنی جماعت (مسلمانوں) کو لے کر وہاں سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔

انہوں نے قوم سے کہا تھا کہ تین دن کے بعد تمہارے اوپر عمومی عذاب آنے والا ہے، پہلے دن تمہارے سب کے چہرے زرد ہو جائیں گے، دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن مکمل سیاہ ہو جائیں گے، تین دن گزرنے پر

جب عذاب کے آثار شروع ہو گئے اور سب کے چہرے زرد ہو گئے، دوسرے دن سب کے چہرے سرخ ہو گئے، تو اس وقت تمام اہل ایمان شہروں سے نکل چکے تھے، اگلے دن جب سب کے چہرے سیاہ ہو گئے، تو انہیں اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا، پھر وہ اپنے بنائے ہوئے مضبوط قلعوں اور مکانات میں داخل ہو کر بزعمِ خود پناہ لی اور محفوظ ہو گئے۔ ادھر سیاہ اور وحشتناک آندھی چلی، تباہ کن زلزلہ آیا اور تین بار سخت ہیبتناک کڑک کی زوردار آوازیں آئیں کہ ان کی ناپاک اور مردار روحیں ان کے منحوس جسموں سے جدا ہو گئیں، اوران کے کلیجے پھٹ گئے اور سب اپنے محلات قلعوں میں منہ کے بل مردے پڑے رہ گئے۔

فبعدا للقوم الظلمین۔ اللّٰھم احفظنا من بطشک و غضبک یا أرحم الراحمین

﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ﴾ تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا اور سب کو (ہلاک کر کے) برابر کر دیا۔ تین دن کے وقفہ و مہلت کے بعد ان کے ربّ نے ایک ہمہ گیر عمومی عذاب سے ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا، ان کے شرک و نافرمانی اور دیگر گناہوں کے سبب سے، یعنی تکذیب صالح علیہ السلام اور قتلِ ناقہ وغیرہ۔

﴿فَسَوّٰاهَا﴾ سب کو (ہلاک کر کے) برابر کر دیا۔ سب زمین کے ساتھ فرشوں کے ساتھ برابر ہو گئے، پوری قوم کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچا، البتہ قوم کا ایک شخص ''ابورغال'' نامی کسی کام پر مکہ مکرمہ چلا گیا تھا۔ وہ سزا سے بچا رہا، کیونکہ وہ بلد الامین (مکہ مکرمہ) میں تھا، مگر جب وہ مکہ مکرمہ سے نکل کر طائف کی طرف روانہ ہوا تو اس پر بھی وہی عذاب نازل ہوا جو اس کی قوم پر نازل ہوا تھا۔ [مسند أحمد، ابن کثیر]

اس کی قبر کا نشان وہاں موجود تھا، لوگ اس پر پتھر مارتے تھے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ وہاں گزر ہوا، تو فرمایا: معلوم ہے کہ لوگ اس قبر پر کیوں پتھر مارتے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: حضور! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں! آپ نے ارشاد فرمایا: یہ ''ابورغال'' کی قبر ہے، یہ قوم ثمود کا ایک شخص تھا جب تک حرم میں موجود رہا عذاب سے محفوظ رہا، مگر جب وہاں سے نکلا تو اس کو بھی عذاب نے پکڑ لیا۔ فرمایا: اس کی نشانی یہ ہے کہ اس شخص کے پاس سونے کی ایک چھڑی تھی جب اس کی قبر اکھاڑی گئی تو لاش گل سڑ چکی تھی، مگر سونے کی چھڑی وہاں موجود تھی، اس طرح اس معتوب شخص کی نشاندہی بھی ہو گئی۔

بعض مورخین نے لکھا کہ یہ ابورغال نامی شخص ''قوم ثقیف'' کا ایک نامور سردار تھا، جس نے ''ابرہہ اشرم'' کے لشکر کی راہنمائی کرتے ہوئے طائف سے مزدلفہ اور وادی محسر تک ان کے ساتھ چلا تھا، پھر راستے میں مرگیا تھا اور

لوگ اس کی قبر پر سنگباری کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دوسرا شخص ہو اس کا نام بھی ابو رغال ہو۔ واللہ اعلم

اس امت کا سب سے بڑا شقی و بدبخت:

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ میں تم کو بتاؤں کہ سب سے بڑا شقی کون ہے؟ عرض کیا: فرمایئے! ارشاد فرمایا: ایک تو وہ جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کیا، اور اس سے بڑا بدبخت شقی وہ ہے جو تمہارے سر پر تلوار مار کر تمہاری داڑھی خون سے رنگین کردے گا۔ [تفسير مظهري برواية أحمد] یہ شقی ''عبدالرحمن بن ملجم'' خارجی تھا جس نے سیدنا حضرت علی امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ پر ماہ رمضان میں مسجد کے اندر تلوار سے وار کیا، آپؓ کو شہید کیا۔ آپؓ کی شہادت سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا خاتمہ ہوا، جس سے پوری امت کو وہ نقصان پہنچا، جس کی تلافی قیامت تک نہ ہوسکی۔ إنا للہ و إنا إليه راجعون

جس طرح ''عنیزہ'' نامی منحوس عورت کو حاصل کرنے کے لیے ''قدار بن سالف'' شقی نے حضرت صالح علیہ السلام کی بابرکت اونٹنی کو ہلاک کیا تھا، بعینہٖ اسی طرح اس امت کے شقی ابن ملجم ملعون نے ''قطامہ'' نامی خارجی عورت کو حاصل کرنے کے لیے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو شہید کیا۔ انسانی خواہشات اور شہوتوں میں فرج کی شہوت سب سے زیادہ شرمناک اور بدترین اور نہایت خبیث ہے، اسی شہوتِ فرج ہی کی کارستانی نے حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل کو اپنے بھائی حضرت ہابیل کے قتل پر آمادہ کیا تھا۔ قیامت تک جتنے بھی قتل ہوں گے ان میں قابیل کا حصہ برابر ہوگا۔

﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا﴾ اللہ ربّ العزّت کی قدرت کاملہ کا پوری کائنات پر احاطہ ہے، وہ ہر قسم عجز و نیاز، خوف و خطرہ سے منزہ اور پاک ہے، وہ کسی قسم کے عواقب و نتائج کی پرواہ تک نہیں کرتا، ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ مالکُ الملک جل شانہ اگر کسی قوم کو تہ بالا ہلاک کرتا ہے یا کسی قوم کی تباہی کا فیصلہ صادر فرماتا ہے، تو اس کے انجام سے خائف نہیں ہوتا، وہ کیوں خائف ہو جبکہ ساری کائنات اس کے ہر حکم پر گھوم رہی ہے؟ اس کے ایک اشارہ سے تمام علویات و سفلیات لمحوں میں نیست و نابود ہو کر قیامت برپا ہوسکتی ہے۔ ؎

اوست سلطان ہر چہ خواہد آن کند ☆ عالمے را در دمے ویران کند

سعدیؒ

کسی قوم و ملت کی مجال نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرسکے، ربّ العزّت کی ذات پاک

ہر قسم کے خدشات سے ماوراء ہے، اس کی قوت وعظمت کے سامنے کسی بڑی سے بڑی قوم کو دم مارنے کی ہمت و جرأت نہیں، وہ جس طرح فیصلہ کرے اور جس قوم کی تباہی کا حکم دے اسے بلا رکاوٹ نافذ کرسکتا ہے۔ ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٣] (وہ جو کام کرتا ہے اس کی پرستش نہیں ہوگی، اور (جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کی) ان سے پرستش ہوگی)۔ ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [الملک: ١] (اور وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

سُورَۃُ الّیل

مکیۃ آیاتہا ۲۱ رکوعہا ۱

سورۂ لیل مکی ہے، اس میں اکیس (۲۱) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ اللیل ہے، یہ نام پہلی آیت کے پہلے کلمہ اللّیلِ سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول سورۃ الاعلیٰ کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت اکیس (۲۱) آیات، اکہتر (۷۱) کلمات اور تین سو دس (۳۱۰) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

① سورۃ الشّمس اور سورۃ اللیل دونوں کی ابتداء قسموں سے ہے۔ ② دونوں میں نفوسِ انسانیہ (سعید وشقی) کا بیان واضح ہے۔ ③ سورۃ الشّمس میں فجور وتقویٰ کا بیان تھا، اس سورت میں ان کے انجام کا بیان ہے۔ ④ وہاں قوم ثمود کے اشقیٰ کا بیان تھا (قدار بن سالف) یہاں امت محمدیہ کے اشقیٰ امیہ بن خلف کا تذکرہ و بیان ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ جب انسان اپنے آپ کو اعمالِ صالحہ کا عادی بنالیتا ہے تو اس کے لی

ے اچھے اعمال خواہ کتنے ہی کٹھن اور مشکل ہوں آسان ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے لیے اگرچہ اطاعت وتقویٰ اور اتباعِ شریعت کا راستہ بڑا دشوار گزار اور خاردار ہوتا ہے، لیکن وہ شخص اس پر خراماں اور شاداں وفرحاں، یوں گزر جاتا ہے جیسے کہ اس کے راستہ میں اطلس وکمخواب یا پھولوں کا فرش بچھا ہوا ہو، اس کے برعکس جو لوگ برائیوں کے دلدادہ ہوتے ہیں وہ گناہوں اور معاصی میں ایسی لذّت وسکون محسوس کرتے ہیں جو درحقیقت ان کی تباہی اور بربادی وبدنامی کا باعث ہوتے ہیں، انہیں شراب نوشی، زنا، عصمت فروشی، قتل وغارت وغیرہ مخرب اخلاق کاموں پر نہ پشیمانی ہوتی ہے نہ شرمندگی وخجالت۔

پس ارشاد ہوتا ہے کہ مختلف ارادوں سے اعمال مختلف پیدا ہوں گے، اور مختلف اعمال کے مختلف نتائج کا ظہور بدیہی اور لازمی ہوگا، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی زبانی تبلیغ وہدایت سب کے لیے عام ہے، کسی پر قبول کرنے کا جبر وزبردستی نہیں، جو چاہے بخوشی ہدایت اختیار کرے اور جو چاہے بخوشی ہلاکت وتباہی کے گڑھے میں کود جائے، آئندہ ہر شخص کا انجام اس کے صحیح یا غلط انتخاب کے ساتھ وابستہ ہوگا، تصدیق وتکذیب کے نتائج کھل کر سامنے آجائیں گے، سخاوت والے فیضیاب رہیں گے، بخیل وکنجوس عذاب الیم میں مبتلا رہیں گے، اول کی تعبیر ''یُسْرٰی'' سے، دوم کی تعبیر ''عُسْرٰی'' کے ساتھ واضح کی جا رہی ہے۔ واللہ اعلم

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝١ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝٢ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۝٣ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝٤
فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝٥ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝٦ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ
اسْتَغْنٰى ۝٨ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝٩ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝١٠ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝١١
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝١٢ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝١٣ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۝١٤ لَا يَصْلٰىهَآ
اِلَّا الْاَشْقَى ۝١٥ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝١٦ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝١٧ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝١٨ وَ
مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝١٩ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝٢٠ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝٢١

ترجمہ: قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے ① اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو جائے ② اور قسم ہے

اس کی جس نے نر و مادہ کو پیدا کیا③ بیشک تمہاری کوششیں مختلف ہیں④ پھر جس نے دیا اور پرہیز گاری اختیار کی⑤ اور اچھی بات کی تصدیق کی⑥ تو ہم اس کے لیے راحت کی چیز آسان کر دیں گے⑦ اور جس نے کنجوسی کی اور بے پرواہی اختیار کی⑧ اور اچھی بات کو جھٹلا دیا⑨ تو ہم اس کے لیے تکلیف کی چیز آسان کر دیں گے⑩ اور اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا جب وہ برباد ہونے لگے گا⑪ بیشک ہم پر تو راہ دکھا دینا ہے⑫ اور ہمارے ہی قبضہ میں ہے آخرت اور دنیا⑬ پھر میں تم کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا چکا ہوں⑭ اس میں صرف وہی بڑا بد بخت گرے گا⑮ جس نے جھٹلا دیا اور منہ موڑا⑯ اور اس آگ سے وہ پرہیز گار دور رہے گا⑰ جو اپنا مال اس غرض سے دیتا ہے کہ وہ پاک ہو جائے⑱ اور اس پر کسی کا کوئی احسان بھی نہیں جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو⑲ وہ صرف اپنے عالیشان ربّ کی رضا جوئی کے لیے دیتا ہے⑳ اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا㉑

معارف ومنازل

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عشاء اور ظہر کی نمازوں میں ''سورۃ الاعلیٰ، سورۃ الشمس اور سورۃ اللیل'' کو بکثرت پڑھا کرتے تھے، اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو خطاب کر کے یہی فرمایا کہ انہی سورتوں کو پڑھا کریں۔ [بخاري]

قدرت کاملہ کی نشانیاں:

﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى﴾ قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے، یا نورِ آفتاب کے پردوں کے پیچھے دنیا کو تاریک کر دے۔ رات طویل و قصیر اور سرد و گرم ہونے کے اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ شانہ کی قدرت کاملہ کی ایک عجیب علامت و نشانی ہے، اور موت و فنا نیز قیامت کا بھی ایک نمونہ ہے۔ جس طرح رات کو یکے بعد دیگرے سب پر نیند طاری ہو جاتی ہے، اسی طرح دنیا میں یکے بعد دیگرے سب پر موت طاری ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ قیامت آ جائے گی اور اس کی ظلمتیں سب کو گھیر لیں گی۔

اسی طرح رات کی تاریکی کی طرح جب انسان کے قلب و دماغ پر گناہوں کی ظلمت احاطہ کرتی ہے اور نورِ قلب پر کفر و شرک کی تاریکی محیط ہو جاتی ہے، تو سلیمُ الفطرت انسان کے اعمال تاریکی اور ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں، اور یولد علی فطرۃ الإسلام والی کیفیت ظلمتوں میں نیست و نابود ہو کر نفسِ امارہ کی لغزشوں میں پھنس کر

حیوانیت کا منظر پیش کرتی ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ [الأعراف:۱۷۹] (ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں، اوران کی آنکھیں ہیں مگران سے دیکھتے نہیں، اوران کے کان ہیں پران سے سنتے نہیں، یہ لوگ بالکل چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے) کا دوردورہ ہوگا، انسانی شرافت وفطرت ضائع ہوکرحیوانیت وبہیمیت کا ظہور ہوگا۔

﴿وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى﴾ قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہوجائے۔اوررات کی تاریک پردوں کواپنے انوار وبرکات سے ختم کردے۔یہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کادوسرانمونہ ہے، اس میں حیات بعدالموت، حشرونشراور بعث کا منظربھی ہے، اورانسان کے قلب ودماغ کی نورانیت کی طرف اشارہ ہے، اوراسلام کی گوناگوں انواروبرکات اورفطری تقاضوں کی نشاندہی ہے۔

﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى﴾ اورقسم ہے نرومادہ پیداکرنے کی۔مَا مصدریہ ہے۔یاقسم ہے اس ذات پاک کی جس نے ایک ہی تخم سے نرومادہ کی تخلیق فرمائی، جبکہ مَا موصولہ بمعنی مَنْ کے ہو۔نرومادہ سے حضرت آدم علیہ السلام وحضرت حواء علیہاالسّلام مراد ہوں جوکہ تمام اولاد کے لیے بمنزلہ اصول کے ہیں، یامطلق نرومادہ بحیثیت مجموعی جنس وانواع کے جوانسانوں اورحیوانات سب کوشامل ہو۔یہ ربّ العزّت کی قدرت کاملہ کی تیسری نشانی ونمونہ ہوکراس کی عظیم قدرت پردلیل ہے۔

دوسری جگہ ارشادفرمایا: ﴿وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا﴾ [النبأ:۸] (ہم نے تمہیں جوڑاجوڑاپیداکیا) یعنی اگر تم رات دن کی نیرنگیوں کونہیں سوچ سکتے توذرانزدیک اپنی ذات میں غورکرو، اللہ تعالیٰ نے تم سب کومردہی پیدانہیں کیااورنہ سب کوعورتیں بنایا، تم خودسوچو، مردوزن دونوں کی تخلیق ایک ہی قطرۂ آب سے ہوتی ہے، ایک ہی رحم میں نشوونمااورپرورش پاتے ہیں، خوراک بھی یکساں ہے لیکن کسی کوذکر (لڑکا) کسی کو(انثیٰ) لڑکی بنادیا۔

ایک آئندہ کے لیے باپ بننے کے قابل ہے، دوسری ماں بننے کی قابل ہے، جس نے باپ بنناہے اس کے اعضاء، دماغ، قلب گوشت، پوست، ہاتھ پاؤں اوردیگرآلات اوربہت سی صلاحیتیں عطاکیں، جن کی بدولت وہ باپ بننے کے منصب پرفائزہوسکتاہے، اورجس کوماں بناہے وہ ماں بننے کی تمام جسمانی ساخت اورنفسیاتی صلاحیتوں اعضاءوجوڑوں ودیگرآلات سے بہرہ ورلطف اندوزہے۔اگریہ نرومادہ کانظام نہ ہوتاتوساری لذّتیں کدورتوں میں

بدل جاتیں، اور افزائشِ نسل ختم ہو جاتی، اور زندگی کا یہ کٹھن سفر ہر کیف و سرور، نیرنگیوں اور نزاکتوں سے محروم ہو کر نہایت تلخ اور دشوار ہو جاتی۔

﴿إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ﴾ بیشک تماری کوشش مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ تنبیہ فرمارہے ہیں اور وضاحت کے ساتھ دلائل قدرت بیان کرر ہے ہیں۔ دیکھیں! ربّ تعالیٰ نے پوری کائنات کو ایک حیثیت و ایک رنگ پر تخلیق نہیں فرمایا، جبکہ مختلف شعبوں اور ہر طرح کے مزاج وصفات کی نیرنگیوں پر چیزوں، مخلوقات، انسان وحیوانات جمادات نباتات، حتیٰ کہ معمولی کیڑے مکوڑوں کو بھی مختلف کیفیتوں پر پیدا فرمایا ہے، اور اگر ان مخلوقات کی حیثیتوں اور ان کی صفات وغیرہ پر غور کیا جائے تو ہر چیز میں اس کی قدرت کے عجیب وغریب کرشمے نمایاں ہیں، اور انہی اختلافات میں اس کی حکمتوں کا جلوہ نمایاں ہے۔

ففي كل شئى له اٰية	☆	تدل علىٰ أنه واحد
گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن	☆	ہے زیب اس جہاں کا فقط اختلاف میں

انسان کی پیدائشی مادہ ایک ہی قطرۂ آب ہے، پھر اس سے مختلف انواع مرد وعورت کی پیدائش جن میں سے ہر ایک کے اوصاف، کمالات، صلاحیتیں، حسن وقبح وغیرہ بیشمار متنوع اوصاف، پھر عقل وفہم سوچ وسمجھ کا اختلاف، خیالات، مساعی، جدوجہد، قوتِ علمیہ اور قوتِ عملیہ وغیرہ کا تنوع واختلاف صرف یہ نہیں، بلکہ سینکڑوں دیگر امور میں اختلاف وجدائی، یہ سارے اس کی قدرت وحکمت کے کرشمے اور اس کی وحدانیت پر واضح دلائل وثبوت ہیں۔

انسانی مساعی واعمال کا تذکرہ فرما کر سمجھا رہے ہیں کہ تمہاری کوششیں مختلف اور نہایت متضاد ہیں، کوئی عدل وانصاف کا خوگر ہے، کوئی ظلم وزیادتی پر راضی ہے، کوئی ایمان باللہ پر مصر ہے، کوئی شرک وکفر پر نازاں ہے، کوئی ابدی سعادت کا طالب ہے، کوئی ابدی شقاوت کا خریدار ہے، کوئی تزکیہ پر مائل ہے، کوئی ناپاکی کا خواہاں ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کی رضا پر قربان ہے، اور اس کی خاطر مال وجان تک فداء ہے، اور سب کچھ اس کے حکموں پر لٹارہا ہے۔

دوسری طرف کوئی نام ونمود اور غیر شرعی مصرف شیطانی ونفسانی خواہشات پر مال خرچ کر رہا ہے، علیٰ ہذا القیاس حق وباطل دونوں کے درمیان ہر طرح و ہر محاذ پر معرکے جاری رہتے ہیں اور رہیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کسی نہ کسی مقصد کے پیش نظر جدوجہد سعی وعمل کرنے کا عادی ہے جیسا کہ: ﴿إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا﴾ [الانشقاق: ۶] (بیشک تو اپنے پروردگار کے پاس پہنچنے تک مسلسل کسی

محنت میں لگا رہے گا)۔ اور ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ﴾ [البلد: ۴] (یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے تکلیف میں) کے تحت معلوم ہو چکا ہے۔ بعض لوگ ابدی راحتوں کی خاطر سامان فراہم کر رہے ہیں، اور بعض لوگ ابدی مصیبتوں اور دائمی ہلاکتوں کا سامان کر رہے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے: كلّ الناس يغدوا فبايع نفسه فمعتقها أو موبقها۔ [مشکوٰۃ] یعنی ہر انسان جب صبح کو اٹھتا ہے اور اپنے نفس کو فروخت کرتا ہے، تو کچھ لوگ اپنے لئے سامانِ نجات مہیا کرتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے آپ کو ہلاک وتباہ کر لیتے ہیں، کوئی مسجد میں ہوگا کوئی شراب خانے میں، علیٰ ہذا القیاس۔

رات دن ذکر وانثی کی تینوں قسموں کا جواب ﴿اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى﴾ ہے۔قسموں اور ان کے جواب میں بہت سی مناسبتیں ہیں: (۱) یہ کہ نر ومادہ کی اکثر وبیشتر انقلابی کوششیں لیل ونہار ہی میں ہوتی رہتی ہیں۔

(۲) جس طرح لیل ونہار اور مرد وعورت مختلف چیزیں ہیں اسی طرح مؤمن وکافر کے عقائد واعمال بھی ایک دوسرے سے مختلف وممتاز ہیں، کافر کے اعمال رات کی طرح تاریک اور مؤمن کے اعمال دن کی طرح روشن اور نورانی ہوتے ہیں۔

(۳) موسموں کے لحاظ سے رات دن گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں، اسی طرح مؤمن کے نیک اعمال اور کافر کے برے اعمال مختلف کیفیتوں کے ساتھ، زیادہ اور کم ہوتے رہتے ہیں۔

(۴) دن کی روشنی سے رات کی تمام چھپی ہوئی چیزیں ظاہر ہوجاتی ہیں، اور رات کی تاریکی میں دن کے تمام ظاہر چیزیں چھپ جاتی ہیں، اسی طرح مؤمن کے سارے چھوٹے بڑے اعمال قیامت کے دن ظاہر ہوکر فائدہ مند رہتے ہیں، جبکہ کافر کے صدقات، عدل وانصاف، رحمدلی وغیرہ (نیک اعمال) وہاں قیامت کے دن ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ناکارہ وبے سود ہوکر ان پر ﴿وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ [الفرقان: ۲۳] (اور جو انہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اُڑتی خاک کر دیں گے) اور قیامت کے روز انہیں نیک اعمال کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

(۵) جس طرح شمس وقمر یا رات دن کے اعمال اور حقیقت ومراد مختلف ہے، اسی طرح مرد وعورت کے فطری اعمال وفرائض وغیرہ امور مختلف ہیں، اور ہر ایک کا دائرۂ عمل ایک دوسرے سے الگ ہے، اور کسی بھی فطری عمل و فریضہ میں مساوات نہیں، ہاں! اگر مغربی تہذیب کے دلدادے ان دونوں متضاد فطرتوں میں جو مساوات کے مدّعی

ہیں وہ ہرگز صحیح نہیں، بلکہ غیر فطری منگھڑت خیالات ہیں، انہیں چاہئے کہ پہلے سردی گرمی، لیل ونہار، روشنی وتاریکی، صحت ومرض، علم وجہالت وغیرہ امور میں مساوات قائم کرکے دکھائیں، پھر مرد وعورت کی مساوات کا دعویٰ کریں اور دو چار بچے وہ خود بھی جنم لیں تب مزہ آئے گا، یہ شیطانی حربے رحمانی فطرت کو کبھی تبدیل نہیں کرسکیں گے۔

انسانی کوششیں کیوں اور کس طرح مختلف ہیں؟

انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرنے اور بے کار بیٹھنے کا عادی نہیں، اسے محنت وحرکت وہر قسم کی جستجو کا فطری طور پر شوق ہے، مختلف اوقات میں مختلف زاویوں پر وہ محنت کرتا رہتا ہے، اور شب وروز مصروفِ عمل رہتا ہے، اس کے اعمال تین حیثیتوں پر منقسم ہیں: (۱) خیر محض، جس میں شر کا شائبہ نہ ہو۔ (۲) شر محض، جس میں خیر کی بو تک نہ ہو۔ (۳) خیر وشر دونوں سے مرکب، لیکن یہ تیسری قسم حکم کے اعتبار سے دوسری قسم میں شمار ہے، کیونکہ نتیجہ اخس وارزل کا تابع ہوتا ہے۔ البتہ صفاتِ حمیدہ واخلاقِ رزیلہ کے حاملین میں ایمان کی دولت موجود ہے، تو قاعدۂ شرعیہ کی رُو سے ایسے لوگوں کو نجات اخروی ضرور میسر آجائے گی، جیسے فرمایا: ﴿خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحاً وَّ آخَرَ سَیِّئاً عَسَی اللہُ اَن یَّتُوْبَ عَلَیْھِمْ﴾ [التوبۃ: ۱۰۲] (انہوں نے خلط ملط کردیا اچھے عمل اور دوسرے برے عمل کو، امید ہے اللہ ان کی توبہ قبول فرمائیں)۔

قسم اول کے لئے تین شرطیں ہیں جو یہ ہیں:

(۱) اعتقاد صحیح، یقین کامل۔ (۲) ظاہر وباطن شرع کے موافق۔ (۳) نیت واخلاص کا تحقق۔

جبکہ قسمِ ثانی میں ان چیزوں کا فقدان شرط ہے، یعنی وہاں فساد عقیدہ، ناموافقت شریعت اور فساد نیت وعدمِ اخلاص کا تحقق شرط ہے، تب ہی تو شر محض کا تحقق ہوگا۔ اس دوسری قسم میں مزید کئی صورتیں نکل سکتی ہیں، مثلاً:

(۱) صورت ونیت دونوں درست ہوں، لیکن اعتقاد فاسد ہو، جیسے کفار کے نیک اعمال، اعمال تو اچھے ہوتے ہیں مگر وہ عقائد کی بنیاد پر نہیں کرتے۔ (۲) صورت واعتقاد دونوں درست ہوں، لیکن نیت خالص نہ ہو، جیسے ریاکاری کے اعمال، جن میں اخلاص بالکل نہیں ہوتا۔ (۳) نیت واعتقاد دونوں درست ہوں، مگر صورت شریعت کے خلاف ہو، جیسے محفل میلاد، ماتم شہداء کربلا یا صوفیا کا سماع۔ (۴) اعتقاد درست ہو، مگر صورت ونیت غیر صحیح ہو، جیسے محرم داری و ریاکاری۔ (۵) صورت درست ہو، مگر اعتقاد ونیت فاسد ہوں، جیسے کسی مطلب کے لیے کافر کی نماز وغیرہ۔ (۶) نیت درست ہو مگر اعتقاد وصورت غلط ہوں، جیسے بدعتیوں کے بعض اعمال، مثلاً: صلوٰۃ وسلام قبل از آذان، یا محافل وجلوس

ربیع الاوّل، یوم وفات النبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ ان بے شمار انواع واقسام کا خلاصہ بیان ہوا، جن کی تفصیل کتب فقہ وعقائد وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اعمال کے انہی اختلاف پر روزِ قیامت جزاء وسزا کا ترتب ہوگا۔ واللہ اعلم۔ آگے قرآن حکیم نے ترغیب وترہیب کی حیثیت سے سعی وعمل کے اعتبار سے انسانوں کو دو گروہ میں تقسیم کیا ہے۔

سعی وعمل کے اعتبار سے دو گروہ:

اول گروہ کامیاب لوگوں کا ہوگا، دوم گروہ ناکام لوگوں کا ہوگا، اور ہر ایک گروہ کے تین اوصاف کا بیان:

پہلا گروہ کامیاب لوگوں کا ہے، ان کے تین اوصاف حمیدہ ہیں: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی﴾ (تو جس نے (خدا کے راستے میں مال) دیا اور پرہیز گاری کی اور نیک بات کو سچ جانا) تو ان کے تین صفات یہ ہوئے:

(۱) اللہ تعالیٰ کی رضا میں مال خرچ کرنا۔ (۲) اللہ تعالیٰ سے ڈر کر زندگی کے ہر شعبے میں اس کے حکموں پر چلنا، اور ہر قسم کی خلاف ورزی سے اجتناب کرنا۔ (۳) اچھی بات کی تصدیق کرنا۔

دوم گروہ پہلے گروہ کے بالمقابل ناکام لوگوں کا ہے، ان کے بھی تین اعمال واوصافِ رذیلہ بیان کئے گئے ہیں: ﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی﴾ (اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا)۔ یہ دوسرے گروہ کے تین صفات ہوگئے: (۱) صفتِ بخل وکنجوسی ہے، یعنی راہِ خدا میں ہر قسم کے مال خرچ کرنے سے گریز کرنا۔ (۲) دوسرا وصف استغناء یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی بجائے بے رخی اور بے نیازی اختیار کرنا۔ (۳) تیسرا وصف اچھی بات کی تکذیب کرنا اور جھٹلانا۔

اول گروہ کی تینوں حمیدہ صفات میں پہلی صفت اعطاء وبخشش اور سخاوت ہے، یہ ایک بہت بلند وبالا پاکیزہ صفت ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی فضیلت ومدح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: سخاوت اللہ پاک عزّ اسمہٗ کی صفت ہے، اور سخی مسلمان اللہ پاک کا محبوب ہے، اُسے قرب الٰہی کا شرف حاصل ہے، وہ ربّ العزّت سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے، جہنم سے دور ہے، اور سخی بے علم عابد بخیل سے افضل ہے۔ [مشکوٰۃ] فرمایا: سخی اللہ تعالیٰ کا دوست ہے، اگرچہ بے عمل ہو۔ [مشکوٰۃ]

دوسری صفت تقویٰ وپرہیز گاری، یہ پیغمبروں علیہم السّلام والی عمدہ صفت ہے، سارے انبیاء کرام علیہم السّلام، صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم، تمام اولیا وصالحین، علماء وصلحاء اسی بابرکت صفت کے ساتھ موصوف ومتصف ہیں، اور یہی صفت ان کے لیے طرۂ امتیاز ہے، اس تقویٰ کے ساتوں مراتب پر سورۂ بقرہ کے شروع میں کلام ہو چکا ہے۔

اول گروہ کی تیسری عمدہ صفت ''تصدیق بالحسنیٰ'' ہے، جس کے بہت سے معانی بیان ہوئے ہیں:

(۱) ملت اسلام کا کلمہ توحید لا إله إلا الله مراد ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ، عبدالرحمن السلمیؒ اور ضحاکؒ کا قول ہے۔ (۲) جنت مراد ہے، لقوله تعالىٰ: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى﴾ [یونس:۲۶] (جو لوگ نیکی کریں ان کے لیے نیکی ہے)۔ یہ قول حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، عکرمہؒ اور قتادہؒ وغیرہ حضرات سے منقول ہے۔ (۳) وعدۂ خداوندی مراد ہے، یہ مقاتلؒ اور کلبیؒ سے منقول ہے۔ [مظهري، روح المعاني وعزيزي]

فریق دوم کے اوصافِ مذمومہ میں پہلی صفت بخل ہے، بخل وکنجوسی ایک مہلک صفت ذمیمہ ہے، بخیل شخص دوزخ سے قریب ہوتا ہے، حضرت باری تعالیٰ عزّ مجدہٗ سے، نیز جنت سے اور اسی طرح عام لوگوں سے دور ہوتا ہے، حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بخیل اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے، اگرچہ عبادت گزار ہو۔ [مشكوٰة]

دوم صفتِ استغناء (یعنی بے رخی ولاپرواہی اور اللہ تعالیٰ سے دوری) یہ تمام معاصی کی جڑ اور بنیاد ہے۔ سوم صفتِ مذمومہ کفر وتکذیب حسنیٰ، کلمہ اسلام کا منکر، جنت کا منکر، وعدہ خداوندی کا منکر۔

فریقین کے نتائج کا بیان وضاحت:

مذکورہ دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کا نتیجہ: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴾ سے بیان فرمایا ہے، یعنی ہم اس کو سہولت آسانی کی توفیق دیں گے (سہولتوں نعمتوں خوشحالیوں کے لیے تیار کریں گے)۔ یُسْرٰی کے معنی آسانی وراحت اور آرام وسہولت کے ہیں۔ اس سے مراد وہ خصائل ہیں جو انہیں راحتوں تک پہنچائیں، یا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی وجنت تک پہنچا دیں، یعنی یسریٰ، راضية اور مرضية کا مصداق ہے جو پہلے بیان ہوا، یا اس سے شریعت مراد ہے کہ تمام احکامِ شریعت پر چلنا اس کے لیے آسان کر دیں گے، اور شرعی احکام پر چلنے کو اس کی فطرت وملکہ راسخہ بنائیں گے، جیسے کہ ''سورۃ الاعلیٰ'' کی تفسیر میں بیان ہوا، اور آئندہ بھی آنے والا ہے۔

دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ یعنی کافر ومکذب حق کے لیے عُسریٰ کو آسان کر دیں گے۔ عسریٰ کے معنی سخت، مشکل، تکلیف رساں، مراد وہ خصائلِ مذمومہ ہیں جو اسے مشقت ومصیبت میں ڈال دیں، یا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور جہنم میں پہنچانے والے ہوں، یا وہ اعمال ومعاصی جو خلاف شرع اور تباہ کن ہوں۔

مسئلہ تقدیر، یُسریٰ اور عُسریٰ کا مقصد و مطلب:

فریق اول کے لیے فرمایا: ہم اس کو آسان کردیں گے جنت یا راحت یا شریعت کے لیے، اور فریق ثانی کے لیے فرمایا: ہم اس کو آسان کردیں گے مصیبت یا دوزخ یا معصیت کے لیے، حالانکہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ فرمایا جاتا: سَنُيَسِّرُ لَهُ الْيُسْرىٰ ہم اس کے لیے یُسریٰ کو آسان کردیں گے، یا: فَسَنُيَسِّرُ لَهُ الْعُسْرىٰ ہم اس کے لیے عُسریٰ کو آسان کردیں گے، کیونکہ آسانی اور دشواری اعمال کی صفت ہے، نہ کہ ذوات واشخاص کی، مگر قرآن کریم کی تعبیر نہایت بلند و بالا اور تعجب انگیز ہے کہ ہم ان کی ذوات واشخاص کو آسان کردیں گے یُسریٰ اور عُسریٰ کے لیے۔ یعنی ہم ان کی طبیعتوں، مزاجوں اور خیالات کو ایسا تیار کر کے بنا دیں گے کہ اول فریق کے لیے شریعت واعمالِ جنت ورضاءِ الٰہی طبیعت ثانیہ اور ملکہ راسخہ بن جائیں گے، اور اس کے خلاف کرنے میں انہیں رنج وتکلیف محسوس ہوگا، اور موافقت میں سرور وخوشی محسوس کرنے لگیں گے۔

اسی طرح فریقِ ثانی کا مزاج گناہ ومعصیتوں کا عادی ہوکر خلافِ شریعت اعمال پر انہیں سرور حاصل ہوتا رہے گا اور اعمالِ حسنہ پر انہیں دقت اور کوفت ورنج محسوس ہوگا پس ﴿كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۵۳] (ہر جماعت اس پر خوش ہوگی جو اس کے پاس ہے) پر عامل رہیں گے۔

فریق اول سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکیوں سے سیر نہیں ہوتے اور شب وروز نیکیوں میں مشغول ہوتے ہیں، ماہی کی طرح نیکیوں پر زندہ رہتے ہیں، گناہوں سے نفرت اور بیزاری ان کی خصلت ہوتی ہے، جبکہ فریق ثانی ان کے برعکس ہوگا۔

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا جنت اور دوزخ کا ٹھکانا لکھ نہ دیا گیا ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ تو! پھر کیا اس نوشتہ تقدیر پر اعتماد کر کے ہم عمل نہ چھوڑ دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعملوا فكلّ ميسر لما خلق له أما من كان من أهل السعادة فسييسر لعمل أهل السعادة، وأما كان من أهل الشقاوة فسييسر لعمل أهل الشقاوة۔ [متفق عليه] (یعنی تم عمل کرتے رہو، کیونکہ ہر شخص کے لیے وہی کام آسان کردیا گیا جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، جو اہل سعادت ہیں تو اہل سعادت کے اعمال ہی ان کے طبعی رغبت بن جاتے ہیں، اور جو بدنصیب ہیں تو اہل شقاوت کے اعمال ہی ان کا مزاج بن جاتے ہیں)۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور استشہاد اس آیت کی

تلاوت فرمائی: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى﴾
نیکیوں پر چلنا جنت کی بشارت اور علامت ہے، معاصی و گناہوں کا انتخاب یہ دوزخ کی بشارت اور علامت ہے، جن لوگوں کی پیدائش جنت کے لیے ہوان کو جنتی اعمال کی توفیق میسر رہے گی، اور وہ جنتی اعمال اختیار کرتے ہوئے دوزخی اعمال سے ہمیشہ اجتناب کریں گے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کی پیدائش دوزخ کے لیے ہو وہ دوزخی اعمال کو پسند کریں گے اور جنتی اعمال سے دور رہیں گے اور انہیں دوزخی اعمال سے محبت اور جنتی اعمال سے نفرت و بغض ہوگا۔ مگر یہ دونوں چیزیں باعتبار خود خداداد صلاحیت کے استعمال کے نتیجے میں ملتی ہیں، جس کی بناء پر عذاب و ثواب کا ترتب بے محل نہ ہوگا۔

آگے بدنصیب گروہ اہل جہنم کو تنبیہ ہے کہ راہ خدا میں مال خرچ نہ کرنا تمہارے لئے باعث خسران ونقصان ہے، ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى﴾ تَرَدّٰی کے معنی ہلاک ہونا، جہنم میں گرنا، ہلاکت سے مراد استحقاق عذاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد قبر میں اور پھر قیامت کے روز، جب وہ جہنم میں گرے گا تو اس کا مال اس کو کوئی نفع نہ دے گا۔ عموماً بخیل بخل اس لئے کرتا ہے کہ یہ مال وقت پر کام آئے گا مگر کام کیا اس کے برعکس وبال جان بن جائے گا، اور یہی مال اکثر و بیشتر کفر کا سبب بنے گا۔

ہدایت کے اسباب کا بیان:

﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى﴾ بیشک راہنمائی ہمارے ذمہ ہے۔ دراصل حق تعالیٰ شانہ پر کوئی چیز واجب نہیں، لیکن چونکہ اس نے ازل میں فیصلہ فرمادیا ہے اور ہر طرح کی رہنمائی کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی رحمت و حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے، اس لئے وہ رہنمائی کا ذمہ دار کہلاتا ہے۔ امام قتادہ اور زجاج رحمۃ اللہ علیہما کہتے ہیں کہ یہاں عَلٰی تاکید کے لیے ہے۔ امام فرّاءؒ عَلٰی کو اِلٰی کے معنی میں لیتے ہوئے یہ معنی کرتے ہیں کہ جو شخص ہدایت پر چلتا ہے اس کا راستہ ہم ہی تک پہنچتا ہے، جیسا کہ دوسری آیت: ﴿وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ﴾ [النحل: ۹] کے معنی یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی تک سیدھا راستہ پہنچتا ہے۔

تو مطلب یہ ہوا کہ جو راہ ہدایت پر چلتا ہے وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے، تو اس آیت میں عَلٰی بمعنی اِلٰی ہے، اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کس طرح اور کیسی ہے؟ تو اس بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ ہدایت کے لیے اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اسباب مقرر فرمائے ہیں:

(۱) انسان کو حواس ظاہرہ (قوتِ سامعہ، قوتِ باصرہ، قوتِ شامہ، قوتِ لامسہ، قوتِ ذائقہ) عطا فرمائے ہیں۔ (۲) حواس باطنہ (حس مشترکہ، خیال، وہم، حافظہ اور قوتِ متصرفہ) عنایت فرمائے ہیں۔

(۳) ان سب کا بادشاہ عقل و ادراک فراہم کیا ہے، جس کے ذریعہ معرفت حق ہوسکتی ہے، حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ اگر حق تعالیٰ جل مجدہٗ رسولوں پیغمبروں علیہم السلام کو نہ بھیجتا، تب بھی انسان قوتِ عقلیہ کی وجہ سے معرفت حق و توحید کا مکلف تھا۔ (۴) انبیاء و رُسل علیہم السلام بھیجے اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں، شرائع و احکام دیئے۔ (۵) انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے خلفاء، جانشین، علماء، صلحاء اور اولیاء کے ذریعہ رہنمائی فرمائی۔

(٦) بے شمار دلائل عقلیہ، نقلیہ، نفسیہ اور آفاقیہ قائم فرما کر ان میں تفکر، تدبر اور اعتبار و اختیار کا حکم دیا، لیکن بایں ہمہ کسی فرد کو مجبور نہیں کیا گیا اور بے اختیار نہیں رکھا گیا، اگر قدرت کی طرف سے جبر و زبردستی کی جاتی تو حکمت تکلیف باطل ہوجاتی اور ثواب و عقاب کا مسئلہ ختم ہوجاتا، بلکہ تخلیق انسانی کا منشاء و مقصد ہی معطل اور فوت ہوجاتا۔

ہم واضح طور پر دنیا اور اس میں آباد انسانوں میں شب و روز یہ ہر قدم پر ملاحظہ کر رہے اور دیکھ رہے ہیں کہ سب لوگ اپنے دائرۂ اختیار میں جس طرح چاہتے ہیں (اچھا برا) کام کر رہے ہیں، فائدہ اٹھا رہے ہیں اور نقصانات سے دوچار ہیں، کسی پر کسی قسم کا جبر نہیں، تو یہ کون کہتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے، شجر و حجر کی طرح مجبور و بے اختیار ہے؟ اگر کائنات کے چند امور میں انسان بے اختیار ضرور ہے مگر وہ امور اس کے دائرہ تکلیف سے باہر اور خارج ہیں، ان کے متعلق وہ ہرگز مسئول عنہ نہیں، اور جن چیزوں میں (خیر و شر) وہ مسئول عنہ ہے وہ امور مکمل بلا کسی روک ٹوک کے اس کے دائرۂ قدرت و اختیار میں داخل ہیں، اس پر کوئی زبردستی نہیں۔

﴿وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى﴾ بیشک آخرت اور دنیا ہماری ملکیت و تصرف میں ہیں۔ دنیا ہو یا آخرت اور دونوں جہانوں کی نعمتیں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور ملکیت و تصرف میں ہیں، انسان چند روزہ زندگی میں عاریۃً بعض چیزوں کا اگر مالک و متصرف ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت و بخشش کی بدولت، ورنہ وہ خود اپنے وجود و شخصیت کا مالک تک نہیں، تخلیق انسانیت سے لے کر آج تک کسی انسان نے جاودانی زندگی نہیں پائی اور نہ ہی کسی چیز نے اس کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ اس کے بدنی اعضاء ظاہری یا باطنی ہمیشہ کے لیے اس کے قبضہ و تصرف میں نہیں رہے، جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى﴾ اس لئے میں تمہیں بھڑکتی آگ سے ڈراتا ہوں۔ اس جملہ کا تعلق ﴿وَاِنَّ

﴿عَلَيْنَا لَلْهُدٰى﴾ کے ساتھ زیادہ مناسب ہے؛ فرمایا: رہنمائی بھی ہمارا ذمہ ہے، تو دوزخ سے تمہیں ڈرانا بھی ہمارے ذمہ ہے، اسی طرح جنت کی خوش خبری بھی: ﴿لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى﴾ اس بھڑکتی آگ میں صرف بدبخت ہی داخل ہوگا۔ آگے بدبخت کی خود تفسیر فرماتے ہیں: ﴿الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى﴾ أشقى بدبخت وہ ہے جس نے حق اور حسنیٰ کی تکذیب کی اور ایمان سے روگردانی کی۔

شقاوت کی اقسام کا مختصر بیان:

شقاوت، بدبختی ومحرومی اور ناکامی کو کہتے ہیں، شقاوت کی دو قسمیں ہیں: دنیوی اور اخروی:

(۱) دنیوی شقاوت تنگدستی، مسکنت، بدنامی، بیماری، شکست وناکامی، لاچاری، ذلت، مال واولاد، تجارت، زراعت وغیرہ کا نقصان وغیرہ۔

(۲) شقاوت اخروی، جس کی چند قسمیں ہیں:

① ...... عبادات میں کاہلی وسستی اور ارتکاب صغائر۔

② ...... فسق ونافرمانی اور ارتکاب کبائر کے ساتھ عدمِ توبہ۔

③ ...... کفر وشرک کا ارتکاب، یا منافقت اور حیلہ سازی۔

دنیوی شقاوت عارضی اور چند روزہ محرومی ہے، جو چنداں مضر اور تباہ کن نہیں اور قابل اعتناء بھی نہیں، جبکہ اخروی شقاوت نہایت اہم ہے۔ اس کی پہلی قسم بھی ادنیٰ درجہ کی ہے، جو عبادات وحسنات اور تکالیف ومصائب سے زائل ہوجائے گی۔ دوسری قسم بھی ابدی نہیں جو شفاعت یا فضل وکرم الٰہی سے دور ہوجائے گی، زیادہ سے زیادہ عذابِ قبر، حشر، اور دوزخ میں ایک متعین عرصہ تک رہ کر زائل ہوجائے گی۔ البتہ تیسری قسم نہایت خطرناک، تباہ کن اور ابدی ہے، جس کی مغفرت کا کوئی امکان وصورت نہیں، اور کسی تدبیر سے زائل نہیں ہوسکتی۔ اس تیسری قسم کے لوگوں کو قرآن حکیم نے أشقى سے تعبیر فرمایا، جن کی صفتِ کذب وتولی ہی قرار دیا۔

ایک اشکال اور اس کے جوابات:

الْاَشْقَى کی صفت ﴿الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى﴾ اور حصر بالا سے بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ گناہگار مؤمن جو تکذیب وتولیٰ کا مجرم نہیں دوزخ میں نہیں جائے گا، حالانکہ بے شمار نصوص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہگار مؤمن نے اگر توبہ نہ کی، یا کسی کی شفاعت سے یا خاص رحمت سے اس کو معاف نہ کردیا گیا، تو وہ مؤمن فاسق بھی جہنم میں جائے گا

اور اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر ایمان کی برکت سے آخر کار جنت میں جائے گا، اہلسنت والجماعۃ اسی کے قائل ہیں۔

لیکن آیت کے ظاہری الفاظ چونکہ اس کے خلاف ہیں اس لئے ضروری ہے کہ آیت شریفہ کا مطلب ایسا ہو جو دوسری آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ کے خلاف نہ ہو، مفسرین حضرات نے اس آیت کی بہت سی توجیہات کے ذریعے اس شبہ کو حل فرمایا ہے:

(۱) اَشْقٰی صیغہ اسم تفضیل بمعنی شقي صیغہ صفت مشبہ ہے، اور ﴿كَذَّبَ وَتَوَلّٰی﴾ کی قید احترازی نہیں بلکہ قید واقعی ہے، کیونکہ عموماً ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ مؤمن شقی نہیں ہوتا، ایمان پرہیزگاری اور سعادت ہی کو چاہتا ہے، شقی اور گناہگار عموماً کافر ہی ہوتا ہے، مؤمن سے اگر گناہ سرزد بھی ہوجاتا ہے تو جب تک وہ رو دھو کر اس کو معاف نہ کرالے اس کو چین نہیں ہوتا۔

(۲) اَشْقٰی بمعنی شقي ہے، اور تکذیب وتولّی عام ہے اعتقاداً ہو یا لساناً ہو یا صرف عملاً قلبی ولسانی تکذیب وتولّی کفر اور نفاق ہے، اور عملی فسق ہے، کیونکہ فاسق حرمت کا اعتقاد واقرار کے باوجود ممنوعات کا ارتکاب کرتا ہے، لہٰذا یہ لفظ کافر منافق فاسق سب کو مشتمل ہے۔

(۳) اَشْقٰی اپنے تفضیلی معنی پر ہے، اور اس سے مراد کافر ہی ہے، مگر یہاں دخولِ جہنم سے مراد وہ دخول ہے جو ہمیشہ کے لیے ہوگا، اور ایسا دخول صرف کافر کے ساتھ مخصوص ہے، مؤمن بالآخر کسی نہ کسی وقت اپنے گناہوں کی سزا پوری کرنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

(۴) لَا يَصْلٰهَا. کی ''هَا'' ضمیر اس نَارًا کی طرف لوٹ رہی ہے جس کی صفت تَلَظّٰی مذکور ہے، صرف نَارًا کی طرف راجع نہیں، مطلب یہ ہے کہ بھڑکتی ہوئی نارِ شدید میں صرف کافر ہی داخل ہوگا، مؤمن فاسق نارِ شدید میں داخل نہ ہوگا، بلکہ جہنم کے بالائی طبقے میں داخل ہوگا، جہاں کم درجہ کی آگ ہوگی، اس توجیہ پر بھی لفظ اَشْقٰی اپنے تفضیلی معنی پر ہوگا۔

(۵) حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اَلْاَشْقٰی کا مصداق کافر ہی ہے، اور لفظ نَارًا بھی اپنے عموم پر ہے، کیونکہ جب دنیا کی آگ بھی شعلہ زن ہوتی اور بھڑکتی ہے تو جہنم کی آگ تو اس دنیوی آگ سے بدرجہا تیز ہے، خواہ وہ کسی بھی طبقہ کی ہو۔ وہ شعلہ زن ہوگی مگر اس آیت شریفہ میں حصر حقیقی نہیں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ کافر ہی جہنم میں جائیں گے، بدکار مؤمن نہیں جائیں گے، بلکہ حصر اضافی ہے جس کے پیش نظر

مطلب یہ ہوگا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو مؤمن موجود تھے وہ جہنم میں نہیں جائیں گے، اس طرح اس آیت شریفہ سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی صحابی جہنم میں نہیں جائے گا، چنانچہ اہل السنت والجماعة کا اس بات پر اجماع ہے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم عادل اور جنتی تھے، کوئی ان میں فاسق نہ تھا، آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ اس پر شاہد ہیں جن کا انکار کفر ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب جہنم سے محفوظ ہیں:

حضرت شیخ سعدی نے تو انہیں کے متعلق کہا تھا:

بگفتا من گلے ناچیز بودم ☆ ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہمنشین درمن اثر کرد ☆ اگر نہ من ہمان خاکم کہ ہستم

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت نے انہیں تطہیر وتزکیہ اور طہارت ظاہر و باطن کے اس بلند و بالا مقام پر پہنچایا جس سے مزید ارتفاع و بلندی کا تصور ہی نہ ہو، یہی حضرات صداقت نبوت کے تو اوّلین پروانے اور صداقت نبوت پر سچے عادل گواہی اور شہادت دینے والے ہیں، اور پورے عالم پر کلمہ حق وصداقت کو عام کرنے والے پھیلانے والے ہیں۔

مقامِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:

دعوائے نبوت کی صداقت وحقانیت پر گواہی دینے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر قسم کے فسق ومعاصی سے محفوظ رہے، ان کے ایک ادنیٰ فرد کا مقام ومرتبہ اتنا اونچا ہے کہ اس کا تصور ہی ممکن نہیں۔ قطب الاقطاب حضرت اقدس شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جن گھوڑوں پر سواری کی ان گھوڑوں کے ناک کا گرد وغبار بڑی بڑی ہستیوں کی آنکھوں سے افضل ہے، اور انہوں نے جن مبارک آنکھوں سے حضرت حبیب کبریاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی زیارت کی وہ آنکھیں امت کے بڑے بڑے قطب واوتاد اور اولیاء کرام سے افضل و بابرکت ہیں، ان کا مقام پوری امت سے بلند و بالا ہے، اور وہ سارے صدیقیت کے مقام ومرتبہ پر فائز ہیں۔

ان کا مرتبہ انبیا کرام علیہم السلام کے بعد ہے، اول تو ان حضرات میں سے کسی سے صغیرہ گناہ کا صدور بہت ہی شاذ ونادر ہوا ہے، اور اگر اتفاقاً کسی سے کوئی گناہ سرزد بھی ہوا تو اس نے فوراً توبہ کرلی ہے، ان کے خوف وخشیت،

اتقاء وامتثال کے حالات اس پر شاہد ہیں۔ دوم ان کے حسنات اتنی بکثرت (زیادہ) ہیں کہ گاہے کسی سیئہ کا صدور یقیناً معاف ہوگا، إن الحسنت یذهبن السیات (نیک اعمال برے اعمال کا کفارہ بنتے ہیں) اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ایسا پاکیزہ عمل ہے جو کہ تمام اعمالِ حسنہ پر غالب ہے۔

اسلامی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں (حقیر ہی سہی) جس کے متعلق سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح ہدایات اور رہنمائی نہ کی ہو، اسی بنیاد پر ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین و شریعت تمام ادیانِ سماویہ کا خلاصہ اور جامع ہے، اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے جامع الفاظ میں یوں واضح فرمایا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدة:۲] (آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا)۔

پھر خیر القرون کی تاریخ تواتر کے ساتھ اس پر گواہ و شاہد عدل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین و شریعت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا کہ جس کو انہوں نے عملی جامہ نہیں پہنایا ہو، یا فرموداتِ کتاب و سنت میں ان سے کوئی فروگزاشت ہوئی ہو، یا کسی سنت کو کسی مصلحت کے تحت نظر انداز کیا ہو وغیرہ۔

قرآن کریم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ [النساء:۹۵] (اور خدا نے سب سے نیکی (ثواب) کا وعدہ کیا ہے)۔ یعنی ان میں سے ہر ایک کے لئے اللہ ربّ العزّت نے حسنیٰ، یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے، اور دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾ [الأنبياء:۱۰۱] (جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ مقدر ہو چکی ہے وہ دوزخ سے دور رہیں گے)۔ پہلی آیات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے جنتی ہونے کی بشارت ہے۔ دوسری آیت میں سب کے لئے دوزخ سے بری ہونے کا بیان ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جہنم کی آگ اس شخص کو نہیں چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا ہے۔ [ترمذي عن جابر رضی اللہ عنہ]

اس کے علاوہ قرآن کریم کی بے شمار آیات اور ہزاروں صحیح احادیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و مدح میں موجود ہیں، کہیں ان کی صفات، کہیں ان کے لئے مغفرت و رضوان کا وعدہ ہے، کہیں ان کے ایمان کو معیار قرار دیا گیا ہے اور کہیں ان کے اعمال کو، چنانچہ کتب حدیث میں ''کتاب المناقب'' کے ابواب انہیں حقائق کے بیان و توضیح سے بھرے پڑے ہیں، اسی وجہ سے محققین علماء امت نے روافض کے کافر ہونے پر اجماع و اتفاق کیا ہوا ہے، کیونکہ

روافض ان کو برا کہتے اور ان پر تبرا کرتے ہیں، اور وہ قرآن واحادیثِ صحیحہ کے منکر ہیں، اور یہی چیز ان کے کفر کی علامت وثبوت ہے وغیرہ۔ مزید معلومات کے لیے "منهاج السنة، إزالة الخفاء، تحفة اثنا عشرية" وغیرہ کتب کا مطالعہ کیا جائے۔

﴿وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى﴾ دوزخ سے اتقیٰ ضرور بچ جائے گی۔ حرف سین تحقیق کے لیے ہے، أتقى بڑا متقی، یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے، اشقیٰ کا مقابل ہے، قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۳] (خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزّت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے)۔

یہ اَتْقٰی کا مقام بہت ہی بلند ہے، یہ مقام اس شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جو شرک جلی وخفی اور جسمانی وقلبی اور نفسانی تمام گناہوں سے (حتی کہ خلاف اولیٰ اور لایعنی امور سے) پرہیز کا خوگر وعادی ہو، اور صاحب نفس مطمئنہ و نفس مزکیٰ ہو، یہ اتقیٰ عام متقی مؤمن سے کئی درجہ بلند وبالا شخصیت کا نام ہے۔

﴿اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى﴾ وہ مصارف خیر میں اس غرض سے مال خرچ کرتا ہے کہ صاف ستھرا اور پاک ہو۔ ریاکاری، شہرت طلبی، مکافات وغیرہ اغراض فاسدہ اس کے پیش نظر نہیں ہوتیں، بلکہ ترقی درجات، طہارت و پاکیزگی، صفا باطن، طہارت ونمو زیادتی مال ونفس اس کا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں اتقیٰ کی قید احترازی نہیں، بلکہ واقعی نفس الامری ہے، جس کا مصداق سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ ہے۔

اَتْقٰی اور اَشْقٰی سے مراد کون لوگ ہیں؟

اس کی وضاحت اور اسباب نزول کا بیان:

آیاتِ قرآنیہ میں عموم ہے جو بھی بخیل، بے پروا، منکرحق اور بے رخی کرنے والا ہوگا وہ اَشْقٰی کا مصداق ہوگا، اور جو شخص صاحب ایمان، سخی، راہ خداوند تعالی میں اس کی رضاجوئی کے جذبہ سے خرچ کرنے والا، اعلیٰ درجہ کا متقی اور پرہیز گار ہوگا وہ اَتْقٰی کا مصداق قرار پائے گا۔ اگر سبب نزول آیت کا خاص بھی ہوتا ہے تو آیات کے عموم پر مخصوص سبب اثر انداز نہیں ہوتا، العبرة لعموم الألفاظ لا لخصوص الأسباب۔ یعنی خصوصِ اسباب عمومِ الفاظ و معانی پر اثر انداز نہیں ہوگا، اور عمومی معنی ہمیشہ ہر مقام پر جاری وساری رہے گا۔

کلامِ الٰہی کے نزول سے مقصود ہدایت وتزکیہ کا عام نفع ہوتا ہے، البتہ کسی خاص واقعہ سے اس نوع کے واقعات کی وضاحت مقصود ہوتی ہے، مثلاً یہاں کسی خاص اشقی اور مخصوص اتقی کے حال ومآل کو ذکرِ اشخاص کے

ساتھ مخصوص کر دینا یا خود تراشیدہ خیالات کے سانچہ میں ڈال دینا نہایت سخت غلطی ہوگی، مثلاً روافض اہل سعادت کے احوال ونتائج کو آل بیت کے ساتھ اور اہل شقاوت کے احوال وانجام کو ان لوگوں کے ساتھ جن کو انہوں نے اہل بیت کا مخالف قرار دیا ہے چسپاں کر دیتے ہیں، یا اہل بدعت نصوص کو کھینچ تان کر اور تاویلاتِ رکیکہ بعیدہ کے ذریعہ اپنی بدعات کا متدل بناتے ہیں، یا صوفیاء تمام آیات کو توحید وجودی (وحدۃ الوجود) نفس وروح قرب واحوال و مقامات وغیرہ پر چسپاں کرتے ہیں، حالانکہ نزول قرآن کے وقت ان اصطلاحی مسائل کا وجود بھی نہ تھا۔

مطلب یہ نہیں کہ قرآن مجید میں علماء، صلحاء، اہل بیت، صحابہ اور اولیاء کے کارناموں کا وجود یا مدح نہیں، یا اس میں روح ونفس مقامات واحوال توحید واشواق کی طرف اشارہ نہیں، ضرور ہے، مگر مقصد یہ ہے کہ تمام آیاتِ قرآنیہ کو اسباب نزول پر مقید ومنحصر کرنا، یا اپنے ذہنی رخ پر موڑ دینا یقیناً کلام الٰہی پر زیادتی ہے، اور نزول کلام الٰہی کے مقاصد کے خلاف ہے۔

قران حکیم کا مفہوم ومطلب اور نزول کسی خاص شخص یا کسی خاص وقت کے لیے نہیں، وہ ساری مخلوقات کے لیے قیام قیامت تک ہدایت اور مشعل راہ ہے، البتہ خاص وقت اور خاص شخصیت کے لیے نزول ایک سبب و بہانہ ہی ہوگا، مگر مفہوم ومطلب کا عموم اس سے ہرگز متاثر نہ ہوگا، کیونکہ اسباب نزول خاص چند مواقع اور معدود چیزوں کے لیے ہوتا ہے، جبکہ پورے قرآن کے نزول اور ہزاروں تنزیلات اس سے مستثنٰی اور بلا سبب کے ساتھ ہیں، اسی بنیاد پر بعض علماء محققین اسباب نزول کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے ہیں، اور شان نزول کو اہمیت نہیں دیتے ہیں۔

پس ان آیات کریمہ میں بھی نزول قرآن حکیم کے وقت اَتقٰی اور اَشقٰی کی طرف اشارہ ضرور ہے، چنانچہ اَتقٰی سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ یہ آیات مکی ہیں اور مکی زندگی میں مسلمانوں میں ﴿یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی﴾ کا مصداق اگر کوئی بھی فرض کیا جائے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اور کوئی متصور نہ ہوگا۔

مناقب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:

اول تو اس وقت مسلمانوں میں ان کے سوا کوئی بڑا مالدار نہ تھا، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم وغیرہ اتنے مالدار نہ تھے جو اس آیت کے مصداق متصور ہوں، صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی بڑے مالدار تھے، جن کا مال بے دریغ راہ خداوند تعالی میں صرف ہوتا رہا، جنہوں نے پریشان حال مسلمان غلاموں کے آزاد کرنے میں بڑی دلچسپی لے کر انہیں کفار کے قید و بند سے آزاد کرا کر، نیز

رحمة للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم پر اور دیگر مسلمانوں پر بے دریغ مال صرف کرتے رہتے تھے۔

انہوں نے بڑی دلچسپی اور جان نثاری کے ساتھ حضرت بلال حبشی، حضرت زنیرۃ، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت مہدیہ اور ان کی بیٹی حضرت اُم عبیدہ رضی اللہ عنہم اور چند دیگر غلاموں اور کنیزوں کو جو کفار کے ظلم وستم کے نشانہ بنے ہوئے تھے اور ان کے مالک کفار جیسے امیہ بن خلف وغیرہ کے ہاتھوں طرح طرح کی سزاؤ عذابوں میں مبتلاء رہتے تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بڑی رقم کے عوض انہیں خرید کر آزاد کرلیا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا کہ مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں پہنچایا جتنا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال نے پہنچایا ہے۔

اسی لئے تمام مفسرین حضرات کا اتفاق ہے کہ اَتقٰی کا اول مصداق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، اور یہ آیات انہیں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، گویا کہ ان صفات مذکورہ کا حامل جو بھی ہوگا وہ مصداق آیت قرار پائے گا، اور اَشقٰی کا مصداق اول امیہ بن خلف ہے، گو اس جیسے تمام اشخاص اس کے مفہوم میں آجاتے ہیں۔

فائدہ:

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مناقب وفضائل اور اعمالِ حسنہ آسمانوں کے ستاروں سے زیادہ ہیں، کتب سیرت وتاریخ نے انہیں بسط وتفصیل سے بیان کیا ہے، فلیراجع۔

﴿وَ مَا لِاَحَدٍ عِنۡدَہٗ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ تُجۡزٰۤی﴾ اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہ تھا کہ اس کا بدلہ دیا جاتا۔

مستدرک حاکم میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جس مسلمان کو کفار کے ہاتھ میں قیدی دیکھتے اس کو خرید کر آزاد کردیتے تھے، اور اکثر ایسے لوگ کمزور غلام اور باندی ہوتے اور عموماً بے سہارا ہوتے تھے۔

ان کے والد حضرت عثمان ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ جب تم غلاموں کو ازاد ہی کرتے ہو، تو ایسے غلاموں کو آزاد کیا کرو جو قوی اور طاقتور ہوں، جو کل تمہارے دشمنوں کا مقابلہ اور تمہاری حفاظت کرسکیں، یہ سارے کمزور لوگ ہیں، تمہاری کچھ بھی نصرت نہیں کرسکیں گے، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا مقصد ان آزاد کردہ غلاموں سے کوئی دنیوی فائدہ اٹھانا نہیں، بلکہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے انہیں آزاد کرتا ہوں، اور ان کے ایمان کی حفاظت کی خاطر انہیں خرید کر کے آزاد کررہا ہوں۔ حضرت حق سبحانہ نے اس صدقِ نیت اور خلوصِ کامل کی تصدیق فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰی﴾ یعنی ان کا مقصد وغرض عالیشان پروردگار کی رضا کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضاء میں دوسرے طاعات کے مقابلے میں بے دریغ مال خرچ کرنا بڑا مشکل کام ہے، پھر بلا غرض خرچ کرنا اور بھی مشکل ہے، نام ونمود اور شہرت بھی نہ ہو، کسی احسان وبدلہ کا لحاظ بھی نہ ہو، اور ایک کے بجائے کئی گنا زیادہ بھی ہو، یہ ہر شخص کا کام نہیں، جیسے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایمان ساری امت کے ایمانوں پر بھاری ہے، اسی طرح ان کا ہر عمل امت کے تمام اعمال پر بھاری ہے، بایں وجہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے رشک کرتے ہوئے کہا کہ میرے سارے اعمال لے لیں اور صرف غار ثور میں تین راتوں کا عمل مجھے دیدیں، تو میں سعادت مند شمار ہوں گا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک رات آسمان کے ستاروں کو دیکھ کر میں نے عرض کیا اور کہا: یارسول اللہ! کوئی شخص ایسا بھی ہے کہ اس کے اعمال ستاروں کے برابر ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں! عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے حسنات آسمان کے ستاروں جتنے ہیں، پھر میں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا، تو فرمایا: اس کے اعمال ستاروں سے کہیں زیادہ ہیں۔

پس عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ستاروں جتنے اعمال کی پیش کش فرمارہے ہیں، صرف غار ثور کے عمل کے مقابلے میں، یہی تو صدیقیت کا مقام اتقی ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایک ''نسطاس'' نامی بڑا ہوشیار اور قابل غلام ہوتا تھا، جس نے دوہزار دینار بھی جمع کیے تھے، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے مسلمان بنانا چاہا، مگر وہ اس سعادت سے محروم رہا، امیہ بن خلف نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے چالیس اوقیہ چاندی کے ساتھ اس غلام کا بھی مطالبہ کیا، مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بلا چون وچرا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے عوض ''نسطاس'' غلام اور چاندی دونوں راہ خدا میں دیدیئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر کے آزاد کرلیا، اس پر امیہ مشرک نے طنزاً کہا: ابوبکر! تم بڑے گھاٹے میں رہے، مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا: میرا سودا بڑا حیرت انگیز اور نفع بخش رہا اور رہے گا۔ یہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ساتویں غلام تھے، اس کے علاوہ اور چھ غلام اور باندیوں کو خرید کر آزاد کردیا تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ان آیات کے بعد بھی اگر کوئی شخص صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام ومرتبہ کو نہ پہچانے تو اس کے قلب پر آفتاب ایمان کا نوادر پرتو بھی نہیں پڑا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ☆ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

﴿وَلَسَوۡفَ يَرۡضٰی﴾ یَرۡضٰی کی ضمیر اگر رب تعالیٰ شانہ کی طرف راجع ہو تو یہ معنی ہوگا کہ ان کا پروردگار

ان سے ضرور راضی ہوگا، اوراگر یَرْضیٰ کی ضمیر اَتْقٰی کی طرف راجع ہوتو معنی یہ ہوگا کہ یہ اَتْقٰی اپنے ربّ سے ضرور راضی رہے گا، کیونکہ ربّ العزّت اسے جب اپنے خصوصی انعام سے نوازے گا اور بلند وبالا درجات پر جب انہیں پہنچائے گا تو یہ اَتْقٰی بہت خوش اور راضی ہوجائیں گے۔ یہ آیت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق اسی طرح ہے جس طرح آئندہ آنے والی سورۂ ضحیٰ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا گیا: ﴿وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ [الضحی:۵] (اور تمہیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہوجاؤ گے)۔

یہاں دونوں مطلب درست ہیں، اور دونوں کا مآل ایک ہی ہے۔

بخت اگر مدد کند دامنش آرم بکف ☆ گر بکشم زہے طرب ور بکشد زہے شرف

یعنی اگر قسمت کی مدد سے محبوب کا دامن ہاتھ میں آجائے پھر میں اس کو کھینچ لوں تو زہے نصیب! اور اگر وہ کھینچ لے تو زہے شرف۔

صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جو شخص ایک جوڑا (مثلاً دو اونٹ، دو گھوڑے، دو درہم، دو غلام کی آزادی وغیرہ) اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے اسے جنت کے داروغے (فرشتے) پکاریں گے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ادھر سے آؤ! یہ دروازہ سب سے بہتر ہے، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! کوئی ضرورت تو ایسی نہیں، لیکن فرمائیے! کوئی ایسا بھی ہے جو کہ جنت کے تمام دروازوں سے بلایا جائے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ تم ان میں سے ہو۔ [بخاري]

خدا پرست اور مفاد پرست سربراہوں کی صحیح پہچان:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو اس وقت آپ کا شمار مکہ کے بڑے تاجروں اور سرمایہ داروں میں ہوتا تھا، وہ ان دنوں تقریباً چالیس ہزار دراہم و دنانیر اور بہت سے غلاموں کے مالک تھے، یہ سرمایہ اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑا مال شمار ہوتا تھا، مگر انہوں نے یہ سارا مال اشاعتِ اسلام اور مفلوک الحال فقیروں، محتاجوں اور مسلمان غلاموں وغیرہ پر صرف کرنا شروع کیا، اور اپنا مال اپنے ربّ کی اطاعت میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد میں دل کھول کر خرچ فرماتے رہتے تھے، ہر مسلمان کے ساتھ احسان وسلوک جاری رکھتے تھے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کے لئے جتنے لوگ تھے خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سب کے سب پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے احسانات کے بار تھے، یہاں تک کہ عروۃ بن مسعود جو قبیلہ ثقیف کے سردار تھے،

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسے ڈانٹا اور سخت تلخ باتیں سنائیں، تو اس نے کہا کہ اگر آپ کے احسانات مجھ پر نہ ہوتیں، جن کا بدلہ میں ابھی تک نہ دے سکا، تو میں آپ کو ضرور جواب دے دیتا، پس جبکہ عرب کے سردار اور قبائل عرب کے بادشاہ کے اوپر آپ کے اس قدر احسان تھے کہ وہ سر نہیں اٹھا سکتا تھا، دوسروں کا کیا کہنا۔ یہی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہجرت کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر ہجرت پر روانہ ہو رہے تھے صرف چھ ہزار درہم آپ کے پاس تھے، والد محترم نابینا تھے کہنے لگے: ابو بکر! تم اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ جا رہے ہو، تمہارے بچوں کا کیا بنے گا؟ کہنے لگے: میرے بچے اللہ پاک کے سپرد ہیں، جب روانہ ہوئے تو حضرت والد نے بچیوں سے پوچھا: تمہارے والد نے تمہارے لئے کیا مال چھوڑا؟ حضرت اسماء کہتی ہے: میں ڈیڑھ دو سیر پتھر اپنے دوپٹہ پر ڈال کر دادا کے پاس آئی اور کہا: دادا جان! یہ دیکھو! یہ سب چاندی ہمارے لئے چھوڑ کر چلے گئے، جب انہوں نے ہاتھ لگایا، تو کہنے لگے: ہاں بیٹی اب مجھے کوئی فکر نہیں، حالانکہ وہ پتھر تھے، چاندی کیا چونکہ وہ آنکھوں سے معذور تھے، لہٰذا شناخت نہ کر سکے۔

یہی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بیت المال سے خلافت کے دوران یومیہ صرف دو درہم اپنے کثیر اہل وعیال کے لئے لیتے رہے، اور ساتھ روتے رہتے تھے، جب اس کی وفات کا وقت آیا تو یہ نادار فقیر تھے، ترکہ میں ایک دینار بھی نہیں چھوڑا، جس چادر میں بیماری کے ایام گزارے وصیت کی کہ مجھے اسی میں دفنا دینا، جائیداد و جاگیر کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

یہی حال حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا رہا، دورانِ خلافت کسی رشتہ دار عزیز کو کوئی منصب نہیں دیا، یہ حضرات اسلام میں دولت وسرمایہ لے کر آئے تھے، مگر فقیر بن کر دنیا سے رخصت ہوئے اور مقروض رہے، یہی پہچان وشناخت ہے خدا پرست سربراہوں کی۔ کاش! ہمارے موجودہ سربراہ اور سیاسی لیڈروں نے اسلام وقرآن سے سبق سیکھا ہوتا۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر ☆ ہم خوار و ذلیل ہوئے تارک قرآن ہو کر

سُورَۃُ الضُّحٰی

مکیۃ آیاتہا ۱۱ رکوعہا ۱

سورۂ ضحیٰ مکی ہے، اس میں گیارہ (۱۱) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الضحی ہے، پہلی آیت کے پہلے کلمہ الضُّحٰی سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول سورۃ الفجر کے بعد ہے۔ نزول کے اعتبار سے سورۃ الفجر دسویں اور سورۂ ضحیٰ گیارہویں سورت ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس کی گیارہ (۱۱) آیتیں ہیں، چالیس (۴۰) کلمات اور ایک سو بانوے (۱۹۲) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

اس سے پہلی سورت میں لیل ونہار کی قسم کھائی گئی، اس سورت میں بھی ان دونوں کی قسم مذکور ہے، وہاں اشقی کی مذمت اور وعید کا ذکر تھا، یہاں بھی اشقیاء کی مذمت وتردید ہے۔ وہاں اتقی (حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ) کی شان اور یہاں سرچشمہ ہدایت (سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان اطہر کا بیان ہے، وہاں شان صدیقی ﴿وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى﴾ [اللیل:۲۱] (اور جلد راضی ہوجائے گا) کا بیان ذکر تھا، یہاں ﴿وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ میں

شان نبوی کا بیان ہے۔ وہاں ﴿مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى﴾ [اللیل:۱۹] کا تذکرہ تھا، یہاں ﴿وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ تحدیث شکرِ نعمت کا تذکرہ ہے۔

مختصر موضوع:

ناداں، کم ظرف اور ناعاقبت اندیش انسانوں کے توہمات اور فاسد خیالات کی بڑی قوت کے ساتھ اور نہایت حکیمانہ انداز میں تردید و بیخ کنی کی جارہی ہے، ساتھ ساتھ محبوب عالم حبیب کبریاء صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا تذکرہ ہورہا ہے، پھر ان عظیم لطائف وکرامات اور بے پایاں عنایات واحسانات کا بیان ہے جو ربّ العالمین رحمٰن ورحیم عزّ شانہ نے اپنے محبوب ترین ''رؤف ورحیم'' بندے اور رسول پر فرمائے ہیں۔ اس کے ساتھ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے لئے ابر رحمت بنا کر سارے جہاں پر برسنے اور انہیں سلیقہ وآداب سکھانے کا تذکرہ ہے، اور پھر انہیں ناتواں وضعیف انسانوں پر ترحم وشفقت کا حکم دیا جارہا ہے، اور خدائی نعمتوں پر شکر کا حکم ہے۔

شان نزول سورۃ الضحیٰ:

أخرج أحمد و عبد بن حميد و البخاري و مسلم و الترمذي و النسائي و أبو نعيم و البيهقي، و ابن جرير و الطبراني عن جندب بن سفيان البجلي رضي الله عنه قال: اشتكى النبي صلى الله عليه وسلم فلم يقم ليلتين أو ثلاثا فاتته امرأة فقالت: يا محمد! ما أرى شيطانك إلا قد تركك لم نره قربك ليلتين أو ثلاثا، فأنزل الله: و الضحى و الليل اذا سجى۔ [در منثور]

ترجمہ: جندب البجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت مبارکہ درست نہ رہی، چنانچہ آپ دو یا تین راتیں شب خیزی نہ فرماسکے، ایک گستاخ عورت آئی اور آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگی: مجھے یوں معلوم ہورہا ہے کہ تیرا شیطان تجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے، ہم نے دو تین رات سے اسے تمہارے قریب آتے نہیں دیکھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

البتہ! فرق ضرور ہے کہ بخاری میں حضرت جندب بن سفیان کی جو روایت ہے اس میں تہجد کے لیے نہ اٹھنے کا ذکر ہے، وحی میں تاخیر کا ذکر نہیں، اور ترمذی کی روایت میں تہجد کے لئے نہ اٹھنے کا ذکر نہیں، بلکہ صرف وحی میں تاخیر کا ذکر ہے۔ بظاہر دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں پیش آئی ہوں، راوی نے کبھی ایک

کو بیان کیا، کبھی دوسرے کو، بعض روایات میں دونوں کا ذکر بھی ہے۔

یہ عورت جس نے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہو کر آپ کو طعنہ دیا، اُم جمیل بنت حرب ابو سفیان کی بہن ابولہب کی بیوی تھی، جس کے متعلق ''سورۃ اللھب'' کے اخیر میں: ﴿وَ امْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ [المسد: ۴] (اور اس کی بیوی لکڑیوں کو اٹھانے والی) کا نزول ہوا۔ اس خبیث عورت کا اصلی نام ''اروٰی بنت حرب'' ہے، اس کی کنیت ''ام جمیل'' اور لقب ''عوراء'' (کانی) ہے، اپنے بد بخت شوہر کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت بغض و عداوت رکھتی تھی، اور ہر قسم کی مخالفت، ایذا رسانی اور دشمنی میں پیش پیش رہتی تھی۔

تاخیرِ وحی کے واقعات متعدد مرتبہ پیش آئے ہیں، اور اس تاخیرِ وحی میں بہت بڑی بڑی عجیب حکمتیں ہیں۔ پہلی مرتبہ شروع نزولِ قرآن میں پیش آئی، جس کو زمانہ فترتِ وحی کہا جاتا ہے، یہ سب سے زیادہ طویل رہی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ ڈھائی سال رہی، راجح قول یہ ہے کہ یہ تین سال کے عرصے تک رہی۔

ایک واقعہ تاخیرِ وحی کا اس وقت پیش آیا جب مشرکین اور یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ''ذوالقرنین، اصحابِ کہف اور روح'' کے متعلق سوال کیا، اور آپ نے عنقریب جواب دینے کا وعدہ فرما لیا، مگر ''ان شاء اللہ'' نہ کہنے کے سبب کچھ روز تک وحی کا سلسلہ بند رہا۔ تفصیل سورۃ الکہف میں دیکھی جائے۔ اس پر مشرکین نے طعنہ زنی شروع کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا اس سے ناراض ہو گیا اور قطع تعلق کیا، اور ان کو چھوڑ دیا، اسی طرح یہ واقعہ نزولِ سورۃ الضحیٰ کا سبب بنا۔

پس یہ متعدد واقعات ضروری نہیں کہ ایک ہی زمانے میں پیش آئے ہوں، بلکہ آگے پیچھے بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مدنی زندگی میں بھی تاخیرِ وحی کے متعدد واقعات پیش آئے، ایک واقعہ ''إفک'' کے موقع پر، دوسرا جب آپ کے دولت کدہ میں چارپائی کے نیچے ایک چھوٹا سا کتے کا بچہ مر گیا تھا، جسے چار دن کے بعد وہاں سے ہٹایا گیا تھا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ''إفک'' کے موقع عام وحی جاری رہی، مگر براءتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق وحی بند رہی۔ واللہ اعلم

کرامت صدیق رضی اللہ عنہ:

حضرت اُم عمیس رضی اللہ عنہا کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کر لیا، اس دوران کسی عارضہ سے ان کی بینائی جاتی رہی تھی، کفار کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو خوب طعنے دیئے اور کہا کہ دیکھو! ہمارے معبود ''لات اور عزّیٰ'' کی

کرامت کہ انہوں نے اس کو کیسا نابینا اوراندھا کیا، حضرت ام عمیس رضی اللہ عنہا نے کہا کہ تمہارے ان بے جان معبودوں میں کوئی قدرت نہیں کہ وہ کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچائیں، یہ ایک امتحان ہے، اور یہ سب کچھ میرے قادر وتوانا معبود ربّ العزّت سبحانہ کی طرف سے ہے، پس یہ بات ربّ العزّت سبحانہ کو پسند آئی، فوراً ان کی آنکھیں روشن ہوگئیں اور بینائی لوٹ آئی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالضُّحٰی ۙ﴿۱﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ؕ﴿۳﴾ وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ
الۡاُوۡلٰی ؕ﴿۴﴾ وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ؕ﴿۵﴾ اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ۪﴿۶﴾ وَوَجَدَکَ
ضَآلًّا فَہَدٰی ۪﴿۷﴾ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی ؕ﴿۸﴾ فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡہَرۡ ؕ﴿۹﴾ وَاَمَّا السَّآئِلَ
فَلَا تَنۡہَرۡ ؕ﴿۱۰﴾ وَاَمَّا بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: قسم ہے روزِ روشن کی ① اور رات کی جب چھا جائے ② آپ کے ربّ نے نہ آپ کو چھوڑا، اور نہ آپ سے بیزار ہوا ③ اور آپ کے لیے آخرت دنیا سے بہت بہتر ہے ④ اور آپ کا ربّ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہوجائیں گے ⑤ کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا؟ پھر آپ کو ٹھکانہ دیا ⑥ اور اس نے آپ کو ناواقف پایا تو آپ کی رہنمائی کی ⑦ اور آپ کو نادار پایا تو غنی کردیا ⑧ تو آپ یتیم پر سختی نہ کیجیے ⑨ اور سائل کو نہ جھڑکیے ⑩ اپنے ربّ کے احسان کا ذکر کیا کیجیے ⑪

معارف ومنازل

اس سورت میں ضحیٰ سے چاشت کی روشنی، اور لیل سے مراد رات کی تاریکی ہے۔ یہاں ضحیٰ پہلے اور لیل کا ذکر مؤخر ہے، اور سابق سورت میں لیل مقدم اور دن کا ذکر مؤخر ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ پہلی سورت میں لیل کو نہار پر اس لئے مقدم کیا کہ واقعۃً رات پہلے آتی ہے اور دن بعد میں، چوں کہ لیل کو نہار پر تقدمِ طبعی حاصل ہے تو ذکراً بھی مقدم ہوا، اور یہاں دن کو رات پر اس لئے مقدم کیا گیا کہ دن کو رات پر فضیلت حاصل ہے، تو ذکراً بھی مقدم ہوا۔

[مظهري]

دوم یہ کہ سورۃ اللیل میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فضائل تھے، چنانچہ اس سورت کو ''سورۃ ابی بکرؓ'' بھی کہتے ہیں، اور اس سورت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل مذکور ہیں، اس لئے اس کو سورۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں، تو سورۃ اللیل میں شانِ صدیقی کا بیان ہے، وہاں لیل کا ذکر نہار سے پہلے ہے، اس لئے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی کی ابتدا میں تاریکی اور کفر تھا، پھر اسلام کی روشنی اسے نصیب ہوئی، اور اس سورت کی ابتداء والضحیٰ (روشنی) سے ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے، اور آپ کی حیات سعیدہ طیبہ ابتداء سے انتہاء تک روشن ہے، كما في الحديث: أول ما خلق الله نوري۔

قسم کے لئے ضحیٰ اور لیل کا انتخاب کیوں؟

چاشت اور رات سے قسم کیوں کھائی گئی؟ اس کے لئے چند وجوہات ہیں:

(۱) قسم کے لئے ضحیٰ اور لیل کا انتخاب اس لئے ہوا کہ جس طرح اللہ تعالی ظاہر میں اپنی قدرت وحکمت کی مختلف نشانیاں ظاہر کرتا ہے، کبھی دن کی تابانی، کبھی رات کی تاریکی اور ہر ایک کو دوسرے کے بعد ظاہر کرتا رہتا ہے، اسی طرح کیفیت باطنی کا حال ہے، اگر سورج کے دھوپ اور روشنی کے بعد رات کی تاریکی کا آنا حق سبحانہ وتعالیٰ کی ناراضگی اور خفگی کی دلیل وثبوت نہیں تو چند روز وحی کی بندش بھی اس کی علامت نہیں، بلکہ جس طرح رات کے بعد روزِ روشن کا آنا ضروری ہے اسی طرح چند انقطاع کے بعد وحی الٰہی کا آنا ضروری ہے۔

(۲) اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی اور بشارت ہے کہ جس طرح روز وشب کی آمد مسلسل دائمی ہے، اسی طرح وحی کا تسلسل بھی جاری رہے گا۔

(۳) جس طرح رات دن گھٹتے اور بڑھتے ہیں اور وہ مختلف کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی سرور وغم، مسرت وپریشانی، حزن وملال اور زبانِ خلق سے مختلف طعن وتشنیع کے حالات وکیفیات سے دوچار ہونا پڑے گا، اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ضحیٰ کہ مدّت روشنی بہ نسبت رات کے مختصر ہے، اسی طرح دنیا کی خوشیاں بہ نسبت پریشانیوں کے مختصر اور قلیل ہیں۔ واللہ اعلم

(۴) رات دن پر قسم کی یہ وجہ بھی ہے کہ اگر دن کی روشنی بغیر انقطاع کے اگر مسلسل رہے تو وہ آدمی کو تھکا دے اور کئی پریشانیوں میں مبتلا کردے، تو رات کی آمد تھکاوٹوں کے زوال کا بہترین پیغام ہے، تاکہ انسان سکون

وثبات حاصل کرے، اسی طرح اگر نور وحرارت وحی کا مسلسل رہے تو شاید قابل تحمل وبرداشت نہ رہے، اس لئے حکمت خداوندی کا تقاضا ہے کہ اس میں وقفہ دیا جائے، خاص کر ابتدائی حالات میں، کیونکہ یہ سورت باعتبار نزول کے گیارہویں سورت ہے، باقی پورے قرآن کریم کا نزول اس کے بعد ہے، تاکہ آہستہ آہستہ تحمل کا مادہ پختہ ہوتا جائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعصاب پر بوجھ نہ ہو، قرآن کریم نے فرمایا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا﴾ [المزمل: ۵] (ہم جلد آپ پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں) اسی معنی پر دال ہے۔

﴿وَ الضُّحٰى﴾ قسم ہے چاشت کی، یا دن کی۔ ﴿وَ الَّیْلِ اِذَا سَجٰى﴾ اور رات کی قسم جب وہ چھا جائے۔ جواب قسم: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى﴾ نہ ہی چھوڑا ہے آپ کو آپ کے ربّ نے، اور نہ ہی ناراض ہوا ہے۔ یہ معاندین ومشرکین کے دعویٰ کی تردید ہے۔

﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى﴾ اور پچھلی گھڑی آپ کے لیے اگلی گھڑی سے بہت بہتر ہے۔ یہاں اولیٰ سے مراد اگر دنیا ہو اور آخرت اپنے معنی پر ہو تو یہ معنی ہوگا کہ کفار ومشرکین جو آپ کو طعنہ دے رہے ہیں وہ دنیا میں تو اس کا مشاہدہ کر ہی لیں گے کہ وہ سراسر غلطی پر تھے، اور ان کے بیجا طعن وتشنیع لغو اور کذب تھے، اس سے آگے ہم ابدی ودائمی انعامات کا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کرتے ہیں کہ یہ اخروی انعامات دنیوی انعامات سے بہت زیادہ اور بہت بہتر ہوں گی۔

اگر یہاں لغوی معنی مراد ہو تو یہ معنی ہوگا کہ ہر پچھلی گھڑی ہر پہلی گھڑی سے آپ کے لئے بہت بہتر ہوگا، اور یہ حالات تسلسل کے ساتھ ایسے جاری رہیں گے کہ آپ کے لیے اور آپ کے پیغام حق کے لئے ہر آنے والا دن ہر گزشتہ دن سے بہت بہتر ہوگا، اور مسلسل آپ کی ظاہری وباطنی ترقیات میں ہر آن اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اس تفسیر میں عموم ہے، جس میں دنیوی، اخروی، ظاہری باطنی اور سارے انعامات آجاتے ہیں، اور یہ آیت اپنے اس عمومی معنی کے لحاظ سے ایک پختہ پیشینگوئی پر مشتمل ہوگی، اور آپ کے لیے بے حد بڑی خوشخبری ہوگی کہ آپ ذرہ بھر پریشان نہ ہوں، ہر بعد کا دور پہلے دور سے آپ کے لئے بہتر ثابت ہوگا، اور یہ خوشخبری آپ کی حیات حمیدہ وسعیدہ ہی میں بڑے زور وشور سے پوری ہوگئی کہ تمام قبائل عرب فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں فوج درفوج داخل ہوئے، اور پورا جزیرۂ عرب اسلام کے قلمرو میں شامل ہوکر اسلامی جہاد اور تبلیغ واشاعتِ دین میں برابر کے شریک ہوئے، جس کے نتیجے میں مختصر دور خلافت راشدہ میں ایران، عراق، شام مصر، یمن، کابل خراسان، آرمینیہ، جزائر،

بلقان، فلسطین، آذر بائیجان اور قسطنطنیہ و کچھ حصہ افریقہ کے اور مغرب کے فتوحات اسلامیہ کے دائرے میں داخل ہوئے۔

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ اور آپ کا ربّ آپ کو اتنا زیادہ نعمتوں سے نوازیں گے کہ آپ راضی ہوجائیں گے۔ صاحب مظہری نے بیہقی، طبرانی اور حاکم رحمہم اللہ سے نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ امت کی آئندہ فتوحات سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے (بحالت کشف) پیش کی گئیں، تو آپ کو بہت ہی خوشی ہوئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے شمار انعامات وعطیات دنیوی واخروی کا وعدہ فرمایا گیا ہے، مثلاً اقتدار کامل، دشمنوں پر فتح، کثرت امت، اسلام کی دور دور تک اشاعت، آخرت میں مقامِ محمود شفاعت کبریٰ، شفاعت صغریٰ، کثرت ثواب وقرب وغیرہ ایسے بے شمار عطیات جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اسی عموم کے فائدہ کے لئے يُعْطِي کا مفعول ثانی حذف کر دیا گیا۔ حضرت عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿يُعْطِيكَ رَبُّكَ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ربّ العزّت شانہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کی اجازت عطا فرمائیں گے، اور آپ کی امتؐ کو بخش دیں گے، یہاں تک کہ آپ راضی ہوجائیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

رضائے خدا تعالیٰ برضائے حبیب خدا:

خطیب نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا لا أرضى وواحد من أمتي في النار۔ [المنير] یعنی جب یہ بات ہے تو میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا جب تک کہ میری امت میں سے ایک آدمی بھی جہنم میں رہے گا۔ [سراج منیر]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ میری امت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیں گے یہاں تک کہ ربّ العزّت سبحانہ کا ارشاد ہوگا: رَضِيتَ يا محمد صلى الله عليه وسلم (اے محمد! آپ راضی ہیں) تو میں عرض کروں گا: یا رب! رَضِيتُ (اے میرے ربّ! میں راضی ہوگیا)۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک دن سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آیت تلاوت کی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول مذکور ہے: ﴿فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهٗ مِنِّيْ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ

رَّحِيمٌ﴾ [ابراھیم:۳۶] (سوجس شخص نے میرا کہا مانا وہ میرا ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے)۔ پھر دوسری آیت تلاوت فرمائی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے: ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [المائدة:۱۱۸] (اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر بخش دے تو (تیری مہربانی ہے) بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے)۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھا کر گریہ وزاری شروع کردی، اور بار بار یہ فرمایا: أمتي اللّٰهم أمتي۔ اللہ ربّ العزت نے جبریل علیہ السلام کو بھیجا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں کہ آپ کیوں روتے ہیں؟ اور یہ بھی فرمایا: اگرچہ ہم کو سب کچھ معلوم ہے۔

جبریل امین علیہ السلام نے آکر رونے کا سبب دریافت کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اپنی امت کی مغفرت چاہتا ہوں، حق سبحانہ وتعالیٰ نے جبریل امین علیہ السلام کو دوبارہ بھیجا اور فرمایا کہ جاکر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ کہہ دو کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ہم آپ کو امت کے بارے میں راضی کریں گے، رنجیدہ نہیں کریں گے۔ [مسلم]

حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اے گروہ عراق! تم کہتے ہو کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ امید دلانے اور خوش کرنے والی آیت: ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ [الزمر:۵۳] (اے پیغمبر! میری طرف سے لوگوں کو) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا، خدا تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے) ہے، اور ہم اہل بیت کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں سب سے زیادہ امید آفریں آیت: ﴿وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ ہی ہے۔

﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم پایا اور ٹھکانہ دیا۔ یہاں سے بے شمار اخروی نعمتوں کی بخشش کے اجمالی وعدہ کے بعد دنیوی چند نعمتوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

دریتیم کا بچپن، لڑکپن اور جوانی سے نبوت تک:

مذکورہ آیات میں جن نعمتوں کا تذکرہ ہے ان میں سے پہلی نعمت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے سہارا یتیم تھے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سہارا دے کر اس طرح نوازا اور پالا کہ جس کی مثال نہ ہو۔ حبیب ربّ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دنیا میں تشریف نہیں لائے تھے کہ آپ کے والد ماجد حضرت عبد اللہ کا عین جوانی میں بعمر ۲۶ سال یثرب (مدینہ منورہ میں) انتقال ہوگیا، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی مال وجائیداد چھوڑی نہ سرمایہ اور مال ومتاع۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو بے کسی ویتیمی کے ساتھ آئے، ربّ العزّت نے مہربان والدہ کی آغوش شفقت اور دادا حضرت عبد المطلب کی ایسی محبت وعنایت کے سایہ میں آپ کی پرورش فرمائی کہ حضرت عبد المطلب نے آپ کے سامنے اپنی اولاد کو بھلا دیا، مشفق ومہربان دادا نے اپنی تمام تر توجہات اپنے ہونہار دریتیم پوتے پر مرکوز کردیں۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آٹھ سال کے ہوئے تو یہ سایہ عطوفت وشفقت بھی سر سے اٹھ گیا اور حضرت عبد المطلب کا انتقال ہوگیا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابو طالب کے دل میں آپ کی ایسی بے مثال محبت ڈال دی کہ وہ اپنی حقیقی اولاد سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ اور دل جان سے آپ پر قربان ومہربان ہوگئے۔ ابو طالب آپ کی پوری توقیر واحترام کرتے تھے، اور آپ پر ہر سیاہ وسفید قربان کرتے، اور ہر طرح حفاظت ونگہداشت کرتے رہتے تھے۔

یہ سلسلہ برابر چلتا رہا اور زندگی کے ہر قسم نشیب وفراز آتے رہے اور گزرتے گئے، مگر ابو طالب کی شفقتوں میں کسی بھی مرحلہ پر کوئی کمی تو درکنار روز بروز اس کے مہر ومحبت کے مدارج میں نمایاں اضافہ ہوتا رہا، حتیٰ کہ سلسلہ رشد وہدایت نبوت ورسالت کے سورج کا طلوع ہوا، اور قوم کے طوفانی مخالفتوں کا دور شروع ہوا، مگر ابو طالب سینہ سپر ہوکر آپ کی حمایت میں بڑے بڑے مصائب وطوفانوں کا پوری قوت وعزیمت اور جرأت ودلیری کے ساتھ وہ تاریخی مقابلہ کرتا رہا جس کی کوئی مثال نہیں۔ وہ ہر محاذ پر چڑھتے بڑھتے طوفانوں کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہتے، اور اپنے نفس کو بطور ڈھال پیش کرتے رہتے، یہ بہادر شمشیر زن باوجود بت پرست مشرک ہونے کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیتا تھا اور مخالفین سے لڑتا رہتا تھا۔ درحقیقت باطن میں یہ سب کچھ ربّ العزّت کی حسن تدبیر اور فَاٰوٰی کی کرشمہ سازی اور نوازش تھی۔

مصلحت را تہمت بر آہوئے چین بستہ اند ☆ کار زلف تست مشک افشانی ما عاشقان

حدیث میں ہے: إن اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر۔ [متفق علیہ] کاش اس مخلص وجان نثار ابو طالب کو ایمان کی دولت نصیب ہوجاتی، تو یہ پوری امت کے لیے باعث فخر وسرور ہوتا، لیکن قلمِ ازل نے اس کے لیے جان نثاری وسرفروشی تحریر میں لائی تھی، مگر حرف ایمان واخلاص کو نظر انداز کیا تھا۔

یہاں تک کہ ہجرت سے پہلے جب ابو طالب کا مکہ ہی میں انتقال ہوا تو اس ظاہری سایہ کے اٹھنے کے بعد

مخالفین نے بڑے بڑے سخت گیر موقف اختیار کئے، تو اللہ ربّ العزّت نے اوس وخزرج (انصار مدینہ) کے توسط و ذریعہ سے فَآوٰى والا وعدہ پورا فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اور فَآوٰى کے سایہ میں آرام فرمایا، جس کی تاریخ بڑی لمبی اور طویل ہے، اور اس کی تمام تر سعادت انصار مدینہ کو حاصل ہے۔ واللہ اعلم

دوسری نعمت: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو ناواقف پایا تو رہنمائی فرمائی۔ بچپن کے یتیمی کے بعد شعور و شباب کا دور شروع ہوا، یہ زمانہ ولولوں اور جوانی کی امنگوں کا عجیب وغریب دور ہوتا ہے، انسانی خواہشات اپنے عروج پر ہوتے ہیں، طرح طرح کے رنگ رلیوں کا زمانہ ہوتا ہے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مادر زاد نبی و معصوم اور بچپن ہی سے سردارِ اتقیاء اور رئیس الموحدین تھے، آپ کی عفت و پاکدامنی، اخلاقِ حمیدہ، حیاتِ سعیدہ وطیبہ، صفاتِ محمودہ وسعیدہ، دیانت وامانت، صدق وتقویٰ، مکارمِ اخلاق وغیرہ سب پیدائشی اور فطری طور پر بے مثال اور ضرب الامثال تھے۔

پوری قوم اور پورے معاشرہ میں یکتا و یگانہ تھے، دوست کیا دشمن کو بھی حرف گیری اور انگلی اٹھانے کی جرأت وہمت نہ ہوتی، پوری قوم کو خطاب کرتے کہتے ہیں: "تم نے اپنے لمبے عرصے میں مجھے کیسے پایا؟" پوری قوم (موافق ومخالف) بیک زبان پکار کر کہتی ہے: ماجرّ بنا عليك إلا صدقا۔ ہم نے سچائی کے علاوہ آپ میں کچھ نہیں پایا، جس کی فطرت نیک خوئی اور سراسر نیکی ہو، مگر ہنوز نا مور پاکباز پارسا ہستی محبت ومراتب قرب ونیاز کی سنگلاخ گھاٹیوں اور اسلام قرآن، ایمان وشریعت کے ان حقائق حقہ سے واقف وباخبر نہ تھے جو آپ کو کچھ عرصہ بعد عطا فرمائے گئے، ابھی تک تو ﴿وَمَا كُنتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ [الشوریٰ: ۵۲] (تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو) کا دور دورہ رہا۔

آپ عبادت واستعانت، ذکر وتسبیح، عشق ومحبت میں شب وروز مصروف رہنے کے باوجود تفصیلات اور درجاتِ قرب ووصال سے سراسر ناواقف اور بے خبر ہوتے تھے، حتی کہ فَهَدٰى کے انوار برکات اور فیوض رحمانی کا ظہور ہوا، اور آپ کو علم الاوّلین والآخرین کا وارث وحقدار بنایا گیا اور تجلی اعظم عرش الٰہی سے آپ کے قلب مبارک پر متوجہ ہوئی، اور وجدت بردها بين ثديي کا نور ظاہر ہوا۔

یہ تمام لفظ هُدٰى کا کرشمہ اور عنایت کا نمونہ بن گیا، اور اس سے پہلے کے مراحل کا نکتہ کلمہ ضَآلًّا سے تعبیر ہوا، اور یہ بات عقل ونقل دونوں سے ثابت ہے کہ سارے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام قبل از نبوت تمام علوم و

معارف اور ہر قسم کے شرعی احکام سے ناواقف اور خالی الذہن ہوتے ہیں، جب انہیں منصبِ نبوت سے نوازا جاتا ہے اور فیضانِ وحی کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اور تحملِ وحی کے لیے ان کو شرحِ صدر کی نعمت عطا کی جاتی ہے، تو سلسلۂ ہدایت علم و معرفت کے حقائق حسب فرمانِ الٰہی: ﴿وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ﴾ [النساء: ۱۱۳] (اور تمہیں وہ باتیں سکھائی ہیں جو تم جانتے نہیں تھے)، ﴿وَمَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ [الشوریٰ: ۵۲] (تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو)۔ اور ﴿وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ [طٰہٰ: ۱۱۴] (اور دعا کرو کہ میرے پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے)۔ تدریجاً آہستہ آہستہ ترقی کناں جاری ہوجاتے ہیں۔ اسی کو: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ سے واضح فرمایا گیا۔

قرآن کریم میں ضَالّ کا کلمہ اپنے تمام مشتقات (اسماء وافعال وغیرہ) کے ساتھ مختلف معانی میں تقریباً دو سو پندرہ مقامات میں مذکور ہے، اور ہر مقام پر اسی کے سیاق و سباق کے مناسب کوئی معنی محتملہ مراد ہوتا ہے، چنانچہ موجودہ مقام پر جو معنی مراد لیا گیا یہی مناسب اور مقامِ نبوت کے عین مطابق ہے۔ یہاں دوسرے معانی کا لحاظ اس لئے نہیں ہوسکتا کہ وہ معانی یا تو جزئی قسم کے ہیں یا شانِ و مقامِ نبوت کے خلاف ہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے روح المعانی میں ایک جزئی واقعہ اس انداز میں بیان فرمایا ہے کہ ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بحالتِ صغرِ سنی مکہ مکرمہ کے کسی پہاڑ میں گم ہوگئے، اتفاق سے ابوجہل اونٹنی پر سوار ادھر سے آنکلا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سوار کرکے آپ کے دادا عبد المطلب کے پاس لے آیا، اور کہا کہ آپ کے اس بیٹے سے نہ معلوم ہم کو کیا کچھ پہنچے گا، عبد المطلب نے پوچھا کیوں؟ ابوجہل نے کہا: بچہ فلاں درے میں راستہ بھول گیا تھا، میں نے اس کو اٹھا کر اپنے پیچھے اونٹ پر بٹھلایا تو اونٹنی وہیں بیٹھ گئی، بہت کوشش کی نہیں چلی، پھر میں نے اس بچہ کو اونٹ سے اتار کر اپنے آگے بٹھلایا تو اونٹنی اٹھ کر چلنے لگی۔ (گویا جس طرح فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرائی گئی، اسی طرح اس امت کے فرعون (ابوجہل) سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے دادا عبد المطلب تک پہنچانے کی خدمت لی گئی۔ [روح المعاني]

فائدہ لطیفہ:

جمہور علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہر قسم کی صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے معصوم اور پاک ہیں، اور ابتداء ہی سے کفر و شرک کبائر اور ہر قسم کی ظاہری و باطنی گندگیوں اور تمام عیوب و نقائص سے مبرا اور

پاک ہوتے ہیں، ان میں کوئی بات قابل نفرت نہیں ہوتی، ان کو اعلیٰ خاندان، اعلیٰ بلند و بالا اخلاق، اعلیٰ صورت و سیرت پر پیدا کیا جاتا ہے، ان کی پیدائش وضع وحمل اور دیگر تمام انسانوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ ابتداء پیدائش سے منصب نبوت اور انتخاب رسالت تک مسلسل من جانب اللہ ان کی نگہداشت اور حفاظت ہوتی ہے، کیونکہ ان کو مخلوق کا ہادی و رہبر بنانا ہوتا ہے، اس لئے ان میں کوئی چیز قابلِ نفرت ہونا عقل ونقل اور مقصود خداوندی کے خلاف ہے۔

نبی اس عظیم برگزیدہ ہستی ہی کا نام ہے کہ جس کا دامن ہر قسم کی آلائشوں سے پاک اور بے داغ ہو، قبل از نبوت کا دور ہو یا بعد نبوت، وہ ہر لحہ و ہر لحظہ ربّ العزّت کی حفاظت ونگرانی میں ہر عیب ونقص کے ورود سے محفوظ ہوگا۔ پس لفظ ضَالّ سے اگر کوئی کج فہم، ناعاقبت اندیش اور منصب نبوت کی طہارت و پاکیزگیوں سے نابلد کوئی دوسرا معنیٰ متعین کرے گا تو اس کا شمار مَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ اور ضَالِّین و مَلْعُوْنِینَ میں ہوگا۔ من أهان أنبياء الله تعالى أو قال فيهم مالا يليق بجنابهم و شأنهم فعليه لعنة الله و الملئكة و الناس أجمعين۔ [روح المعاني، كبير]۔

از خدا خواہیم توفیق ادب ☆ بے ادب محروم گشت از فضل ربّ

تیسری نعمت: ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلاً فَأَغْنٰى﴾ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنگدست وعیالدار پایا تو غنی کر دیا۔ عمر شریف کی تیسری حالت ہے جس میں آپ عیالدار تھے، صرف اپنے خاندانی اہل وعیال کے بوجھ کا مسئلہ نہیں، بلکہ قبل از نبوت آپ کا یہ حال ہوتا تھا کہ تحمل الكلّ و تكسب المعدوم و تعين على نوائب الحق و تقري الضيف و تصل الرحم۔ آپ کا شمار اعلیٰ درجہ کے صلہ رحمی کرنے والوں میں ہوتا تھا، آپ تنگدست مفلوک الحال محتاجوں کی ہر ممکن مدد کرتے تھے، آپ دوسروں کا بوجھ اپنے اوپر اٹھاتے تھے۔

آپ کی کمائی دوسروں پر وقف ہوتی تھی، آپ بڑے پایہ کے مہمان نواز ہوتے تھے، آپ ہر کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اور حال یہ کہ آپ خود فقر فاقہ اور تنگدستی کے مدارج میں زندگی گزارتے تھے، آپ کے پاس کوئی سرمایہ، تجارت، ذراعت، ملازمت اور صنعت وغیرہ کوئی چیز نہ تھی، مگر ربّ العزّت نے اپنے فضل سے آپ کو ہر طرح غنی کر دیا، غناء قلبی کا تو یہ عالم ہے کہ آپ سید الاغنیاء ہیں۔

تونگری بدل ست نہ بمال ☆ بزرگی بعقل ست نہ بسال

اور غناء ظاہری اس طرح فرمایا گیا کہ آپ کو ربّ العزّت سبحانہ نے رفیقۂ حیات سیدۃ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا عطا فرمایا جو مکہ مکرمہ میں چوٹی کی سرمایہ دار، رئیسہ خاتون تھیں، جنہوں نے سارے سرمایہ داروں اور سرداروں

نامور شخصیتوں کو ٹھکرا کر آپ کے ساتھ عقد نکاح اور وابستگی کو ترجیح دی اور اپنے تمام تر پورے سرمایہ مال و دولت کو بطیبِ خاطر فخریہ انداز پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں پر نثار کر دیا۔ یہ سب کچھ تکوینی باطنی طور پر آپ کے ربّ عزّ سبحانہ کے لطف وعنایتوں کے کرشمہ اور نظر شفقت کا نتیجہ تھا۔ پھر سیدۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد صدیق رضی اللہ عنہ کا پورا سرمایہ آپ کے قدموں پر نثار ہوا، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار دراہم آپ پر قربان کیے۔

اس کے بعد مدینہ منورہ کے جان نثار انصار الاسلام رضی اللہ عنہم نے تو وہ تاریخی جانی و مالی قربانیاں پیش کیں جن کی نظیر تاریخ اقوام عالم پیش کرنے سے قاصر ہے، پھر ہر طرف سے فتوحات کے ذریعہ مال غنیمت کے دروازے بھی بڑے زور و شور سے کھل گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے وہ اموال غنائم مستحق لوگوں تک پہنچے، جن کا تصور نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ''جعرانہ'' کے میدان میں اموالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے تو نو مسلم قریشی مسلمان محوِ حیرت اور مخمصوں میں گرے ہوئے نظر آتے تھے، ایک ہی دن میں نماز ظہر سے عصر تک اور پھر عصر سے مغرب تک آپ نے چالیس ہزار بکریاں، چوبیس ہزار اونٹ اور آٹھ ہزار اوقیہ چاندی تقسیم فرما کر ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ﴾ کی عملی تفسیر پڑھا دی اور لکھوا دی۔

عروج و ترقی اور نام آوری کے اسباب:

جو لوگ دنیا میں ترقی کرتے ہیں اور بڑے بڑے مناصب اور اعلیٰ عہدوں پر پہنچتے اور معاشرہ میں نمایاں سرداری حاصل کرتے ہیں، ظاہری طور پر اس کے نمایاں اسباب چار ہیں:

(۱) پہلا سبب: نامور باپ اور دیگر رشتہ داروں کی قوت اور نام آوری۔

(۲) دوسرا سبب: تعلیم، علم اور خواندگی جس کی بدولت لوگ ترقی اور خوشحالی کے اکثر و بیشتر مدارج طے کرتے ہیں۔

(۳) تیسرا سبب: مضبوط و طاقتور قوم کی پشت پناہی، جس کی بدولت لوگ اونچے مقامات پر پہنچ جاتے ہیں۔

(۴) چوتھا سبب: دولت و سرمایہ اور کثرتِ مال و غناء کی بدولت انسان بڑے بڑے اونچے مقامات طے کر کے سرداری حاصل کرتا ہے۔ اگر یہ چاروں اسباب بیک وقت کسی کے پاس ہوں تو وہ یقیناً شرافت و بزرگی کا مالک ہو جاتا ہے، اور اگر کسی کے پاس یہ چاروں اسباب غیر موجود و مفقود ہوں تو سوائے گمنامی اور شکستہ حالی کے کچھ نہیں ہوگا۔

اللہ ربّ العزّت کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا اندازہ لگانا بڑا مشکل ہی ہے کہ وہ اپنے محبوب، پیغمبر اعظم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرپرستی فرماتے ہوئے اسے تمام ظاہری اسباب سے مستغنی فرمائے، جہاں ابتدائی پیدائش سے اُسے یتیم و بے سہارا پیدا کیا، مالی حالت اتنی کمزور رکھی کہ ہر قسم کے سرمایہ، ومال، زراعت وتجارت، صنعت وحرفت وغیرہ سے مستغنی اور بے بہرہ رکھا، پھر قومی شرافت اپنی جگہ برقرار، مگر پوری قوم نے آپ کی مخالفت اور آپ کو زیر کرنے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر آپ کے پروگرام کی ہمہ تن مخالفت کی۔ تعلیم کا حال تو سب کو معلوم ہے کہ آپ خالص اُمی اور ناخواندہ تھے، آپ اپنے نام لکھنے پر بھی قادر نہ تھے۔

ان تمام ظاہری اسباب کے فقدان کے باوجود پروگرام وعزمِ مصمم یہ رہا کہ آپ کو پورے جہان کی سرپرستی اور سرداری، مزید برآں یہ کہ دنیا و آخرت دونوں کی سرداری سونپی گئی، اور یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ حقیقتاً وواقعتاً اس عظیم منصب پر آپ کو عروج بخشا گیا، اور ہر کامیابی نے آپ کے قدموں کو چوما، آپ کو منصب وہ ملا جس کا کوئی تصور نہ کرے، آپ کو معراج جیسے مقام پر پہنچا کر پوری کائنات کے لیے نمونہ بنایا گیا، اور سید الاوّلین والآخرین کے القاب سے نوازا گیا، اور ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ کے خطاب سے یاد کیا گیا۔ ؎

لایمکن الثناء کما کان حقه ★ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یتیمی اور فقر وتنگدستی قومی مراعات کی کمی، امی و ناخواندگی وغیرہ کبھی آپ کی ترقی میں حائل نہ بنے، مِن جانب اللہ سرپرستی نے آپ کو تمام ظاہری اسباب سے بے پرواہ و مستغنی بنایا، اور آپ کے خلاف دشمنوں کی تدبیروں کو خاک میں ملا کر نیست ونابود کر دیا۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی إمام المتقین، و صلی اللہ علیه و اٰله و صحبه و سلم أجمعین۔

آگے تذکرہ بے مثال نعمتوں کے شکر ادا کرنے کے سلسلہ میں آپ کو ہدایات دی گئیں جو یہ تین احکام ہیں:

پہلا حکم: ﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ پھر آپ یتیم کو نہ دبائیے۔ اور کسی قسم کی بدسلوکی وزیادتی نہ کریں، بلکہ جس طرح عام خلق پر آپ بے مثال و بے حد شفقت فرماتے ہیں یتیموں پر اس سے بھی زیادہ رحم وکرم فرمائیے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا بہتر سلوک کیا جاتا ہو، اور مسلمانوں کا بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو''۔

اسی طرح فرمایا: ''جو شخص کسی یتیم کے سر پر (شفقت سے) ہاتھ پھیر دے اس کا ہاتھ یتیم کے سر کے جتنے بالوں پر گزرے گا اتنی ہی نیکیاں اس کے لیے لکھی جائیں گی''۔ ایک شخص نے اپنے دل کی قساوت اور سختی کی شکایت کی،

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر دے''۔ اسی طرح فرمایا: ''روزِ قیامت میں اور یتیم کی کفالت کرنے والے دو انگلیوں کی طرح قریب ہی رہیں گے''۔ [مشکوۃ]

دوسرا حکم: ﴿وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ﴾ اور آپ سائل کو نہ جھڑ کیے۔ یہاں سائل اپنے عموم پر ہے، دینی مسئلہ دریافت کرنے والا ہو یا کسی دنیوی مال و متاع (روپیہ پیسہ) کا سوال کرنے والا، لہٰذا یہ دونوں سائل آپ کی شفقت وعنایت کے مستحق ہیں، آپ کی شان عالی کے لئے بعید ہے کہ آپ انہیں جھڑک کر محروم و دل شکستہ کریں۔

تیسرا حکم: ﴿وَ اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ﴾ اور آپ اپنے ربّ کی نعمت کو بیان کیجئے۔ نعمت اپنے عمومی معنی کے اعتبار سے عام ہے، یعنی ظاہری، باطنی، دینی، دنیوی، مادی، روحانی ہر طرح کی نعمتیں مراد ہیں۔ موجودہ اور آئندہ دنیا اور آخرت کی نعمتیں سب اس میں آجاتی ہیں، پھر آپ کو اظہار نعمت اور تحدیثِ نعمت کا حکم دیا جارہا ہے، تاکہ ﴿وَ كَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا﴾ [النساء: ۱۱۳] (اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل تھا) کا کھلم کھلا اظہار ہو، اور ان نعمتوں پر شکر بھی ہو۔

پس نعمتیں بہت ساری مختلف النوع ہوتی ہیں، تو ہر نعمت اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک خاص شکر اور خاص قسم کی تحدیث کا متقاضی ہے، تو مجموعی طور پر تمام نعمتوں کا دینے اور عطا کرنے والا حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے، اور ان میں سے کوئی نعمت میری ذاتی کمالات کا نتیجہ نہیں ہے۔ نعمت نبوت کا اظہار تبلیغ اور دعوت الی اللہ کے ذریعہ ہو، نعمتِ قرآن کا اظہار اس کی اشاعت کے ذریعہ ہو، نعمتِ ہدایت کا اظہار اس طریقہ سے ہو کہ بے راہ اور گمراہوں کی رہنمائی ہو، اور صراط مستقیم کی طرف دعوتِ عامہ کا اہتمام ہو، اس سلسلے میں مصائب وتکلیفات پر صبر کامل ہو، نعمتِ مال کے ذریعہ ناداروں اور محتاجوں کی دستگیری اور نگہبانی ہو، غرض یہ کہ دریا بکوزہ کے بمصداق یہ لفظ فَحَدِّثۡ ہزاروں نعمتوں پر شکر گزاری کا مختصر کلمہ کے ذریعہ تحدیث وشکر پر تنبیہ ورہنمائی ہے۔

ماقبل میں جن خاص تین نعمتوں کا تذکرہ ہے اور بعد میں جن خاص تینوں حکموں کا بیان ہورہا ہے، ان کی ترتیب اس طرح سمجھنا چاہئے کہ ''لف ونشر'' غیر مرتب کا لحاظ رکھا گیا ہے، ﴿اَمَّا الۡيَتِيۡمَ﴾ کا تعلق ﴿اَلَمۡ يَجِدۡكَ يَتِيۡمًا﴾ کے ساتھ ہے، ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ﴾ کا تعلق ﴿وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا﴾ کے ساتھ ہے، ﴿وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ﴾ کا تعلق ﴿وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ کے ساتھ ہے۔

سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن، یعنی سورۃ الناس تک اکثر سورتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ربّ العزت

سبحانہ کے انعامات اور آپ کے خصوصی فضائل کا ذکر ہے، البتہ چند سورتوں میں احوالِ قیامت بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کا شروع خود قرآن حکیم کی عظمت اور نا قابلِ شک وشبہ ہونے سے کیا گیا، اور ختمِ قرآن اس ذات کی عظمت وبزرگی پر کیا گیا جس پر قرآن پاک نازل کیا گیا۔

تلاوتِ قرآن کے وقت ایک سنت عمل:

سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن مجید تک ہر سورت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے، اور تکبیر کے الفاظ حضرت شیخ صالح مصری رحمۃ اللہ علیہ نے لا إله إلا الله و الله أكبر بتلائے ہیں۔[مظهري] لیکن اگر صرف الله أكبر و لله الحمد یا صرف الله أكبر کہہ لے تب بھی سنت ادا ہو جائے گی۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ہر سورت کے ختم پر اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر سورت کے شروع میں ایک مرتبہ تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے، دونوں میں سے جس کو بھی اختیار کیا جائے بہر دو صورت سنت ادا ہو جائے گی۔ چند دن وقفہ (بندشِ وحی) کے بعد جب دوبارہ وحی کا آغاز ہوا تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ محبت و سرور حاصل ہونے پر بطور خوشی تکبیر پڑھی اور الحمد لله و الله أكبر کہا۔[رواه أبي بن كعب عن النبي صلى الله عليه وسلم] هذا هو المراد۔ و الله أعلم ۔

دامن نگاہ تنگ وگل حسن تو بسیار ☆ گل چین تو از تنگی داماں گلہ دارد
لا یمکن الثناء کما کان حقہ ☆ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

سُورَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ

مکیۃٌ آیاتہا ۸ رکوعہا ۱

سورۂ الم نشرح مکی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

لفظی اعتبار سے یہ ہے کہ شروع سورت میں کلمہ ''اَلَمْ نَشْرَحْ'' ہے جو کہ سورت کا نام ہے، اور معنوی اعتبار سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا بیان اور شرح صدر کا ذکر ہے۔

زسر سینہ اش جامی اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ برخوان ☆ زمعراجش چہ میپرسی کہ سُبْحَانَ الَّذِيْ اَسْرٰى

فقد أعطيت ما لم يعط خلق ★ عليك صلوة ربك والسلام

نزول:

سورۃ الم نشرح مکی ہے، اس کا نزول سورۃ الضحیٰ کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت آٹھ (۸) آیات، اٹھائیس (۲۸) کلمات اور ایک سوتیس (۱۳۰) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

سورۃ الضحیٰ میں ان انعامات کا ذکر تھا جو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے لطف وکرم سے اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت فرمائے، اس سورت میں بھی، مگر دوسرے پیرایہ پر انعامات وافضالات کا تذکرہ ہے، گویا یہ

سورت سابقہ سورت کا تتمہ وخلاصہ ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطنی مخصوص مزایا وکمالات اور ربّ العزّت سبحانہ کی طرف سے مخصوص انعامات واکرامات جو آپ کو عطا کئے گئے ہیں ان کا بیان ہے، اور یہ تسلی بھی ہے کہ ہر غم و پریشانی کا نتیجہ راحت وخوشحالی ہے، اور ہر تاریکی کے پیچھے انوار وبرکات کا طلوع ہونا لازمی یقینی ہے، اس کے ساتھ آپ کو حکم دیا جارہا ہے کہ یہ جو آپ پر انعاماتِ الٰہیہ کا فیضان ہورہا ہے، آپ انہیں مزید بڑھانے کی کوشش کریں اور خلقِ خدا کی اصلاح میں پوری جدوجہد جاری رکھیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۙ﴿۱﴾ وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ ۙ﴿۳﴾ وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ؕ﴿۴﴾ فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ؕ﴿۶﴾ فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ۙ﴿۷﴾ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ ﴿۸﴾

ترجمہ: کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ نہیں کھول دیا؟ (۱) اور کیا ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ نہیں اتار دیا؟ (۲) جس نے آپ کی کمر کو بوجھل کیا تھا (۳) اور کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا ذکر بلند نہیں کر دیا؟ (۴) پھر یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے (۵) بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے (۶) پھر جب آپ فارغ ہوجایا کریں تو محنت کیا کیجیے (۷) اور اپنے ربّ ہی سے لو لگا لیجیے (۸)

معارف ومنازل

شرح کا معنی: بسط وتفصیل یا کھولنا پھیلانا۔ یہ اپنے مضاف الیہ کا تابع لفظ ہے، مثل: شرح الکلام، یا شرح الکتاب، بمعنی کسی کلام یا کتاب کے غوامض ومخفی حقائق کو کھول کر بیان کرنا، یا جس طرح علماء کرام کہتے ہیں کہ حدیث پاک قرآن کریم کی شرح ہے، یعنی قرآن مجید میں جو چیزیں اجمالاً مختصراً موجود ہیں حدیث پاک میں ان کی شرح وتفصیل کھول کر بیان ہوئی ہے۔

شرحِ صدر کے معنی اسی سے ماخوذ ہیں کہ انوارِ الٰہی سے سینہ کا ایسا کشادہ ہونا کہ ہر قسم کے شکوک وشبہات دور ہوں، اور طمانینت ویقین کے ساتھ ہر قسم کے حالات وشدائد وغیرہ کے تحمّل وبرداشت کا جذبہ موجزن ہو، اور کسی قسم کی ناگفتہ بہ پریشانی سے کدورت وانقباض پیدا نہ ہو۔

ربّ کریم کا ارشاد ہے: ﴿فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ﴾ [الأنعام: ۱۲۵] (تو جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے)۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰهُ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ﴾ [الزمر: ۲۲] (بھلا جس شخص کا سینہ خدا نے اسلام کے لئے کھول دیا ہو اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی پر ہو)۔

شرحِ صدر ہدایت کا آخری عظیم الشان مرتبہ ہے، اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ نہیں ہے، یہ مرتبہ اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے شایانِ شان ہے، یہ کوئی ایک جزئی یا دینی دنیوی کسی ایک دو مسائل کے ساتھ مربوط نہیں، بلکہ اس اعلیٰ وارفع مقام کا تعلق پوری کائنات کے تمام شرائع واحکام، بلکہ ذات وصفات باری تعالیٰ جل وعلا، نیز دنیا وعقبیٰ کے تمام مہمات کے ساتھ وابستہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی ہم کلامی کے ساتھ سب سے پہلے اسی نعمت عظمیٰ کی درخواست کی تھی: ﴿قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِىۡ صَدۡرِىۡ﴾ [طٰہٰ: ۲۵] (کہا: میرے پروردگار! (اس کام کے لئے) میرا سینہ کھول دیں)۔ لیکن شرحِ صدر کا درجہ کمال سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا طلب ملا اور آپ کو نوازا گیا، کیونکہ آپ کی نبوت کبریٰ کے لیے یہ درجہ ضروری اور لازمی تھا۔

اس شرحِ صدر کا مفہوم بڑا ہی وسیع اور نہایت ہی عالمگیر ہے، جیسے پہلے بیان ہوا، مثلاً اعلیٰ درجہ کے تحمّل وبردباری، ایمان وحکمت اور علم ومعرفت سے صدر وسینہ کا پُر ہونا اور ملک وملکوت لاہوت وجبروت کے حقائق کا منکشف ہونا، قلب کا علم وعرفان، اسرار وحکم کا خزانہ ہونا، زبان کا اسرارِ غیبیہ، رموز واسرار مخفیہ کا ترجمان بن جانا، جس سے عالم غیب کا مشاہدہ، سیر إلی اللہ وفي اللہ تک رسائی اور بلاغ کا حاصل ہونا، (جیسے لیلۃ المعراج میں ہوا) پھر خلق خدا کی طرف توجہ، خالق عزّ شانہ کی طرف توجہ میں مخل نہ ہونا، حوصلہ کا اتنا بلند ہونا جیسے کہ بلندی سموات ہے اور افکار وخیالات کی روشنی سورج وقمر کی طرح ہونا۔

غرض فاضلانہ اخلاقِ حمیدہ واعمالِ سعیدہ کی ایسی بلندیوں اور رفعتوں تک رسائی جہاں صاحب شریعت کے سوا ساری مخلوقات میں کسی کو یہ مرتبہ وشرف حاصل نہ ہو، اور نہ کوئی کسی غیر کے لیے اس کا تصور وادراک کر سکے، اور نہ کوئی

دریافت کر سکے، اسی شرحِ صدر، کمالِ حوصلہ اور مرتبہ ختمِ نبوت کی وجہ سے آپ مرجع خلائق امام الہدیٰ سید الاولین و الآخرین اعبد الخلائق حبیب کبریاء حبیب اکبر ہیں، شاہ و گدا، علماء و صلحاء، اہلِ سیاست اور ارباب حکومت، ارباب عبادت، ارباب عدالت، اصحاب زہد و ریاضت، ارباب علم و معرفت ساری مخلوقات، بلکہ انبیاء و رُسل علیہم السلام سب ہی آپ سے اکتسابِ فیض اور رہبری کے خواہاں اور طلبگار و محتاج ہیں، آپ ان سب کے لیے ہادی اعظم ہیں۔ ؎

و کل آی أتی الرسل الكرام بها ★ فإنما اتصلت من نوره بهم

فإنه شمس فضل هم كواكبها ★ يظهرن أنوارها للناس في الظلم

حتى إذا طلعت في العالمين ★ عم هداها و احيت سائر الأمم

شرحِ صدر ظاہری اور باطنی دونوں کا بیان:

شرح صدر باطنی کا بیان مختصراً مکمل ہوا، اور یہی اصلی شرحِ صدر ہے، جس کا تعلق عالم غیب کے ساتھ ہے۔ عالمِ محسوس و عالمِ اجسام میں جو ہے یہ اس کا فرع و عکس ہے، جس طرح سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو شرحِ صدر غیبی و باطنی حاصل ہوا جو کہ عبارت ہے، اس کمال ختمِ نبوت سے جس تک کسی دوسری مخلوق کی رسائی اور اس کے عرفان کی پہنچ نہیں ہوسکتی، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شرحِ صدر ظاہری و حسی اور جسمانی بھی ہوا، اسی ظاہری شرح صدر کو شقِ صدر کا معجزہ بھی کہا جاتا ہے، اور اس کے چار مراتب وادوار ہیں۔

پہلی بار شق صدر:

پہلی بار شقِ صدر اس وقت ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی کفالت و پرورش میں تھے۔ اس وقت حضرت جبرئیل و حضرت میکائیل علیہما السلام نے آبادی سے باہر میدان میں آکر آپ کا سینہ مبارک شق کیا اور قلب اطہر نکالا، اس سے خون کی پھٹکی نکال کر پھینک دی اور قلب کو دھو کر صاف کر کے اس میں سکینہ بھر دیا، اور قلب و صدر کی سلائی کردی۔ اس شرحِ صدر سے مقصود یہ تھا کہ بچگانہ لہو ولعب کی عادت اور غیر موزون ناشائستہ حرکات کے میلان سے آپ کے قلب اطہر کو پاک کر دیا جائے، اور زمانہ طفولیت ہی سے تمکین و وقار اور پاکیزہ و عمدہ جذبات سے اس کو مزین کیا جائے، اس وقت آپ لگ بھگ چار سال کے تھے۔

دوسری بار شق صدر:

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف دس سال کی تھی حضرت جبرئیل و میکائیل علیہما السلام نے آپ کا سینہ

مبارک کھول کر قلب مبارک کو سونے کی طشت میں آب قدس سے دھویا، اور شکم مبارک کو بھی دھویا اور کوئی نورانی چیز دل میں ڈال دی اور اوپر سے بھی چھڑک دی، اور فرشتوں نے کہا کہ کینہ وحسد اور بدخواہی کے جذبات سے دل مبارک کو پاک کر کے اس میں ہم نے شفقت ومہربانی بھر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس وقت سے میں اپنے قلب میں ہر چھوٹے بڑے پر شفقت ومہربانی پاتا ہوں، اس عمر شریف میں چونکہ آپ جوانی کے قریب تھے اس لئے اس شق صدر سے جوانی کے غلط رجحانات، جذبات، شہوت وغضب وغیرہ سے قلب مبارک کو پاک رکھنا مقصود تھا۔

تیسری بار شق صدر:

زمانہ بعثت کے قریب جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حراء میں معتکف اور یکسوئی سے عبادت خداوندی میں مشغول تھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بھی وہاں موجود تھیں، اس وقت تیسری مرتبہ حضرت جبرئیل ومیکائیل علیہما السلام نے آپ کا سینہ چاک کیا اور قلب اطہر کو سونے کی طشت میں آب زمزم سے دھویا اور پھر بند کیا، نیز پشت پر دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ثبت کر دی، اس شرحِ صدر کا مقصد بارِ نبوت کے تحمل اور وحی الٰہی کے اٹھانے کے لئے توفیق واستعداد پیدا کرنا اور وحی الٰہی کے تحمل وصلاحیت کو مستعد وبیدار کرنا تھا، و غیر ذٰلک من الکرامات و اللطائف۔

چوتھی بار شق صدر:

چوتھی مرتبہ شرحِ صدر شب اسراء ومعراج کے موقعہ پر ہوا، اس دفعہ ایمان وحکمت سے قلب مبارک کو پُر کرنا بھی روایات میں مذکور ہے۔ سفرِ معراج پر روانگی سے قبل اس خاطر شق صدر ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالمِ ملکوت کی سیر اور عالمِ بالا کی تجلیات وانوار برداشت کرنے کی قوت واستعداد پیدا ہو جائے، یہ چار مرتبہ آپ کا شق صدر معنوی شرح صدر کا نمونہ ومثال ہے۔ بعض مفسرین وعلماء سیرت کا خیال ہے کہ شقِ صدر صرف دو مرتبہ ہوا ہے: ایک بار بچپن میں حضرت حلیمہؓ کے پاس، اور ایک بار شب معراج میں مگر مشہور یہی چار ہیں، جو بیان ہوئے۔ واللہ اعلم

﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴾ کلمہ لَكَ سے یہ بتلانا ہے کہ مرتبہ شرحِ صدر آپ کی خصوصیت ہے، اور شرحِ صدر میں آپ ہی کا نفع ہے کہ اس سے آپ کو وہ اعلیٰ امتیازی کمالات حاصل ہوئے، جو آپ ہی کے شایان شان تھے۔ دوم بجائے قَلْبَكَ کے صَدْرَكَ فرمایا، کیونکہ قلب (دل) صدر (سینہ) کے اندر ایک محفوظ مقام پر ہے، جب سینہ منور ومحفوظ ہو گیا تو قلب بدرجہ اولیٰ محفوظ ومنور ہوگا، کیونکہ جب پورا شہر محفوظ ہو جائے، تو گھر ضرور محفوظ

ہو جائے گا۔

﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ﴾ اور ہم نے آپ کے اوپر سے آپ کے اس بار گراں (بوجھ) کو اتار دیا، جس نے آپ کی کمر (پیٹھ) کو دبا کر رکھا تھا (بوجھل کیا تھا)۔ اس جملہ کا عطف سابق جملہ ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ پر ہے، کیونکہ اس کا ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے، جو فعل منفی پر داخل ہے، اور نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے، تو معنی یہ ہوا: شرحنا لک صدرک، لہٰذا معطوف ومعطوف علیہ کی مناسبت ظاہر ہے اور خبر اور انشاء کا فرق بھی جاتا رہا۔

یہاں پہلی آیت میں آپ کے اول کمال کا، اور دوسری آیت میں دوم کمال وخصوصیت کا ذکر ہے، آئندہ آیت میں تیسری خصوصیت وکمال کا تذکرہ ہے۔ وِزْر کا معنی بوجھ کے ہیں، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [الإسراء: ۱۵] (اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا)۔ اور اَنْقَضَ کا لفظی معنی ''کمر توڑ دینے اور کمر جھکا دینے'' کے ہیں، جب انسان پر بڑا بوجھ لاد دیا جائے تو اس کی کمر جھک جاتی ہے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ وہ بوجھ جس نے آپ کی کمر جھکا دی تھی ہم نے اس کو آپ سے ہٹا دیا۔ وِزْر سے مراد تکلیفاتِ شرعیہ کی تبلیغ اور اس پر عمل ہے، کیونکہ تکالیفِ شرعیہ کی پابندی بڑی دشوار ہے، چنانچہ قران کریم میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا﴾ [الأحزاب: ۷۲] (ہم نے (بارِ) امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا)۔

تو ظاہر ہے کہ جس بارِ امانت کے قبول کرنے اور اٹھانے سے سماوات وارض اور فلک بوس پہاڑ خوف محسوس کر کے انکاری ہوئے تو ان امورِ صعبہ اور تکالیفِ شرعیہ کو انسان کے نرم ونازک کندھوں پر رکھنے سے اس کی کمر کا جھکنا معقول ہے، مگر اللہ تعالیٰ شانہ نے شرحِ صدر فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حوصلہ بلند فرمایا، اور تکالیفِ شرعیہ آپ کے لئے سہل، مرغوب ومحبوب اور فطری مقتضیات بن گئیں، اور ان کی ادائے گی میں دشواری کے بجائے لذت وحلاوت اور سکون وراحت محسوس ہونے لگی۔

صوفیائے کرام جو کہا کرتے ہیں کہ شرعی تکلیفات عبادُ الرحمن سے ساقط ہو جاتی ہیں، اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ وہ تکالیفِ شرعیہ تکالیف نہیں رہتیں، بلکہ مرغوب ومحبوب اور باعثِ راحت اور سراپا حلاوت بن جاتی ہیں، اور خلافِ طبع چیزیں سارے کے سارے عینِ فطرت بن جاتی ہیں، جن کے انجام دہی میں بجائے تکلیف کے سرور و

لطف حاصل ہوجاتا ہے، قوله تعالى: ﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ [البقرة:۴۵] (اور بے شک نماز گراں ہے، مگران لوگوں پر (گراں نہیں) جو عجز کرنے والے ہیں)۔ و قوله عليه السلام: و جعلت قرة عيني في الصلوٰة اسی معنی کی تائید میں وارد ہے۔ شرحِ صدر کا یہ مرتبہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہراً و باطناً علی الاعلان، بدرجہ کمال حاصل ہوا تھا، مگر اولیاء امت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ اور آپ کی اتباع کی برکت سے باطنی طور پر اس رتبہ کی نسبت حاصل ہوتی ہے۔ [مظهري وغيره]

اور یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ نبوت اور اس کے لوازمات کا بوجھ اور مسلسل تبلیغ واشاعت دین یہ کوئی معمولی بوجھ نہیں، پس ﴿ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ [الغاشية:۲۲] (تم ان پر داروغہ نہیں ہو)۔ ﴿ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ [البقرة:۱۱۹] (اور اہل دوزخ کے بارے میں تم سے کچھ پرسش نہیں ہوگی)۔ اور اس معنی کی دوسری آیتوں نے اس بوجھ کو ہلکا کرنے میں بڑا کردار ادا کیا، اس طرح: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ۲۸۶] (خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا) نے بھی۔ واللہ اعلم

﴿وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ اور ہم نے آپ کے لیے آپ کا ذکر بلند کیا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتِ شان وہ مثالی تمغہ امتیاز ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامِ قیامت تک ساری کائنات میں یہ مقام و مرتبہ خصوصیت کے ساتھ آپ ہی کا حصہ رہا ہے، جس کے متعلق حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور انور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اس آیت کے معنی پوچھے، تو انہوں نے کہا کہ ربّ العزّت سبحانہ کا ارشاد ہے کہ: ''جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ذکر کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی کیا جائے گا''۔ [بخاری] حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ''تفسیر مظہری'' میں فرماتے ہیں کہ اس آیت وحدیث کا تقاضا یہ ہے کہ ملأ أعلیٰ (آسمانی فرشتے) جب اللہ ربّ العزّت کا ذکر کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ؎

جس دل میں ہے اللہ وہیں رہتے ہیں محمد بھی ☆ اللہ جو کہتے ہیں وہی کہتے ہیں محمد بھی

حضرت امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے کہ: لا إله إلا الله وحده دينه الإسلام و محمد عبده و رسوله۔ حضرت عطاء رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں ''رفع ذکر'' سے مراد کلمہ طیبہ، اذان، اقامت، تشہد، خطبہ منبر میں

اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔

شہادت کا التزام و معیت تمام علماء اسلام کا مسلم متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر کوئی شخص اقرار توحید اور تصدیق اُلوہیت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت نہ دے تو یہ اس کے لئے بے سود ہے، اور وہ بدستور کافر ہی رہے گا، اور بات اظہر من الشمس ہے کہ قرآن کریم بار بار توحید باری تعالیٰ کے اثبات کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے اثبات وحقانیت پر بار بار تاکید فرماتا ہے۔ حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر فرماتے ہیں۔ ؎

أغر عليه بالنبوة خاتم ⋆ من الله مشهود يلوح و يشهد

و ضم الإله اسم النبي باسمه ⋆ إذا قال في الخمس المؤذن أشهد

و شق له من اسمه ليجله ⋆ فذو العرش محمود و هذا محمد

تاریخ عالم اس پر گواہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنہا بغیر کسی حمایتی کے نہایت بے سروسامانی کے عالم میں ایک ایسی مشرک جاہل ومتعصب قوم میں توحید کی آواز بلند کی جنہوں نے توحید وایمان کا کئی پشتوں اور سینکڑوں سالوں سے نام تک نہیں سنا تھا، اور حیات بعد از موت اور وقوعِ قیامت جیسے عقائد سے وہ سراسر خالی الذہن اور منکر تھے۔

جوں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کا نعرہ بلند فرمایا تو پورا معاشرہ اور ساری قوم آپ کے خلاف محاذ جنگ بن کر مخالفت پر اتر آئی، پورے جزیرے میں میدانِ کارزار جیسے حالات پیدا ہوئے، مگر ان مصائب وآلام نے آپ کا راستہ نہیں روکا، ہزاروں مخالفتوں اور طرح طرح کے مصائب کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے عزم وہمت اور استقلال کے ساتھ مقابلہ فرمایا، اور جرأت وبہادری کے ساتھ اپنا پروگرام جاری رکھا، ایک مختصر مدت میں چار دانگ عالم میں اسلام وقرآن کا پیغام پہنچ کر آپ کا ذکر خیر ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ کی صورت میں عام ہوتا رہا، ہر چند دنیا نے اسے کمزور کرنے اور مٹانے کی کوشش کی، مگر تائید ایزدی کے ساتھ قرآنی ہدایات بڑھتے رہے اور اسلام کا نور جگمگاتا رہا۔

خلافتِ راشدہ کا زرین دوران ہی فتوحات اور پیش قدمیوں میں صرف ہوتا رہا، کاشغر (چین) سے لے کر فرانس کی سرحدوں تک اور بعض افریقی ممالک تک مجاہدین اسلام نے اسلامی علم بلند کر کے لہرایا۔

یہی ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ تعبیر ومثال ہے، جسے قرآن حکیم نے بیان کر دیا، اور عُسر کے ساتھ دنیا و آخرت کے لئے دونوں یُسر کی رنگ میں پیش فرما کر آپ کی تسلی کرائی اور: ﴿وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ﴾ کی خوشخبری

سنائی، اور سارے عالم میں اس رفعِ ذکر کا غلغلہ شروع ہو کر بڑھتا رہا، ان میں روزانہ پانچ مرتبہ اذانوں، اقامتوں، نمازوں، خطبوں، تلاوتوں اور ذکر واذکار کے ذریعہ آپ کا نام بلند ہوتا رہا، اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوگا جبکہ روئے زمین پر کہیں نہ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک زبانوں پر نہ آتا ہو۔ اس سے قرآن کریم کی صداقت اور اس کا اعجاز نمایاں واضح ہے، کیونکہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت کوئی شخص اس کا اندازہ اور تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک نام اتنی بلندیوں کو چھوئے گا، مگر تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ یہ پیشینگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبولیتِ عامہ کا عجیب اثر ہے کہ دنیا میں کوئی سمجھدار انسان آپ کا نام بغیر تعظیم کے نہیں لیتا، اگرچہ وہ مسلمان بھی نہ ہو۔

فائدہ:

یہاں تین کمالات وانعامات کا ذکر ہے (شرحِ صدر، وضعِ وِزر، رفعِ ذکر) ان تینوں کو تین جملوں میں ذکر فرمایا ہے، اور سب میں فعل ومفعول کے درمیان حرف لَكَ یا عَنْكَ لایا گیا ہے، اس میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور مخصوص فضیلت وعظمت کی طرف اشارہ ہے۔

یا رب صلّ و سلّم دائماً أبداً ★ علىٰ حبيبک خير الخلق كلّهم

و أحسن منک لم ترقطّ عين ★ و أجمل منک لم تلد النساء

خلقت مُبراءً من كلّ عيبٍ ★ كأنک قد خُلقتَ كما تشاء

﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْراً﴾ پھر یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کمالات وانعامات آپ کو مصیبتوں، سختیوں اور بے شمار رنج وتکلیفوں پر صبر جمیل کرنے کی برکت سے عطا ہوئے ہیں، اور حضرت منعم جل شانہ کی عادت یہ ہے کہ وہ ہر مشکل ومصیبت کے ساتھ ایسی سہولت وآسانی بھی عطا فرماتے ہیں، جس سے وہ مصیبت آسان ہوجاتی ہے، اگر مصیبت کے گزر جانے کے بعد اسے یاد کریں یا آنے سے پہلے اس کا تصور کریں تو اپنے اندر اس کے برداشت کرنے کی طاقت نہ پائیں گے۔

اس قسم کی آسانیاں اور سہولتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شرحِ صدر وفراخی حوصلہ کے سبب حاصل ہوئیں، یا آئندہ حاصل ہوجائیں گی، کیونکہ کمالات وانعامات کے حاصل کرنے میں موانع پیش آنے کے باوجود تنگدلی ومایوسی یا تردد سے آپ محفوظ رہے، اور آپ کو صبر کرنے کے بعد وہ سکون اور اطمینان حاصل ہوا یا ہوجائے گا، جس کی بدولت زندگی

پھر آپ شکر کی لازوال نعمتوں میں راحت وخوشی محسوس کرتے رہیں گے۔

ایک نکتہ:

یہ قاعدہ ہے کہ معرفہ کو یا اسم نکرہ کو اگر دوبارہ معرفہ لایا جاتا ہے، تو اس سے عین اول مراد ہوجاتا ہے، نکرہ کی مثال: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ﴾[المزمل:۱۶] (جیسے ہم نے فرعون کے پاس رسول بھیجا، پس فرعون نے رسول کی نافرمانی کی)۔ اس آیت میں رَسُوْلًا اور الرَّسُوْلَ دونوں کا مصداق ایک ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، اگر معرفہ ہو تو اس کی مثال یہی کلمہ الْعُسْر ہے، جس کو دوبارہ معرفہ لایا گیا، تو دونوں عُسر ایک ہی شمار ہوں گے۔ اگر ایک نکرہ کو دوبارہ نکرہ لایا جائے، جیسے: یُسْرًا کا کلمہ ہے تو دونوں کے مصداق الگ الگ ہوتے ہیں، تو پہلا یُسر دوسرے یُسر سے الگ ہوگا۔

تو یہ دو یُسر شمار ہوئے، جبکہ عُسر دونوں جگہ ایک ہی شمار ہوگا، اسی طرح معرفہ اگر دوسری مرتبہ نکرہ لایا گیا، جیسے: جاء ني الرجل جاء ني رجل، تو ثانی رجل، اول رجل کا غیر ہوگا، تو دو رجل شمار ہوں گے، حاصل یہ ہوا کہ ان دونوں آیتوں میں ایک عُسر (دشواری) پر دو یُسر (آسانیوں) کا وعدہ ہے، پھر دو سے مراد دو کا عدد نہیں، بلکہ متعدد ہونا مراد ہے، مطلب یہ ہوا کہ ایک مشکل اور تنگی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی یا آئے گی، اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی سہولتیں اور آسانیاں حاصل رہیں گی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مرسلاً مروی ہے (مرسل حدیث خصوصاً حسن یا ابن سیرین یا سعید کی حجت ہے) وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے سنا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو اس آیت سے بشارت دیتے ہوئے فرمایا: لن يغلب عسر يسرين، یعنی ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی۔

چنانچہ تاریخ وسیرت کی سب کتابیں اس پر شاہد ہیں کہ مشکل سے مشکل کام، بلکہ لوگوں کی نظروں میں جو کام نہایت مشکل نظر آتے تھے یا ناممکن شمار ہوتے تھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وہ سب آسان اور ممکن ہوتے چلے گئے، اب آیت کا مفہوم اگر عام مراد لیا جائے تو یہ وعدہ پوری امت کے لئے ہوگا کہ ہر ایک مؤمن کے عُسر پر ربّ العزّت سبحانہ کی طرف سے دو یُسر کا وعدہ سمجھا جائے گا، اس صورت میں عُسر کا الف لام عہد کے لئے نہیں ہوگا۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ وعدہ تمام مؤمنوں کے لئے ہے، مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عُسر کے بعد

ایک یُسر اسی دنیا میں، اور ایک یُسر آخرت میں حاصل ہوگا، اور مؤمنوں کو عُسر دنیوی کے بعد یُسر اُخروی ملے گا، لیکن اگر آیت کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اہل ایمان کے لئے عام رکھا جائے کہ ایک مشکل پر سب کو دو آسانیاں میسر آئیں گی، خواہ دنیا میں ہوں یا دنیا و آخرت دونوں میں ہوں، تو یہ عمومی اطلاق نظم قرآن پاک کے لئے زیادہ مناسب ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دشواری اگر کسی سوراخ کے اندر بھی ہوگی تو آسانی اس کی تلاش میں سوراخ کے اندر بھی جا گھسے گی، اور ایک دشواری دو آسانیوں پر کبھی غالب نہ ہوگی۔ اسی کو شاعر نے کہا ہے: ؎

إذا شتدت بک البلوی ٭ ففکر فی الم نشرح

فعسر بین یسرین ٭ إذا فکرتہ فافرح

جب تجھ پر کوئی مصیبت سخت ہو جائے، تو سورۂ ألم نشرح میں غور کر کے اس میں ایک تنگی دو آسانیوں کے درمیان ہے، جب تو یہ بات سوچ لے تو خوش ہو جا۔

مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ مَعَ الْعُسْرِ کا مطلب بعد العسر ہے، لفظ بعد کے بجائے لفظ مع کا استعمال یہ بتانے کے لئے ہے کہ عسر کے بعد یسرین کا حصول متصل و یقینی اور قریب ہی ہے۔

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ جب آپ تبلیغ و دعوت الیٰ اللہ کے کام سے مکمل فراغت پائیں تو اپنے ربّ کے ساتھ بلا واسطہ خصوصی توجہ کا اہتمام کریں۔ اور اس میں تعب و تھکان سے محنت کریں اور اسی رغبت کو مقصد حیات سمجھ کرامت کی رہنمائی کا سبب و تعلیم کا ذریعہ بنائیں۔

جاننا چاہئے کہ مؤمن کی ساری زندگی عبارت ہے، اشتغال بطاعۃ اللہ و ذکر اللہ سے کبھی خلق خدا کی تبلیغ و دعوت الیٰ اللہ کے التزام سے، چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے نائبین کا طرۂ امتیاز و شان یہی اصلاح و ہدایت خلق ہی ہے، اس سے فراغت کے بعد دوسرا مرحلہ براہ راست توجہ و سیر الیٰ اللہ کا ہے، جس میں خصوصی عبادات نماز، ذکر و اذکار، دعوات، قیام اللیل وغیرہ امور ہیں، ان کی بجا آوری بھی نہایت اہم اور ضروری ہے، گویا اول مرحلہ علم کا ہوا، دوسرا مرحلہ عمل کا، یا یہ کہ پہلا مرتبہ عمومی اعمال کا، دوسرا مرحلہ خصوصی اعمال کا۔ واللہ اعلم

سُورَةُ التِّينِ

مكية آياتها ٨ ركوعها ١

سورۂ تین مکی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

سورت کا نام سورۃ التین ہے، یہ لفظ پہلی آیت کا پہلا کلمہ ہے، اسی سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول سورۃ البروج کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت آٹھ (۸) آیتوں، چونتیس (۳۴) کلمات اور ایک سو پچاس (۱۵۰) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

سورۂ انشراح میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلتوں اور رفعتوں کا بیان تھا، اس سورت میں بھی انہیں مراتب وفضائل کا تذکرہ ہے۔ سابق سورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کا بیان تھا، اس سورت میں آپ کی جائے پیدائش اور مرکزِ بعثت دعوت وتبلیغ کے مرکز بلدامین کا تذکرہ ہے، اور ساتھ ساتھ طور سینین (سیدنا موسیٰ علیہ السلام) کا بالواسطہ تذکرہ بھی ہے۔ سابق سورت میں یہ بیان تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے افضل وبرگزیدہ ہیں، اس سورت میں انسان کے لیے احسن تقویم کی فضیلت کا ذکر ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں (تین، زیتون، مکہ مکرمہ، کوہ طور) کی قسم اٹھا کر انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے کہ اس نے انسان کو تمام مخلوقات سے بہترین شکل وصورت میں پیدا فرمایا ہے، اس سے بہتر صورت اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو عطا نہیں فرمائی، پھر ارشاد ہے کہ یہ ظاہری خوبصورتی انسان کی باطنی و روحانی خوبصورتی کا مرہون منت ہے، اگر انسان اپنے فرائضِ منصبی کو پورا ادا کرتا ہے تو واقعی وہ کائنات کی بہترین ہستی ہے، اور اگر وہ ان پاکیزہ فرائض کی بجا آوری نہیں کرتا تو پھر اس سے بڑھ کر ذلیل چیز بھی دنیا میں نہیں ہوسکتی، ایسا انسان کائنات کی حقیر چیز سے بھی بدتر اور ذلیل شمار ہوجاتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾ وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ﴿۳﴾ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ
اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَہُمۡ
اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ﴿۶﴾ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۷﴾ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ٪﴿۸﴾

ترجمہ: قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی ① اور طور سینا کی ② اور اس امن والے شہر کی ③ بیشک ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچہ میں پیدا کیا ہے ④ پھر ہم نے اس کو پستی والوں سے بھی زیادہ پست کردیا ⑤ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے، تو ان کو نہ ختم ہونے والا ثواب ملے گا ⑥ اور پھر اے انسان کونسی چیز تجھ کو بدلے کے دن کا منکر بنا رہی ہے ⑦ کیا اللہ تعالیٰ سارے حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ ⑧

معارف ومنازل

ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ نے اس سورت کی ابتداء چار عظیم الشان کثیر البرکۃ چیزوں کی قسموں سے فرمائی ہے، پھر خلقتِ بنی آدم کا کمال وخوبصورتی بیان فرما کر سعادت وشقاوت کے اعتبار سے اس کا انجام ومآل بھی بیان فرمایا ہے۔

چار مخصوص چیزوں کی قسمیں اور فوائد:

اس سورت میں شروع کی تین آیات میں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، جن میں سے دو درخت ہیں، یعنی (انجیر) اور زیتون، ایک پہاڑ ہے (کوہ طور) اور ایک مبارک شہر ہے (مکۃ المکرمۃ) ان چار چیزوں کی وجہ تخصیص یہ ہوسکتی ہے کہ یہ دونوں درخت کثیر البرکۃ اور کثیر المنافع ہیں، جس طرح کہ کوہ طور اور شہر مکہ مکرمہ عظیم الشان اور کثیر البرکۃ ہیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تین اور زیتون کے ذکر سے وہ جگہ مراد ہو، جہاں یہ درخت بکثرت پیدا ہوتے ہیں، اور وہ ملک شام و فلسطین ہے، جو معدن و مرکز ہے انبیا علیہم السلام کے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے وطن سے ہجرت فرما کر وہیں مقیم ہوئے۔

یہ خطہ اکثر و بیشتر انبیاء کرام علیہم السلام کا وطن و مسکن رہا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ارجمند حضرت اسحاق علیہ السلام اور اس کی پوری نسل انبیاء ورُسل علیہم السلام کا تعلق اسی سرزمین سے وابستہ رہا ہے۔ مسجد اقصیٰ بیت المقدس بھی اسی کا حصہ ہے، کوہ طور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ربّ العزّت سبحانہ سے ہم کلام ہونے کا مقام ہے، طور سینین طور سینا، اسی مقام کا نام ہے، قرآن کریم نے: ﴿الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ﴾ [الإسراء: ۱] (جس کے گردا گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں) اسی مقام کو کہا ہے اور نوازا ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ سطور میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

﴿بَلَدِ الْاَمِیْنِ﴾ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ مکہ مکرمہ کا شرف اور عظمت محتاج بیان نہیں ہے، وہ: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ﴾ [آل عمران] (پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکے میں ہے بابرکت اور جہاں کے لیے موجبِ ہدایت اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے، جو شخص اس (مبارک) گھر میں داخل ہوا اس نے امن پالیا)۔

مکہ مکرمہ کے فضائل و برکات تواتر کے ساتھ اتنی بکثرت ہیں کہ انہیں کسی طرح احاطہ و بیان کرنا ممکن نہیں، خاص کر یہ فضیلت عالیہ کاملہ کہ وہ سارے انبیاء علیہم لسلام کا قبلہ رہا ہے، اور سرور عالم خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد و مسکن رہا ہے، اور قیامِ قیامت تک عالم اسلام کا قبلہ و کعبہ ہے، جہاں فریضۂ حج جیسی عبادت کی سالانہ ادائے گی ہوتی رہے گی، اسی بنیاد پر ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ نے اسے ﴿وَهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ [آل

عمران: ۹۶] (مخلوقات کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے) کے نام ولقب سے یاد فرمایا۔ الحمد للہ

اگر ان مقامات سے مراد ان کے مکین ہوں، یعنی انجیر و زیتون کے پہاڑ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام و دوسرے انبیاء علیہم السلام ہوں، طور سینین سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں، اور بلد امین مکہ سے مراد حضرت رحمۃ العلمین صلی اللہ علیہ وسلم ہوں، تو یہ ایک عمدہ تعبیر و تاویل ہوگی، جس کو بعض مفسرین نے پسند کیا اور سراہا ہے۔ رحمہم اللہ۔ پس یہ ہستیاں (یعنی انبیاء علیہم السلام) آنے والی آیت: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ کے لیے بمنزلہ ثبوت و گواہ کے ہیں، اور احسن تقویم کے لئے بہترین نمونے ہیں، فالأنبياء الكرام أحسن الناس و أفضلهم خلقاً و صورةً و علماً و عملاً و تقوًى۔

انجیر اور زیتون کے فوائد و برکات کا مختصر بیان:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ [آل عمران:۱۹۱] (اے ہمارے پروردگار! آپ اس کو بلا وجہ پیدا نہیں فرمایا)۔ ربّ العزّت سبحانہ نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت کائنات کی کوئی چیز بغیر منافع و فوائد بے مقصد پیدا نہیں فرمائی ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی تخلیق میں بے شمار فوائد ودیعت رکھے گئے ہیں، کیڑے مکوڑے ہوں یا معمولی مخلوقات میں اتنی بکثرت فوائد مستور ہیں، جنہیں شمار نہیں کیا جا سکتا، طبی مفردات میں انجیر کے ستر سے زائد خواص و منافع اور زیتون کے تقریباً ایک سو سے زائد فوائد کا بیان ہے۔

انجیر کے فوائد میں سے چند یہ ہیں:

یہ ایک عمدہ غذا ہے، مقوی معدہ، قبض کشا ہے، مشتہی فربہی لانے والا ہے، مقوی دماغ، مقوی قلب ہے، بواسیر کے لیے بڑا مفید، جگر، گردہ، پتہ، مثانہ کے لیے بہت بڑا مفید ہے، اور مخرج سنگِ گردہ و مثانہ ہے، بالوں کے لیے اکسیر ہے، خارش کے لئے بہق و برص کے لیے فائدہ مند ہے، شبکوری اور امراضِ چشم میں کارآمد ہے، مقوی بدن، مقوی باہ ہے، پرانے بخاروں کو دفع کرتی ہے، بے خوابی اور سہر کے لیے قاطع ہے، کرمِ شکم کا مخرج ہے، کھانسی میں مفید ہے، مدر بول ہے، جوڑوں کے درد اور عرق النساء، نقرس کے لئے بہت کارآمد ہے، عورتوں کے اکثر زنانہ امراض میں بڑی کارآمد ہے، سینہ کو بلغم سے صاف کرتی ہے، اگر طالب علم اسے مسلسل دو ماہ یومیہ چار عدد استعمال کرے قوت حافظہ تیز ہو جائے گی، جو لوگ اسے سرکہ کے ہمراہ کھائیں پیٹ کی چربی زائل ہو جائے گی، بد بوئے دہن اور بغل کو دور کرتی ہے۔

زیتون: انجیر میں جتنے فوائد ہیں وہ سب کے سب زیتون میں موجود ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے فوائد زیتون میں ہیں، مثلاً یہ کہ زیتون سل ودق کا عمدہ علاج ہے، اس کا تیل پچیس بیماریوں میں کار آمد ہے، بالوں کی سیاہی کو برقرار رکھتا ہے، عورتوں کے سیلان الرحم اور مردوں کے جریان میں اچھا خاصا کار آمد ہے، زخموں پر چھڑکنے سے فائدہ ہوتا ہے، گرنے والے بالوں کو روکتا ہے اور فائدہ دیتا ہے، بدن اور معدہ کی خشکی دور کرتا ہے، غدہ قدامیہ کو درست رکھتا ہے، امراضِ کان وناک میں مفید ہے، بچھو کے کاٹے پر لگانے سے درد کم ہوجاتا ہے، قولنج میں مفید ہے، وجع المفاصل میں کار آمد ہے، گرتے ناخنوں کو سہارا دیتا ہے، کثرتِ زکام اور درد سینہ ونزلہ میں فائدہ مند ہے، لکنت زبان کے لیے مفید ہے، کثرتِ احتلام میں اور حرارتِ مثانہ میں فائدہ مند ہے، پاک ہے وہ ذات عالی صفات جل شانہ جس نے ایک ایک ذرہ میں ہزاروں فوائد ومنافع پیدا کئے، اور اپنی مخلوقات کو نوازا ہے۔

طور سینین کی تحقیق اور اس کا تعین:

کلمہ ''طور'' قرآن حکیم میں دس مقامات پر مذکور ہے، جن کی تفصیل اور مقامات یہ ہیں:

(۱) ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ [البقرة: ٦٣] (اور جب ہم نے تم سے عہد (کر) لیا اور کوہِ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا)۔

(۲) ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ [البقرة: ٩٣] (اور جب ہم نے تم سے عہد (کر) لیا اور کوہِ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا)۔

(۳) ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ﴾ [النساء: ١٥٤] (اور ان سے عہد لینے کو ہم نے ان پر کوہِ طور اٹھا کھڑا کیا)۔

(۴) ﴿وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ﴾ [مریم: ٥٢] (اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب پکارا)۔(۵) ﴿وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ﴾ [طٰه: ٨٠] (اور تمہیں طور کی داہنی طرف کا وعدہ دیا)۔(۶) ﴿وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ﴾ [المؤمنون: ٢٠] (اور وہ پیڑ پیدا کیا کہ طور سینا سے نکلتا ہے)۔

(۷) ﴿اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا﴾ [القصص: ٢٩] (طور کی طرف ایک آگ دیکھی)۔

(۸) ﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا﴾ [القصص: ٤٦] (اور نہ تم طور کے کنارے تھے جب ہم نے ندا فرمائی)۔(۹) ﴿وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ﴾ [الطور: ١] (طور کی قسم اور اس نوشتہ کی

جو کھلے دفتر میں لکھا ہے)۔

(۱۰) ﴿وَ التِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ﴾ [التین: ۲] (انجیر کی قسم اور زیتون کی اور طور سینین کی)۔ ان دس مقامات کی آخری دو مقامات میں قسم کے ساتھ ہیں، باقی اٹھ مقامات پر بغیر قسم کے مذکور ہے۔

طُوْرِ پہاڑ، ہرا بھرا پہاڑ، کوہ درخت ناک جزیرۂ نمائے سینا کے ایک مخصوص و متعین، پہاڑ کا نام۔ عربی زبان میں طور کے معنی پہاڑ کے ہیں، لیکن بعض اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ مطلق پہاڑ کو طور نہیں کہتے، بلکہ جب تک وہ درختوں سے ہرا بھرا نہ ہو طور نہیں کہلائے گا۔ عرب کے مشہور جغرافیہ نویس اور ادیب علامہ یاقوت حموی رومی المتوفی ۶۲۶ھ اپنی کتاب معجم البلدان میں جو قدیم جغرافیہ پر نہایت ہی مستند اور مشہور و معروف تصنیف ہے رقمطراز ہیں:

﴿وَ الطُّوْرُ﴾ في كلام العرب الجبل، و قال بعض أهل اللغة: لا يسمى طورا حتى يكون ذا شجر و لا يقال للاجرد طور۔ [ج: ٦ ص: ٦٧] ''طور'' عربی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں، اور بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ جب تک پہاڑ میں درخت نہ ہوں اس کو ''طور'' سے موسوم نہیں کیا جاتا، چنانچہ خشک پہاڑ کو جو درختوں سے خالی ہو طور نہیں کہتے۔

امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں مجاہد سے نقل کیا ہے کہ سریانی زبان میں ''طور'' پہاڑ کو کہتے ہیں، اور ابن ابی حاتم ضحاکؒ سے ناقل ہیں کہ نبطی زبان میں ''طور'' کے معنی پہاڑ کے ہیں۔ [الاتقان في علوم القرآن]

بہر حال! ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی سریانی اور نبطی تینوں زبانوں میں ''طور'' کا استعمال یکساں طور پر ہوتا ہے، لیکن عربی لغت نویسوں نے اس کے معنی بیان کرنے میں سرسبز اور خشک پہاڑ کا بھی فرق ملحوظ نظر رکھا ہے۔ مفسرین و ارباب روایت میں سے ابن جریر ابن ابی حاتم اور ابن مردویہؒ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس فرق کو نقل کیا ہے: الطور ما أنبت من الجبال و ما لم ينبت فليس بطور۔ [فتح القدير للشو كاني] طور وہ پہاڑ ہے جس میں روئیدگی ہو، اور جس میں روئیدگی نہیں وہ ''طور'' نہیں۔

قرآن مجید میں طور کا استعمال ایک مخصوص و متعین پہاڑ کے لئے ہوا ہے چنانچہ الطُّوْر الف لام عہد کا اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جو مصر و مدین کے مابین ہے۔ حضرت موسیٰ علی نبینا و علیه الصلوة و السلام کو اسی پہاڑ پر تجلی خداوندی سے سرفراز فرمایا گیا تھا، اسی پہاڑ پر آپ کو خلعتِ کلیمی سے نوازا گیا تھا، اسی پہاڑ پر آنجناب کو بارگاہِ ربانی سے ''الواحِ توریت'' کے نسخہ مرحمت فرمائے تھے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس کو حضرت جبریل علیہ السلام نے اُٹھا کر

بنی اسرائیل کے سروں پر لا کھڑا کیا تھا، قرآن مجید میں جابجا ان تمام واقعات کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

یاقوت رومی نے طور کے سلسلہ میں حسب ذیل پہاڑوں کی نامزدگی کی ہے:

(۱) بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ طور یہی پہاڑ ہے، جو نابلس پر بلند ہے، سامرہ اس کا حج کرتے ہیں، اور یہود اس کی بڑی تعظیم بجالاتے ہیں، یہود کے زعم میں اسی پہاڑ پر حضرت ابراہیم علی نبینا علیہ الصلوۃ و السلام کو حضرت اسماعیل علی نبینا و علیہ الصلوۃ و السلام کی قربانی کے لئے حکم دیا گیا تھا، مگر ان کے یہاں تورات میں ذبیح بجائے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں۔

(۲) مصر کے قریب ایک موضع کے پاس جس کا نام "مدین" ہے، ایک پہاڑ ہے جو "طور" سے موسوم ہے، یہ صلحاء کا مسکن ہے، اس پہاڑ کے پتھروں کو کسی ترکیب سے بھی توڑا جائے ان پر درخت عتیق (یہ ایک قسم کی گھاس ہے جو درختوں پر آویزاں ہو جاتی ہے، اس کے فوائد بہت ہیں، اس کا پھل شہتوت کی مزاج کا ہوتا ہے) کی تصویر نمودار ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوۃ و السلام کو دوسری مرتبہ خطاب الٰہی اسی پہاڑ پر ہوا تھا، جبکہ وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے واپس آرہے تھے "نبطی" میں ہر پہاڑ کو طور کہتے ہیں، اور جب اس پر سبز اور درخت ہوں تو "طور سینا" کہلاتا ہے۔

(۳) طبریہ اردن پر بھی ایک پہاڑ ہے، جس کو "طور" کہا جاتا ہے، یہ طبریہ سے بارہ میل پر ہے۔

(۴) مصر کے بالائی علاقہ میں ایک آبادی کے پاس "طور" نامی ایک پہاڑ ہے، جس میں متعدد گاؤں بستے ہیں، اور اسی کے قریب کوہ فاران واقع ہے۔ [معجم البلدان]

طور کی وجہ تسمیہ:

(۱) طور کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے صاحبزادے "بطور بن اسمٰعیل" کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر طور سے موسوم ہے، با کا استعمال ثقل کی وجہ سے جاتا رہا، اور طور کہا جانے لگا۔ یہی نہیں، بلکہ پورا ملک شام بھی طور کہلاتا تھا۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ چونکہ "بطور بن اسمٰعیل" یہاں کے حکمران تھے، ان کی نسبت سے پورا ملک طور کہلاتا تھا۔

(۲) چونکہ ملک شام اور وہاں کے پہاڑ طور سے موسوم تھے، اس لئے طور موسیٰ کے سلسلہ میں بھی بہت سے علماء کا ذہن ملک شام کی طرف منتقل ہوا، اور انہوں نے اس کو شام ہی میں بتلایا، حتی کہ ابوحیان نے تو "البحر المحیط" میں

یہاں تک لکھ دیا کہ اس میں کوئی اختلاف ہی نہیں کہ یہ پہاڑ شام میں واقع ہے، چنانچہ محمود آلوسی روح المعانی میں رقمطراز ہیں: و في البحر أنه لم يختلف في أنه جبل بالشام و تعقبه الشهاب بأنه خلاف المشهور فإن المعروف اليوم بطور سينا ما هو يقرب التيه بين مصر و العقبة۔

البحر المحیط میں ہے کہ اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ شام میں ایک پہاڑ ہے، اور شہاب الدین خفاجی نے اس پر گرفت کی ہے کہ یہ خلاف مشہور ہے، کیونکہ جو پہاڑ آج طور سینا کے نام سے معروف ہے، وہ ہے ''جوتیہ'' کے نزدیک مصر اور عقبہ کے مابین واقع ہے۔

واضح رہے کہ زمانۂ حال میں نہر سویز نے براعظم افریقہ کو ایک عظیم الشان جزیرہ کی شکل میں ایشیاء کے براعظم سے جدا کر دیا ہے، ورنہ جزیرہ نمائے سینا خلیج سویز اور خلیج عقبہ سے گھرا ہوا ہے، اس کے شمال میں بیابانِ تیہ ہے، یہ عرب کے شمال اور مغربی حصہ کو افریقہ سے ملائے ہوئے تھا، اس جزیرہ نما میں سینا کا کوہستانی سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے، جدید جغرافیہ نویس تصریح کرتے ہیں کہ ''طور'' کا اطلاق جزیرہ نمائے سینا کے متعدد پہاڑوں پر ہوتا ہے، لیکن موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے سلسلہ میں کوہِ طور سے مراد کوہ سینا ہے۔

قرآن مجید میں دو مقام پر ''طور'' کی قسم کھائی گئی ہے: ایک سورۂ طور میں، دوسرے سورۂ تین میں۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ دہلوی نے اس سلسلہ میں ایک نفیس بحث سپرد قلم فرمائی ہے، جو ہدیہ ناظرین ہے، فرماتے ہیں:

طور لغت میں پہاڑ کو کہتے ہیں، پہاڑ دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو درختوں سے ہرے بھرے ہوں، ان میں جا بجا پانی کے چشمے بہہ رہے ہوں، جن کی بدولت درختوں کی ان میں بہتات ہوں، میوہ کے اقسام میں سے ''چارمغز اور حبّ الزلم'' جس کو ہندی میں ''چرونجی'' کہتے ہیں، نیز انجیر و زیتون اور بھی بڑے بڑے درخت خصوصاً ساگوان کے درخت خود رو وہاں پیدا ہوتے ہوں، اور انواع و اقسام کی دوائیاں اور جڑی بوٹیاں، گرم مصالحہ اور جدوار، نیز طرح طرح کی نفع بخش و مضر نباتات کی وہاں کثرت سے پیداوار ہو، اور عجیب عجیب جانور، جیسے بارہ سنگھا اور آہوئے، مشک اور مرغ زریں اور مختلف اقسام کے جانور وہاں پیدا ہوتے ہوں، اور جنس معادن سے بلور یشب اور دوسرے مختلف اقسام کے پتھر وہاں پائے جاتے ہوں۔

سو اس قسم کے پہاڑ کی جامعیت بہت اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جاتی ہے کہ اس میں طرح طرح کے نباتات اور انواع و اقسام کے حیوانات موجود ہوتے ہیں، نیز ارواحِ جنیہ ان پہاڑوں میں بہت ہوتے ہیں، اور انسانی افراد بھی

اشیاءِ مذکورہ سے نفع اندوزی کی خاطر وہیں سکونت اختیار کر لیتے ہیں، سو ایسی جمعیت وہاں فراہم ہو جاتی ہے کہ اس کا عشرِ عشیر بھی کسی جگہ معلوم نہیں ہوتا، تاہم باوجود اس جامعیت کے ہر کوہ پر شجر پر، تجلی الٰہی نہیں ہوتی، لہٰذا اس قسم کے پہاڑ پر اگر تجلی الٰہی بھی حاصل ہو جائے تو پھر جامعیت اتم فراہم ہو جاتی ہے۔

سو اس صفت کا کوہ و پر شجر مدین و مصر کے راستہ میں ایک پہاڑ ہے کہ جس کو ''فلسطین'' کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ و السلام کو اسی پہاڑ پر تجلی الٰہی سے مشرف فرمایا گیا، اور ندائے ''اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ'' اسی پہاڑ سے آپ کے سمعِ اقدس میں پہنچائی گئی۔ اسی پہاڑ پر آنجناب کو رتبۂ کلیمی حاصل ہوا، اور اس واقعہ کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ و السلام اس پہاڑ پر تشریف لے جاتے اور مناجات باری میں چلہ کشیاں فرماتے تھے۔ الواحِ توریت بارگاہ خداوندی سے اسی پہاڑ پر آپ کو عنایت ہوئی تھیں۔

سو وہ پہاڑ جامعیت ظاہر کے ساتھ ساتھ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ و السلام کے اسرارِ وحی اور انوارِ عبادات کا بھی جامع تھا، اور جس اسرار و انوار نے اس پہاڑ پر ظہور فرما کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیہوش کیا، وہ اس قدر اس مقام پر جاگزین اور راسخ رہا کہ مدتہا مدت اور زمانہائے دراز کے گزرنے پر بھی وہ پیروان حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے شرائع کی امداد کے لئے کافی ہوا، پس انوار موسوی کا مبدأ اور منتہا کہ سارے بنی اسرائیل جن انوار سے منور و مہذب ہوئے یہی مبارک پہاڑ ہے۔ اسی واسطے اس قسم میں پہلی قسم سے بھی ترقی فرمائی، کیونکہ جو نور زیتون میں ہے وہ نور نورِ عنصری ہے، اور جس نور نے اس پہاڑ پر تجلی فرما کر اس کو ریزہ ریزہ اور پارہ پارہ کر دیا تھا وہ نور الٰہی تھا کہ قرنوں اور مدتوں اس کی تاثیر باقی رہی، اور نہال کمال موسوی کو تابہ ابد اس سے سیراب فرمایا۔

دوسرے خشک پہاڑ کہ اس میں پانی نہ جھاڑ ا ایسا پہاڑ انسان کے جسم مردہ کے مانند ہے کہ بظاہر انسان معلوم ہوتا ہے اور باطن میں کسی انسانی کیفیت کا حامل نہیں، اور چونکہ اس قسم کا پہاڑ قسم کے قابل نہیں، لہٰذا اس سے بچنے کے لیے ہی ''سینین'' کا لفظ فرمایا ہے، اور اگرچہ اصل لغت میں ''طور سینین'' ہر کوہ پُر شجر کو کہتے ہیں، لیکن اہل عرب کے عرف میں یہ لفظ اسی کوہ موسوی کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس پر تجلی الٰہی واقع ہوئی تھی۔

سِیۡنِیۡنَ نبطی زبان کا لفظ ہے، نبطی اقلیم شام کے کاشتکار لوگ ہیں، عرب اس لفظ کو طرح طرح کے تصرف سے استعمال کرتے ہیں، کبھی ''سِیۡنِیۡنَ'' کہتے ہیں، اور کبھی ''سَیۡنَا'' بفتحہ سین، چنانچہ سورۂ قَدۡ اَفۡلَحَ میں آیا ہے، اور کبھی ''سِیۡنَآءَ'' بکسر سین، چنانچہ ابو عمرو، نافع اور ابن کثیرؒ نے یہی قرأت کی ہے۔

اور بعض مفسرین کا بیان ہے کہ انجیر سے مراد مسجد اصحاب کہف ہے، اس مسجد کے حوالی میں انجیر کے درخت بہت ہیں، اور زیتون سے مراد مسجد بیت المقدس ہے کہ اس کے اردگرد درخت زیتون بہت ہیں۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ زیتون سے مراد "طورِ زیتا" ہے کہ جو بیت المقدس کی شرقی جانب ایک پہاڑ ہے، اور مسجد اقصیٰ پر بلند ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ) جب بیت المقدس کی زیارت کے لئے تشریف لے گئیں اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھ چکیں تو "کوہ زیتا" کے اوپر چڑھ گئیں، اور اس پر بھی نماز ادا کی، اور اس پہاڑ کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر اشارہ فرمایا کہ اس جگہ سے لوگ قیامت کے دن جدا ہوں گے، ایک جماعت بہشت کو روانہ ہوگی اور دوسری دوزخ کو، یہ وہی پہاڑ ہے کہ حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوۃ و السلام کو اسی پہاڑ پر سے آسمان پر اٹھایا گیا تھا، اس مقام کی نصاری بڑی تعظیم کرتے تھے، اور اب بھی کرتے ہیں، اس پہاڑ کی چوٹی پر "سیلانہ" نامی ایک فرنگی عورت نے ایک گرجا تعمیر کرایا تھا، اور اس گرجا میں ایک گنبد بنایا تھا کہ جس کو "مصعدِ عیسیٰ" کہا کرتے تھے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کی جگہ۔

رفتہ رفتہ وہ کنیسہ تو منہدم ہو گیا، لیکن بالفعل اس پہاڑ پر خرنوب نبطی کا درخت ہے، جس کے قریب ایک مسجد بنائی گئی ہے، اور اس مسجد کے پائیں میں ایک غار ہے، بہت سے لوگ اس مکان کی زیارت کے واسطے وہاں جاتے ہیں، اور اس درخت کو "خرنوب العشرۃ" کہتے ہیں۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے جب بیت المقدس کو فتح کر کے فرنگیوں کے ہاتھ سے چھڑایا تھا تو "طور زیتا" کی کل زمین کو شیخ احمد حکاری اور شیخ علی حکاری دونوں کو برابر تقسیم کر کے وقف کر دیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۰؍ ذی الحجہ ۵۸۴ھ ہجری کا ہے۔ اور وہ زمین تا حال ان دونوں شیخوں کی اولاد کے ہاتھ میں ہے۔ (یہ قصہ شاہ صاحبؒ کے عہد تک ہے، معلوم نہیں اس دور انقلاب میں اب وہ زمین کس کے قبضہ میں ہے)۔ [نعمانی] پس اس صورت میں اول قسم اس مقام کی ذکر کی جو اصحاب کہف کے انوارِ ولایت کی جگہ ہے۔

اصحاب کہف اولیاء کا وہ پہلا گروہ ہے کہ جنہوں نے راہِ فنا کو طے کیا ہے، اس کے بعد مقامِ انوارِ نبوتِ عیسوی کی قسم کھائی، ازاں بعد مقام انوارِ موسوی کی قسم کو ذکر کر کے اس کے بعد فرماتے ہیں:

﴿وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ﴾ یعنی قسم ہے اس امانت والے یا امن والے شہر کی۔ اس شہر سے مکہ معظمہ مراد ہے کہ جو اپنی جامعیت میں انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ [تفسیر فتح العزیز]

یہاں یہ امر بھی واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین کا اس امر میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ طور سے ''طور موسیٰ'' اور بلدِ امین سے ''مکہ معظمہ'' مراد ہے، لیکن عام طور پر مفسرین تین وزیتون سے انجیر وزیتون ہی مراد لیتے ہیں، حالانکہ سیاق چاہتا ہے کہ یہاں بھی تین وزیتون سے منابت التین والزیتون مراد ہوں۔ اور ان سے بھی ایسے دو مختلف مقامات مراد ہوں کہ جو طور و بلدِ امین کی طرح مہبط انوارِ الٰہی ہوں۔ متقدمین سلف کی ایک جماعت نے اس کی تصریح بھی کی ہے، چنانچہ ابن زید فرماتے ہیں کہ ''تین'' سے مسجد دمشق اور ''زیتون'' سے مسجد بیت المقدس مراد ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ تین وہ پہاڑ ہے جہاں دمشق آباد ہے، اور زیتون وہ پہاڑ ہے جہاں بیت المقدس بسا ہوا ہے، عکرمہ اور کعب احبار کہتے ہیں کہ تین دمشق اور زیتون بیت المقدس ہے۔ [تفسیر فتح القدیر]

تین وزیتون سے منابت ﴿وَالتِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ﴾ یعنی ان کے پیداوار کے مقامات کو مراد لینے میں زبان کا ادنیٰ سا بھی اشکال نہیں۔ عرب کا دستور ہے کہ وہ اکثر ان مقامات کو جہاں پر کوئی درخت کثرت سے پیدا ہو، اسی درخت کے نام سے موسوم کر دیتے ہیں، چنانچہ جہاں غضا (غضا ایک قسم کا درخت ہے جو بیر کے مشابہ ہوتا ہے) کے درخت بکثرت ہوں، اس مقام کو ''غضی'' اور درختوں کا جھنڈ جہاں ہو اس کو ''شجر'' اور نخلستان کو ''نخلہ'' کہتے ہیں۔ یہ لفظ کے اصلی معنی سے ہٹتا نہیں، بلکہ اس کے متعدد معانی میں سے ایک معنی کا استعمال ہے بطریق تسمیۃ الظرف بالمظروف کے، یعنی ظرف کو مظروف کا نام دے دینا، جو شائع ذائع ہے، پس تین و زیتون سے ان کے مقامات روئیدگی کو مراد لینا بھی اسی قبیل سے ہے۔

مولانا حمید الدین فراہی نے اپنی تفسیر ''نظام القرآن'' میں سورۃ التین (نظام القرآن میں سے تفسیر سورۃ التین کا ٹکڑا علیحدہ رسالہ کی صورت میں ''مطبع معارف اعظم گڑھ'' میں طبع ہو چکا ہے، اسی طرح پارۂ عم کی کچھ اور سورتوں کی تفسیریں بھی علیحدہ علیحدہ رسالوں کی شکل میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں) کی تفسیر میں ان مقامات کے تعین پر بڑی عمدہ اور تحقیقی بحث کی ہے، وہ مقاماتِ ثلاثہ کی تعیین میں تو شاہ صاحبؒ سے متفق ہیں، زیتون سے وہ بھی ''طور زیتا'' یعنی جبل زیتون ہی مراد لیتے ہیں، البتہ تین کی تفسیر میں شاہ صاحبؒ نے محمد بن کعبؒ کے قول کو لیا ہے، وہ تین مسجد اصحاب کہف کو بتلاتے ہیں۔

مولانا فراہیؒ نے اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ وہ تین سے مسجد نوح علی نبینا علیہ الصلوٰۃ و السلام کو مراد لیتے ہیں کہ جو کوہِ ''جودی'' پر تعمیر کی گئی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

سے اس روایت کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے نقل کیا ہے۔ [فتح القدیر]

﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ﴾ بیشک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا۔ یہ چاروں قسموں کا جواب ہے، اس مضمون کے لئے چار قسمیں کھائی گئی ہیں کہ انسان کی تخلیق سب سے یعنی تمام مخلوقات سے اعلیٰ واحسن ہے، اس کے تناسبِ اجزاء کو دیکھا جائے تو عقل حیران رہ جائے، ناک ہے تو کیسی اور کس موقع پر، آنکھیں ہیں تو کیسی اور کس انداز پر، بھوؤں اور پلکوں کی خوبصورتی اس نرگسی آنکھ کی (جس کی سفیدی اور سیاہی عاشق کو بیتاب کرے) پھر ہاتھ پاؤں اور انگلیاں ان کے جوڑ اور خوبصورت ساخت کیسے دلکش، قدسرو درخت کی طرح، پیشانی اور دونوں دلگداز کانوں کی شکل کیسی حسین وجمیل ہے، رخساروں کی خوبی آفتاب وچاند کی طرح، بالوں کی لمبائی و رنگ دونوں سرخابی اور کاغذی ہونٹ اور شیریں زبان وخوبصورت دہن ''درعدن'' کی طرح، دندان، گردن جو آہوئے ختن کو شرمائے، نازونخرہ اور دلفریب گفتار۔

ربّ العزۃ الخالق المصور، ﴿یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ﴾ [آل عمران: ٦] (وہی ہے کہ تمہاری تصویر بناتا ہے ماؤں کے پیٹ میں جیسی چاہے) کے مالک ومختار نے انسان کو کیسا عمدہ و اعلیٰ شعور، علم و فراست کی وہ اعلیٰ بلند پایہ قابلیتیں، صلاحتیں اور بخشی گئی ہیں، جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئیں۔

اس کے ساتھ یہ کرم نوازی دیکھیں کہ تمام جاندار بڑے دیو ہیکل مخلوقات، ہاتھی، اونٹ گھوڑے، خچر گدھے، گائے، بھینس وغیرہ سب اس کی تسخیر میں دے کر اسے اکثر و بیشتر مخلوقات پر حکمرانی بخشی گئی کہ ان جانوروں سے حیوانات اور جمادات ونباتات وغیرہ سے جب چاہے، جس طرح چاہے، جتنا چاہے ہر قسم کی خدمت لے اور ان پر حکمرانی کرے، مجال نہیں کہ کوئی مخلوق اس کی فرمانبرداری سے انحراف کرے۔

پھر اس کے باطن میں کیا کیا مخفی استعدادیں اور قوتیں رکھ دیں کہ اس کو قادر، مرید، سمیع، بصیر، مدبر، حکیم، متکلم اور مافی الضمیر کا گویا بنادیا، گویا اپنی صفاتِ عالیہ سے اُسے حصہ عطا کیا، چنانچہ حدیث شریف میں اسی طرف اشارہ ہے: إن الله خلق آدم علی صورته (اللہ ربّ العزّت نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا)۔ [مشکوۃ] کیونکہ ربّ العزّت سبحانہ ہر قسم کی شکل وصورت سے تو پاک ہے: ﴿لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] (اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے)۔ ﴿اَفَمَنۡ یَّخۡلُقُ کَمَنۡ لَّا یَخۡلُقُ﴾ [النحل: ۱۷] (کیا جو پیدا فرماتا ہے اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرسکتا؟)۔ اس کی کوئی مثل نہیں، اور مخلوق جیسا نہیں، پھر یہ صفات ہی کی طرف اشارہ ہے۔

پھر انہیں مزایا وصفات کی بدولت تو انسان کو عالم اصغر کہا گیا ہے، یہ تمام عالم کا مجموعہ ونمونہ ہے، جو کچھ جہاں میں ہے وہ سب کچھ حضرت انسان کی جان میں ہے، اس میں سینکڑوں دریا موجزن ہیں، بے شمار لہریں بہہ رہی ہیں، بلندو بالا پہاڑوں کا سلسلہ، شجرونباتات بوٹیوں کی سبزی، زرخیزی، آتش فشاں استعداد، ہیبت ناک جہنمی گڑھے، پُراز ظلمات، عجیب وغریب جنتی نزاکتیں، رحمتیں، شفقتیں، یہ انداز بیان یوں سمجھنا چاہئے اور چار نہروں کا اندازہ لگانا اس طرح ہے: (۱) شہوت کی نہر (۲) غصہ کی نہر (۳) طمع لالچ، حبِّ مال وجاہ کی نہر (۴) خیال وشعور کی نہر۔

اگر یہ صحیح اور تابع وحی الٰہی ہوں تو سب کچھ خیر، اور اگر یہ طغیانی پر ہوں تو اس کے ڈوبے کبھی نہ ابھرے، اسی طرح عشق ومحبت کی نہریں، علم وادراک، رحمت وشفقت کی نہریں، شب وروز چلتی رہتی ہیں، قوتِ ملکوتیہ وفطریہ کے بلندو بالا پہاڑوں کا سلسلہ، جن میں انجیروزیتون کے پھل میوے لگے ہوئے اور قوت بہیمیہ کے پرخار تباہ کن وادیاں، ہیبت ناک گڑھے، جن میں سانپ بچھواورز ہریلے جانور بستے پھلتے ہیں۔

جس طرح عالمِ کبیر پر تاریکیوں کی رات آتی ہے، اور انوار آفتاب عالمتاب چاند وسورج ضوٗ افشاں ہیں، اسی طرح یہ عالمِ صغیر بھی انہیں حقائق واشیاء سے زندہ وفائدہ کشاں ومحظوظ ہے، پس اگر انسان نے ظلمتوں، حماقتوں، گندگیوں، خباثتوں، بغاوتوں اور نفسانی شہوتوں کی ناپاک نہروں سے بچنے اور ایک طرف ہونے کی کوشش کی تو سعادت کے ملک کا بادشاہ بن گیا، ﴿رَاَیۡتَ نَعِیۡمًا وَّ مُلۡکًا کَبِیۡرًا﴾ [الدھر:۲۰] (تو دیکھے گا نعمت اور بڑی بادشاہی) کا استحقاق حاصل کیا، اور اگر اس نے کوشش نہیں کی اور من مانی کا شکار رہا، خودسری اختیار کی اور دنیا کی سرسبزی پر جھک کر احسن تقویم کے مالک کا حکم نہیں مانا، تو شقاوت کے عمیق گڑھے ''اسفل السافلین'' میں گر گیا، جہاں سے نکلنا مشکل کیا بلکہ محال ہے، آنے والے آیات میں انہی دونوں حالتوں کا بیان ہے۔

﴿ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ﴾ پھر اسے ہر نیچی سے نیچی حالت کی طرف پھیر دیا۔ حیوانات بیچارے سارے پست اور نیچے اس لئے ہیں کہ ان کے پاس بلندیوں پر چڑھنے کے ذرائع ووسائل نہیں، نہ عقل، نہ غور وفکر، نہ استعداد، نہ وحی الٰہی کی رہنمائی، مگر یہ احسن تقویم کا مالک انسان ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہے، اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جو ابھی بیان ہوئے، مگر اس بدنصیب نے باوجود ان سب کچھ کے تحصیلِ کمالات میں کوشش نہیں کی، بلکہ منعمِ حقیقی کے وجود تک کا انکار کر کے مصلحین کی تکذیب کی، دنیا کو سب کچھ سمجھ کر عقبیٰ کا مذاق اڑایا، تب ہی تو جانوروں سے بدتر ہو کر اسفل السافلین کی تہہ میں پہنچ گیا۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب انسان خداوند قدوس کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے، اور اپنی فطری استعداد عقل وشعور کو آخرت کے تصور سے ہٹا کر چند روزہ دنیوی عیش وعشرت پر لگا دیتا ہے، حرص، طمع، لالچ، خود غرضی، نفس پرستی، نشہ بازی، شہوت رانی، کمینہ پن، غیض وغضب اور شہوت پرستی کا شکار ہو کر پستی میں گر جاتا ہے، اہل حق سے دوری اور گندے معاشرے میں ڈوب جاتا ہے، تو تمام بلندیوں سے نیچے گر کر بداخلاقی اور بے رحمی کے گڑھے میں گرتا ہے، جانوروں سے بدتر اور بے رحم درندوں سے زیادہ ستمگر ظالم بن جاتا ہے، کسی پر اُسے رحم نہیں آتا، نہ شرم و حیاء، بلکہ تمام انسانی اقدار کا دشمن بن جاتا ہے۔

ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو درندگی کی صفت میں تمام جنگلی خونخوار درندوں کو مات کرتی ہے، درندہ تو صرف اپنے پیٹ اور غذا کی خاطر جانوروں کا شکار کرتا ہے، جانوروں کا قتل عام نہیں کرتا، مگر درندہ صفت انسان خود اپنے ہم جنس انسانوں کا نہایت بیدردی کے ساتھ قتل عام کرتا ہے، درندہ جانور اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے، مگر یہ أحسن تقویم پر پیدا ہونے والا درندہ اپنی عقل سے کام لے کر توپ، بندوق، راکٹ، بم، ٹینک، گولہ بارود، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، ہوائی جہاز اور دیگر بے شمار مہلک ہتھیار آئے دن ایجاد کرتا رہتا ہے، اور انسانوں میں امن وسلامتی عام کرنے کے بجائے پورے کرۂ ارض کو میدانِ کارزار و محاذِ جنگ قرار دے کر لاکھوں ٹن گولہ بارود نہایت بیدردی کے ساتھ اپنے ہم جنس انسانوں پر موسلا دھار بارش کی طرح برسا کر نہتے بے گناہ لاکھوں انسانوں کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے، اور اربوں کھربوں کی جائیداد مال واسباب ہزاروں مکانات بڑے بڑے شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کرتا ہے۔

یہ ناعاقبت اندیش انسان اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے کمینہ پن کی انتہاء کو پہنچتا ہے کہ عورتوں اور قوم کی لڑکیوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے، ایک ایک عورت کو دس بیس مرد اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں، باپوں، بھائیوں اور شوہروں کے سامنے ان کے گھر کی عورتوں کی عصمت لوٹتے ہیں، بچوں کے سامنے ان کے باپ ماں اور ماں باپ کے سامنے ان کے بچوں کو بیدردی سے قتل کرتے ہیں، اور ان کے خون پینے پر انہیں مجبور کرتے ہیں، اس کے علاوہ دیگر ہزاروں قسم کے مخرب اخلاق اعمال بڑے فخر ومباہات سے انجام دیتے رہتے ہیں، جنہیں سن کر یا دیکھ کر انسانیت کا سر شرم کے مارے جھک جاتا ہے۔

مشرق سے مغرب تک جنوب سے شمال تک پورا کرۂ ارض جو کسی وقت ماضی میں امن وآشتی اور سلامتی کا

گہوارہ رہا، مختصر مدت کے بعد رو بزوال ہو کر فسق و فجور شرک وضلالت اور طرح طرح کے جرائم ومظالم اور انسانیت سوز مخرب اخلاق اعمال کے دلدل میں تباہ ہو کر، غرق ہوا، ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ [الروم: ۴۱] (زمین اور سمندر میں فساد ظاہر ہوا ان اعمال کی وجہ سے جو لوگ کرتے ہیں) موجودہ یورپ اس کی زندہ مثال ہے۔

حاصل یہ کہ انسان أحسن تقویم کے ساتھ ایمان واعمال کے درجے میں فرشتوں سے بھی بازی لے جاتا ہے، اور اسفل السافلین کی دلدل میں اپنے شرک وکفر اور دیگر معاصی کی بدولت شیطان کو بھی مات دے کر پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ خلاصہ تفسیر یہ ہے کہ:

﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾ سے مراد عام انسان نہیں، بلکہ یہ کفار وفجار اور مشرک لوگوں کے لئے ہے، پھر: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ﴾ میں وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جنہوں نے ایمان لایا اور نیک اعمال اختیار کئے، اپنی فطری استعداد کو ضائع نہیں کیا، منعمِ حقیقی عزّ شانہ کی نعمتوں کا شکر بجالایا وغیرہ۔ یہ تفسیر چونکہ محاسبۂ اخروی، قانونِ جزاء وسزا کے مطابق تھی اس لئے ہم نے اسے اختیار کیا۔

دوسری تفسیر جس میں رَدَدْنٰهُ سے مراد عام انسان لئے گئے ہیں، اور استثنا میں بھی مخصوص لوگوں کو شامل کیا گیا ہے، وہ تفسیر اگرچہ عمدہ وبرحق ہے، مگر قانونِ مجازات کے دائرہ سے چونکہ خارج ہے اس لئے اس کو ترک کیا گیا، کیونکہ آئندہ آیت: ﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ﴾ صریحاً قانونِ مجازات (جزاء وسزا) پر دلالت کنندہ ہے۔

فائدہ:

﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ﴾ فعل بافاعل ومفعول بہ، اَسْفَلَ منصوب بنزع الخافض، أي في أسفل یہ متعلق یا مکان محذوف کی صفت ہو کر رَدَدْنَا کا مفعول ثانی یا مفعول اول سے حال ہوگا۔ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ پورا جملہ رَدَدْنٰهُ کے مفعول بہ سے استثناء متصل ہے، جبکہ ﴿اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾ سے جہنم نار مراد ہو۔ اور اگر ﴿اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾ سے ارزلِ عمر بڑھاپے وغیرہ مراد ہو جس طرح دوم تفسیر ہے، تو استثناء منقطع ہوگا۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، تو ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال وکردار حکیمانہ شریفانہ ہیں، اور ان کے چہروں پر کوئی سیاہی نہیں، ان کے قلوب

صاف شفاف اور بے داغ ہیں، ان کے دامن پاک ہیں، ان کی پیشانی پر گناہوں کے دھبے نہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قلوب پر شمع توحید روشن کیا ہوا ہے، اتباعِ شریعت ان کی فطرت کے ساتھ موجزن ہے، احکامِ الٰہی کی بجا آوری میں سرگرم رہتے ہیں، اللہ ربّ العزّت کی خوشنودی ورضا انہیں ہر وقت بے چین و پریشان رکھتی ہے، وہ احسن تقویم کے احسن تقاضوں کی تکمیل میں رات دن مصروف رہتے ہیں۔

تو اللہ ربّ العزّت رحمٰن ورحیم غفور وشکور انہیں ایسا اجر دے گا جو کبھی منقطع نہ ہوگا، جب تک دنیا میں رہیں گے نظر رحمت کے سایہ میں ہوتے ہیں، یہاں سے روانگی پر ﴿ارْجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ [الفجر:۲۸] (اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا، راضی کرنے والا راضی کیا ہوا) کی بشارت سنیں گے، جب قبروں سے اٹھیں گے تو ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ [الزخرف:٦٨] (آج تم پر کوئی خوف نہیں ہوگا)۔ ان کے چہروں سے معلوم ہوتا رہے گا، جب پل صراط پر سے گزریں گے تو کالبرق اللامع کا منظر دیکھیں گے، اور جب جنت الفردوس میں داخل ہوں گے تو ﴿سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ﴾ [یٰس:۵۸] (سلامتی ہے رحیم پروردگار کی طرف سے) سے ان کا استقبال کیا جائے گا، جب جنت کے بالا خانوں پر پہنچیں گے تو ﴿ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ﴾ [الحجر:٤٦] (اس میں داخل ہو جا سلامتی کے ساتھ امن میں ہو کر) کا خوش کن، روح پرور اور دلنواز نغموں سے مسحور ہو کر ہمیشہ کے لئے استراحت پائیں گے۔

﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ﴾ پس کون جھٹلا سکتا ہے آپ کو اس کے بعد جزاء وسزا کے معاملہ میں؟

اس آیت کے کئی مفہوم بیان ہوئے ہیں، سب سے پسندیدہ مفہوم علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے قتادہ اور فراء سے نقل کیا ہے: قال الفراء و قتادة أيضا: المعنى: فمن يكذبك أيها الرسول بعد هذا البيان بالدين؟ واختاره الطبري۔ یعنی قیامت کے برپا ہونے اور اس روز نیک و بد کو جزاء وسزا کا جو نظریہ آپ نے پیش کیا ہے کون عقلمند اس کی تکذیب کر سکتا ہے؟ یہ کہنے کی جرأت کس میں ہے کہ جس شخص نے ساری عمر احکامِ الٰہی کی اشاعت و بجا آوری میں گزاری، جس نے اپنے آرام وآسائش کو بنی نوع انسان کے آرام وآسائش کے لئے وقف کر دیا، جس نے نورِ حق پھیلانے میں اپنی ساری کوششیں صرف کر دیں، اس کو اس عمر بھر کی سعی پیہم اور عمل محکم کا کوئی اجر نہ ملے؟ اور جو اپنے کرتوتوں بداعمالیوں کے باعث اَسفل السافلین تک پہنچا، اس کو کوئی سزا نہ ملے۔ اس کی مزید تشریح یہ ہے:

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ﴾ کیا نہیں ہے اللہ تعالی سب حاکموں سے بڑا حاکم؟ اگر کسی

چھوٹے سے خطہ کا کوئی حاکم ہو تو تم اس سے عدل وانصاف کی توقع رکھتے ہو، اگر وہ ظلم وستم پر اتر آئے تم اس سے نفرت کرنے لگتے ہو، اور اگر حالات اجازت دیں تو اس کا تخت وتاج چھین لیتے ہو، خود ہی بتادیا کہ اللہ تعالیٰ شانہ سے بڑا حاکم اور کون ہے؟ اس کی حکومت سے بڑی حکومت کس کی ہے؟ اس کی مملکت سے وسیع مملکت کہاں ہے؟ اس کے باوجود کیا تم اس ظلم کو روا رکھنے کی اس سے توقع رکھتے ہو کہ وہ ظالم کو کچھ نہیں کہے گا اور مظلوم کی کچھ نہیں سنے گا اور کوئی داد رسی نہیں ہوگی؟ ہرگز نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا اور محال ہے۔

فائدہ:

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اس سورت کی تلاوت ختم کرو، تو کہو: بلی و أنا علی ذلک من الشاهدین۔ اور کبھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت کے بعد یہ کہتے: سبحانک فبلی۔ [روح المعانی]

اسی طرح جب پڑھو: ﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ [الزمر: ٣٦] (کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟) تو فوراً کہو: بَلٰی وَهو کافٍ عَبدَہ۔ اور جب پڑھو: ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى﴾ [القیمۃ: ٤٠] تو فوراً کہو: بَلٰی هو قَادِرٌ عَلٰی اَن یُحیِ المَوتٰی۔

سُورَةُ العَلَق

مكية آياتها ١٩ ركوعها ١

سورۂ علق مکی ہے، اس میں انیس (١٩) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ العلق اور سورۃ إقرأ ہے، دونوں لفظ پہلی اور دوسری آیت میں موجود ہیں۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے، اور یہ سورت انیس (١٩) آیات، بہتر (٧٢) الفاظ اور ایک سو اسی (١٨٠) حروف پر مشتمل ہے۔ نزول کے اعتبار سے سب سے پہلی اور ابتدائی سورت ہے۔

ربط و مناسبت:

(١) سورۂ تین میں ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ کے تحت انسان کا بہترین ساخت میں پیدا کرنا، اور اس کا جامع الکمالات ہونا بیان فرمایا گیا تھا، اس سورت میں ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ میں اس کی پیدائش کا ایک حقیر چیز یعنی خون کی پھٹکی سے ہونا بیان کیا گیا ہے، گویا سابق میں انسان کی علتِ صوری کا ذکر ہے، اور یہاں علتِ مادی کا اظہار ہے۔

(٢) سابقہ سورت میں انسان کا جامع الکمالات ہونا مذکور ہے، تو اس سورت میں اس حقیقت کو عیاں فرمایا گیا کہ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے ایسا حقیر ہے کہ اس کا مادہ خون کی پھٹکی ہے، لیکن علوم و معارف الٰہیہ نے اس کو

جامع کمالات بنا دیا، اور اشرف و افضل امانت کا حامل ہونے کی وجہ سے اس کو أحسن تقویم میں پیدا کیا گیا، کیونکہ مکان مکین کے مناسب ہوتا ہے۔

(۳) اسی طرح سورۂ تین میں مکذّبین اور ان کی تکذیب کے بے اثر ہوجانے کو اجمالاً بیان فرمایا گیا تو یہاں اشارۃً ایک مکذّب کی زبردست کوشش کے نصرت خداوندی سے ناکام ہوجانے کا واقعہ بھی ذکر فرمایا گیا، ان کے علاوہ دیگر لفظی و معنوی مناسبات غور و فکر سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

مختصر موضوع:

ابتدائی آیتوں میں انسانی پیدائش کا تذکرہ ہے، اور قدرتِ الٰہی عزّ شانہ نے انسان کی ابتدائی تخلیق کے ساتھ اُسے علم عطا کرنے کے بیان کے ساتھ اُسے قلم کے کمال و ہنر عطاء کرنے اور قلم کی عظمت و اہمیت کا بیان ہے، اس کے ساتھ یہ بیان بھی کہ انسان کی فلاح و سعادت توحید باری تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہے، اور کبر و غرور کی مذمت کا بیان ہے، نماز و تقویٰ اور ہدایت کے فضائل و برکات کے بیان کے ساتھ ایک متعصب کافر (ابو جہل) کی شرارت و سرکشی پر اُسے خبردار کیا گیا ہے، اور اس پر زبانیہ فرشتوں کی گرفت کا تذکرہ ہے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ اور قرب الٰہی کی نعمت کے حصول کا حکم دیا گیا ہے، اس کے ساتھ علم و عمل کے فضائل اور قلم کی اہمیت و برکت اور مال و غرور کی مذمت کا بیان بھی ہے۔

سب سے پہلی وحی:

سورۂ علق جس کو سورۂ اقرأ بھی کہتے ہیں بالاتفاق مکی ہے، اس سورت کی شروع کی پانچ آیات اِقْرَاْ سے مَالَمْ يَعْلَمْ تک سب سے پہلے نازل ہوئیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء انہی پانچ آیات سے ہوئی ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں سے ثابت ہے، جمہور سلف و خلف کا اس پر اتفاق ہے، اور اکثر مفسرین کی تحقیق یہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ سب پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی، چنانچہ بعض علماء اسی کے قائل ہیں، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے اول نازل ہونے والی سورت سورۂ مدثر ہے، اور بعض حضرات اسی کے قائل ہیں، جمہور نے ان مختلف روایات میں توجیہات کی ہیں، جن سے یہ ظاہری اختلاف دور ہوجاتا ہے۔

(۱) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جمہور سلف و خلف کے نزدیک ثابت و صحیح یہی ہے کہ سب سے پہلے سورۂ

اقرأ کی ابتدائی پانچ آیات کا نزول ہوا، اور جن روایات سے سورۂ مدثر کا نزول اول معلوم ہوتا ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ زمانۂ فترتِ وحی کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیات نازل ہوئیں، پھر وحی کا نزول مسلسل ہوگیا۔ اور سورۂ فاتحہ کا سب سے پہلے نزول جن روایات سے معلوم ہوتا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ پوری سورت سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی، اس سے پہلے چند سورتوں کی متفرق آیات گو نازل ہو چکی تھیں، مگر پوری سورت کوئی بھی نازل نہیں ہوئی تھی۔

(۲) سب سے اول سورۂ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیات ہی اتریں، مگر تعلیم سوال اور نماز میں پڑھنے کے لئے سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی اور ایک مدت وحی بند رہنے کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر اتری، اسی طرح تینوں کو تین اعتبارات سے **أوّل ما نزل من القرآن** کہہ سکتے ہیں۔

(۳) وحی کی ابتدائی دور میں سورۂ اقرأ کی اوّلین آیات سورۂ فاتحہ اور آیات سورۂ مدثر کا نزول ہوا، اس لئے سب کو بطور اولیت عرفی **أول ما نزل من القرآن** کہہ سکتے ہیں، لیکن اوّلیت حقیقیہ سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیات ہی کو حاصل ہے۔

(۴) طریقہ تعلیم سکھانے کے لئے سب سے اول سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات اتریں، اور نماز میں پڑھنے کے لئے سب سے پہلے سورۂ فاتحہ اور دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیات نازل ہوئیں، مگر ابتداء حقیقی سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات ہی کو حاصل ہے۔

شانِ نزول:

بخاری و مسلم کی ایک طویل حدیث میں نبوت و وحی کی ابتداء کا واقعہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس طرح منقول ہے کہ سلسلہ وحی کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ واقعہ بن کر روزِ روشن کی طرح ظہور میں آجاتا، اس کے بعد مخلوق سے یکسو ہو کر گوشہ نشینی و عبادت کا تقاضا قلب اطہر میں پیدا ہوگیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلوت و عبادت کے لئے غارِ حراء کو منتخب فرمایا۔

تصدق ان کی تنہائی پہ ہنگامہ دوعالم کا ☆ حراء کے غار کی قسمت کھلی عزلت گزیں آئے

غارِ حراء مکہ مکرمہ کے قبرستان جنۃ المعلّٰی سے کچھ آگے ایک پہاڑ پر ہے، اس پہاڑ کو جبل النور کہتے ہیں، اس کی بلند چوٹی دور سے نظر آتی ہے۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار میں جا کر راتوں عبادت میں مشغول

رہتے، جب تک اہل وعیال کی خبر گیری کی ضرورت پیش نہ آتی آپ ﷺ وہیں مقیم رہتے۔ آپ ﷺ اپنے ہمراہ ضروری توشہ لے جاتے اور توشہ ختم ہونے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاتے، پھر مزید کچھ دنوں کے لئے توشہ لے جاتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ اسی غارِ حراء میں تھے کہ اچانک آپ کے پاس حق آگیا، یعنی وحی پہنچی۔

غارحرا میں خلوت گزینی کی مدت میں علماء کا اختلاف ہے، صحیحین کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک ماہ، یعنی پورے ماہ رمضان اس میں قیام فرمایا۔ ابن اسحق رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت میں اور زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''شرح مواہب'' میں فرمایا کہ اس سے زائد مدت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس غار میں رہنے کی مدت اکثر ماہ سے کم ہوتی تھی، اور کبھی مکمل ایک ماہ بھی آپ ﷺ اس غار میں مقیم رہے ہیں۔

نزول وحی سے قبل آپ ﷺ کی عبادت اس غار میں کس طرح ہوتی تھی؟ بعض کہتے ہیں حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی شریعتوں کے مطابق آپ ﷺ عبادت کرتے تھے، مگر نہ کسی روایت سے اس کا ثبوت ہے اور نہ آپ ﷺ کے اُمی ہونے کی وجہ سے یہ احتمال صحیح ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عبادت مخلوق سے یکسو ہو کر اللہ کی طرف خاص توجہ اور تفکر یا تسبیح وتہلیل وغیرہ تھی۔

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وحی آنے کی صورت یہ ہوئی کہ جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس (انسانی شکل میں) آئے (چہرہ آفتاب کی طرح نورانی اور سر پر نورانی تاج تھا، سبز لہلہاتی ہوئی پوشاک تھی، اور آپ ﷺ سے کہا: اِقْرَأْ یعنی پڑھئے، آپ ﷺ نے فرمایا: مَا أَنَا بِقَارِي یعنی (میں پڑھنے والا نہیں ہوں)، کیونکہ آپ ﷺ اُمی تھے)۔

بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کے پاس ایک سبز ریشمی کپڑا بھی تھا، جس میں کچھ لکھا ہوا تھا، وہ آپ ﷺ کو دکھلا کر کہا پڑھئے، آپ ﷺ پر حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مطلب اس وقت واضح نہ تھا کہ آپ علیہ السلام کوئی تحریر پڑھوانا چاہتے ہیں یا اور کچھ (اس لئے آپ ﷺ نے مَا أَنَا بقاري فرما کر اپنے امی ہونے کا عذر فرمادیا)۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اس جواب پر جبرئیل علیہ السلام نے مجھے آغوش میں لے کر اتنا دبایا کہ مجھے اس کی تکلیف محسوس ہونے لگی، پھر چھوڑ دیا اور کہا: اِقْرَأْ میں نے پھر وہی جواب دیا: مَا أَنَا بقاري پھر انہوں نے دوبارہ مجھے آغوش میں لے کر اتنا دبایا کہ مجھے تکلیف محسوس ہونے لگی، پھر چھوڑ دیا،

اور تیسری بار پھر کہا: اِقْرَأْ میں نے پھر وہی جواب دیا: ما أنا بقارئ، تو تیسری مرتبہ پھر آغوش میں لے کر دبایا اور چھوڑ کر کہا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝﴾ (یہ پانچوں آیات آپ ﷺ کو خوب یاد ہوگئیں، اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے زمین پر پیر مارا تو ایک چشمہ ابل پڑا اور آنحضرت ﷺ کو وضو، غسل اور استنجاء کرنے کا طریقہ سکھایا، پھر دو رکعت نماز پڑھوائی اور سورۂ فاتحہ بھی سکھائی کہ اس کو نماز میں پڑھا کریں)۔

آپ قرآن کی یہ (سب سے پہلی پانچوں) آیات لے کر دولت کدہ پر تشریف لائے، آپ ﷺ کا دل کانپ رہا تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آکر فرمایا: زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ (مجھے ڈھانپو، کپڑا اڑھاؤ) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ پر کپڑے ڈالے، یہاں تک کہ یہ (لرزہ) ہیبت کی کیفیت رفع ہوگئی (کپکپی اور ہیبت کی کیفیت، حضرت جبرئیل علیہ السلام کے خوف سے نہ تھی) آپ ﷺ کی شانِ عالی اس سے بلند و بالا ہے، بلکہ اس وحی کے ذریعہ جو نبوت و رسالت کی ذمہ داری آپ ﷺ کو سونپی گئی تھی، آپ ﷺ اس کے بارِ گراں کا احساس فرما رہے تھے، پھر فرشتہ کو اس کی اصلی ہیئت میں دیکھنے سے اگر ایسا ہوا ہو، تو طبعاً ہیبت کا طاری ہوجانا مستبعد نہیں۔

کپکپی جسم میں دل منزلِ اجلال خدا ☆ لے کے یوں کوہِ حراء سے کوئی نامہ آیا

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کیفیت سے افاقہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو غار حراء کا پورا ماجرا سنایا، اور فرمایا کہ اس سے مجھ کو ایسی کیفیت لاحق ہوئی کہ مجھ کو اپنی جان کا اندیشہ ہوگیا۔ اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز ناکام نہیں ہونے دیں گے، کیونکہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، بوجھ میں دبے ہوئے لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، بے روزگاروں کو روزگار دلاتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، اور مصیبت زدوں کی امداد کرتے ہیں۔ (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پڑھی لکھی خاتون تھیں، ان کو شاید کتب سابقہ سے یا ان کے جاننے والوں سے یہ بات معلوم ہوئی ہوگی کہ جس شخص کے اخلاق و عادات ایسے کریمانہ و رحیمانہ ہوں وہ محروم نہیں ہوتا، اس لئے اس طریقہ پر رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی)۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئیں۔

یہ زمانۂ جاہلیت ہی میں بت پرستی سے تائب ہو کر نصرانی ہو گئے تھے، اور اس وقت دین حق یہی تھا۔ ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ پڑھے لکھے آدمی تھے، عبرانی زبان بھی جانتے تھے، اور عربی تو تھی ہی ان کی مادری زبان، وہ عبرانی زبان میں لکھتے تھے، اور انجیل کو عربی زبان میں لکھتے تھے، لیکن اس وقت وہ بہت بوڑھے تھے، بڑھاپے کی وجہ سے بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: اے میرے چچازاد بھائی! ذرا اپنے بھتیجے کی بات سنئے! ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حراء کا پورا واقعہ بیان فرمادیا، ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ نے سنتے ہی کہا کہ یہ وہی ناموس اکبر، یعنی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی اُتارا تھا، کاش میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے زمانہ میں قوی ہوتا، اور کاش میں اس وقت زندہ ہوتا، جب کہ آپ کی قوم آپ کو (وطن سے) نکالے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (تعجب سے) پوچھا: کیا میری قوم مجھ کو نکال دے گی؟ ورقہ رضی اللہ عنہ نے کہا: بلاشبہ ضرور نکالے گی، کیونکہ جب بھی کوئی آدمی وہ پیغام حق اور دین برحق لے کر آیا ہے جو آپ لائے ہیں تو اس کی قوم نے اس کو ستایا ہے، اور اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پرزور مدد و حمایت کروں گا، مگر ورقہ رضی اللہ عنہ اس چند روز بعد ہی انتقال کر گئے، اور اس واقعہ کے بعد (ایک عرصہ کے لئے) وحی قرآن کا سلسلہ رک گیا۔ [بخاري ومسلم]

فترتِ وحی کی مدت سُہیلی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق ڈھائی سال تھی، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سال تھی۔ واللہ اعلم

فوائد:

(۱) کمالات کی ترقی بتدریج بنی آدم کی فطرت ہے، اسی فطری قاعدہ کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اول سچے خوابوں کے ذریعہ علومِ غیبیہ کا القاء ہوتا رہا، اور عالمِ غیب سے مناسبت پیدا کی گئی، تا کہ اسرارِ غیبیہ و حقائق کبریٰ کے تحمل کی رفتہ رفتہ عادت ہو جائے، اس کے بعد ترقی کا دوسرا مرتبہ شروع ہوا، وہ یہ کہ حالتِ بیداری میں خلوت و فراغ میں عالمِ ملکوت کا مشاہدہ ہونے لگا، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت و گوشہ نشینی کا شوق ہوا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حراء میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی، اور الواثِ بشریہ و کدوراتِ بہیمیہ سے آئینۂ باطن پاک صاف ہو گیا، تو عیاناً عالمِ ملکوت کے بادشاہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی۔ یہ ترقی کا تیسرا مرتبہ تھا، اور کسی کشف کے انتظار میں رہتے تھے، اور

یہی حال خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھی تھا۔

(۲) اس تقریر سے یہ شبہ بھی حل ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو کس طرح پہچان لیا، حل کا حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ ملکوت سے مناسبت تامہ، بلکہ مشاہدۂ کاملہ ہو چکا تھا۔

(۳) حضرت جبرئیل علیہ السلام نے تین بار اِقْرَأْ کہا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عذر فرماتے رہے، اور ہر مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دبوچا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر فرمانا تو اس لئے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِقْرَأْ کے معنی متعین طور پر معلوم نہ ہوئے تھے کہ مجھ سے کیا پڑھوانا مطلوب ہے، اور یہ امر کوئی خلافِ شان نہیں تھا، یا تعیینِ مراد کے باوجود اس لئے عذر فرمایا کہ قراءت کا استعمال عموماً لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کے معنی میں ہوتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حروف شناس نہ ہونے کے سبب عذر فرمایا، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا دبانا شاید اس لئے ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر بارِ وحی کے تحمل کی استعداد کامل پیدا ہو جائے۔ یہ ایک خاص قسم کی توجہ تھی، اس کو صوفیہ کی اصطلاح میں توجہ اتحادی کہتے ہیں، اس توجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا بارِ گراں آسان ہوگیا، اور جو وحی نازل ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضبط فرمالیا۔

توجہ کی قسمیں:

(۴) حضراتِ صوفیہ کے نزدیک تاثیر کے اعتبار سے توجہ کی چار قسمیں ہیں، ان کو نسب اربع بھی کہتے ہیں:

(۱) نسبت انعکاسی:

اس میں مرید کے اندر شیخ کا عکس آجاتا ہے، جب تک مرید شیخ کے سامنے رہتا ہے اسی وقت تک یہ اثر بھی رہتا ہے، جیسے آئینہ میں صورت اسی وقت تک نظر آتی ہے جب تک آئینہ سامنے ہو، یا جیسے کوئی شخص عطر لگا کر مجلس میں آیا تو اہل مجلس کے دماغ اس سے معطر ہوگئے، وہ شخص مجلس سے چلا گیا تو خوشبو بھی چلی گئی۔

(۲) نسبتِ القائی:

اس میں تاثیر تھوڑی دیر پا ہوتی ہے جو غفلت یا گناہ سے ختم ہو جاتی ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی اپنے چراغ میں تیل بتی وغیرہ درست کر کے لائے اور روشن کر کے لے جائے، تو جب تک اس میں تیل اور بتی ختم نہ ہوں گے وہ روشن رہے گا۔ ہاں! اگر ہوا، بارش وغیرہ کوئی مانع پیش آجائے تو وہ چراغ بجھ جائے گا۔ بعض شیوخ اس نسبت کے حصول پر اجازت وخلافت بامید حفاظت عطا کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

(۳) نسبتِ اصلاحی:

شیخ اپنی روحانی طاقت وتصرف سے مرید کی اصلاح کر دیتا ہے، اور اس کے لطائف جاری ہو جاتے ہیں، یہ پہلی دونوں نسبتوں سے قوی تر ہوتی ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کاریگر کسی پانی کے خزانہ سے نالی ملادے، یا فوارہ جاری کردے، یہ نالی اور فوارہ اسی وقت تک جاری رہ سکتے ہیں جب تک پانی کی نالیوں میں اور فوارہ کے پائپ میں کوڑا کرکٹ جمع ہو کر بند نہ ہو جائیں، یا پانی کا خزانہ ختم نہ ہو جائے۔ عموماً مشائخ اس نسبت پر خرقۂ خلافت دیدیتے ہیں۔

(۴) نسبتِ اتحادی:

اس اعلیٰ درجہ کی تاثیر کا نام ہے، جس میں مرشد کامل اور مرید باصفا کی روح ایک ہو جاتی ہے، جو کمالات شیخ کی روح میں ہوتے ہیں وہ سب مرید کی روح میں آجاتے ہیں، اس میں پھر بار بار استفادہ کی ضرورت نہیں رہتی، مگر یہ نسبت کم یاب ہے۔ ؎

من تو شدم تو من شدی ☆ من تن شدم تو جان شدی
تا کس نگوید بعد ازین ☆ من دیگرم تو دیگری

یہی توجہ اتحادی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر کی تھی، اس توجہ میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہمیشہ اتحادِ ظاہری و باطنی باقی رہے، چنانچہ یہ ملکیت کبریٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی حال تھا، پھر ترقی کا وہ مقام حاصل ہوا کہ وہاں وہمِ جبرئیل علیہ السلام بھی نہ پہنچا۔

(۵) آپ کا آغازِ وحی میں گھبرا جانا اور ورقہ سے بیان کرنا شبہ کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ خوف وہیبت وحی سے حال اضطراری تھا، یا وحی نبوت کی ذمہ داری کی بنا پر تھا، یا خالق سے ہٹ کر تبلیغ کے لئے توجہ الی الخلق کے تصور سے تھا، اور ورقہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنا مزید اطمینان وزیادت ایقان کے لئے تھا نہ کہ عدمِ ایقان کے سبب، نیز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ رضی اللہ عنہا کے پاس لے جانا انتہائی محبت کے جوش میں تھا، جو ایک اچھی بیوی کو اپنے شوہر سے ہو سکتی ہے۔

(٦) پھر چند روز بعد ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے اور نصرت وتائید کا وعدہ کرنے والا شخص ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ اس عالم سے اٹھا لیا گیا، اس میں یہ حکمت تھی کہ کسی کو اس شبہ کی گنجائش نہ رہے کہ ورقہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ باتیں

بتلاتے ہیں، اور گزشتہ واقعات سکھاتے ہیں، نیز حق تعالیٰ کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ کسی سابق دین والے یا کسی اہل کتاب کی نصرت وتائید کا مرہون منت آپ ﷺ بنیں، بلکہ جو کچھ ہو وہ آپ ﷺ ہی کی ذات عالی سے ہو جیسا کہ ابتداء ہی سے ظاہری اسباب سے بچا کر آپ ﷺ کی تربیت کی گئی تھی، اور آپ ﷺ کو اُمی (ناخواندہ) رکھ کر ہر قسم کے شکوک وشبہات کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا گیا تھا۔

(۷) مردوں میں سب سے پہلے ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ ایمان لائے، اور آپ ﷺ کی تصدیق کی۔ ان کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو خواب میں سفید لباس پہنے ہوئے دیکھا اور اس کی تعبیر بیان فرمائی کہ وہ جنتی ہیں۔

(۸) بظاہر اُمی کو اِقْرَاْ کا حکم دینا تکلیف مالا یطاق ہے، جیسے نابینا کو دیکھنے کا حکم دینا، یا شَل کو چلنے کا حکم دینا، اور تکلیف مالا یطاق ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرۃ:۲۸۶] (اللہ کسی انسان کو مکلّف نہیں فرماتا مگر اس کی قدرت کے مطابق) کی رو سے ممنوع ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم تکلیفی نہیں، تلقینی تھا، جیسے معلّم بچے کو تعلیم شروع کراتے وقت کہتا ہے: پڑھ، حالانکہ بچہ اس وقت پڑھنا نہیں جانتا، استاد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسے میں پڑھ کر بتاؤں اسی طرح پڑھ، یہی مطلب حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بھی تھا کہ جس طرح آپ کو پڑھ کر بتاؤں، آپ ﷺ اسی طرح پڑھیں۔

(۹) ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ روایت میں ہے کہ جبرئیل ومیکائیل علیہما السلام نے آپ ﷺ کا سینہ چاک کیا، اور دھویا تھا، پھر دونوں نے کہا تھا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾۔

شرح صدر کے متعلق تفصیلی مباحث سورۃ الم نشرح کے ضمن میں بیان ہوئے، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

اتر کر حراء سے سوئے قوم آئے	☆	اور اک نسخہ کیمیاء ساتھ لائے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۭ﴿۵﴾ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ

اَسْتَغْنٰى ⑦ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ⑧ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ⑨ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ⑩ اَرَءَيْتَ اِنْ
كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ⑪ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ⑫ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ⑬ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ
يَرٰى ⑭ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ⑮ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ⑯ فَلْيَدْعُ
نَادِيَهٗ ⑰ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ⑱ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ⑲

ترجمہ: آپ اپنے ربّ کے نام سے پڑھئے جس نے سب کچھ بنایا① آدمی کو خون سے پیدا کیا② پڑھئے اور آپ کا ربّ بڑا کریم ہے③ جس نے لکھنا سکھایا④ انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ جانتا نہ تھا⑤ یقیناً بلاشبہ آدمی حد سے گزر جاتا ہے⑥ اس لئے کہ خود کو مستغنی سمجھتا ہے⑦ بیشک اپنے ربّ کے پاس تجھے واپس جانا ہے⑧ آپ نے دیکھا اسے جو بندہ کو روکتا ہے⑨ جب وہ نماز پڑھتا ہے⑩ بتائیے اگر وہ ہدایت پر ہو⑪ یا پرہیز گاری کا حکم دے رہا ہو⑫ بھلا بتائیے اگر وہ جھٹلا دے اور منہ موڑ لے⑬ تو کیا اس کو معلوم نہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے؟⑭ خبردار! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے⑮ جو جھوٹی اور گنہگار پیشانی ہے⑯ پھر وہ اپنی مجلس والوں کو بلالے⑰ ہم بھی جہنم کے کارندے بلائے لیتے ہیں⑱ ہرگز آپ اس کا کہنا نہ مانیے اور نماز پڑھتے رہئے، اور اللہ کا قرب حاصل کرتے رہئے⑲

معارف ومنازل

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ پڑھئے آپ اپنے ربّ کے نام سے۔ یعنی جو قرآن پاک آپ پر نازل ہونے والا ہے، جس میں یہ اولین نازل شدہ پانچ آیات بھی داخل ہیں، جب آپ اس کی تلاوت کریں تو اپنے ربّ کے نام سے یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر تلاوت شروع کیا کریں، یہ ایسا ہی حکم ہے جیسی دوسری آیت: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ [النحل:۹۸] (پس جب آپ قرآن پڑھیں تو اللہ کی پناہ لیں) میں اَعُوْذُ بِاللّٰه پڑھنے کا حکم ہے، اور بسم اللہ و اعوذ باللہ کے حکم سے اصل مقصود توکل و استعانت ہے جو واجب ہے، اور زبان سے کلمات تعوذ تسمیہ کو آغازِ تلاوت میں پڑھنا مسنون ومندوب ہے، گو اس آیت کے نزول کے وقت بسم اللہ کا آپ کو معلوم ہونا ضروری نہیں۔

بعض احکام اول اجمالاً آتے ہیں، اور تفصیل بعد میں ہوجاتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسمیہ

اولاً سکھادی گئی ہو، چنانچہ واحدی نے عکرمہ وحسن رحمۃ اللہ علیہم سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کا نزول ہوا، پھر سورۂ اقرأ کا ہوا۔ اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ سب سے پہلے جبرئیل امین جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی لے کر آئے تو کہا: اے محمد! اعوذ باللہ پڑھیے! پھر کہیے: بسم الله الرحمن الرحيم۔ [روح المعاني] علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بھی کوئی سورت نازل ہوتی تو پہلے بسم اللہ نازل ہوتی تھی، (تو جب سورۂ اقرأ کا نزول شروع ہوا تو پہلے بسم اللہ بھی ضرور نازل ہوئی ہوگی۔ [اتقان: ۲۴ ج: ۱] تفسیر مذکورہ کے مطابق ﴿بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ میں باء زائدہ ہے، یا استبراک کے لئے ہے، یا الصاق یا استعانت کے لئے ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

شبہ:...... آغازِ کلام میں ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ ہے جس کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنے ربّ کے نام سے بسم اللہ پڑھ کر قرآن پڑھیے! تو یہ الفاظ قرآن میں داخل نہ ہونے چاہیں، کیونکہ ان میں تو قراءت قرآن کا امر ہے، اور أمر بالشئ شئ سے خارج ہوتا ہے۔

جواب:...... کلامِ ربانی محاوراتِ انسانی میں نازل ہوا ہے، تو یہ اسم الٰہی سے قراءت کلام الٰہی شروع کرنے کا حکم ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہے: اِسْمَعْ مَا اَقُوْلُ لَکَ۔ جو کچھ میں کہوں اس کو سن، تو اس جملہ کے بعد والے کلام کا سنانا جس طرح مقصود ہے خود اس جملہ کا سنانا بھی مقصود ہوتا ہے۔

لہٰذا حاصل یہ ہوگا کہ خواہ ان آیتوں کو پڑھو (جن میں حکم قراءت ﴿بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ ہے) یا ان آیات کو پڑھو جو بعد میں نازل ہوں گی، سب کی قراءت ﴿بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ ہونا چاہئے، یہی شبہ وہاں پیش آئے گا جہاں "قُلْ" آیا ہے، مثلاً: ﴿قُلْ اُوْحِيَ﴾ [الجن: ۱] ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ [الکافرون: ۱] ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ﴾ [الإخلاص: ۱] ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ [الفلق: ۱] ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ [الناس: ۱] وغیرہ، اور یہی جواب مذکورہ وہاں بھی ہوگا کہ جس طرح اور اوامر قرآنیہ ہیں، اسی طرح "قل" اور "اِقْرَاْ" بھی ہیں، اور تمام اوامر جو قرآن میں ہیں قرآن میں داخل ہیں، خطوط، کلام اور محاورات میں جاننا چاہئے، توجہ فرمائیے، سوچئے، سنئے، جیسے الفاظ، اور دوسری زبانوں میں ان کے مفاہیم جاری ہوتے ہیں اور وہ خطوط و گفتگو کے اجزاء ہوتے ہیں۔ فافهم

☆☆☆

اسمِ ربّ کی خصوصیت:

آیت میں ﴿بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ فرمایا، باسم اللہ نہیں فرمایا، کیونکہ لفظ اللہ ذات واجب الوجود کا عَلَم ہے، اور معرفتِ ذات کا طریقہ صرف آثار وصفات میں غور وفکر ہے، اور صفات باری میں سب سے زیادہ واضح اور نمایاں تعلق ہم سے صفتِ ربوبیت وتخلیق کا ہے، تخلیق وربوبیت کی صفات اس بات پر دلیل ہیں کہ تمام ممکنات متغیروزوال پذیر اور فانی ہیں، جو ان کے حادث ہونے کی علامت ہے، اور ہر حادث کے لئے ایسے خالق کی یقیناً ضرورت ہے جو ازلی اور ابدی ہو، اور جو حدوث ونقصان، فنا وزوال اور تغیر احوال سے مبراء ہو، اس لئے معرفتِ ذات کے لئے معرفتِ ربوبیت اوّلین شرط ہے، لہٰذا ﴿بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ نہایت مناسب وبرمحل ہے۔

سوال: حضرات صوفیہ اسمائے صفات سے قطع نظر کر کے اسم ذات کو ذکر کر کے کیوں اختیار کرتے ہیں؟

جواب: کیونکہ سفر طریقت ذات واجب تعالیٰ پر ایمان کے بعد اسی کی طرف شروع ہوتا ہے، اس کے لئے صوفی کے حق میں اسم ذات ہی اولیٰ ہے، پھر اسم ذات میں تمام صفات اجمالاً آجاتی ہیں، کیونکہ اسمِ ذات مجتمع وحاوی ہوتا ہے تمام صفات پر، اس لئے اسمِ ذات ہی ذات سے زیادہ قرب رکھتا ہے، اور صوفی کا مقصود اعلیٰ واصلی ذات ہی ہے۔

فائدہ:

لفظ رَبِّ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہم آپ کی مکمل تربیت کریں گے، اور نبوت ورسالت کے اعلیٰ درجات پر پہنچائیں گے۔

دوسری تفسیر:

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِقْرَاْ میں مطلق قراءت کا حکم ہے، قرآن وغیرہ کسی چیز کی تخصیص نہیں، نفسِ فعل، عدمِ تعیین مفعول میں الف لام جنسی کی طرح قلیل وکثیر کو حاوی اور عام ہوتا ہے، اس صورت میں "با" استعانت کی ہوگی، اور یہ جملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول: ما أنا بقاري کا جواب ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ آپ پڑھئے، اپنی قوت وعلم کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے ربّ کی مدد سے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح پر ﴿بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ میں لفظ اسم زائد ہوگا، جیسے ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ میں اسم زائد ہے۔

☆☆☆

فائدہ:

پہلی ہی وحی میں اس طرف اشارہ ہوگیا کہ جس کتاب کی یہ پہلی وحی ہے وہ پڑھی جانے اور لکھی جانے والی کتاب ہے، دیگر کتب کی طرح نہیں کہ ٹونوں اور ٹوٹکوں کی طرح چھپائی جائے، نیز جس ذات گرامی پر یہ کلام اتر رہا ہے اس نبی اُمی کا خصوصی معجزہ اوران کی امت کا امتیازی نشان علم ہوگا، چنانچہ قرآن مقدس جتنا لکھا پڑھا گیا دنیا میں کوئی کتاب اس کی مقابل نہیں، اور نبی امی کا سب سے عظیم معجزہ بھی کتاب علم (قرآن مقدس) ہی ہے، اور آپ کی شان اقدس أُوْتِيتُ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ کی صفت سے مزین ہے، اور آپ کی امت کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں کی برکت سے جس قدر علم ملا ہے ساری دنیا کو ان کے پاسنگ بھی نہیں ملا، کیونکہ جس طرح ذاتِ نبی صفات ربانی کا آئینہ ہوتی ہے، اسی طرح امت بھی اپنے نبی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ ﴾ یہ لفظ رَبّ کی صفتِ کاشفہ ہے۔ تخلیق تقاضہ ربوبیت ہے، کیونکہ ربوبیت کے معنی ہیں: کسی چیز کو عدم سے وجود اور نقص سے کمال کی جانب بتدریج وبکمال شفقت لے جانا۔ خَلَقَ کا مفعول یہ مذکور نہیں، جس کا فائدہ عموم ہے، کوئی خاص مفعول ذکر کیا جاتا تو تخصیص کا وہم ہوسکتا تھا، اب مطلب یہ ہوا کہ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ یا یہ کہئے کہ خَلَقَ فعل متعدی کو فعل لازم کی جگہ میں استعمال کیا گیا، کیونکہ مقصود اس سے ربّ کی صفتِ تخلیق وتکوین کی خصوصیت کا بیان کرنا ہے، نیز حق تعالیٰ کی نعمتوں میں اوّلاً ظہور اسی نعمت کا ہوتا ہے، اس لئے مقامِ تذکیر میں ربّ کے بعد اسی صفتِ تخلیق کو لایا جانا مناسب ہوا۔

ربّ کی اضافت کاف خطاب کی طرف کرکے بتایا گیا کہ حق تعالیٰ آپ کی تربیت کی طرف متوجہ ہیں، اس لئے تربیت میں آپ تمام مخلوقات سے ممتاز ومنتخب ہیں۔

اب یہ خیال کہ کلام قدیم کو کس طرح پڑھایا جائے گا جبکہ بندہ حادث ہے، تو اللہ کی صفتِ خلق کو یاد کیجئے جس نے اپنی صفتِ قدیمہ خالقیت کا مظاہرہ فرما کر کائنات کو پیدا کیا، وہ ربّ کائنات وخالق مخلوقات اپنے کلام قدیم کو محاورات انسانی کے قالب میں ڈال کر اپنے بندوں کی زبان پر جاری فرمادے، تو یہ اس قادر مطلق وخالق برحق کی قدرت میں ہے، اب رہا یہ خیال کہ انسان ذلیل وکلام عزیز میں کوئی مناسبت نہیں، تو جس حق تعالیٰ نے انسان کو ایک خون جیسی چیز سے پیدا فرما کر عزّت وکرامت کا تاج اس کے سر پر رکھا، اس کو اشرف المخلوقات بنایا، اور أحسنِ تقویم میں پیدا فرما کر ایسی روح سے نواز دیا کہ وہ اسرار الٰہیہ کی حامل ہے، تو وہ اس کو اپنے کلام کا حامل بھی بنا سکتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ پوری کائنات کی تخلیق کے بعد اس آیت میں حضرت انسان کی تخلیق کا بیان ہے، کیونکہ تمام کائنات کا خلاصہ انسان ہے، اس عالم اصغر میں عالم اکبر کے تمام نمونے اور نظائر موجود ہیں، نبوت ورسالت اور قرآن واحکام کے نازل کرنے کا مقصد احکامِ الٰہیہ کی تعمیل وتنفیذ ہے، وہ انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے، نیز ربوبیتِ خداوندی کا مظہر اتم انسان ہی ہے، اسی طرح معرفت حق کا فردِ اکمل بھی انسان ہے، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے: کنت کنزاً مخفیاً فأحببت أن أعرف فخلقت الخلق۔

فائدہ:

عَلَق کے معنی مطلق خون یا منجمد خون کے ہیں، انسان کی تخلیق پر مختلف دور گزرتے ہیں، اس کی ابتداء مٹی اور عناصر اربعہ ہیں، پھر نطفہ، اس کے بعد علقة یعنی منجمد خون، پھر مضغة یعنی گوشت، پھر ہڈیاں وغیرہ۔ علقة ان تمام ادوار میں ایک درمیانی حالت ہے، اس کو ذکر کرنے سے اس کی دونوں طرفوں (اول وآخر) کی طرف اشارہ ہوگیا۔

دوسرے خون انسان کی خلقت وپیدائش اور بقاء سب کے لئے ضروری ہے، بخلاف مٹی اور منی وغیرہ کے کہ وہ ابتداء میں ضروری ہیں اور بقاء میں نہیں، اس لئے انسان کے ایسے مادہ کا ذکر کیا جو اول سے اخیر تک ہمہ وقت انسان کے ساتھ موجود رہتا ہے، پھر اسی خون سے جو ذلیل بھی ہے اور ناپاک بھی، اعضائے جسمانی بھی وجود میں آتے اور قائم رہتے ہیں، اور اسی کے ساتھ پاکیزہ روح بھی یگانگت واتحاد پیدا کرلیتی ہے، جملہ ظاہری وباطنی قویٰ کا تعلق اسی سے ہوتا ہے، ان متضاد اشیاء کا اتحاد بتاتا ہے کہ حضرت انسان وحی واسرارِ الٰہیہ کا حامل بھی بن سکتا ہے، یہ اللہ جل شانہ کی قدرت کا عجیب کرشمہ اور معرفتِ الٰہیہ کے لئے ایک حیرت انگیز نمونہ بھی ہے۔

فائدہ:

اول خلق کا مفعول بہ عام مانا گیا ہے، یہ بھی احتمال ہے کہ کاف خطاب مفعول بہ محذوف ہو أي الذي خلقک۔ سوال پیدا ہوا کہ کس چیز سے پیدا کیا؟ تو بطورِ استیناف ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ جنس انسان کی تخلیق بیان کرکے مخاطب کی تخلیق پر اشارہ ابلغ طریقہ پر فرمادیا، کیونکہ کنایہ تصریح سے ابلغ ہوتا ہے، اس میں آپ کا زبردست احترام بھی ہے اور کمال بھی، بلکہ ہر کمال کی عطا کی خوشخبری بھی۔

یہ بھی احتمال ہے کہ فعل اول کا مفعول بہ ''الْاِنْسَانَ'' محذوف ہو، اور ثانی ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ﴾ اس کی تاکید اور توضیح ابہام کے لئے ہو، اور اس سے عظمت انسانی کا اظہار بھی مقصود ہو، اور تخلیق انسانی کے متعلق کلام کو

مخاطب کے لئے دل نشین بنانا بھی منظور ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”﴿الْاِنْسَانَ“ سے بھی ذات رسول اکرم ﷺ مراد ہو، اور خصوصیت ذکر آپ کے شرف کی وجہ ہو۔ واللہ اعلم

اِقْرَاْ یہ تکرار مبالغہ وتاکید کے لئے ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ پہلی اِقْرَاْ میں آپ ﷺ کو خود اپنے لئے تلاوت قرآن پاک کا حکم ہے، اور دوسرے اِقْرَاْ میں تبلیغ امت کے لئے پڑھنے کا حکم ہے، کیونکہ اوروں کی طرح آپ ﷺ بھی احکام کے مکلف ہیں، اور تبلیغ وتعلیم پر بھی مامور ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اول اِقْرَاْ میں نماز میں قرأت کا حکم ہے، اور دوسرے میں خارج نماز۔ بعض کہتے ہیں کہ پہلا حکم خود حضرت جبرئیل علیہ السلام سے سیکھنے کے لئے ہے، اور دوسرا دوسروں کو سکھانے کے لئے ہے۔ واللہ اعلم

﴿وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ﴾ صفت الْاَكْرَمُ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تخلیقِ عالم وتخلیقِ انسان میں اللہ تعالیٰ کی نہ اپنی کوئی غرض ہے، نہ اپنا کوئی نفع، بلکہ یہ سب کچھ اس کی جود وکرم کا تقاضا ہے کہ بن مانگے کائنات کو وجود کی نعمت عظمیٰ عطاء فرما کر اس پر دیگر دوسری بیشمار نعمتوں کی بارش فرما دی۔

اَکْرَمُ اسم تفضیل کا صیغہ ہے، یعنی وہ ان کریموں میں سے بڑا کریم ہے جن کا وجود واقعی یا فرضی مانا جائے، یا بمعنی کریم صفتِ مشبہ ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ صفاتِ خداوندی میں اَفعل وفعیل کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں، لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہی کریم ہے، اس کی ذات وصفات میں چونکہ کوئی شریک نہیں اس لئے اللہ کی صفت کرم ورحمت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ دوسرے جو کرم ورحمت خداوندی کے آئینے ہیں ان کو مجازاً کریم ورحیم کہہ دیا جاتا ہے، اس جملہ میں اس عذر کو بھی رفع فرمایا گیا جو آپ نے جبرئیل امین علیہ السلام کے سامنے ما أنا بقاري فرما کر کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ گو اُمِّيْ ہیں، مگر آپ کا ربّ تو بہت بڑا کریم ہے، وہ ایک اُمِّيْ کو اگر کائنات کے داناؤں کا امام وتاجدار بنا دے تو اس کے کرم سے کیا بعید ہے؟

﴿الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ بعض علماء کہتے ہیں کہ عَلَّمَ کا مفعول بہ محذوف ہے، اور بِالْقَلَمِ کا تعلق اسی سے ہے، أي علّم الخط بالقلم یعنی اس ربّ اکرم نے قلم سے لکھنے کا طریقہ سکھایا، تاکہ علوم اور کتابیں مفید ہوں اور باقی رہ سکیں اور دور، دراز علوم کی اشاعت ہو سکے۔

بعض کا خیال یہ ہے کہ بِالْقَلَمِ کا تعلق علم سے ہے، یعنی قلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے علوم سکھائے، پھر ﴿الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ ﴿رَبُّكَ الْاَكْرَمُ﴾ (مرکب توصیفی) کی خبر ہے، یا یہ دوسری خبر ہے، اور پہلی

الْأَكْرَمُ ہے، یا الْأَكْرَمُ صفت اول ہے اور یہ دوسری صفتِ کاشفہ ہے، جس سے ربّ تعالیٰ کی اکرمیت کی وضاحت ہوتی ہے، کیونکہ علوم کا سکھانا اور افادۂ علوم کے اسباب کا پیدا کرنا اللہ کا بڑا اکرم ہے، اور قلم جیسی بے جان چیز سے علوم کے سمندر بہا دینا اس کی عجیب قدرت اور شان اکرمیت کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔

تعلیم کا اول اور اہم ذریعہ، قلم:

سب سے پہلے تعلیم تحریر کا ذکر، تحریر کی عظمت کو ظاہر کر رہا ہے، کیونکہ علوم کا تحفظ اکثر تحریر سے ہوتا ہے، اور سیکھنے سے مقصد تحفظِ علوم ہی ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لما خلق الله الخلق كتب في كتابه، فهو عنده فوق العرش: أن رحمتي غلبت على غضبي۔** یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوق کو پیدا فرمایا تو اپنی کتاب میں (جو عرش پر اللہ کے پاس ہے) یہ لکھ دیا تھا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ ایک حدیث میں یہ بھی ہے: **أول ما خلق الله القلم فقال له: اكتب! فكتب ما يكون إلى يوم القيامة فهو عنده فوق عرشه۔** یعنی (سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا، اور اس کو لکھنے کا حکم دیا، اس نے وہ تمام چیزیں جو قیامت تک ہونے والی تھیں لکھ دیں، یہ کتاب اللہ کے پاس عرش پر ہے)۔ [ترمذي]

حاصل یہ ہے کہ اللہ نے قلم کو پہلے پیدا فرمایا، لکھوانے کا اہتمام فرمایا، یہاں بھی اقرأ کے بعد تعلیمِ انسان سے پہلے تعلیم بالقلم کا ذکر فرمایا، جس سے تحریر کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ **القلم صيّاد العلوم و لو لا القلم لما قام الدين و لا صلح العيش۔** تمام امور دینیہ و دنیویہ کا نظام و تحفظ قلم ہی کے ذریعہ ہے۔ **و التفصيل في تفسير عزيزي و قد مر في تفسير سورة القلم فتذكر۔**

علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ تعلیم و تعلّم میں کتابت کا بڑا اہتمام کیا ہے، جس پر ان کی تصانیف آج بھی شاہد ہیں، مگر دور حاضر میں اس سے بہت غفلت ہے۔

کتابت اللہ کی بڑی نعمت ہے:

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو دین قائم نہ رہتا، نہ دنیا کا نظام، **كما مر آنفاً**۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا اکرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہ جانتے تھے، اور ان کو جہالت کی تاریکی سے نورِ علم کی طرف نکالا، اور علم کتابت کی ترغیب دی، اس میں بے شمار منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ تمام علوم و حکم کی تدوین اولین و آخرین کی تاریخ ان کے

حالات ومقالات اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں ہیں، سب قلم ہی کے ذریعہ لکھی گئیں، اور دنیا میں باقی رہیں، اگر قلم نہ ہوتو دین ودنیا کے تمام کام معطل ومختل ہوجائیں۔

قلم کی تین قسمیں:

پہلا قلم وہ ہے جس کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرما کر اس سے تقدیر کائنات لکھوائی۔ دوسرا فرشتوں کا قلم ہے جس سے وہ واقعات ومقادیر واعمال لکھتے ہیں۔ تیسرا انسانوں کا قلم ہے، تفصیل ہم سورۂ قلم میں لکھ چکے ہیں۔

امام تفسیر حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے ابو عمرو رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دستِ قدرت سے بنائی ہیں، ان کے سوا باقی مخلوقات کو امرِ ''کُن'' سے پیدا کیا، وہ چار چیزیں قلم، عرش، جنت عدن اور حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

علم کتابت دُنیا میں سب سے پہلے کس کو دیا گیا؟

بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے فنِ کتابت ابو البشر آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا۔ [کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ]

بعض نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن حضرت ادریس علیہ السلام کو ملا ہے، اور سب سے پہلے کاتب دنیا میں وہی تھے۔ [ضحاک رحمۃ اللہ علیہ] بعض کہتے ہیں کہ جو بھی کتابت کرتا ہے وہ تعلیم منجانب اللہ ہے۔ پہلا قول راجح اور قوی ہے، آیت کریمہ: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ [البقرۃ: ۳۱] (اور اللہ نے آدم کو تمام نام بتادیئے، پھر ان کو فرشتوں پر پیش کیا) اس پر واضح ثبوت ودلیل ہے۔ واللہ اعلم

کتابت ووحی میں کمال مناسبت:

تعلیمِ قلم کا سلسلہ اس طرح ہے کہ اول معنی ذہن میں متعین ہوتے ہیں، پھر قوتِ خیالیہ ان کو الفاظ کا جامہ پہناتی ہے، اس کے بعد قلم کے ذریعہ وہ نقوشِ خطیہ کی صورت میں کاغذ پر ظہور کرتے ہیں، پھر پڑھنے والا ان کو معلوم کرتا اور سمجھتا ہے۔ سلسلہ وحی بھی اسی طرح سے ہے کہ اول کلامِ نفسی اشکال والفاظ سے مبرا تھا، پھر لوحِ محفوظ میں الفاظ کی صورت اختیار کی، پھر بواسطہ جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صفحۂ خیال میں منقش ہوا، پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ فیض ترجمان سے ہر خاص وعام کو پہنچا اور انہوں نے اس کو سمجھا، لہٰذا نعمتِ قلم کو امکان وحی ربانی کے اثبات میں دلیل بنایا جاسکتا ہے، شاید تعلیم بالقلم کو اس موقع پر ذکر کرنے میں یہ حکمت بھی مضمر ہو۔ واللہ اعلم

☆☆☆

نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم کتابت کیوں نہ دی گئی؟

حق جل مجدہٗ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس کو لوگوں کے فکر و قیاس سے بالاتر بنانے کے لئے اول سے اخیر تک آپ کے ایسے حالات بنائے تھے کہ جن میں کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش و محنت سے کوئی کمال حاصل نہیں کر سکتا تھا، جائے پیدائش کے لئے صحرائے عرب تجویز ہوا، جو متمدن دنیا اور علم و حکمت کے گہواروں سے بالکل کٹا ہوا تھا، اور راستے اور مواصلات اتنے دشوار گزار تھے کہ شام، عراق اور مصر وغیرہ کے متمدن شہروں سے یہاں کے لوگوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا، اس لئے اہل عرب سب کے سب امی کہلاتے تھے، ایسے ملک اور ایسے قبائل میں آپ پیدا ہوئے، اور پھر حق تعالیٰ نے ایسے سامان و اسباب فراہم کئے کہ عرب کے لوگوں میں جو خال خال علم و خط و کتابت سیکھ لیتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے سیکھنے کا بھی موقع نہ دیا گیا۔

ان حالات میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والے انسان سے علم و حکمت اور اخلاقِ فاضلہ عالیہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی ماحول میں رکھ کر حق تعالیٰ نے اخلاقِ معلیٰ پر تربیت دی، اور خلعت نبوت و رسالت سے سرفراز فرما کر علم و حکمت و تربیت کا ایک غیر منقطع سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے جاری فرما دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کلامِ بلاغت نظام پیش فرمایا کہ اس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے عرب کے بڑے بڑے فصحاء، بلغاء، شعراء اور زبان آور دم بخود اور عاجز و سرنگوں ہو گئے۔

یہ ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ تھا کہ کوئی ادنیٰ عقل والا انسان بھی یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کسی سعی و عمل کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ یہ غیبی عطیات ہیں جس ذاتِ گرامی نے کسی معلم و ادیب، شاعر و کاتب کے سامنے ایک مرتبہ بھی زانوئے ادب طے نہ کئے ہوں چالیس سالہ پاکیزہ زندگی میں علم، شعر و کتابت کا جس ذات میں کوئی تصور بھی نہ ہو سکتا ہو، وہ ایک بیک ایسا علم و حکمت، فصاحت و بلاغت سے لبریز کلام قوم کے سامنے پیش کر دے، یہ ایک نبوی معجزہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ آپ کی علم کتابت نہ سکھانے میں یہ عظیم حکمت پوشیدہ تھی۔ یا خاتم الرسل المبارک صلوٰۃ صلی علیک منزل القرآن۔

تعلیم کے اور بھی بہت سے ذریعے ہیں:

﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ اس سے پہلی آیت میں تعلیم کے ایک خاص ذریعہ کا ذکر تھا جو عام طور پر تعلیم کے لئے استعمال ہوتا ہے، یعنی قلم کے ذریعہ تعلیم، اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اصل تعلیم دینے والا تو حق

سبحانہ وتعالیٰ ہے، وہی مؤثر بالذات ہے، اگر وہ تعلیم نہ دینا چاہے تو قلم بھی اس کے حق میں بے سود ہے، اور وہ تعلیم دینا چاہے تو تعلیم دینے میں اس مسبب الاسباب و معلمِ حقیقی کو قلم کی حاجت نہیں، وہ بغیر کسی سبب ظاہری کے بھی تعلیم دے سکتا ہے، اور قلم کے علاوہ دوسرے اسباب وذرائع سے بھی دے سکتا ہے، اسی لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ ناواقف تھا۔

آیت میں قلم یا کسی دوسرے ذریعہ تعلیم کا ذکر نہ فرمانے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی یہ تعلیم انسان کی ابتدائے آفرینش سے جاری ہے، اول اس میں عقل پیدا کی جو سب سے بڑا ذریعہ علم ہے، انسان اپنی عقل سے خود بغیر کسی تعلیم کے بہت سی چیزیں سمجھتا ہے، پھر اس کے پس وپیش میں اپنی قدرت کاملہ کے ایسے مناظر ودلائل قدرت نے رکھ دیئے ہیں کہ جن کا مشاہدہ کر کے وہ اپنی عقل کے ذریعہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان سکتا ہے، پھر وحی والہام کے ذریعہ بہت سی چیزوں کا علم انسان کو دیا، اور کتنی چیزوں کا علم انسان کے ذہن میں بلا کسی واسطہ کے خود بخود پیدا فرما دیا۔

ایک بے شعور بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد اپنے مرکز غذا، یعنی ماں کی چھاتیوں کو پہچان لیتا ہے، پھر ان سے دودھ حاصل کرنے کا طریقہ بھی خود ہی جان لیتا ہے، یہ اس کو کون سکھا سکتا تھا کہ چھاتیوں کو دبا کر اس ترکیب سے دودھ چوس کر نگل لے؟ یہ معلمِ حقیقی کی قدرتی تعلیم ہی کا کرشمہ ہے، پھر رونے کا ہنر اس کو قدرت نے ولادت کے ساتھ ہی سکھا دیا، بچہ کا یہ رونا اس کی تمام ضرورت ہے، اس کی بھوک، پیاس، سردی، گرمی وغیرہ کی تمام ضروریات اس رونے ہی سے پوری ہوتی ہیں، یہ رونے کی تعلیم قدرت کے سوا بچہ کو کون دے سکتا تھا؟ اور کس طرح دے سکتا تھا۔

اس قسم کے تمام علوم وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار خصوصاً حضرت انسان کے ذہن میں بغیر کسی ذریعہ کے اپنی قدرت سے پیدا فرما دیئے ہیں، اس کے بعد پھر زبانی تعلیم، قلبی تعلیم وغیرہ کے ذریعہ ان علومِ وہبیہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، ﴿أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ﴾ [طٰہٰ: ۵۰] (ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی، پھر راہ دکھائی)۔

یہاں ﴿مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (جس کو وہ نہ جانتا تھا) کی قید کی بہ ظاہر ضرورت نہ تھی، کیونکہ تعلیم تو اسی چیز کی ہوتی ہے جس کو انسان نہیں جانتا، یہ قید اس وجہ سے بڑھائی کہ خداداد علم وہنر کو انسان اپنا ذاتی کمال نہ سمجھ بیٹھے۔

﴿مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ سے تنبیہ کردی کہ ہر انسان پر ایسا وقت بھی آیا ہے جب وہ کچھ نہیں جانتا تھا، جیسا کہ

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا﴾ [النحل:۷۸] (اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے)۔ معلوم ہوا کہ انسان کو جو بھی علم و ہنر ملا ہے وہ اس کا اپنا ذاتی کمال نہیں، سب خالق و مالک ہی کا عطیہ ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو تعلیم دی گئی، ﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرة:۳۱] (اور آدم کو تمام نام بتا دیئے) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری پیغمبر ہیں جن کی ذات گرامی میں تمام انبیائے سابقین علیہم السلام کے علوم اور لوح و قلم کے علوم موجود ہیں۔

فإن من جودک الدنیا وما فیها ٭ ومن علومک علم اللوح والقلم

یعنی دنیا و مافیہا آپ کی سخاوت کا ایک جزء ہے، اور لوح و قلم کا علم آپ کے علم کا ایک حصہ ہے۔

انسان کا علم لوحِ محفوظ سے بھی زائد ہے:

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ کو بالقلم کی قید سے مقید نہیں فرمایا، اور مفعول بہ الانسان کو ذکر کیا ہے، اس سے پہلے جملہ میں مفعول بہ کو ذکر نہیں کیا، اور بالقلم کی قید کا ذکر فرمایا ہے، اس سے اشارۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا علم اور کائنات سے زائد ہے، کیونکہ پہلے جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور دوسری مخلوق (ملائکہ وغیرہ) سب کو قلم کے ذریعہ سے علم دیا ہے، اور قلم سے دیا ہوا علم تمام کا تمام لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے، کوئی چھوٹی بڑی، خشک و تر چیز ایسی نہیں جو لوح محفوظ میں درج نہ ہو، لیکن انسان کو دیا ہوا علم مکتوب لوح محفوظ کے علاوہ بھی ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرة:۳۱] (اور اس نے آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے)۔

اگر علمِ آدم صرف وہی تھا جو لوح محفوظ میں مکتوب ہے تو فرشتے جواب کیوں نہ دے سکے؟ اور ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ [البقرة:۳۲] (انہوں نے کہا: تو پاک ہے، جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں) کے ساتھ معذرت کیوں کی؟ پھر اللہ تعالیٰ کا علم حضوری قدیم ہے، حصولی نہیں کہ لوحِ محفوظ اس کو محیط ہو سکے، اور قلم اس کو لکھ سکے۔ [مظهري]

یہاں تک سورۂ اقرأ کی وہ پانچ آیات تھیں جو سب سے پہلے نازل ہوئیں، اس کے بعد آیات کافی عرصہ کے بعد نازل ہوئیں ہیں، کیونکہ باقی آیات اخیر سورت تک ابو جہل کے ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں، اور ابتدائے

وحی ونبوت کے وقت مکہ میں کوئی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مخالف نہ تھا، اہل مکہ آپ کو صادق اور امین جیسے القاب سے پکارتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت و تعظیم کا برتاؤ کرتے تھے، ابو جہل کی مخالفت و دشمنی خصوصاً نماز سے روکنے کا واقعہ جو آگے آنے والی آیات میں مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اس وقت کا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت ودعوت کا اعلان فرمادیا تھا، اور شب معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز کا حکم ہو چکا تھا۔

انسان کی سرکشی:

ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی کہ ابو جہل نے لوگوں سے کہا: کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری موجودگی میں خاک پر چہرہ رگڑتا (سجدہ کرتا) ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! ابو جہل بولا: لات وعزیٰ کی قسم! اگر میں نے اس کو ایسا کرتے دیکھ لیا تو پاؤں سے اس کی گردن روند ڈالوں گا، اور اس کے منہ کو مٹی میں رگڑ دوں گا۔ اس پر کَلَّآ سے اخیر تک آیات نازل ہوئیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو جہل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے سے روکا اور کہا کہ اگر آئندہ نماز پڑھیں گے تو ایسا ایسا کردوں گا یعنی اوپر ذکر کی ہوئی دھمکی دی تھی۔

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى﴾ اس آیت کا روئے سخن اگرچہ خاص شخص، یعنی ابو جہل کی طرف ہے، جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کی تھی، مگر عنوان عام ہے، جس میں عام انسانوں کی ایک کمزوری بیان کی گئی ہے، وہ یہ کہ انسان جب تک دوسروں کا محتاج رہتا ہے تو وہ سیدھا چلتا ہے، اور جب اس کو یہ گمان ہو جائے کہ میں کسی کا محتاج نہیں ہوں اور میں سب سے بے نیاز ہوں تو اس میں سرکشی اور ظلم و جور کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں، جیسا کہ عموماً اہل دولت ارباب حکومت اور اصحاب شوکت و کثرت میں اس کا بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمول واقتدار اور جتھے کی طاقت میں مست ہو کر کسی کو نظر میں نہیں لاتے، چونکہ ابو جہل کا بھی یہی حال تھا کہ وہ مکہ کے خوشحال لوگوں میں سے تھا اور اکثر لوگ اس کی تعظیم کرتے اور اس کی بات مانتے تھے، وہ بھی اسی پندار میں مبتلا ہوا، یہاں تک کہ سید الانبیاء، اشرف الخلائق صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عالی میں گستاخی کر بیٹھا۔ اگلی آیات میں ایسے سرکشوں کے انجام بد پر تنبیہ ہے۔

﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾ اس کے معنی یہ ہیں کہ سب کو اپنے ربّ ہی کی طرف لوٹنا ہے، اور اپنے اچھے برے اعمال کا حساب دینا ہے، اس وقت سرکش اپنی سرکشی کا مزہ چکھ لے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ طاغی اور سرکش انسان کو خطاب کیا گیا ہو، اور کلام میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات ہو، اور الرُّجْعٰى میں الف لام مضاف الیہ کے

عوض میں ہو، أي رجعاک، مطلب یہ ہے کہ او سرکش ظالم! تجھ کو اپنے ربّ کے پاس جا کر اس کی بارگاہ میں حساب دینا پڑے گا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ میں مغرور انسان کے غرور کا علاج بتایا گیا ہو کہ اے احمق! تو خود کو مستغنی و خود مختار سمجھتا ہے، اگر تو غور کرے تو تو اپنی ہر حال اور ہر حرکت وسکون میں اپنے ربّ تعالیٰ کا محتاج ہے، اگر اس نے تجھے بظاہر کسی انسان کا محتاج نہیں بنایا تو کم از کم اس پر تو غور کر لے کہ اپنے مالک کا تو ہر وقت ہر چیز میں محتاج ہے، اور انسانوں کی محتاجی سے بھی خود کو بے نیاز سمجھنا ایک مغالطہ ہی ہے، کیونکہ ہر انسان مدنی الطبع اور ایک دوسرے کا محتاج ہے، وہ اکیلا اپنی کسی ایک ضرورت کو بھی پورا نہیں کرسکتا، اگر انسان اپنے ایک لقمہ ہی میں غور کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ وہ ہزاروں انسانوں، حیوانوں اور دوسرے مخلوقات کے عمل اور مدتِ دراز تک کام میں لگے رہنے کا نتیجہ ہے، جسے وہ نہایت بے فکری کے ساتھ حلق سے اتار لیتا ہے، اور ہزار ہا انسانوں کو اپنی خدمت میں لگا لینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

یہی حال اس کے لباس اور دوسری تمام ضروریات کا ہے کہ ان کے مہیا کرنے میں ہزاروں لاکھوں انسانوں اور جانوروں کی محنت کا دخل ہے، جو نہ کسی انسان کے غلام ہیں اور نہ نوکر، مگر ایک نظامِ قدرت ہے کہ ہر انسان وحیوان اس قدرتی نظام کی لڑی میں منسلک ہے، ان باتوں میں غور وفکر سے انسان پر یہ راز کھلتا ہے کہ میری تمام ضروریات مہیا کرنے کے لئے خالق کائنات نے ایک عجیب وغریب نظام اپنی قدرتِ کاملہ وحکمتِ بالغہ سے بنایا اور چلایا ہے، کسی کو کاشت میں لگایا، کسی کو کاشت کے آلات تیار کرنے کے لئے نجار و آہنگر بنایا، کسی کو محنت ومزدوری پر راضی کر دیا، کسی کو کاشت میں لگایا، کسی کو صنعت وتجارت پر راغب کر دیا وغیرہ، نہ کوئی حکومت قانون کے ذریعہ اس کا نظم کرسکتی ہے، نہ کوئی جماعت یا فرد، اس لئے اس غور وفکر کا لازمی نتیجہ:

﴿اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی﴾ ہے، یعنی انجامِ کار سب چیزوں کا حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے تابع ہونا مشاہدہ میں آجاتا ہے، غرور وخود فریبی کی جڑیں کٹ کر قلب میں حق تعالیٰ کی عظمت ومعرفت جاگزیں ہو جاتی ہے۔

﴿اَرَئَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی﴾ سے سرکش انسان کی سرکشی کی مثال ہے۔ حضرت ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوجہل نے نماز سے روکا تھا، اس سلسلہ میں یہاں سے خاطئة تک آیات کا نزول ہوا تھا۔ اور دوسرے مفسرین کی تحقیق اوپر مذکور ہوئی۔

اَرَءَيۡتَ میں ہمزہ استفہامِ تقریر کے لئے (قَد کے معنی میں) ہے، اور مقصود اقرارِ مخاطب ہے، اور خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ یا استفہام برائے تعجب ہے، بمعنی أخبرني اور رؤیت سے مراد رؤیتِ قلبی ہے، ایک مفعول الَّذِيۡ سے صَلّٰى تک ہے، اور دوسرا محذوف ہے: أي كيف يطغى۔

يَنۡهٰى سے مراد ابو جہل ہے، اور عَبۡدًا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ اَرَءَيۡتَ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ ﴿عَبۡدًا اِذَا صَلّٰى﴾ بصورت غائب ہے، یعنی خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے، اس طرح تعبیر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپ کی کمالِ عبودیت کی صراحت ہے، آپ کا برحق ہونا اور کمالِ عبودیت سے متصف ہونا اور روکنے والے کا طغیان، یہ امور اس سے واضح ہو رہے ہیں۔

عبادت سے منع کرنا ظلم وسرکشی ہے:

اس سے واضح ہوا کہ عبادت سے روکنا جرم عظیم ہے، کیونکہ بندہ پر حق ہے کہ وہ اپنے قلب وقالب، زبان اور دھیان سے حق تعالیٰ کی عبادت کرے، اور ایسی جامع عبادت جو انسان کے ظاہر و باطن پر حاوی ہو نماز ہے، اور اللہ جل شانہٗ کا حق ہے کہ وہ بہر حال معبود رہے، اور بندوں پر نظر کرم فرمائے، لہٰذا جو شخص نماز سے روکتا ہے وہ عبد و معبود، دونوں کی حق تلفی کرتا ہے، اور اس سے بڑھ کر سرکشی وظلم اور کیا ہوگا؟ یہ آیت گو ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی لیکن جو بھی ایسا کرے گا وہ بھی ظالم وسرکش اور ابو جہل کی طرح مجرم قرار پائے گا۔

بعض اوقات نماز سے شرعاً منع کیا جاتا ہے:

بعض موقعوں پر شریعت ہی نے نماز سے منع کرنے کا حکم دیا ہے، مثلاً اوقاتِ مکروہہ میں نماز سے روکنا ضروری ہے، اوقات مکروہہ پانچ ہیں: (۱) صبح صادق سے لے کر طلوع شمس تک۔ (۲) عصر کے فرض پڑھ لینے کے بعد مغرب تک، ان دونوں وقتوں میں نوافل ممنوع ہیں۔ (۳) طلوع آفتاب کے وقت۔ (۴) استواء کے وقت۔ (۵) غروب کے وقت۔

ان تینوں اوقات میں فرائض نوافل اور نمازِ جنازہ وسجدۂ تلاوت ممنوع ہیں، البتہ اس دن کی نماز عصر میں اگر دیر ہوگئی ہے تو غروب کے وقت بھی ادا کر لینی چاہئے، اسی طرح مغصوبہ زمین میں نماز سے منع کیا گیا ہے۔

غلام یا باندی کو آقا نوافل اور تہجد سے منع کر سکتا ہے، تا کہ وہ خدمت میں کوتاہی نہ کریں، شوہر بیوی کو اپنی خدمت کی وجہ سے نوافل واعتکاف، اسی طرح نفلی روزوں سے منع کر سکتا ہے، یہ منع درحقیقت نماز سے منع کرنے میں

داخل نہیں، کیونکہ یہ ایک عبادت سے روک کر دوسری عبادت میں لگا دینا، بلکہ نوافل سے روک کر فرائض کی طرف متوجہ کرنا ہے، یا شریعتِ مطہرہ کے حکم کی وجہ سے روکنا ہے، نہ کہ سرکشی کی وجہ سے، اور اصل قابلِ مذمت منع وہی ہے جس کا منشاء سرکشی ہے۔

جائز منع کرنے کے آداب:

اگر ممنوع اوقات اور مکروہ مواقع پر بھی نماز سے منع کیا جائے تو ادب ملحوظ رکھنا چاہئے، مثلاً: یہ نہ کہے کہ نماز نہ پڑھو، بلکہ حکم بیان کر دیا جائے کہ اس وقت نماز ممنوع ہے، یا یہ وقت نماز کا نہیں وغیرہ، ایسے الفاظ مذکور ہوں کہ صراحتاً نماز سے منع نہ ہو، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار نمازِ عید سے قبل لوگوں کو نوافل میں مشغول پایا، تو آپ نے ارشاد فرمایا: ان لوگوں سے یہ کہہ دو کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز عید سے پہلے عید گاہ میں کبھی نوافل پڑھتے نہیں دیکھا، لوگوں نے یہ بات نہ سنی اور نوافل پڑھتے رہے۔ عرض کیا گیا: اے امیر المؤمنین! حکم فرمائیں! تو ان کو زبردستی روک دیا جائے، فرمایا: میں اس آیت: ﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى﴾ کے مضمون سے ڈرتا ہوں، اور نماز سے منع کرنے میں سختی مناسب نہیں سمجھتا ہوں، لیکن امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کا تقاضا یہ ہے کہ ادب ملحوظ رکھتے ہوئے لوگوں کو ممنوعات سے حتی المقدور روکا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادب ملحوظ رکھا، اور اس وقت نوافل کی صراحۃً نہی وارد نہ ہونے کی وجہ سے منع میں سختی بھی نہ فرمائی۔

﴿اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى﴾ اور دیکھو تو، اگر اس نے دین حق کو جھٹلایا اور اس سے منہ موڑا۔ یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ کو معلوم ہے کہ اگر وہ بندہ، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے میں ہدایت پر ہو، یا پرہیز گاری کی دعوت دینے میں حق پر ہو تو ان کو خیر کے کاموں سے روکنے والے کا انجام کیا ہوگا؟ یقیناً وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابو جہل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز اور دعوت دونوں چیزوں سے روکا تھا، لیکن اس سے پہلی آیت میں صرف نماز سے روکنے کا ذکر ہے، کیونکہ آیات کا نزول نماز سے روکنے ہی کے واقعہ پر ہوا۔

یوں تو ابو جہل اور دوسرے کفار دعوت و توحید سے بھی روکتے ہی تھے، اس لئے اس دوسری آیت میں امر بالتقویٰ کا تذکرہ بھی کر دیا گیا، پھر نہی العبد سے مراد عام ہے، یعنی ہر خیر سے روکنا اس میں داخل ہے، لیکن اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی حالات انہیں دونوں چیزوں (نماز دعوت) پر منحصر تھے، تکمیل نفس کے لئے نماز اور

دوسروں کی تکمیل کے لئے دعوت وتبلیغ، اس لئے یہاں انہیں دونوں چیزوں کا ذکر فرمایا گیا۔

آیت کی دوسری تفسیر:

تفسیر سابق تو اس پر مبنی ہے کہ کَانَ کا اسم عَبْدًا کی ضمیر کو مانا جائے، لیکن اگر ابوجہل کو کَانَ کی ضمیر کا مرجع مانا جائے تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر یہ سرکش اپنی سرکشی کا علاج کر لیتا، ہدایت پر آجاتا اور دوسروں کو بھی نصیحت کر کے تقویٰ و پرہیزگاری کی دعوت دیتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔ بہر دو صورت لفظ اَوْ منع خلو کے لئے ہے، انفصال حقیقی یا منع جمع کے لیئے نہیں ہے، جیسے جَالِسِ الْحَسَنَ اَوِ ابْنَ سِيرِينَ میں۔

﴿اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى﴾ اس جملہ میں ان مخففہ بھی ہوسکتا ہے، اور اسم ضمیر شان ہوگی، أي إنه۔ ان شرطیہ بھی ہوسکتا ہے اور جزاء جملہ ﴿اَلَمْ يَعْلَمْ﴾ ہوگا، یا جزا محذوف ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس بدنصیب سرکش نے تصدیق کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا دیا اور حق سے منہ موڑ لیا تو کیا اس کو معلوم نہیں کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے؟ اس کو اس کی سزا دے گا، یا وہ عذاب خداوندی سے کس طرح بچے گا؟

﴿اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى﴾ کیا اس کو معلوم نہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے؟ ہمزہ اس میں استفہامِ انکاری کے لئے ہے، اور يَعْلَمْ کی ضمیر کا مرجع ﴿الَّذِيْ يَنْهٰى﴾ ہے، یعنی اس روکنے والے کو معلوم ہے کہ اللہ اس کی شرارتوں کو دیکھ رہا ہے اور اس کو سزا کا بھی یقین ہے۔ اول تو اس لئے کہ اللہ کی قدرت اور اس کے سمیع وبصیر ہونے پر دلائل آفاقی وانفسی بیشمار قائم ہیں۔ دوسرے ابوجہل بھی تنہائیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا جانتا اور کہتا تھا: و الله إن محمدا الصادق۔ محض ضد وعناد کی وجہ سے تکذیب کرتا تھا۔

پہلے جملہ شرطیہ کی جزا محذوف ہے، اور یہ جملہ ﴿اَلَمْ يَعْلَمْ﴾ الخ دوسرے جملہ شرطیہ کی جزا ہے، اور تیسرے کی محذوف ہے، یا یہ تیسرے شرطیہ کی جزا ہے اور دوسرے کی جزاء یہی جملہ محذوف ہے، یا اس کے برعکس ہے۔ مفسرین نے اس میں مختلف احتمالات بیان کئے ہیں۔

اسی طرح لفظ اَرَءَيْتَ یہاں تین جگہ آیا ہے، تینوں میں مخاطب عام ہے، یعنی جو شخص بھی یہ کلام سنے، یا تینوں میں مخاطب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یا اول وثالث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں اور ثانی میں ابوجہل، ہر احتمال کے مناسب آیات کے معانی ہوں گے، اور ان خطابات میں التفات حاکمانہ انداز کے ہیں کہ حاکم کسی معاملہ میں کبھی کسی کو مخاطب بناتا ہے، کبھی کسی کو، اور اَرَءَيْتَ کو تین بار لانا انتہائی تعجب کے اظہار کے لئے

ہے، اور حق تعالیٰ تعجب سے بری ہیں، تعجب صرف مخاطب کے اعتبار سے ہے۔ واللہ اعلم

كَلَّا یعنی وہ ہرگز نماز سے نہ روکے، یا ہرگز ایسا نہیں کہ اس سرکش کو یونہی چھوڑ دیا جائے گا، اور ان کے دنیوی مرتبہ وعزّت کے لحاظ سے اس کو سزا نہ دی جائے گی۔

﴿لَئِن لَّمْ يَنتَهِ﴾ اگر وہ اپنی دھمکی اور شرارت وسرکشی اور تکذیب وبے رُخی سے باز نہ آیا:

﴿لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ﴾ تو ہم اس کی چٹیا (پیشانی کے بال) پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ﴾ ایسی پیشانی جو جھوٹی اور خطاء کار پیشانی ہے۔ سفع کے معنی جس طرح گھسیٹنے کے ہیں سیاہی کے بھی آتے ہیں، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم اس کو سیاہ کر دیں گے۔

پیشانی پکڑ کر گھسیٹنے کا مطلب:

پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹنے کو اس لئے خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ: (۱) جس کی پیشانی (سر) کے بال قبضہ میں آجاتے ہیں، وہ مجبور ومقہور ہوجاتا ہے۔ (۲) پیشانی اشرف الاعضاء ہے، اس کو پکڑ کر گھسیٹنے میں انتہائی توہین وحقارت ہے۔ (۳) غرور وکبر کا مصدر ومرکز سر ہی ہے، کیونکہ غرور وہم وخیال اور حواس خمسہ ظاہرہ (باصرہ، سامعہ، لامسہ، ذائقہ اور شامہ) سے پیدا ہوتا ہے، اور یہ سب قوتیں سر میں موجود ہیں، تو منشائے کبر وغرور جب سر ہوا، تو سزا بھی اسی مقام کو دی گئی، جیسے چور ہاتھ سے چوری کرتا ہے تو اس کی سزا بھی ہاتھ کا کاٹنا ہی ہے۔

(۴) بننے سنورنے کا تعلق بھی بیشتر سر اور اس کے قریبی اعضاء سے ہے، مثلاً: سر میں تیل لگانا، کنگھی کرنا، عمامہ باندھنا، آنکھوں میں سرمہ لگانا، چہرہ کو صاف اور مزین کرنا وغیرہ، تو پیشانی کے بال پکڑ کر اس کو خاک میں آلودہ کرنا اس کے مناسب سزا اور گویا علاج بالضد کے قبیل سے ہے۔

خاطی اور مخطی میں فرق:

خاطیؔ وہ شخص ہے جو قصداً ضد وعناد کے جذبہ سے گناہ کرتا ہے، اس کا گناہ ناقابلِ معافی ہوتا ہے، اور مخطیؔ وہ ہے کہ اس سے نادانستہ طور پر یا معمولی غفلت کی وجہ سے غلطی ہوگئی۔ خاطیؔ کے لئے قرآن پاک میں سخت عذاب کی وعیدیں وارد ہوئی ہیں، مثلاً: ﴿مِنْ غِسْلِينٍ ۝٣٦ لَّا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ۝٣٧﴾ [الحاقة] (یعنی غسلین خاطئین ہی کھائیں گے) اور مخطیؔ کے لئے معافی کا وعدہ مذکور ہے، مثلاً: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ [البقرة: ٢٨٦] (اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا خطا کریں تو ہم کو نہ پکڑ)۔

جب یہ آیت نازل ہوئیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھ کر لوگوں کو سنائی تو رفتہ رفتہ ابوجہل تک بھی اس کی خبر پہنچی، وہ ملعون نہایت غضبناک ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے ناداں! تجھے معلوم ہے کہ تو کس کو ڈراتا ہے؟ اگر میں چاہوں تو ابھی سواروں اور پاپیادوں سے اس میدان کو بھر دوں، لیکن اس کی مجھے ضرورت ہی نہیں، تجھ کو اور تیری قوم کو تو وہی لوگ کافی ہیں جو میری مجلس میں حاضر رہتے ہیں، اور اگر میں ان کو ابھی بلالوں تو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

امام ترمذی وابن جریر رحمۃ اللہ علیہما نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت نقل کی اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، ابوجہل آ گیا اور کہنے لگا: میں نے تجھے اس کام سے منع نہیں کر دیا تھا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جھڑک دیا، تو وہ بولا: تجھے خوب معلوم ہے کہ مکہ میں میری چوپال سے بڑی کسی کی چوپال نہیں (یعنی میں بہت بڑے جتھے والا ہوں) تو مجھے جھڑکتا ہے، خدا کی قسم! تیرے مقابلہ میں مَیں اس وادی کو شہسواروں اور پاپیادوں سے بھر دوں گا، اس پر مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں:

﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ وہ اپنی مجلس والوں اور اپنے جتھے کو بلالے، ہم بھی اپنی دوزخ والی پولیس کو بلالیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اگر وہ اپنے کنبے قبیلے والوں کو بلالیتا تو جہنم کے کارندے علی الاعلان آنکھوں دیکھتے، اس کو پکڑ لیتے۔ علامہ محلیؒ نے اس قول کو حدیث مرفوع کہا ہے۔

مسلم ونسائی اور مسند احمد کی روایت ہے کہ پھر ایک بار حسب دستور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبۃ اللہ کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے، تو ابوجہل لعین نے دیکھا اور حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا، جب قریب آیا تو کسی چیز کو ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا جلدی سے پچھلے پیروں لوٹا، لوگوں نے دیکھ کر پوچھا: کیا بات ہے، کیا آفت ہے؟ پچھلے پیروں کیوں بھاگے؟ تو اس نے کہا کہ میرے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان آگ کی ایک خندق حائل ہو گئی، جس میں پروں کی حرکت محسوس ہو رہی تھی ہے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ ابوجہل نے یہ بھی کہا کہ ایک بڑا اژدھا میری طرف لپکا، اس سے مجھے بہت دہشت معلوم ہوئی، اگر میں ذرا ٹھہر جاتا تو آگ میں جل جاتا، یا اژدھا مجھے نگل جاتا، لوگوں نے کہا: یہ کیا بات؟ اس نے کہا کہ یہ شخص بڑا جادوگر ہے، یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر وہ آگے بڑھتا تو فرشتے اس کو اُچک لیتے اور تم سب کے سامنے اس کے ٹکڑے کر ڈالتے۔

آخر کارقرآن پاک اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پورا ہوا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر جب ابو جہل سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اپنی جمعیت کو لے کر نکلا، تو اس پر قہر الٰہی نازل ہوا اور اس کا جتھا اور اہل مجلس اس کے کچھ کام نہ آئے، کچھ تو مارے گئے، کچھ شکست خوردہ ذلیل ہو کر بھاگے اور کچھ گرفتار ہوئے، اور یہ نا ہنجار دو بچوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر زمین پر گرا، اس کی پر غرور پیشانی خاک آلود ہوئی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی گردن کاٹی، اور اس کے کان میں سوراخ کر کے رسی باندھی اور گھسیٹتے ہوئے اس ناپاک کنویں کے پاس لائے جس میں کفار کی لاشیں لا کر ڈالی جا رہی تھیں، اس کی ناپاک، جھوٹی اور خطا کار پیشانی کے بال پکڑ کر اس کو بھی اس کنویں میں ڈال دیا گیا۔ فلعنة الله على أعداء رسول الله و الصلوة و السلام على رسول الله

زَبَانِيَة کون ہیں؟

زبانیہ بظاہر وہی انیس (۱۹) فرشتے ہیں جن کا ذکر سورۂ مدثر میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد کی لمبائی زمین سے آسمان تک ہے، اور ایک کاندھے سے دوسرے کاندھے تک کا فاصلہ ایک سال کی مسافت ہے، ان کی آنکھیں بجلی کی طرح چمکتی ہیں، اور دانت بارہ سینگھے کے سینگوں کی طرح مڑے ہوئے ہیں، ان کے بال اتنے لمبے ہیں کہ زمین پر گھسیٹتے ہیں، اور ان کے منہ سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں، ان کی ہتھیلیاں اتنی وسیع ہیں کہ ایک ہتھیلی پر ستر ہزار انسان سما سکتے ہیں، ان کا سردار مالک (داروغہ جہنم) ہے، اور باقی اٹھارہ مالک کے تابع ہیں۔ [عزيزي]

﴿كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ دیکھو اس کا کہنا نہ ماننا، اور سجدہ کرتے ہوئے قربِ (خدا) حاصل کرتے رہنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن کو زجر و توبیخ، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی و تسکین کے بعد اس بات کی ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اس معاند کی بات نہ مانیں، نماز و سجدہ میں مشغول رہیں، اور اس طرح حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے رہیں۔ اس آیت میں لفظِ كَلَّا بمعنی حقًا ہے، تو معنی یہ ہے کہ یقیناً ایسا ہوگا کہ اگر وہ اپنے جتھے کو بلا کر لائے گا تو ہم دوزخ کے جلادوں کو بلا لیں گے، اور اگر زجر و ردع کے لئے ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ وہ اپنے جتھے کو بلا لائے (سجدہ سے مراد نماز ہے، نہ صرف کہ سجدہ، یہ تسمية الكل باسم الجزء کے قبیل سے ہے)۔

☆☆☆

سجدے میں دعا کی قبولیت:

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أقرب مایکون العبد من ربه و هو ساجد فأکثروا الدعاء۔ (بندہ اپنے ربّ سے قریب ترین سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے، لہٰذا سجدہ کی حالت میں خوب دعاء کیا کرو)، فإنه قَمِنٌ أن یستجاب لکم۔ (کیونکہ سجدہ کی حالت دعا قبول ہونے کے لائق ہے)۔

سجدے میں دعا کے مسائل:

مسئلہ: (۱) نوافل کے سجدوں میں دعا کرنا ثابت ہے، بعض روایات کے خاص الفاظ بھی آئے، وہ ماثورہ الفاظ پڑھے جائیں تو بہتر ہے۔ فرائض میں سجدہ کی حالت دعا ثابت نہیں، کیونکہ فرائض میں اختصار مطلوب ہے، اگر سجدہ میں دعا کرنی ہو تو نفل نماز پڑھے۔ اور سجدہ کی حالت میں ماثورہ دعا یا بزبانِ عربی اور کوئی دعا کرسکتا ہے۔

مسئلہ: (۲) اگر سجدہ میں دعا کرنی ہو تو نفل نماز پڑھے، اور سجدہ کی حالت میں ماثورہ دعا یا بزبانِ عربی اور کوئی دعا کرسکتا ہے، عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں دعا نہ کرے، نیز صرف سجدہ کرکے اس میں دعا مانگنا احناف ؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔

مسئلہ: (۳) اس آیت کو پڑھنے اور سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب ہے۔ صحیح مسلم میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت پر سجدۂ تلاوت کرنا ثابت ہے۔

فوائد:

(۱) جس آیت میں لفظ کَلَّا آیا ہے وہ یقیناً مکی ہے، مدنی آیات میں کہیں کَلَّا نہیں آیا، کیونکہ یہ لفظ غضب پر دلالت کرتا ہے، جس کے مستحق کفارِ مکہ تھے، نہ کہ مؤمنینِ مدینہ۔

(۲) لفظ کَلَّا قرآن پاک کے نصف اول میں نہیں ہے، نصف آخر میں خصوصاً اخیر کے چند پاروں میں بہت آیا ہے، وجہ یہ ہے کہ اول نرمی سے سمجھایا جاتا ہے، اور جب سمجھانے سے سمجھ میں نہ آئے تو جھڑکنا اور دھمکانا پڑتا ہے، قرآن کا انداز بھی یہی ہے، نصف اول میں ہر طرح سمجھایا گیا، اور اخیر میں کَلَّا کے ذریعہ دھمکایا بھی۔

و ما نزلت کلا بیثرب فاعلمن ★ ولا جاء فی القرآن فی نصفه الاعلی

(۳) اس سورت کے شروع میں علم کی فضیلت اور اس کے بعد مال کی مذمت مذکور ہے۔ معلوم ہوا کہ علم

پسندیدہ اور مال ناپسندیدہ ہے۔

رضینا قسمة الجبار فینا ★ لنا علمٌ و للجهال مال

فانَّ المال یفنی عن قریب ★ فإنّ العلم باق لا یزال

(۴) سورۂ انفطار میں انسان کے اعتدال جسمانی اور تسویۂ اعضائے انسانی کو بیان کرتے ہوئے لفظ کریم ذکر کیا، اور یہاں تعلیم کی اہمیت وعلم کی فضیلت کے موقع پر لفظ أکرم مذکور ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ علم نعمت صحت و حسن وجمال سے بڑھ کر ہے۔

(۵) ابوجہل کے متعلق استمرار پر دلالت کرنے والا مضارع کا صیغہ جس کے شروع میں لام تاکید بھی ہے "لَیَطۡغٰی" لایا گیا اور فرعون کے حق میں لفظ طَغٰی صیغہ ماضی لایا گیا، اس فرق وتغییر اسلوب میں اشارہ ہے کہ ابوجہل سرکشی وکبر میں فرعون سے بڑھ کر تھا، کیونکہ:

(۱) فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو صرف زبانی اذیت پہنچائی، اور اس خبیث نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زبان اور ہاتھ وغیرہ سے ہر طرح ایذائیں پہنچائیں۔

(۲) فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ابتداء میں اچھا سلوک کیا، پالا پوسا اور اخیر میں ڈوبتے وقت ﴿اٰمَنۡتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَاَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ [یونس:۹۰] (میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس پر بنو اسرائیل نے ایمان لایا، اور یہ کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں) اس کی زبان سے نکلا تھا، یعنی اس کا تکبر کم از کم موت کے وقت تو ٹوٹ گیا تھا، گو بے وقت ٹوٹا، اور ابوجہل شروع سے آپ سے حسد رکھتا تھا، اور مرتے وقت بھی اس کا تکبر کم نہ ہوا، زخمی ہو کر گرا تو کہا: کاش کسان کے لڑکوں کے علاوہ کوئی بہادر مجھے قتل کر دیتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے سینہ پر سر کاٹنے کے لئے چڑھے تو کہا: او بکریوں کے چرواہے! تو بلند مقام پر بیٹھا ہے، پھر کہا کہ کیا تم لوگوں نے مجھ سے زیادہ بلند مرتبہ آدمی کو قتل کیا ہے؟ غرض اس کا غرور مرتے دم تک کم نہ ہوا۔ ﴿فَبِئۡسَ مَثۡوَی الۡمُتَکَبِّرِیۡنَ﴾ [غافر:۷۶] (تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے)۔ أعاذنا اللہ منہ

سُورَةُ الْقَدْرِ

مکیۃ آیاتہا ۵ رکوعہا ۱

سورۂ قدر مکی ہے، اس میں پانچ (۵) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ القدر ہے، یہ لفظ پہلی آیت میں موجود ہے اسی سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

اس سورت کا نزول سورۃ الکافرون کے بعد ہے، اس کی پانچ (۵) آیات، تیس (۳۰) کلمات اور ایک سو بارہ (۱۱۲) حروف ہیں۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اتقان میں لکھا ہے کہ اس سورت کے بارے میں دو قول ہیں: جمہور علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے، وھو الاصح۔

امام واحدی، علامہ واقدی اور امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہم نے اسے مدنی سورت شمار کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مختار ہے، کیونکہ شب قدر رمضان کا حصہ ہے، اور نزول رمضان مدنی ہے۔

مختصر موضوع:

نزولِ قرآن، فضائلِ لیلۃ القدر، نزولِ روح الامین دیگر فرشتوں کے ساتھ۔

☆☆☆

ربط ومناسبت:

سورۃ العلق میں قراءتِ قرآن کا امر تھا، جبکہ سورۃ القدر میں اس کی فضیلت وعلت اور وجہ کا بیان ہے، گویا کہ ارشاد ہورہا ہے: اقرأ القرآن لأن قدرہ عظیم و شأنہ فخیم۔ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ کی ضمیر (ہٗ) کا مرجع اقرأ کے مفعول بہ محذوف یعنی القرآن ہی ہے، جو سابقہ سورت میں گزر چکا، اسی بنا پر یہ سورۃ العلق کے بعد ہے۔ دوم یہ کہ سورۃ العلق میں پہلی وحی کا بیان ہے، اور اس سورت میں نزول قرآن کے وقت کا بیان ہے۔ سوم یہ کہ سورۃ العلق میں معاندین ومخالفین پر سرزنش وگرفت کا تذکرہ ہے، اور اس سورت میں موافقین واطاعت شعاروں کے لئے عنایات وترقی درجات کا تذکرہ ہے۔

شان نزول:

ترمذی، حاکم، ابن جریر طبری نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا (وحی منامی) کہ بنی امیہ کے ظالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر بندروں کی طرح کودرہے ہیں، آپ کو اس خواب سے بے حد صدمہ ہوا، تو آپ کی تشفی کے لئے سورۃ الکوثر اور سورۃ القدر نازل ہوئی۔ روایت کی روشنی میں مطلب یہ ہوا کہ بنی امیہ کے ہزار ماہ کی حکومت سے ایک شب قدر بہتر ہے۔ حافظ مزنی اور ابن کثیر کے نزدیک یہ حدیث منکر ہے، اور ترمذی کے نزدیک غریب جداً ہے۔

بنوامیہ کی حکومت پورے ہزار مہینوں پر مشتمل رہی، بعد میں ربّ العزّت نے اسے تباہ کیا، یہ حکومت اسلام کے نورانی چہرے پر منحوس سیاہ داغ تھی جو ختم ہوئی (بہ استثناء حضرت امیر معاویہ وحضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما) شاعر نے صحیح کہا: ؎

نیرنگئ جہاں کا تماشا تو دیکھئے ☆ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر مروانی خاندان کی حکومت کا کوئی جواز ہی نہ تھا، مگر ہوا سب ہی کچھ۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔ اسی بناء پر علماء ومؤرخین اسے خلافت نہیں کہتے ملوکیت کہتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دن ان کی امت کی عمریں دکھلائی گئیں کہ ساٹھ ستر برس کے قریب قریب ہیں، تو آپ پریشان ہوئے کہ گزشتہ امتوں کی بڑی بڑی عمروں کے مقابلے میں میری امت کی عمریں نہایت کم اور مختصر ہیں، اور ان کے اعمال کا بھی یہی حال رہے گا، اور قیامت میں

شرمندگی بھی ہوگی، اور جنات ونعیم آخرت کی بھی کمی ہوگی، تو اللہ ربّ العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے سورۃ القدر نازل فرمائی جس سے آپ خوش ہوئے اور راضی رہے۔ [تفسیر عزیزی]

اسی طرح ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اور دیگر مفسرین نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مختلف روایات بھی نقل کی ہیں۔ بہر حال اس سورت کے نزول کے بارے میں مختلف قسم کی روایات منقول ہیں، قدر مشترک سب روایات میں یہی ایک بات ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ جل شانہ کی طرف سے یہ ایک بہت بڑا انعام اور خصوصی کرامت ہے، اور قابل قدر ایک مابہ الامتیاز وصف ہے۔

اول یہ کہ اس امت کی سعادت وابدی فلاح وکامیابی کے لئے قرآن حکیم جیسی کتاب کو نازل کیا گیا، دوسرے یہ کہ انہیں لیلۃ القدر مرحمت فرمائی گئی کہ سال بھر میں ایک بار وفاداروں کو شاہانہ عنایات اور خسروانہ انعامات سے نوازا جائے، اور امت محمدیہ علی نبیہا الصلوٰۃ والسلام کو ایک ہی رات (لیلۃ القدر) میں وہ لازوال دولتیں (اجر وثواب ومغفرت) میسر آجائیں کہ ہزار مہینوں کی کوششوں سے بھی کسی کو نہ حاصل ہوسکیں۔ وذلک فضل اللہ وعنایتہ علی أمۃ سیدنا محمد صلی اللہ علی وسلم خاصۃً۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۚ ① وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ؕ ② لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ۬ۙ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَہۡرٍ ؕ ③
تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ۚ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ ۙ ④ سَلٰمٌ ۟ۛ ہِیَ حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ٪ ⑤

ترجمہ: بیشک ہم نے قرآن مجید کو شب قدر میں اتارا ہے① اور آپ کو معلوم ہے کیسی ہے شب قدر؟② شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے③ اس میں فرشتے اور روح اترتے ہیں اپنے ربّ کے حکم سے ہر مراد لے کر④ وہ سراپا سلام ہے، وہ صبح روشن ہونے تک رہتی ہے⑤

معارف ومنازل

قدر کے معنیٰ ہیں: عظمت وشرف، اکثر علماء کرام جمہور امت کی یہی رائے ہے، اور صحیحین ودیگر کتب حدیث میں اسی پر مسائل کا ترتب ہوا ہے۔

یہ قدر وشرف اور عظیم برکت جو اس مبارک رات میں رکھی گئی ہے، اولاً وبالذات یہ قدر وبزرگی اسی رات

کے ساتھ مخصوص ہے جس طرح کہ **لیلة الجمعة یالیلة العیدین یایوم العرفة ولیلة العرفة۔**

ثانیاً یہ شرف ہر اس عمل کو حاصل رہے گا جو اس مخصوص رات میں ادا کیا جائے، مثلاً نماز، تلاوت، ذکر و اذکار، دیگر اعمالِ خیر وغیرہ۔ ثالثاً اس مبارک مخصوص رات میں جو شخص عبادت واذکار شب بیداری میں مصروف رہے گا یہ شرف اس کو بھی حاصل رہے گا، اور وہ شخص صاحب قدر وعظمت ہی شمار ہوگا، علیٰ ہٰذا القیاس۔

قدر کے دوسرے معنی تقدیر وحکم کے بھی آتے ہیں، اس معنی کے لحاظ سے لیلة القدر کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ تمام مخلوقات کے لئے جو کچھ تقدیر ازل میں لکھا گیا تھا اس کا جو مخصوص حصہ اس سال کے رمضان سے آئندہ رمضان تک پیش آنے والا ہے، وہ اس رات میں ان فرشتوں کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جو تدبیر کائنات اور تنفیذ امور پر مامور ہیں، اس میں ہر انسان کی موت وحیات، رزق وروزی، خوشحالی وپریشانی، وغیرہ کی مقررہ مقداریں فرشتوں کو لکھوا دی جاتی ہیں، یہاں تک کہ جس شخص کو اس سال حج وعمرہ، شادی، اولاد و دیگر بہت سی چیزیں نصیب ہوں گی موہ سب لکھ دی جاتی ہیں، اور جن فرشتوں کے یہ جملہ امور حوالہ کئے جاتے ہیں، وہ بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما چار مقرب فرشتے ہیں: حضرت میکائیل، اسرافیل، جبرائیل، عزرائیل علیہم السلام۔

یادرہے کہ یہ ایک سالہ جزوی فیصلہ ہوگا، آئندہ سال اسی رات تک کے لیے اس میں کچھ حصہ عام مخلوقات اور مجموعی کائنات کے لئے ہوگا، اور کچھ حصہ افراد واشخاص کے لئے الگ الگ متعین ہوگا، کچھ کا تعلق قضاء مبرم کے ساتھ اور کچھ کا تعلق قضاء معلق کے لئے ہوگا، اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ اس مبارک رات میں عبادات وطاعات کی بجا آوری کے ساتھ دعا والحاح زاری اور طلب عفو وکرم اور فراخی رزق وخوشحالی اور دیگر امور میں اکثر وقت صرف ہو تو بہتر رہے گا۔

لیلة القدر اور لیلة المبارکة دونوں ایک ہیں:

سورۃ الدخان کی آیت: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ﴾ [الدخان: ۳] (بیشک ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے ایک مبارک رات میں، بیشک ہم ہی ڈرانے والے تھے) میں بھی لیلة مبارکہ سے جمہور مفسرین وعلماء محققین کے نزدیک شب قدر ہی مراد ہے، کیونکہ اس شب میں ربّ العزّت سبحانہ کی طرف سے بندوں پر بے شمار برکات کا نزول ہوتا ہے، ملائکہ وروح الامین علیہم السلام اترتے ہیں، شام سے صبح تک تجلیات ربانی بندوں کی طرف متوجہ رہتی ہیں، صلحاء اور عباد کے مراتب بلند ہوتے ہیں، جو شخص پہلے سے عابد وزاہد صاحب تقویٰ نہ ہو اور اسی شب کو

تائب ہوکر خلوص قلب کے ساتھ عبادت واستغفار میں مشغول ہو وہ بھی باذن اللہ صاحب مرتبہ لوگوں میں شامل ہوجائے گا، اور اچھا مقام پائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ ﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِيۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾ اور ﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِيۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ [الدخان: ۳] دونوں کا مصداق ایک ہی ہے، اور نزول قرآن کریم کا دونوں آیتوں میں یکساں بیان ہے، اسی ایک رات کو شب قدر اور شب مبارکہ سے یاد فرمایا گیا ہے۔

اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت: ﴿شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِيۡٓ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ﴾ [البقرۃ: ۱۸۵] (رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا) سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کا نزول ماہ رمضان میں ہوا۔ ان تینوں آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کریم لیلۃ القدر میں نازل ہوا، اور اسی شب کو لیلۃ مبارکہ بھی فرمایا گیا ہے، اور یہ شب لیلۃ القدر یا لیلۃ مبارکہ رمضان میں تھی جس میں قرآن حکیم کا نزول ہوا۔

چونکہ بعض روایات میں شعبان کی پندرہویں شب (شب برأت) کے متعلق آیا ہے کہ اس رات میں ارزاق، آجال اور دیگر امور کے فیصلے ہوجاتے ہیں اور لکھے جانے کے بعد فرشتوں کے سپرد کیے جاتے ہیں، اور سورۂ دخان کی مذکورہ آیت (جس میں لیلۃ مبارکہ میں نزول قرآن کا ذکر ہے) کے بعد فرمایا گیا ہے: ﴿فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ ۝ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا﴾ [الدخان] (یعنی اس رات میں ہر حکمت والے معاملہ کا فیصلہ ہماری طرف سے کیا جاتا ہے)۔

اس لئے بعض مفسرین حضرات جیسے عکرمہ وغیرہ نے ان روایات کو سورۂ دخان کی آیات سے جوڑ کر لیلۃ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البرأۃ (شب برأت) سے کردی ہے، جس کی وجہ سے سورۃ القدر و سورۂ دخان کی آیات میں تعارض ہوجاتا ہے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک لیلۃ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البرأۃ سے کرنا صحیح نہیں، کیونکہ لیلۃ مبارکہ میں نزول قرآن کا ذکر ہے، اور آیت بقرۃ میں ﴿شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِيۡٓ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ﴾ [البقرۃ: ۱۸۵] (رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا) سے قرآن حکیم کا نزول ماہ رمضان میں متعین اور متفق علیہ ہے۔

اب رہی یہ بات کہ روایات سے ارزاق و آجال وغیرہ کے فیصلے شب برأت میں ہونا معلوم ہوتا ہے، اور آیت سورۂ دخان سے لیلۃ مبارکہ میں فیصلوں کا ہونا معلوم ہوتا ہے، تو حافظ ابن کثیرؒ نے اس روایت کو (جس میں شب برأت میں فیصلے ہونا مذکور ہے) مرسل قرار دیا ہے، اور ایسی روایات نصوصِ صریحہ کے مقابلہ میں قابل اعتماد و لائق قبول

نہیں ہوسکتیں۔

قاضی ابوبکرابن عربیؒ نے فرمایا کہ شب براءت کے بارے میں کوئی روایت قابل اعتماد ایسی ثابت نہیں ہے جس سے اس رات (شب براءت) میں رزق وروزی، موت وحیات وغیرہ کے فیصلے ہونا معلوم ہوتا ہو، بلکہ انہوں نے فرمایا کہ شب براءت کی فضیلت میں کوئی قابل اعتماد روایت ہی موجود نہیں، لیکن روح المعانی میں ایک بلاسند روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس مضمون کی منقول ہے کہ موت وحیات، رزق وروزی وغیرہ کے فیصلے نصف شعبان کی رات میں لکھے جاتے ہیں، اورشب قدر میں وہ لکھے ہوئے فیصلے فرشتوں کے حوالے کئے جاتے ہیں۔

اگر یہ روایت ثابت ہوجائے تواس طرح دونوں قولوں میں تطبیق بھی ہوسکتی ہے، ورنہ اصل بات جوتصریح قرآنی اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے یہی ہے کہ سورۂ دخان کی آیت لیلۃ مبارکۃ: ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝﴾ [الدخان] کے سب الفاظ قرآنی شب قدر ہی کے متعلق ہیں۔

ضعیف حدیث اوراثباتِ احکام:

ضعیف حدیث کے بہت سے مراتب واقسام ہیں، اگر یہ ائمہ حدیث کے ہاں موضوع یامتروک ہوتواس سے کسی بھی حکمِ شرعی کا اثبات نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ مردوداور نا قابلِ التفات ہی رہے گی، اس کے علاوہ ضعیف حدیثوں کے متعلق علماء حدیث کے مختلف مذاہب ہیں جو کہ تقریباً تین ہی ہیں:

پہلا مذہب امام بخاری، امام مسلم، یحی بن معین، علامہ ابن حزم وغیرہ حضرات کا ہے، ان کے نزدیک حدیث ضعیف مطلقاً قابل احتجاج نہیں، نہ احکامِ خمسہ میں اور نہ ہی فضائل وغیرہ میں، امام مسلم نے مقدمہ میں اس پر مکمل جرح کرکے اس قسم کی حدیثوں کوساقط الاعتبار والعمل قرار دیا ہے، اسی طرح ابن حزم نے بھی۔

دوم مذہب امام احمد، امام ابوداؤد، امام ترمذی وغیرہ حضرات کا ہے، ان کا کہنا ہے کہ حدیث ضعیف اگرچہ اثباتِ احکامِ شرعیہ میں ناکافی اورغیر معتبر ہے، مگر قیاس پر اسے ترجیح ضرور حاصل ہے۔

سوم مذہب جمہور عام محدثین کرام کا ہے، وہ ضعیف حدیثوں کوفضائل اعمال کے اثبات میں قابل استدلال سمجھتے ہیں، چنانچہ بہت سے فضائل ضعیف حدیثوں سے ثابت کرنے کارواج عام معمول بہ رہا ہے، اوراس میں کوئی قباحت نہیں۔ قال الإمام ابن مهدي فيما أخرجه البيهقي في المدخل: إذا روينا عن النبي صلى الله عليه و سلم في الحلال و الحرام و الأحكام شددنا في الأسانيد و انتقدنا في الرجال، و إذا روينا في الفضائل و

الثواب والعقاب سهلنا في الأسانيد وتسامحنا في الرجال، وبه قال الحاكم وابن عبدالبر وأبوزكريا العنبري وابن الصلاح والنووي والزركشي وابن حجر والقسطلاني والسيوطي وغيرهم من الأئمة كالغزالي والمنذري رحمهم الله (خلاصة قواعد التحديث، والتدريب وغيرهم)۔

قال المحقق جلال الدين الدواني في رسالته "أنموذج العلوم": اتفقوا على أن الحديث الضعيف لاتثبت به الأحكام الشرعية، ثم ذكروا أنه يجوز بل يستحب العمل بالأحاديث الضعيفة في فضائل الأعمال، وممن صرح به النووي في كتبه لاسيما كتاب الأذكار۔ وفيه إشكال لأن جواز العمل واستحبابه كلاهما من الأحكام الشرعية الخمسة، فإذا استحب العمل بمقتضى الحديث الضعيف كان ثبوته بالحديث الضعيف وذلک ينافي ماتقرر من عدم ثبوت الأحكام بالأحاديث الضعيفة۔ انتهى كلامه۔

یہ اشکال نہایت قوی ہے، شہاب الخفاجی وغیرہ نے اس اشکال کے جو جوابات دیئے ہیں وہ سارے کمزور و ضعیف ہیں، شیخ جمال القاسمی نے انہیں رد کیا ہے، اور علامہ دوانی کی تائید میں زبردست دلائل دیئے ہیں۔ مکمل تفصیل قواعد التحدیث میں درج ہے وہاں ملاحظہ کی جائے۔

رہا شب براءت کی فضیلت کا معاملہ، سو وہ ایک مستقل علیحدہ چیز ہے، اور اس کی فضیلت کی روایات اکثر ضعیف ہیں، اسی لئے قاضی ابوبکر بن عربیؒ نے شب براءت کی فضیلت کے ثبوت کا انکار کیا ہے، لیکن شب براءت کی فضیلت والی روایات گو باعتبار سند ضعیف ہیں لیکن کثرت طرق سے ان کو ایک گونہ قوت حاصل ہوگئی ہے، اس لئے بہت سے مشائخ (صوفیاء کرام) نے ان روایات کو اس لئے قبول کیا ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف روایات پر عمل کر لینے کی گنجائش ہے، تفصیل گزر چکی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت:

تفسیر روح المعانی کے حوالہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق بعض مفسرین نے لیلۃ مبارکہ سے شب براءت مراد لے کر ﴿فِيهَا يُفْرَقُ﴾ [الدخان:۴] کا تعلق اسی سے جوڑ کر اس طرح تطبیق دی ہے کہ امورِ تقدیر کے ابتدائی اجمالی فیصلے شب براءت میں مرتب ہوجاتے ہیں، پھر ان کی تفصیلات شب قدر (رمضان) میں لکھ کر فرشتوں کے حوالہ کر دی جاتی ہیں، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا معنی اور خلاصہ ہے، جس کو امام

بغوی رحمہ اللہ نے بروایت ابوالضحیٰ تفسیر معالم میں نقل کیا ہے۔

فضائل لیلۃ القدر:

سب سے بڑی فضیلت جو تمام فضائل پر حاوی اور محیط ہے وہ نزول قرآن حکیم ہی ہے۔ دوم اس ایک رات کی عبادت کا ہزار مہینوں یعنی تراسی سال چار مہینے کی عبادت سے بہتر اور افضل ہونا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے عبادت کے لیے قیام کرے اس کے تمام پچھلے گناہ (صغیرہ) معاف کردئے جاتے ہیں۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ آیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہارے اوپر ایک مہینہ ایسا آیا ہے کہ جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے، جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا تو گویا وہ ساری ہی خیر سے محروم رہ گیا، اس کی خیر سے تو صرف بدنصیب ہی محروم رہتا ہے۔ [صحيحين، ترمذي]

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب قدر میں جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ آتے ہیں، اور ہر اس شخص کے لئے جو کھڑا ہو یا بیٹھ کر عبادت کر رہا ہو (ذِکر، تلاوت، وغیرہ) دعائے رحمت ومغفرت کرتے ہیں۔ [مشکوٰۃ]

فائدہ:

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری خلقت سے افضل ہیں، اور آپ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے، آپ کی کتاب قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں سے افضل ہے، پھر رمضان المبارک کا مہینہ تمام مہینوں سے افضل اور لیلۃ القدر رمضان کی تمام راتوں سے افضل ہے، پس اللہ تعالیٰ شانہ نے افضل الکتب (قرآن) کو افضل الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر افضل الامۃ کی ہدایت کے لیے افضل الشهور رمضان کی افضل اللیالی لیلۃ القدر میں افضل البقاع وخیر البقعۃ مکۃ المکرمۃ میں نازل فرما کر ہر اعتبار سے اس کی تکمیل فرمائی۔ [خلاصہ ابن کثیر وغیرہ]

قرآن مجید کا یہ پہلا کلی ومکمل نزول اسی شب قدر میں دفعۃً چوبیس (۲۴) رمضان کو لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا (بیت العزۃ) میں یک بارگی، پھر آہستہ آہستہ تیئیس (۲۳) سالوں میں حسب ضرورت وواقعات نازل ہوتا رہا۔

کتب تواریخ وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام آسمانی کتابوں کا نزول رمضان ہی میں ہوا ہے۔

☆☆☆

لیلۃ القدر کی تعیین میں اقوال:

شب قدر کی تعیین میں احادیث وآثار میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، جس طرح حروف مقطعات اور اسم اعظم نیز ساعت اجابتِ جمعہ اور دیگر چند چیزوں کے معانی اوقات یا تعیین میں اختلاف ہے، اسی قسم کے اختلاف لیلۃ القدر کی تعیین میں بھی ہے، بسا اوقات اس سلسلے میں چالیس تک کے اقوال ہوتے ہیں۔ دراصل ان اختلافات کی وجہ اختلاف روایات وآثار ہی ہیں، اور اختلاف روایات میں ایک مخفی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے جسے قصداً پردۂ خفاء میں مصلحتاً رکھا گیا ہے۔

البتہ علماء محققین نے کہا ہے کہ یہ رات کسی خاص تاریخ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کسی سال کسی تاریخ میں ہوتی ہے، اور کسی سال اور تاریخ میں ہوتی ہے، علیٰ ہٰذا القیاس۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ وہ تمام سال میں دائر رہتی ہے، چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور تفسیر درمنثور کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں کہ جو شخص تمام سال کی راتوں میں جاگے وہ شب قدر کو پا سکتا ہے، یعنی مطلب یہ ہوا کہ یہ رات تمام سال میں دائر رہتی ہے۔

دوسرا قول حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کا یہ ہے کہ صرف تمام ماہ رمضان میں دائر رہتی ہے، جیسا کہ بہت سی احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ شب قدر تمام رمضان میں کوئی ایک متعین رات ہے جو معلوم نہیں ہے۔

شوافع حضرات کا راجح قول یہ ہے کہ اکیسویں شب کا لیلۃ القدر ہونا اقرب واصوب ہے۔ حضرت امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کا قول یہ ہے کہ شب قدر رمضان کے اخیر عشرہ کی طاق راتوں میں دائر رہتی ہے، یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ اور ۲۹ میں۔

جمہور علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ رمضان کی ستائیسویں رات میں زیادہ امید ہے۔ شیخ محی الدین بن عربیؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ان لوگوں کا قول زیادہ صحیح ہے جو کہتے ہیں کہ شب قدر تمام سال میں دائر رہتی ہے، اس لئے کہ میں نے دو مرتبہ اس کو شعبان میں دیکھا ہے: ایک مرتبہ پندرہ کو اور ایک مرتبہ انیس کو، اور دو مرتبہ رمضان کے درمیانی عشرہ میں ۱۳، اور ۱۸ کو، اس کے علاوہ رمضان کے آخری عشرہ کی ہر طاق رات میں دیکھا ہے، اس لئے مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ تمام سال کی راتوں میں پھرتی اور گشت لگاتی رہتی ہے، البتہ رمضان میں بکثرت پھرتی ہے، یہ

نسبت سال کے دوسرے مہینوں کے۔

حکیم الامت صاحب اسرار شریعت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شب قدر سال میں دو مرتبہ ہوتی ہے: ایک وہ رات ہے جس میں احکامِ خداوندی نازل ہوتے ہیں، اور اسی رات میں قرآن کریم بھی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا تھا، یہ رات رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام سال میں دائر رہتی ہے، لیکن جس سال قرآن مجید نازل ہوا اس سال رمضان میں آئی تھی، اور اکثر رمضان ہی میں ہوتی ہے، دوسری شب قدر وہ ہے جس میں روحانیت کا ایک خاص انتشار ہوتا ہے، اور اس میں ملائکہ بکثرت زمین پر اترتے ہیں، شیاطین بند رہتے ہیں، دعائیں اور عبادتیں قبول ہوتی ہیں، یہ رات رمضان کے ساتھ مخصوص ہے، ہر رمضان میں خصوصاً اس کے اخیر عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے اور بدلتی رہتی ہے، بہت سے مشائخ دیوبند نے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔ [فضائل رمضان]

بیہقی وقت حضرت الشیخ قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ کی تفسیر مظہری میں ہے کہ ان سب یعنی (چالیس اقوال) میں سے صحیح یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان شریف کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے، مگر اخیر عشرہ کی کوئی تاریخ متعین نہیں، وہ اس میں کسی بھی رات میں ہوسکتی ہے، بلکہ ہر رمضان میں بدلتی رہتی ہے، احادیث کے تعارض کو دور کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے، پھر اخیر عشرہ میں بھی احادیثِ صحیحہ کی رُو سے طاق راتوں کا زیادہ احتمال ہے، اگر شب قدر کو ان مذکورہ راتوں میں دائر اور ہر رمضان میں منتقل ہونے والی قرار دیا جائے تو وہ تمام احادیث جمع ہو کر اور اپنی اپنی جگہ بلا تاویل وتکلف درست ہوجاتی ہیں جو تعیین شب قدر کے متعلق مذکورہ تاریخوں میں کسی تاریخ کے متعلق آئی ہیں۔

اکثر فقہاء نے اسی کو اختیار کیا ہے، امام مالک، سفیان ثوری، امام احمد، ابوقلابہ، امام اسحٰق بن راہویہ، امام مزنی، ابوثور اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ نے یہی فرمایا ہے۔ اور ایک روایت امام شافعیؒ سے بھی اسی کے موافق منقول ہے۔

صحیح بخاری میں اُم المؤمنین حضرت عایشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تحروا ليلة القدر في العشر الأواخر من رمضان۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: فاطلبوها في الوتر منها۔ یعنی شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ [مظهري]

یہ قول جو مشہور ہے کہ شب قدر ستائیسویں شب ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ وہ اکثر اسی شب میں واقع

ہوتی ہے، اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ لفظ لیلۃ القدر میں نو حروف ہیں، اور یہ لفظ اس سورت میں تین بار مذکور ہے، اور نو کو تین میں ضرب دینے سے ستائیس بنتے ہیں، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ستائیسویں رات شب قدر ہے۔ اور بعض لوگوں نے اس طرح کہا کہ اس سورت میں تیس الفاظ (کلمات) ہیں، اور ستائیسواں کلمہ لفظ هِيَ ہے جس کا مرجع لیلۃ القدر ہے، اس سے ستائیسویں شب قدر کی طرف اشارہ ہے، واضح ہو کہ اس طرح کی تلمیحات واشارات تخمینی ظن پر مبنی ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم

لیلۃ القدر کے مخفی ہونے میں فوائد:

حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے باہر تشریف لائے کہ ہمیں لیلۃ القدر کی اطلاع دیں، مگر یہاں مسجد میں دو آدمی کسی قرض کے متعلق جھگڑ رہے تھے (اس وجہ سے اس کی تعیین اٹھالی گئی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب قریب تشریف لائے تو ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں شب قدر کی خبر دینے آیا تھا مگر فلاں فلاں میں جھگڑا ہو رہا تھا اس وجہ سے اس کی تعیین اٹھالی گئی، ممکن ہے کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہو، لہٰذا اب اس رات کو نویں، ساتویں، اور پانچویں، رات میں تلاش کرو۔ [بخاري]

قرآن کریم نے منازعت واختلاف سے منع فرما کر واضح کیا: ﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ [الأنفال:٤٦] (اور جھگڑے نہ کرو پس تم کمزور پڑ جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی)۔ اس حدیث نے مزید اضافہ کر کے بتادیا کہ آپس کے جھگڑے کی نحوست سے محرومی ہوتی ہے جو کہ لیلۃ القدر کے حق میں معلوم ہوا کہ تعیین اٹھالی گئی، علیٰ ہذا القیاس دوسرے امور کا بھی یہی حال سمجھا جائے کہ جھگڑے اور اختلاف کی وجہ سے محرومی ہوتی ہے، اور برکت اٹھ جاتی ہے۔

لیلۃ القدر کی عدم تعیین اور اخفاء میں بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں کارفرما ہیں، اگر یہ رات معلوم ہوتی تو عام مسلمان بہت سے اعمالِ صالحہ سے محروم رہتے، کیونکہ وہ صرف اسی رات کا اہتمام وانتظام کر کے باقی راتوں کی تنظیم و اہتمام نہیں کرتے، اب جبکہ یہ رات معلوم نہیں تو تمام راتوں میں وہ جاگ کر عبادت کا اہتمام کریں گے، جس کے طفیل سارا رمضان شوق ورغبت میں گزر جائے گا، اور علاوہ لیلۃ القدر کے باقی ایام بھی عبادات کی بدولت نہایت قیمتی بن جائیں گے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اگر طالب علم کو امتحان کا مضمون ومبحث معلوم کیا جائے تو وہ باقی کتاب میں محنت نہیں کرے گا، اور مخصوص مقام کارٹ لگا کر یاد کرے گا، مگر اس کا بڑا علمی نقصان ہوگا، لیکن اگر امتحان کا مقام غیر

معلوم ہوتو وہ پوری کتاب میں محنت کر کے علمی نقصان سے بچ جائے گا اور علمی اضافے کا اسے بڑا فائدہ بھی حاصل رہے گا۔

علاماتِ شب قدر:

اگر سردی کا موسم ہوتو یہ رات عام راتوں کی طرح سرد نہیں ہوتی، اگر گرمی کا موسم ہوتو عام گرم راتوں کی طرح گرم نہیں ہوتی، بلکہ ہرصورت اس میں سردی وگرمی میں اعتدال رہے گا۔ دوم علامت یہ ہے کہ یہ رات صاف شفاف، چمکدار اور روشن معلوم ہوگی۔ سوم کثرت انوار کی وجہ سے چاند کھلا ہوا معلوم ہوگا۔ چہارم اس رات کو صبح تک ستارے شیاطین کے نہیں مارے جاتے۔ پنجم اس رات کی صبح کو سورج تیز شعاعوں کے بغیر طلوع کرے گا۔ ششم اس رات کو تمام درخت جڑی بوٹی سجدہ کریں گے۔ ہفتم سمندر کے تلخ وترش پانی بھی میٹھا ہوجائے گا، لیکن یہ چیزیں ہر ایک کو نظر کہاں آئیں گی، جن لوگوں پر نظر عنایت ہو اور وہ صاحب باطن ہوں تب ان اشیاء کا نظارہ ممکن ہوگا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور انور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں شب قدر کو پاؤں تو کیا دعا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ دعا کرو: اللّٰهم إنک عفوّ تحب العفو فاعف عني۔ [بخاري]

اے ربّ العزت! آپ بہت معاف فرمانے والے اور معافی کو پسند کرنے والے ہیں، میری خطائیں معاف فرمایئے۔ حضرت اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین کو جو عفو ومغفرت کی دعا بتلادی یہ نہایت ہی اہم اور جامع ہے، ہر مسلمان کو چاہئے کہ رمضان شریف کی تمام راتوں میں اس دعا کو کثرت سے پڑھا کرے، بلکہ اس رات یعنی شب قدر میں دعائیں بکثرت پڑھنا ہی اصل سرمایہ ہے، البتہ قیام ورکوع وسجود وتلاوت وغیرہ کی فضیلت اپنی جگہ نہایت اہم ہے، تو دونوں چیزوں کا التزام ہی اصل مطلب ومراد ہونا چاہئے۔

شب قدر امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے:

شان نزول کی روایات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر صرف اسی امت کے ساتھ مخصوص ہے، سابقہ امتوں میں سے کسی بھی امت کو یہ مبارک شب نہیں ملی، یہی جمہور علماء امت کا قول ہے، اور یہ قیامِ قیامت تک باقی ہے، اور ہر سال لوگ اس کی سعادت اور فوائد حاصل کرتے رہیں گے، جس طرح کہ رمضان المبارک کے فضائل و منافع ابدی دائمی ہیں۔ اس بارے میں جمہور علماء میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ اس کی تعیین اٹھالی گئی ہے مگر اس کا وجود باقی ابدی ہے۔

﴿وَمَآ اَدۡرٰكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ﴾ یہاں کلمہ "مَا" دونوں جگہ استفہامِ انکاری کے لیے ہے، جس سے لیلۃ القدر کی عظمت کی نشاندہی مقصود ہے، یعنی آپ کو کسی چیز نے لیلۃ القدر کی عظمت واہمیت نہیں بتائی، اس کی عظمت و فضیلت عقل کی رسائی سے بھی بالاتر ہے، پھر خود ارشاد فرمایا:

﴿لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ﴾ یعنی ہزار ماہ (تراسی سال وچار ماہ) عبادت کرنے کا جس طرح ثواب ہوسکتا ہے شب قدر میں عبادت کرنے کا اس سے کہیں زیادہ ثواب ہے، یہ زائد ثواب کتنا ہے؟ یہ اللہ پاک کو معلوم ہے۔ شب قدر کی دوسری فضیلت کا ذکر:

﴿تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ فِيۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ﴾ حضرت روح اور فرشتے اس رات کو آسمان سے خصوصی پیغامات لے کر زمین پر اترتے ہیں، اوپر سے فرشتوں کی آمد نیچے رمضانی انوار وبرکات کے ساتھ عباد اللہ الصالحین کی تجلیات عبادات وطاعات کے انوار وبرکات کے اختلاط سے ایک عجیب روحانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، اور اس عظیم جماعت کے فیوض وبرکات سے سفلی مخلوقات میں ایک درخشندہ چمکدار ترقی پیدا ہوجاتی ہے، اور بے شمار عباد اللہ الصالحین کو فرشتوں سے غیر مرئی روحانی تجلیات کے انعکاس واختلاط سے بڑے بڑے کمالات تک عروج بھی حاصل ہوتا ہے۔

لطیفہ:

اللہ ربّ العزّت جل شانہ اپنے بندوں پر نہایت بے حد مہربان ہے، اخلاص وتوجہ کے ساتھ کی عبادتوں پر بڑے بڑے ثواب ودرجات عطا فرماتے ہیں، اگر لیلۃ القدر کی ایک رات کی فضیلت ہزار ماہ سے بہتر اور زائد ہے تو یہ کوئی تعجب نہیں، اس لئے کہ یہ رات سال میں ایک یا بقول حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ دو مرتبہ آتی ہے، جس میں تراسی سال چار ماہ کی عبادت کا ثواب رکھا ہوا ہے، اگر کوئی کعبۃ اللہ شریف میں ایک نماز ادا کرے گا تو اسے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملے گا، ایک لاکھ نماز باون (٥٢) سال چھ (٦) ماہ میں ادا ہوسکتی ہیں، اس حساب سے اگر مسجد حرام میں یومیہ پانچ ہی نمازوں کی ادائیگی نصیب ہو تو پانچ لاکھ نمازوں کا ثواب ملے گا، اور عام حالات میں دوسرے مقامات پر پانچ لاکھ نمازیں اگر کوئی ادا کریں تو دوسوتریسٹھ (٢٦٣) سال کی عمر میں یہ ممکن ہے، اس اعتبار سے مسجد حرام کے فضائل لیلۃ القدر سے کہیں بڑھ کر زیادہ ہیں، واللہ أعلم وعلمہ أتم وأکمل۔

روح کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں، علامہ ابن جریرؒ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ

روح چوتھے آسمان پر ہے، تمام انسانوں سے پہاڑوں سے اور ملائکہ سے بڑا ہے۔امام بغویؒ نے اتنا اور بیان کیا ہے کہ وہ روزانہ بارہ ہزار تسبیح (سبحان اللہ) پڑھتا ہے، اور اس کی ہر ایک تسبیح سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا فرماتا ہے، قیامت کے دن روح تنہا ایک صف ہوگا۔[معالم]

ابوالشیخ نے ضحاکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ روح اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، تمام فرشتوں سے بڑا ہے، اگر وہ منہ کھول دے تو سارے ملائکہ اس میں سما جائیں۔ابوالشیخ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول یہ نقل کیا ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے جس کے ستر ہزار منہ ہیں، ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں، ہر زبان میں ستر ہزار بولیاں ہیں، اور ان تمام بولیوں میں وہ اللہ تعالیٰ شانہ کی پاکی بیان کرتا ہے۔

ابوالشیخ نے باسناد عطا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے جس کے دس ہزار بازو ہیں۔باسناد ابوطلحہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے کہ روح جسامت میں سب فرشتوں سے بڑا ہے۔امام بغوی نے عطا کی روایت میں اتنا اور نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن تنہا روح ایک صف میں اور باقی ملائکہ ایک صف میں کھڑے ہوں گے، پس روح کی جسامت ان سب کے برابر ہوگی۔ابوالشیخ نے مقاتل کا قول نقل کیا ہے کہ روح اشرف الملائکہ اور صاحب وحی ہے۔ابوالشیخ نے ضحاکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

حضرت جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ روح متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے:

(۱) امر وحکم کے لیے جیسے ﴿وَرُوحٌ مِّنْهُ﴾[النساء:۱۷۱] اور ﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّي﴾[الإسراء: ۸۵]۔

(۲) ﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوحِ﴾ [النحل:۲] (اتارتا ہے فرشتہ وحی لے کر) بمعنی وحی کے۔

(۳) ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [الشوریٰ:۵۲] بمعنی قرآن کریم کے

(۴) ﴿وَاَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ﴾ [المجادلة:۲۲] بمعنی رحمت کے۔

(۵) ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ﴾ [الواقعة:۸۹] وفي قراءة بضم الراء، بمعنی رزق وروزی کے۔

(۶) ﴿فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوحَنَا﴾ [مریم:۱۷] بمعنی فرشتہ کے۔

(۷) ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ﴾ [الشعراء:۱۹۳] بمعنی فرشتہ جبرئیل علیہ السلام کے۔

(۸) ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوحُ﴾ [النبأ:۳۸] عظیم الرتبہ وعظیم الجثہ روح نامی فرشتہ مراد ہے۔

(۹) ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا﴾ [القدر:۴] فرشتوں کا لشکر مراد ہے اور ان کے سربراہ جبریل علیہ السلام۔

(۱۰) ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ [الإسراء: ۸۵] بمعنی جان یعنی انسانی روح۔ [الاتقان، لغات القرآن، معالم وغیرھا]

البتہ آیت کریمہ: ﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ﴾ [النحل:۱۰۲] یا ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ [الشعراء:۱۹۳] یا ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ [البقرۃ:۸۷] اور ﴿فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا﴾ [مریم:۱۷] ان مقامات میں روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، باقی ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾ [النبأ: ۳۸] اسی طرح ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا﴾ [القدر:۴] یہاں بعض حضرات کے قول کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں، اور بعض نے کہا کہ وہ عظیم الجثہ روح نامی فرشتہ مراد ہے۔ واللہ اعلم۔ [لغات القرآن]

سُورَةُ الْبَيِّنَةِ

مدنيةٌ آياتها ۸ ركوعها ۱

سورۂ بینہ مدنی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کے کئی نام ہیں: ① سورة القيمة۔ ② سورة البلد۔ ③ سورة البينة۔ ④ سورة المنفكين۔ ⑤ سورة البرية۔ ⑥ سورة لم يكن، مشہور نام سورة البينة ہے۔

نزول:

صاحب البحر کہتے ہیں کہ جمہور کے قول کے مطابق یہ سورت مکیہ ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، یحیٰ بن سلام، علامہ ابن الفرس رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ سورت مکیہ ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر، عطاء بن یسار اور عطیہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ سورت مدنیہ ہے۔ کتاب التحریر میں بھی مدنیہ لکھا گیا ہے، اور اسے جمہور کا قول کہا گیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ بھی یہی ہے، اور اسی مدنیت والے اقوال کو روح المعانی نے راجح قرار دیا ہے۔ اس سورت کا نزول سورة الطلاق کے بعد ہے، اس میں چورانوے (۹۴) کلمات اور ایک سو چھیانوے (۱۹۶) حروف ہیں۔

ربط و مناسبت:

سورۃ العلق میں وحی الٰہی، نزولِ القرآن کا بیان تھا، سورۃ القدر میں اس کی آمد کے وقت کا بیان ہوا کہ اس کا

نزول رمضان لیلۃ القدر میں ہوا، اب اس سورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس مقدس کتاب کے لیے ایک رسول (شارح کتاب) کی آمد وتشریف آوری بہت ہی ضروری ہوئی، یعنی ضرورتِ رسالت۔

مختصر موضوع:

سورۃ العلق میں نزول کتاب، سورۃ القدر میں نزول والی رات کی قدر ومنزلت اوراس سورۃ البینۃ میں اس کی دلیل اورضرورتِ رسالت کو بیان فرمایا جارہا ہے کہ مشرک اوراہل کتاب اس وقت تک اپنے باطل عقائد سے دستبردار نہیں ہوں گے جب تک ایسا رسول تشریف نہ لے آئے جن کی ذات اورجن کا کردار ان کی دعوت کی صداقت کی روشن اورواضح دلیل ہو۔

پھر بتایا کہ اہلِ کتاب کا صراطِ مستقیم اورراہ حق سے انحراف اس وجہ سے نہ تھا کہ ان کے پاس کوئی آسمانی صحیفہ نہیں آیا تھا، یا ان کی طرف کوئی رسول مبعوث نہیں کیا گیا تھا، بلکہ یہ لوگ محض ذاتی اغراض اور شخصی مفاد اور بغض و عناد کی وجہ سے حق سے منحرف ہوگئے، اور صراط مستقیم چھوڑ گئے۔ پھر اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ سب رسول اور سارے نبی ایک ہی دین کی دعوت دینے کے لیے مبعوث کئے جاتے رہے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پورے خلوص اوریکسوئی کے ساتھ ربّ العزّت کی توحید وعبادت، اقامت نماز، اداءِ زکوٰۃ وغیرہ میں سرگرم رہو، جن لوگوں نے اس دولت کو قبول نہ کیا اوراس پر عمل کرنے سے منکرو گریزاں رہے وہ بدترین خلائق ہیں، لیکن جن خوش نصیبوں نے اس دعوت کو صمیمِ قلب سے قبول کیا، اور پورے اخلاص سے اس کی ہدایات پر عمل پیرا رہے وہ خیر البریۃ اور تمام مخلوقات سے اعلیٰ وارفع ہیں، جنت اوراس کی نعمتوں اورراحتوں کی بشارت کے ساتھ انہیں یہ مژدہ جانفزا بھی سنایا جارہا ہے کہ انہوں نے اپنے ربّ سے ترساں ولرزاں جس طرح اپنی زندگی گزاری اس کے عوض انہیں اس بلندو بالا منصب پر فائز کیا جائے گا جہاں ربّ ذوالجلال والاکرام ان سے اوروہ اپنے ربّ کریم ورحیم سے راضی ہوں گے۔

لطیفہ:

جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضرت جبریل علیہ السلام نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ حضرت باری تعالیٰ جل شانہ کا آپ کو حکم ہوا ہے کہ یہ سورت آپ تلاوت کر کے سید القراء ابی بن کعب کو سنائیں، حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اس کا ذکر فرمایا، اوران کے سامنے اس بابرکت سورت کی تلاوت کی، حضرت ابی بن کعب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کیا ربّ العٰلمین جل شانہ کے پاس میرا ذکر ہوا، میرا نام

لیا گیا؟ فرمایا: ہاں! تیرا ذکر بھی ہوا اور تیرا نام بھی لیا گیا، تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرطِ مسرت اور خوشی میں رو پڑے۔ [متفق عليه، كنز، أحمد وغيرهما]

فائدہ:

جو لوگ قرآن حکیم کے ساتھ خاص شغف اور مخصوص تعلق ومحبت رکھتے ہیں، اور اس کے تلفظ وادائیگی میں محنت کرکے اعلیٰ درجہ حاصل کرتے ہیں، اور پھر اسے حرزِ جان بنا کر اس پر عمل کرتے اور اس کے حقوق بجالا کر اس کی خدمت کرتے ہیں، اور اسے ذریعۂ معاش نہیں بناتے ہیں، تو انہیں یہ مقام اور بلند وبالا مرتبہ حاصل رہے گا۔ اللّٰهم ارزقنا وجميع القراء۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

لَمۡ يَكُنِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ مُنۡفَكِّيۡنَ حَتّٰى تَاۡتِيَهُمُ الۡبَيِّنَةُ ۙ‏ ﴿۱﴾
رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ‏ ﴿۲﴾ فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ‏ ﴿۳﴾ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ
اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنَةُ ؕ‏ ﴿۴﴾ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۙ حُنَفَآءَ
وَيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيۡنُ الۡقَيِّمَةِ ؕ‏ ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ
وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِيَّةِ ؕ‏ ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓـئِكَ هُمۡ خَيۡرُ الۡبَرِيَّةِ ؕ‏ ﴿۷﴾ جَزَآؤُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا
الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾

ترجمہ: کفار اہل کتاب اور مشرکین باز آنے والے نہ تھے جب تک ان کے پاس واضح دلیل نہ آجائے ① یعنی اللہ تعالیٰ کا رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے ② جن میں عمدہ درست مضامین ہوں ③ اور اہل کتاب نے واضح دلیل آجانے کے بعد ہی اختلاف کیا ہے ④ حالانکہ ان کو یہی حکم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو خالص اسی کے لئے ہی رکھیں یکسو ہو کر اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیا کریں اور یہی مستحکم صحیح دین ہے ⑤ بیشک جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب اور مشرکین وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے، وہی بدترین خلق ہیں ⑥ بیشک

جولوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے وہی بہترین خلق ہیں۞ ان کا بدلہ ان کے ربّ کے پاس ہمیشہ رہنے والی بہشتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی رہیں گے، یہ (سب کچھ) اس کے لئے ہے جو اپنے ربّ سے ڈرتا ہو۞

معارف ومنازل

اس سورت میں بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کفروشرک کے غلبہ کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ سارے جہاں میں کفروشرک اور جہالت کی عالمگیر ظلمت چھائی ہوئی تھی، چاردانگ عالم کے کسی بھی افق پر نورو ہدایت کا کوئی نام و نشان نہ تھا، انسان کا شمار بدترین مخلوقات میں ہوتا تھا جس کی پیشانی ہر شجرو حجر کے سامنے جھک جاتی، اور یہ بدقسمت ہر بے جان پتھر کو معبود کا درجہ دے کر اس کی عبادت پر فخر وخوشی محسوس کرتا، ایسے وقت میں ربّ العلمین جل شانہ کی رحمت وحکمت عمومی کا تقاضا ہوا کہ اس عمومی بین الامی جہالت کی ظلمتوں کو دور کرنے کے لئے ایک تابناک عالمگیر عظیم ہستی کو مبعوث فرمایا جائے، کیونکہ جتنا مرض مہلک وخطرناک ہوگا اسی کے مطابق معالج وحکیم بھی عظیم وحاذق ہوگا، اور دوا وعلاج بھی بیش قیمت واعلیٰ بے مثال ہوگی، پس حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ یہ ہستی ایسی ہو کہ ایک قوم وملک کے لیے نہ ہو، بلکہ سارے جہاں کے لئے ہو، جس سے پوری کائنات کی تاریکیاں دور ہوسکیں۔

توبفضلہٖ ورحمتہٖ الواسعۃ اس شرک وکفر اور عمومی جہالت کے شدید وتباہ کن مرض کے علاج کے لئے جس ماہر حکیمِ حاذق مصلحِ اعظم معلمِ اکبر کو بھیجا گیا اس کو ان آیاتِ کریمہ میں بینة سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اور وہ ذات گرامی سراج منیر، بشیر ونذیر، ہادیٔ اعظم، صاحب المعراج، السراج الوہاج، رسول اکرم نبی اعظم سید عالم حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم ہیں، جو قرآن کریم کی حجتِ واضحہ وآیاتِ بینات لے کر دنیا میں تشریف لائے، اور سارے روحانی جسمانی بتکدوں کو اور ہزاروں صنم خانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے گم گشتہ انسانوں کا رشتہ معبودِ حقیقی کے ساتھ جوڑ کر نجات دلائی۔

ان آیات میں عظمت شان نبوی منصب رسالت اوصاف قرآن حکیم کا اسی خاطر اجمالاً بیان ہوا، اس سورت کی ابتدائی آیتوں کی علماء کرام نے مختلف تفسیریں بیان کی ہیں، اختصار کے پیش نظر صرف دو پر اکتفاء کرتے ہیں۔

(۱) بعثت نبوی سے پہلے اہل کتاب ومشرکین عرب حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے منتظر

رہتے تھے، جب آپ آیات بینات واضحات کے ساتھ تشریف لائے تو یہ سارے لوگ بغض وعناد، ہٹ دھرمی اور عداوت کی وجہ سے اولین منکرین ومکذبین بن کر ہر محاذ پر آپ کی مخالفت میں اتر آئے، جیسے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾[البقرۃ:۸۹] (تو جب ان کے پاس وہ چیز آگئی جس کو وہ پہچانتے تھے تو اس کا انکار کیا)۔اسی طرح فرمایا:﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾[البقرۃ:۱۴۶] (وہ آپ کو ایسا جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں،اور بیشک ان میں سے ایک گروہ حق کو چھپاتے ہیں،اور وہ جانتے ہیں)۔

یہ لوگ جس طرح بڑی شدت کے ساتھ آپ کی آمد کا انتظار کررہے تھے،لیکن جب آپ کی نبوت کا سورج طلوع ہوا تو نہایت شدت سے منکر ہوئے اور تکذیب کرنے لگے،اور خصوصاً اہل کتاب توریت وانجیل کے اوراق سے آپ کی صفاتِ کاملہ اور اوصافِ حمیدہ کو تحریف کے ذریعہ نکال دیئے اور چھپائے، پوری قوم تو بجائے خود کوئی دس (۱۰) یہودی وغیرہ اسلام قبول کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوئے، اسی طرح مشرکین عرب میں زور وشور سے چرچا ہورہا تھا کہ ہمارے اندر یعنی ہم ہی میں سے ایک مصلح بڑی ہستی جلوہ گر ہونے والی ہے جو عرب کے لیے ایک تابناک درخشاں عزّت وشوکت کا باعث بنے گی، اور پوری عرب کو گمنامی کی ذلّتوں سے نکال کر افق کی بلندیوں پر پہونچائے گی، تمام عداوتوں کو محبتوں سے اور ذلّتوں کو عظمتوں سے، اور تمام گمنامیوں کو عزّتوں اور شوکتوں سے تبدیل کرکے تمام معمورہ میں عرب قوم کو سرپرستی اور سربراہی دلائے گی، اور اونٹوں کے چرواہے گلہ بانوں کو مسند اقتدار عطا کرکے، اور انہیں وہ ذوقِ خلافت عنایت فرمائے گی، جس پر کرۂ ارض تو کیا آسمانوں کے مقربین فرشتوں کو بھی رشک آجائے گا، مگر یہ بزدل اہل کتاب اور جہالت کے تعصب میں ڈوبے ہوئے مشرکین عرب اس عظیم ہستی کے منکر ودشمن بن گئے۔

(۲) عام عوام الناس کا حال یہ ہے کہ وہ دینی امور اور دنیوی معاملات میں ہر محاذ پر اکثر وبیشتر اپنے سرداروں اور بڑوں کے تابع ہوا کرتے ہیں، اور بڑے لوگ اکثر وبیشتر مفاد پرست خود غرض ہوتے ہیں، وہ کسی ایسے پروگرام کو کبھی حق نہیں سمجھتے اور قبول نہیں کرتے ہیں جس سے ان کی سیادت وسرداری کو خطرہ لاحق ہو۔ مختصر تفصیل سورۂ نوح کے فوائد میں گزرچکی ہے۔

ہر زمانہ، ہر معاشرہ اور ہر قوم میں اکثر وبیشتر مذہب واسلام کی جو مخالفت ہوئی ہے یا ہوگی وہ عموماً ایسے رئیس و مالدار لوگوں کی وجہ سے ہے، کیونکہ انہیں مذہب کی غلامی قبول کرنے سے اپنے اقتدار کے سورج کے غروب ہونے کا

خطرہ محسوس ہوگا، بخلاف عوام الناس کے کہ انہیں اس قسم کا خطرہ نہیں ہوتا، مگر وہ بڑوں کی غلامی میں پھنسے ہوئے ان کے تابع ہوتے ہیں، وہ آزادی کے ساتھ کبھی اپنی قسمت کا فیصلہ نہیں کر سکتے، تو آیت:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ کے معنی یہ ہوں گے کہ اہل کتاب اور مشرکین اپنی سیادت و سرداری سے ٹلنے والے یا ہٹنے والے نہ تھے یہاں تک کہ ان کے پاس بینۃ آجائے، اور جب بینۃ ان کے پاس آگیا اور وہ اس پر ایمان نہ لائے تو ان کی ریاست جاتی رہی، اور ان کا اقتدار تہہ و بالا ہو کر ہمیشہ کے لیے تباہ ہوا۔ اس سورت میں اس توجیہہ پر تورات کی اس پیشینگوئی کی طرف اشارہ ہو جائے گا کہ یہود کی حکومت اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ان کے پاس ''شیلا'' نہ آجائے، اور شیلا سے مراد بینۃ ہے، جس کی تفسیر ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ہے، تو اس آیت میں بطور پیشینگوئی اہل کتاب و مشرکین کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ بینۃ آچکا، فاران کی پہاڑیوں سے اتر کر دنیا کی تقدیر بدلنے کے فیصلے کا وقت آپہنچا، اب تمہاری سیادت و سرداری کا سورج غروب ہوگا، اب سرکشی و غرور چھوڑ کر اسے قبول کرو اور صراط مستقیم پر جم جاؤ، ورنہ تمہاری خیریت نہیں، دونوں جہانوں کی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، مختصر عرصے میں دورِ فاروقی میں عظیم سلطنتیں فارس و روم تباہ ہوئے، ایران، شام، مصر، فلسطین، یمن سے قیصر و کسریٰ کی حکومتیں اور اسی طرح مشرکین عرب کی قبائلی سرداری و حکمرانی تکذیب حق و انکار نبوت کی پاداش میں تہہ و بالا زیر و زبر ہو کر ختم ہو گئیں۔ الحمد للہ

لطیفہ:

علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ بعض ائمہ لغت نے ﴿مُنْفَكِّيْنَ﴾ کا معنی ھالکین بتایا ہے، اس صورت میں مطلب واضح ہے، ہلاکت سے دنیوی و اخروی دونوں مراد ہو سکتے ہیں، اور کلمہ حَتّٰى کا مدخل ﴿مُنْفَكِّيْنَ﴾ پر عطف ہوگا۔ واللہ اعلم

﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً﴾ بَيِّنَةُ کی تفسیر رَسُوْلٌ کے ساتھ، اور رَسُوْلٌ کی صفت يَتْلُوْ کے ساتھ۔ ﴿فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ صحف اور کتب دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ البتہ یہاں کتب سے مراد احکامِ شریعت جو محکم اور ناقابلِ نسخ ابدی دائمی احکام مراد ہیں۔ قَيِّمَةٌ یہ کتب کی صفت ہے۔ قَيِّم و قَيِّمَة جو قرآن حکیم میں (سورۃ الکہف، سورۃ الروم، سورۂ آل عمران، سورۃ الحج اور دیگر) مختلف مقامات پر مذکور ہیں، مطلب تقریباً

سب کا ایک ہی ہے، یعنی منصفانہ، معتدل، غیر منسوخ، مستحکم، محکم، مضبوط وغیرہ، چونکہ قرآنی احکام (اسلامی اور شرعی احکام) ان تمام صفات سے موصوف ہیں، اس لئے یہ سارے معانی بیک وقت مراد ہو سکتے ہیں۔

واضح ہو کہ "بینة" سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے جو کہ بینة کی اصلی مصداق ہے، یہ جمہور کا قول ہے، لیکن قتادہ اور زید کے نزدیک اس سے مراد قرآن حکیم ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ بینة سے معجزہ (قرآن) اور صاحب معجزہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں مراد ہیں، اور لفظ دونوں پر صادق و منطبق ہے۔

﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ تَفَرَّقَ سے مراد یہاں اختلاف وانکار اور تکذیب ہے۔ واضح ہو کہ کفر ایک منحوس مہلک مرض ہے جس طرح مرض کے مختلف مدارج واقسام ہوتے ہیں اسی طرح کفر کی چار اقسام علماء کرام نے بیان کی ہیں، وہ اس لئے کہ کفر ایک بغاوت وسرکشی ہے، اس لئے اس کی اقسام بھی متعدد ہوئیں:

قسم اول کفر انکار: وہ یہ ہے کہ قلب وزبان دونوں سے انکار وتکذیب ہو جیسے قریش کا کفر۔

قسم دوم کفر جحود: یعنی قلب میں معرفت کے باوجود زبان سے انکار ہو جیسے یہود ونصاریٰ کا کفر۔

قسم سوم کفر عناد: یعنی معرفتِ قلبی واقرارِ لسانی (احیاناً) کے باوجود انقیاد وتسلیم نہ ہو جیسے یہود کا کفر اور دیگر بعض مشرکین (مشرکین مکہ) کا کفر۔

قسم چہارم کفر نفاق: یعنی اقرارِ لسانی اور انقیادِ ظاہری کے باوجود باطن میں تکذیب وانکار جیسے سینکڑوں منافقین کا کفر یہ کفر، باقی تمام اقسام کفر سے زیادہ مضر وخطرناک ہے، اور اس کی سزا بھی سب سے سخت اور شدید ہے۔ اس لئے کہ اس میں کفر کے علاوہ خداع اور دھوکہ دہی کا پہلو بھی ہے۔ [الكوثر الجاري]

تورات وانجیل میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وبعثت اور خاص خاص صفات اور بہت سی علامات کا ذکر وتذکرہ موجود تھا، جنہیں کئی تحریفات کے باوجود جزوی طور پر باقی رکھا گیا تھا، انجیل کے احبار ورہبان ہر زمانے میں انہیں تشہیر کر کے بہت سے لوگوں کو بتائے تھے، کتب سیرت میں ان کا اچھا خاصا تذکرہ موجود ہے، بچپن میں جب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ ملک شام کے تجارتی سفر پر گئے تھے تو شامی راہبوں نے علامات سے شناخت کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کو آپ کی واپسی کا مشورہ دیا تھا وغیرہ۔

اسی طرح قرآن پاک کے نازل ہونے کی بھی وضاحت سے تذکرہ تھا، تو یہود ونصاریٰ اس بات پر سب

متفق تھے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ضرور تشریف لائیں گے، اور وہ آخری رسول ہوں گے۔ صحیح بخاری کتاب الوحی حدیث ہرقل میں صاف طور پر موجود ہے کہ ہرقل نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ آخری پیغمبر آنے والا ہے، ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ تمہارے ہاں آئے گا، ہم خیال کرتے تھے کہ وہ ہم میں سے ہوگا۔[الحدیث]

چنانچہ یہ اہل کتاب اس بات پر متفق تھے کہ وہ ضرور آئے گا، اور وہ آخری رسول ہوگا، اور ان پر قرآن پاک نازل ہوگا، اور اس کا اتباع سب پر لازم ہوگا، اور وہ یہاں تک عقیدہ رکھتے تھے کہ جب کسی وقت مشرکین کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوتا تو وہ آئندہ تشریف لانے والے پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ وسیلہ سے اپنے لئے فتح ونصرت کی اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے تھے، یعنی دعا کرتے تھے کہ یا ربّ! آنے والے نبی آخرالزمان کی برکت اور وسیلہ سے ہمیں دشمنوں پر فتح ونصرت نصیب فرما، قرآن حکیم نے اسی کا تذکرہ فرمایا ہے: ﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [البقرة:۸۹] (اور پہلے وہ فتح مانگتے تھے ان کو لوگوں پر جنہوں نے کفر کیا)۔

نیز یہ اہل کتاب مشرکین سے کہتے رہتے تھے کہ تم ہمارے ساتھ مقابلہ کرتے ہو، مگر یاد رکھو! عنقریب ایک رسول آنے والے ہیں جو ہمارے ساتھ دے کر تمہارا مقابلہ کرے گا، اور تمہیں شکست دے گا، اور وہ ہمارا حمایتی معاون ہوگا، لیکن ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے جب حق وصداقت کا پیغام لانے والا نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور توحید وآخرت کی دعوت دینے لگے، حالانکہ یہ دعوت اہل کتاب کی کتابوں اور ان کی تعلیمات کے عین مطابق تھی، مگر انہوں نے اسے قبول کرنے سے عناد وعداوت کی بنیاد پر انکار کیا، اور مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔

اگر مشرکین نے اس دعوت کی مخالفت کی ہے تو وہ اس بنیاد پر کہ یہ دعوت ان کے عقائد ونظریات کے ساتھ متصادم تھی، لیکن اہل کتاب کی مخالفت غیر معقول اور سراسر تعصب پر مبنی تھی۔ آئندہ آیت میں اسی کا جواب ہے، فرمایا:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾ حالانکہ انہیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، توحید پر جم کر رہیں، اور نماز ادا کریں، اور زکوۃ دیا کریں، یہی ملتِ مستقیمہ اور دینِ الٰہی ہے، تو نبی آخرزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کتب اور آسمانی ہدایات کی تصدیق کی ہے، چاہئے تو یہ تھا کہ وہ بصد خوشی ورضامندی ایمان لاتے، تصدیق کرتے اور خوش ہوکر برضا ورغبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاون دست وبازو بن کر ہراول دستوں میں شامل ہوجاتے، اور ایک دوسرے کو

دعوت دے کر تلقین کرتے کہ سب آجاؤ اس نبی کے دین کو قبول کرو، خدا کی قسم! اس کا دین اور شریعت وملت بعینہٖ ہماری ملت ودین ہے، کوئی فرق یا افتراق نہیں، لہٰذا ہم اور یہ نبی آخرزمان ہر اعتبار سے ایک ہی ہیں، کیونکہ انہوں نے ہمارے عقائد واعمال توحید وایمان کی تصدیق کی ہے (چند مخصوص چیزوں میں جو بنیادی ہیں)۔

مگر بجائے ایمان لانے اور تصدیق کرنے یہ لوگ عام مشرکین سے بھی بدتر برے ثابت ہوئے اور انکار وتکذیب پر ڈٹ کر قیامت تک اسلام اور اسلامی تعلیمات اور پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اور بدخواہ بن گئے، جن کے بارے میں قرآن حکیم نے ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ [الفاتحة:۷] (نہ کہ وہ لوگ جن پر غضب ہوا ہے، اور نہ گمراہ لوگ) کے پیغام کے ساتھ یہ حتمی فیصلہ سنایا اور کہا کہ: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ [البقرة: ۱۲۰] (ہرگز یہود اور نصاریٰ آپ سے راضی نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ آپ ان کے دین کی پیروی نہ کریں)۔ سورۃ البقرۃ پوری کی پوری یہود اور مکمل سورۂ آل عمران نصاریٰ کی تردید پر مشتمل ہیں۔ واللہ اعلم

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ یہاں سے ان اہل کتاب اور مشرکین کا انجامِ بد کا بیان ہو رہا ہے جنہوں نے بینۃ، توحید، رسالت اور قرآن پاک کی تکذیب کی، اسی طرح حنیفیۃ کا انکار کر کے تمام دینی اقدار سے بغاوت کی، پس اللہ تعالیٰ کے احکام کا باغی ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، حتیٰ کہ برے سے برے جانور کتے اور خنزیر سے بھی بدتر شمار ہوگا، اور دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں خوار وذلیل ہو کر ابدی جہنم کا حقدار ٹھہرائے گا۔ ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ﴾ [التين:۵] (پھر ہم نے اس کو سب سے زیادہ نچلی حالت کی طرف لوٹا دیا) کا مستوجب دستحق ہو کر ہمیشہ کے لئے دوزخ کا ایندھن بنے گا۔

اس کے برعکس جو لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کریں گے، اور رسالتِ رُسل، صداقت قرآن، ایمان بالیوم الآخر، اقامتِ صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ اور دیگر دینی اقدار پر کاربند رہ کر حنیفیت پر قائم رہیں گے تو ان کا نیک انجام کتنا درخشاں اور روشن وتابندہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی رضاء کے ساتھ وہ عالیشان جنتوں میں بڑے اعزاز واکرام اور سرخروئی وسعادت کے ساتھ ابدی دائمی خوشی وسروری کے ساتھ رہیں گے، جنہیں اشرف المخلوقات اور خَيْرُ الْبَرِيَّةِ جیسے امتیازی مقامات حاصل رہیں گے۔ زہی سعادت! اور ان کو ان کی حنیفیت کے درختِ طوبیٰ کا اعلیٰ سے اعلیٰ پھل

حاصل رہے گا۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ﴾ اہل جنت کے لئے سب سے بڑی نعمت بلکہ تمام حسی ومعنوی نعمتوں کا سر چشمہ رضاء الٰہی ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ [التوبة: ۷۲] (اور اللہ کی رضا سب سے بڑی چیز ہے) یہ وہ نعمت عظمیٰ ہے کہ جس کے حصول کے بعد کسی قسم کی سخط وناراضگی کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ اس نعمت کے حصول کی خاطر اہل حق نے زندگیاں وقف کر کے تمام دنیوی نازونخروں اور عیش وعشرتوں سے بائیکاٹ اور بغاوت کر کے شب وروز کی زندگی کو زندان بنا کر جدوجہد کی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ربّ العزّت جل شانہ اہل جنت سے خطاب فرمائیں گے، تو جنتی لوگ لبیک کہتے ہوئے جواب دیں گے، تو ارشاد ہوگا کیا تم لوگ راضی ہو؟ اہل جنت عرض کریں گے: اے ہمارے ربّ! کیا اب بھی ہم راضی نہیں ہوں گے؟ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ عطا فرمایا جو اور کسی مخلوق کو نہیں ملا، ربّ العلمین جل شانہ کا ارشاد ہوگا: کیا میں تم کو اس سے بھی افضل اور بہتر نعمت نہ دوں؟ جنتی عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوگی؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں تم پر اپنی رضا نازل کرتا ہوں، آئندہ کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ [متفق عليه]

حدیث بالا میں مذکور ہے کہ اہل جنت سے ربّ العلمین جل شانہ پوچھیں گے: أَرَضِيتُمْ؟ یعنی کیا تم راضی ہو؟ اور اس آیت کریمہ میں خبر دی گئی کہ اہل جنت اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے۔ ﴿وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ یہاں رضا سے مراد یہ ہے کہ بندہ کی ہر آرزو اور مراد پوری ہو، اور اس کی کوئی تمنا باقی نہ رہے، اس مقام پر رضا سے یہی مراد ہے، اور سورۂ ضحیٰ میں آیت: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ [الضحى: ۵] (اور جلد ہی آپ کا پروردگار آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں) میں بھی غایتِ تمنا کا پورا کر دینا ہی مراد ہے، اسی لئے اس آیت کے نزول پر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ پھر تو میں اپنے ربّ سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک میری امت کا ایک شخص بھی دوزخ میں باقی رہے گا۔ [مظهري] اس مضمون کی تفصیل سورۃ الضحیٰ کے فوائد میں دیکھی جائے۔

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ﴾ یہ اعزاز واکرام دخولِ جنت اور رضائے الٰہی جل شانہ کا حصول وغیرہ اس شخص کو حاصل رہے گا جو خشیتِ ایزدی کے سرمایہ سے منسلک اور وابستہ ہو، یہ خشیتِ الٰہی وہ عظیم نعمت ہے کہ جس پر تمام ابدی سرمدی نعمتوں کا دار مدار ہے۔ خشیت غیر اختیاری اور طبعی خوف کو نہیں کہتے جو کسی دشمن یا درندہ یا موذی چیز کی وجہ سے

پیش آئے، بلکہ خشیت اس اختیاری عقلی خوف کو کہتے ہیں جو کسی انتہائی محبت وعظمت کی وجہ سے پیدا ہو جس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کی رضا جوئی کی ہمہ ہر وقت فکر دامن گیر ہو، اور اس کی ناراضگی کے اندیشہ سے بچتا رہے، یہی خشیت مؤمن بندہ کو کامل ومقبول بارگاہ ایزدی بنا دیتی ہے۔ اللّٰھم ارزقنا وجمیع المؤمنین۔ اٰمین

سید عبدالستار شاہ

۲۰ رجب ۱۴۳۲ھ مکۃ المکرمۃ

سُورَةُ الزِّلْزَالِ

مدنيةٌ آياتها ۸ ركوعها ۱

سورۂ زلزال مدنی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الزلزال ہے، اس کی وجہ تسمیہ پہلی آیت سے ماخوذ ہے، اور سورۃ الزلزلۃ بھی اس کا نام ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت آٹھ (۸) آیات، پچیس (۲۵) الفاظ اور ایک سو انچاس (۱۴۹) حروف پر مشتمل ہے۔

نزول:

اس سورت کا نزول سورۃ النساء کے بعد ہے۔ قتادہ ومقاتل اس کو مکی سورت کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، عطاء رضی اللہ عنہم اور جمہور علماء ومفسرین کے نزدیک یہ سورت مدنی ہے، اور اس کا نزول سورۃ النساء کے بعد ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جمہور کے قول کی تائید میں ابن ابی حاتم کی روایت کردہ ایک حدیث پیش کی ہے، جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب اس سورت کی آخری آیت: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ نازل ہوئی تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اپنا ہر ایک عمل دیکھوں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! میں نے عرض کیا: بڑے بڑے بھی؟ فرمایا: ہاں! میں نے عرض کیا: چھوٹے بھی؟ فرمایا: ہاں! میں نے کہا: ہائے میری ماں مجھ کو گم

کردے! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خوش ہو جاؤ اے ابوسعید! کیونکہ ہر نیک عمل دس گنا بڑا ہوتا ہے۔
[الحدیث]

اس روایت سے سورت کی مدنیت پر استدلال کیا جاتا ہے، کیونکہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ مدنی انصاری صحابی ہیں، آپ کا شمار صغار الصحابہ میں ہوتا ہے، اور غزوۂ احد کے بعد وہ بلوغ کو پہنچے ہیں، کیونکہ ان کی وفات ۷۴ھ میں چوراسی سال کی عمر میں ہوئی ہے، تو حدیث مذکور کے واقعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔

ربط و مناسبت:

سورۃ البینۃ میں مؤمنوں اور کافروں کی جزا و سزا کا بیان تھا، اس سورت میں اس سزا و جزاء کے وقتِ وقوع اور کیفیت (وزنِ اعمال وغیرہ) کا بیان ہے۔

فضیلت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۃ الزلزال نصف قرآن کے برابر ہے، اور قل هو الله أحد ایک تہائی قرآن کے برابر ہے، اور قل يا أيها الكفرون ایک چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔ [ترمذي، بغوي، مظهري]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ① وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ② وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ③
يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ④ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ⑤ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِيُرَوْا
أَعْمَالَهُمْ ⑥ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ⑦ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ⑧

ترجمہ: جب زمین کو سخت بھونچال سے ہلایا جائے گا ① اور زمین اپنے دفینے نکال پھینکے گی ② اور انسان کہے گا کہ اسے کیا ہو گیا؟ ③ اس دن وہ اپنی خبریں بتائے گی ④ اس وجہ سے کہ آپ کا رب اس کو یہی حکم دے گا ⑤ اس دن لوگ مختلف گروہ بن کر واپس ہوں گے، تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں ⑥ سو جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ

اس کو دیکھ لے گا⑦ اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا⑧

معارف ومنازل

قرآن وحدیث کے بے شمار نصوص سے تخریب عالم (قیامت) کی ہولنا کیوں اور سختیوں کو زلزلہ سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ اس محکم ومنظم، مضبوط ومعمور عالم کو چشمِ زدن اور مختصر وقت میں زیر زبر اور تہہ وبالا کرنا سوائے ایک حیران کن اور خوفناک زلزلے کے کیسے ممکن ہوگا؟ اور یہ بات طے شدہ ہے کہ قیامت کا ہولناک زلزلہ برے لوگوں پر آئے گا، ایسے وقت پوری دھرتی (کرۂ ارض) پر کوئی ایک شخص ''اللہ'' کہنے والا موجود نہ ہوگا۔

اس میں لوگوں کے اقوال مختلف ہیں: شیخ ابن عربی، مجاہد، عطیہ اور دیگر حضرات کہتے ہیں کہ یہ خوفناک زلزلہ نفخة أولیٰ سے پہلے ہوگا، اور اس کا شمار علاماتِ قیامت میں ہے۔ امام حلیمیؒ اور دیگر بہت سے محققین ومفسرین کہتے ہیں کہ یہ زلزلہ نفخة ثانية کے بعد ہوگا، جب سارے مردے زمین سے اٹھیں گے۔ دیگر علماء یہ کہتے ہیں کہ قربِ قیامت کے زلزلے متعدد ہوں گے، کبھی نفخۂ اولیٰ کے ساتھ اور کبھی نفخۂ ثانیہ کے ساتھ۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے قولِ اول کو، اور حضرت قاضی ثناء اللہؒ نے قولِ ثانی کو ترجیح دی ہے، اور ہر ایک نے اپنے قول کو دلائل وقرائن سے ثابت کرنے کی سعی فرمائی ہے۔

﴿اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا﴾ جب زمین کو زور دار حرکت کے ساتھ ہلایا جائے گا۔ مراد پوری زمین ہے۔ ﴿وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا﴾ اور زمین اپنے بوجھوں کو باہر نکال پھینکے گی۔ ربّ العزّت کا حکم اتنا شدید اور فیصلہ کن ہوگا کہ جس طرح کسی شیشے کے سامان سے بھرے ہوئے برتن کو زور دار حرکت سے ریزہ ریزہ کیا جائے، تو اس کے اندر کے سامان بکھر کر باہر گریں گے اور منتشر ہو جائیں گے، تو وہاں زمین کی یہی کیفیت ہوگی کہ اس میں ہزاروں مدفون دفینے، ہزاروں معدنیات، قیمتی اشیاء، کھربوں، پدموں مدفون انسان، یہ سارے باہر آجائیں گے اور ہزاروں سربستہ پوشیدہ رموز واسرار ظاہر ہو جائیں گے۔

أثقال سے کیا مراد ہے؟

ثقل کے معنی بوجھ، سامان وغیرہ کے ہیں، اگر زلزلہ سے مراد نفخۂ اولیٰ والا زلزلہ ہو، تو اثقال سے مراد زمین کے اندر کے خزانے اور دفینے ہوں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

زمین اپنے جگر کے ٹکڑے سونے چاندی کی بڑی بڑی چٹانوں کی شکل میں اگل دے گی۔

اس وقت قاتل انہیں دیکھ کر کہے گا: ہائے! میں نے اس کے لیے قتل کیا تھا؟ قطع رحمی کرنے والا کہے گا: ہائے! میں نے اس کی وجہ سے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا تھا؟ اور چور دیکھ کر کہے گا: ہائے! میں نے اس کی خاطر ہاتھ کٹوایا تھا؟ پھر کوئی اس سونے کی طرف نہیں دیکھے گا۔ [مسلم، ترمذي]

بخاری اور مسلم نے یہ حدیث تخریج کی کہ عنقریب فرات (بغداد کا دریا) سے بہت سا سونا برآمد ہوگا، اگر کوئی شخص وہاں موجود ہو تو اس میں سے کچھ نہ لے۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ قیامت بپا نہ ہوگی جب تک نہر فرات سونے کا پہاڑ برآمد نہ کر دے گی، اور اسی سونے پر لوگ ایک دوسرے کو قتل کریں گے، یہاں تک کہ سو (۱۰۰) میں سے ننانوے مر جائیں گے، صرف ایک بچے گا، وہ ایک کہے گا کہ: شاید میں ہی ایک بچ گیا ہوں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں اس سونے پر قتال وغیرہ ہوگا، پھر اخیر میں سب کو اس سے نفرت و بیزاری ہو جائے گی، اور کوئی بھی اس کو نہ لے گا۔ واللہ اعلم

یہاں تک اس تقدیر سے واضح ہوا کہ زلزلہ سے وہ عام زلزلہ مراد ہو جو نفخۂ اولیٰ کے ساتھ ہوگا جو اکثر و بیشتر فزع أکبر سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، جسے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے راجح بتایا ہے، فتدبر۔

قوله تعالیٰ: ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ﴾ [الحج: ۱] (قیامت کا زلزلہ ایک حادثۂ عظیم ہوگا)۔

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ زلزلہ نفخۂ ثانیہ کے بعد ہوگا، وہ حضرات أثقال سے مراد مدفون مردے مراد لیتے ہیں، جیسے سورۂ یٰس میں ارشاد ہے: ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ﴾ [یٰس: ۵۱] (اور جس وقت صور پھونکا جائے گا یہ قبروں سے (نکل کر) اپنے پروردگار کی طرف دوڑ پڑیں گے)، یعنی نفخۂ ثانیہ کے بعد زمین مردوں کو باہر نکال کر پھینک دے گی (یعنی قبروں میں مدفون لوگوں کو)۔

بعض علماء نے کہا کہ أثقال سے مراد وہ اسرار اور پوشیدہ مخفی چیزیں ہیں جو ابھی ظاہر نہیں ہیں، اس وقت ظاہر ہوں گے، جیسے سورۃ الطارق میں ارشاد ہے: ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝﴾ [الطارق] (جس دن دلوں کے بھید جانچے جائیں گے)۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ أثقال سے مراد خیر و شر کی گواہی ہے، اس روز زمین ہر خیر و شر کی گواہی دے گی، جیسے کہ حدیث میں ہے کہ زمین پر اچھا برا عمل جو بھی ہوا ہے وہ قیامت کے دن اس کی گواہی دے گی۔

مگر سب سے بہتر یہ ہوگا کہ أثقال اپنے عموم میں استعمال ہو، تاکہ خزائن، دفینے، معدنیات، اسرار، شہادات اور مردے سب کو شامل ہو، کیونکہ جب قرآن حکیم نے کوئی تخصیص نہیں فرمائی تو ہم کو اس میں کسی تخصیص کی کیا ضرورت؟ لہٰذا عموم والے معنی مناسب رہیں گے۔ واللہ اعلم

﴿وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا﴾ یعنی کافر انسان منکر قیامت یہ صورت حال دیکھ گھبراہٹ کے عالم میں کہے گا: یہ کیا ہوا؟ وہ تعجب اور حیرانی کے عالم میں یہ کہے گا، کیونکہ اُسے نہ قیامت کا یقین تھا اور نہ آنے والی دوبارہ زندگی کا، جب وہ یہ سب کچھ یکا یک سامنے مشاہدہ کرے گا تو پریشانی کے عالم میں حواس باختہ ہو کر کہے گا: ہائے! یہ کیا ہو گیا اور کیوں کیسے ہو گیا؟ مؤمن کو ایسے کہنے کی کیا ضرورت؟ وہ ساری زندگی اسی قیامت کے آنے کا رٹ لگا تا رہا اور انتظار کرتا رہا۔

مؤمن اپنے ایمان اور قیامت پر یقین کی بنیاد پر یہ کہے گا: ﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ [یٰس: ۵۲] (یہ وہ قیامت ہے جس کے متعلق رحمٰن جل شانہ نے وعدہ فرمایا، اور پیغمبروں نے سچ کہا) کہ آنے والی زندگی ابدی اور دائمی ہے، جو قیامت کے آنے پر شروع ہو جاتی ہے۔

﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا﴾ اس روز زمین وہ سب کچھ بیان کرے گی جو اچھا یا برا عمل اس پر کیا گیا۔ قرآن کریم کی عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے، اصل عبارت یوں ہے: یومئذ تحدث أخبارها وقال الإنسان مالها۔ (جب زمین سب کچھ خبریں بیان کرے گی تو کافر ناامیدی اور بدحواسی کے عالم میں کہے گا کہ اس زمین کو کیا ہو گیا کہ اس نے سب ہی کچھ بیان کیا)۔

زمین کیسی بولے گی؟

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: تم لوگوں کو معلوم ہے کہ زمین کی خبریں کیا اور کیسی ہوں گی؟ صحابہ نے عرض کیا: اللّٰہ ورسوله اعلم، تو آپ نے ارشاد فرمایا: اس کی خبریں اس طرح ہوں گی کہ جس بندہ یا بندی (مرد، عورت) نے زمین پر جو کچھ اچھا یا برا کیا ہوگا، روز قیامت زمین اس کی گواہی دے گی۔ (ترمذی، نسائی، احمد ابن حبان وغیرہ)

اسی طرح حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمین سے تم لوگ احتیاط رکھو! یہ تمہاری ماں ہے، جس شخص نے اس پر اچھا یا برا کام کیا ہوگا وہ قیامت کے روز ضرور اس کی خبر دے گی۔

[طبراني كبير] کتب فقہ میں جو یہ لکھا ہے کہ عیدین کی نماز کے لئے جاتے وقت آنے جانے کے راستے میں تبدیلی مسنون ہے، اسی طرح فرائض نماز وسنن نوافل کی ادائیگی میں جگہ تبدیل ہو تو مستحب ہے، یہ سارے اسی مقصد کے لئے تا کہ زمین کے بہت سے راستے یا حصے قیامت کے دن نمازی کے لئے گواہی ادا کریں۔

موجودہ زمانے میں سطحی عقل والے روشن خیال قسم کے لوگ جنہیں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں وہ بیچارے اللہ تعالیٰ جل شانہ سے اتنے دور اور اس کی معرفت وصفات اتنے ناواقف رہتے ہیں کہ انہیں قرآن حکیم کے ہر فرمان اور اسلام کے اکثر وبیشتر احکام پر شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں، اس قسم کے مغرب زدہ بیمار ذہنیت والے اعتراض کرتے ہیں کہ بے جان وبے زبان زمین کیسے اور کس طرح بول بول کر لوگوں کے حق میں یا ان کے خلاف گواہی دے گی؟

انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جب ربّ العزّت جل شانہ ہر چیز پر قادر ہے تو وہ قادرِ مطلق بے جان وبے زبان چیزوں میں قوت گویائی پیدا فرمائے گا، ایک قطرۂ آب سے انسان کو بنا کر عجیب عقل وقوت گویائی سے نوازنے والا ربّ اگر زمین کے ذرات، پتھروں، درختوں، چیونٹیوں، جانوروں اور دیگر بے زبان مخلوقات میں قوتِ کلام پیدا کرے، تو یہ کونسا مشکل کام ہوگا؟ آج کل تو ریڈیو اور موبائل پلاسٹک اور اسٹیل بھی بول رہے ہیں، اور یہ کوئی بعید نہیں، مگر جب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل نے یہ سب کچھ بنا دیا تو خالق کائنات براہ راست بغیر انسانی ایجاد کے اگر جمادات، نباتات یا حیوانات میں قوت گویائی پیدا کرے، تو کوئی استبعاد نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر ہر چیز کو ایک روح عطا فرمائی ہے، وہ ہر چند اس میں معلوم ومحسوس نہیں ہوتی، مگر اشیاء کا وجود اور بقاء ودوام خود بخود اس پر گواہ ہے، وہ ارواح غیر مرئی اور مختلف ہیں، بلکہ سائنسدانوں کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ بعض درختوں، بوٹیوں اور سبزیوں میں وہ روح صاف صاف محسوس ہوتی ہے اور اس پر ان مخلوقات کی نشوونما واضح طور پر موقوف ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء کرام کی کرامات میں خرق عادت کے طور پر یہی غیر مرئی ارواح موجود ہیں۔ ایک پہاڑ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جا رہے تھے، پہاڑ نے حرکت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر قدم (پاؤں) مار کر کہا: رک جاؤ! تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید چل رہے ہیں (کھڑے ہیں)۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر خطبہ ارشاد فرمایا، تو درخت کا خشک تنہ (لکڑی) نے آہ وبکا شروع کر دی، جسے سن کر سارے

لوگ ششدر رہے۔ مولانا رومیؒ نے پورے واقعہ کو مثنوی میں نظم کے ساتھ (اصل واقعہ صحیحین وغیرہ کتب حدیث میں ہے) لکھا ہے: ؎

استن حنانہ از ہجر رسول ☆ نالہ میزد ہمچو ارباب عقول
درمیان مجلس وعظ آنچنان ☆ کز وے آگاہ گشت ہر پیر و جوان
گفت پیغمبر چہ خواہی اے ستون ☆ گفت جانم از فراقت گشت خون
مسندت بودم تو از من تاختی ☆ بر سر منبر تو مسند ساختی ...... الی آخر

حضور انور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم غار حراء سے مکہ مکرمہ اور مکہ سے غار حراء جاتے تو راستے میں شجر و حجر آپ کو سلام کرتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام جنگل میں جب زبور پڑھتے یا ذکر کرتے تو پہاڑ، پتھر، درخت، سبزہ، پرندے، سارے ہم کلام ہو کر تسبیح و تہلیل شروع کرتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ چیونٹی کی گفتگو قرآن حکیم کی سورۃ النمل میں مذکور ہے، اُس سورۃ کا نام ہی نمل ہے، یعنی ''چیونٹی''۔ حدیث شریف میں ہے کہ پہاڑ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں، تو ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ آج کسی اللہ والے کا تمہارے اوپر سے گزر ہوا یا نہیں؟ دوسرا پہاڑ اسی کے مطابق اس کو جواب دیتا ہے، (اثبات و نفی میں)۔ تو قیامت کے روز زمین کے مختلف حصوں کا مختلف انسانی اعمال پر گواہی دینا عقلاً و نقلاً ثابت ہے، کوئی عقلمند اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ ہاں! کفر و عناد اور ہٹ دھرمی و مکابرت کا نہ کوئی جواب ہے اور نہ اس مرض کا علاج ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ زمین کو حس و ادراک اور زبان عطا فرمائے گا، پس وہ ہر چیز پر گواہی دے گی۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرامین کو عقل کے ترازو میں تولنے کی کوشش کرتے ہیں وہ نہایت کمزور درجے کے بے عقل ہیں، آج تک انہیں اپنے وجود کی حقیقت کا پتہ نہیں، یہ عقل ایک حد تک ضرور راہنمائی کرسکتی ہے، مگر مغیبات اور خارقِ عادت چیزوں کی معرفت سے عاجز ہے، جو چیزیں وحی الٰہی کے توسط سے معلوم ہوسکتی ہیں وہاں تک عقل کی رسائی کی کوئی گنجائش نہیں، یہی وجہ ہے کہ انسانی عقل سعادت و شقاوت کے تعین سے جاہل اور قاصر ہے، تب ہی تو وحی کی اشد ضرورت و احتیاج ہے۔

﴿بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا﴾ کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا۔ اس کی پوری تفصیل وحی الٰہی

کے بیان (سورۃ الفاتحہ) کے ضمن میں گزر گئی، وہاں دیکھا جائے۔ یہاں وحی بمعنی حکم کے ہے کہ آپ کے رب زمین کو بولنے اور اندر کے خزانے دفینے یا مردے نکال باہر کرنے کا حکم دیا ہے، اور کشف اسرار زمین کی شہادت اور حساب و کتاب کے مراحل طے پائیں گے، تو مختلف اعمال کے اعتبار سے میدانِ محشر کے لوگ مختلف و متفرق ہوں گے، جیسے کہ: ﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ [التکویر:۷] کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ پس جزاء اعمال کے لیے لوگ مختلف درجات متفرق طبقات اور مختلف گروہوں میں مختلف راستوں سے یمین وشمال، دائیں بائیں، یعنی سعادت وشقاوت کے درجات میں لوٹا دیئے جائیں گے۔

﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ﴾ اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھا دیئے جائیں۔ اس دن لوگ متفرق طور پر لوٹیں گے، کچھ دائیں طرف جنت کو جائیں گے، کچھ بائیں سمت جہنم رسید ہوں گے، اسی کے ساتھ دائیں بائیں ہاتھوں میں نامہ اعمال کا بھی فیصلہ ہوگا، اور سارے مخفی امور آمنے سامنے مشاہدہ کی شکل اختیار کریں گے۔

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ کہ نہایت قلیل اور چھوٹی سے چھوٹی نیکی، اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی سامنے آجائے گی، اور انسان ان کو اپنے سامنے مجسم پائے گا، یا اس کی سزا و جزاء اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے گا۔

جس طرح دوسری آیت میں فرمایا: ﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ﴾ [الحاقة:۱۸] (جس روز تمہاری پیشی ہوگی تمہارے سارے اعمال لکھے ہوئے دفتروں میں پیش کئے جائیں گے، کوئی ذرہ بھر عمل بھی پوشیدہ نہیں رہے گا) کیونکہ کائنات کا کوئی ذرہ اللہ تعالیٰ علیم بذات الصدور کے علم محیط سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا، اور دوسری طرف سے: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝۱۱ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۱۲﴾ [الانفطار] (حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں عالی قدر (تمہاری باتوں کے) لکھنے والے جو تم کرتے ہو، وہ اسے جانتے ہیں)۔ یعنی ہمارے انصاف والے امانتدار غیر جانبدار فرشتے تمہارے ہر صغیر و کبیر اچھے برے اعمال کو اپنے دفتروں میں نہایت احتیاط کے ساتھ درج کرتے ہیں، اور روز قیامت انہیں کھول کر پیش کریں گے۔

ان کے دفتروں کے مندرجات دیکھ کر نافرمان بلا اختیار چیخ کر کہے گا: ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ

صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ [الکہف:۴۹] (اور کہیں گے: ہائے شامت! یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے، اور جو عمل کئے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے، اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا)۔

کشف اسرار کے ساتھ مشاہدہ اسرار ہی ہوگا، موجودہ زمانے کے ٹیلیویژن کی طرح ساری زندگی کی ریکارڈ شدہ مووی من وعن دکھادی جائے گی، جس کے مندرجات اتنے خوش کن یا تباہ کن ہوں گے کہ کسی بھی ذرہ عمل سے چشم پوشی نہیں ہوگی، اور نہ کسی انکار کی گنجائش ہوگی، پس پاکیزہ ہے وہ ذت واحد لاشریک جس نے ہر شخص وہر فرد کے اعمال کا ریکارڈ محفوظ رکھا، اور روزِ قیامت بلاکم وکاست مشاہدہ کی صورت میں مووی چلا کر سب کو ان کے اعمال کی پوری شکل وصورت اور تفصیل پیش فرمائیں گے، نیک آدمی اپنی نیکیوں کا آنکھوں سے مشاہدہ کررہا ہے، اور کافر اپنے کفر و فجور کا آنکھوں سے نظارہ کررہا ہے، ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ﴾ [الکہف: ۴۹] (اور وہ اپنے کیے ہوئے اعمال کو حاضر پائیں گے) کا منظر سب کے سامنے ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ [الملک: ۱۴] (بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے؟ وہ تو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا اور (ہر چیز سے) آگاہ ہے)۔

ایک ضروری وضاحت:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ میں "مَنْ" کا عموم وخصوص:

بعض علماء کرام ومفسرین حضرات نے دونوں آیتوں میں تأویل کے درجے پر کلمہ "مَنْ" میں دو وجہ بیان کی ہیں، اسی طرح مابعد کے خیر وشر میں عموم اور خصوص کا امکان بھی ہے، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کو اس کی نیکیوں کا ثواب ملے گا، حالانکہ عام فیصلہ یہ کہ ایمان کے بغیر کوئی نیک عمل کارآمد نہیں اور کفار کے نیک اعمال ﴿هَبَاۗءً مَّنْثُوْرًا﴾ [الفرقان:۲۳] (گرد وغبار کی طرح نیست ونابود ہوجاتے ہیں) جب کافر اپنی بڑی نیکیوں کا اجر وثواب آخرت میں نہیں پائے گا، تو ذرہ برابر کا عمل کسی شمار میں نہیں ہوگا۔

شرح مقاصد اور دیگر بہت سی کتابوں میں واضح طور پر لکھا ہے کہ کافر کے سارے اعمال ایمان اور اخلاص کے نہ ہونے کی وجہ سے بے جان وبے روح ہوکر گرد وغبار کی طرح فنا ہوجائیں گے، اور یہ بھی ہے کہ اس پر علماء امت کا اجماع منعقد ہوچکا ہے، نیز بہت سی نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں مثلاً: ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا

مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰهُ هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا﴾ [الفرقان: ۲۳] (اور جوانہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے، توان کو اُڑتی خاک کردیں گے)۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَيۡسَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ﴾ [هود: ۱٦] (یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتش (جہنم) کے سوا کوئی چیز نہیں، اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کئے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے رہے سب ضائع ہوجائیں گے)۔

﴿مَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ اَعۡمَالُهُمۡ كَرَمَادِ ۨاشۡتَدَّتۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ يَوۡمٍ عَاصِفٍ﴾ [ابراھیم: ۱۸] (جن لوگوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال راکھ کی سی ہے کہ آندھی کے دن اس پر زور کی ہوا چلے)۔

اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کفار کے نیک اعمال کی وجہ سے ان کے عذاب میں کوئی تخفیف ہوجائے گی، کیونکہ: ﴿لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ﴾ [البقرة: ۱٦۲] (اس میں نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہوگا، اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی)۔

﴿زِدۡنٰهُمۡ عَذَابًا فَوۡقَ الۡعَذَابِ﴾ [النحل: ۸۸] (ہم نے عذاب پر عذاب بڑھایا)۔

﴿فَذُوۡقُوۡا فَلَنۡ نَّزِيۡدَكُمۡ اِلَّا عَذَابًا﴾ [النبأ: ۳۰] (اب چکھو کہ ہم تمہیں نہ بڑھائیں گے مگر عذاب)۔

ان جیسی نصوص میں تصریح ہے کہ کفار کے عذاب میں کوئی تخفیف نہیں ہوگی، نتیجہ ظاہر ہے کہ جب کفر کی وجہ سے اعمال بیکار ہوئے، تو تخفیف کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ دوسری بات یہ بھی معلوم ہے کہ: ﴿اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [هود: ۱۱۴] (صغیرہ گناہ وضو، نماز، ودیگر طاعات سے معاف ہوکر ختم ہوجائیں گے) اور ﴿اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبٰٓئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نكفر﴾ [النساء: ۳۱] (اگر بچتے رہو کبیرہ گناہوں سے جن کی تمہیں ممانعت ہے تو تمہارے اور گناہ ہم بخش دیں گے) جیسی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کبائر سے اجتناب مکفر للصغائر ہے۔

اس سلسلے میں دفع شبہات اور حقیقت مسئلہ کچھ یوں ہے کہ ﴿يَصۡدُرُ النَّاسُ﴾ کے اجمال کا مطلب یہ تھا کہ لوگ میدانِ محشر سے اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹے جائیں گے، ﴿فَرِيۡقٌ فِى الۡجَنَّةِ وَفَرِيۡقٌ فِى السَّعِيۡرِ﴾ [الشوریٰ: ۷] (ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ جہنم میں) بعد میں تفصیل بھی اسی کے مطابق ہے کہ پہلے مَنۡ خاص ہے، سعداء جنتیوں کے لیے، وہ ذرہ برابر اپنی نیکیاں دیکھ لیں گے، اور دوسرے مَنۡ خاص ہے اشقیاء اور

دوزخیوں کے ساتھ، وہ ذرہ برابر اپنی بدی بھی دیکھ لیں گے، اس طرح ہر فقرہ کا تعلق ایک فرقہ کے ساتھ ہوگا، اور تفصیل واجمال دونوں ایک دوسرے کے موافق ہوں گے، اور کسی قسم کا شبہ نہیں رہے گا۔

دوم جواب یہ ہے کہ مَنْ مؤمن وکافر دونوں کے لیے عام ہے، مگر یہ کلام ایک مقدر قید کے ساتھ مقید ہے، تو اصل کلام اس طرح ہوگا: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ اِنْ لَّمْ یُحْبِطْ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ اِنْ لَّمْ یُکَفِّرْ۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ مَنْ کے عموم کے ساتھ رؤیت کا عموم بھی ملحوظ ہے کہ یہ رؤیت عام ہے، دنیوی اور اخروی دونوں کو شامل ہے، کیونکہ مؤمن اپنے شر اور برے اعمال کی سزا دنیا میں بھگت لیتا ہے (بیماریوں، غموں، پریشانیوں کی شکل میں) اور اعمال خیر کی جزا آخرت میں اس کو مل جائے گی، اور کافر اپنے اعمال خیر کی جزاء دنیا میں (بشکل صحت تندرستی مال وغیرہ) دیکھ لیتا ہے، اور اعمال شر کی سزا آخرت میں دیکھ لے گا، اس طرح مؤمن وکافر سب اپنے اپنے اعمال خیر وشر کو خواہ وہ ذرہ برابر کیوں نہ ہوں دنیا یا آخرت میں دیکھ لیں گے۔ امام بغوی، ابن جریر اور ابن منذر نے محمد بن کعب قرظیؒ سے ان آیتوں کی یہی تفسیر نقل کی ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ یہ دونوں آیتیں: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ...﴾ اسی حالت میں نازل ہوئیں۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کھانا چھوڑ دیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے جو ذرہ برابر بدی کی ہوگی، اس کو بھی دیکھ لوں گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! اب دنیا میں جو غم و پریشانیاں اور مصائب دیکھتے ہو یہ ''ذرات'' شر ہی کی وجہ سے ہے، اور ''ذرات'' خیر کے مثاقیل آپ کے لئے ذخیرہ ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کا آپ کو پورا پورا بدلہ عطا فرمائے گا۔

ایک روایت حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ فرمایا: تم میں سے جو خیر کا عمل کرے گا تو اس کی جزاء آخرت میں ملے گی، اور جو شر کا عمل کرے گا اس کا بدلہ دنیا میں مصائب و امراض کی شکل میں مل جاتا ہے، اور جس میں ایک ذرہ بھی خیر ہوگا وہ جنت میں جائے گا۔

علامہ سید آلوسی رحمۃ اللہ علیہ روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ مَنْ کو بھی اس کے معنی عام پر رکھا جائے، اور رؤیت سے جزائے اعمال کا مشاہدہ مراد لیا جائے یہی زیادہ ظاہر ہے، اور اس میں کوئی اشکال بھی نہیں، کیونکہ پہلے فقرہ میں

خَیْرًا یَّرَہٗ وعدہ ہے، اور دوسرے فقرہ شَرًّا یَّرَہٗ میں وعید ہے، اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ وعدہ پورا کر رہے گا، ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ [الرعد: ۳۱] (بیشک اللہ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا) اور وعید کا تحقق ضروری نہیں۔

حاصل یہ ہوا کہ خیر کے اعمال بھی سب کے سامنے آجائیں گے، اس میں مؤمن کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ اس کو جزا ملے گی، رہا کافر کا معاملہ، تو احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی، چنانچہ حاتم طائی مشہور سخی (مذہباً عیسائی تھے) کے عذاب میں اس کی سخاوت کی وجہ سے، اور ابولہب کے عذاب میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خوشی میں ''ثویبہ'' نامی باندی کو خوشخبری سنانے کی وجہ سے آزاد کیا، اور ابوطالب کے عذاب میں تخفیف سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی وجہ سے روایات صحیحہ سے ثابت ہے، اور آیت: ﴿لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ﴾ [البقرۃ: ۱۶۲] (ان پر سے عذاب ہلکا نہ ہوگا) سے مراد عذاب کفر ہے کہ قابل تخفیف نہیں ہے، اور جو تخفیف زیرِ بحث ہے اس کا اعمالِ کفر کے عذاب سے تعلق ہے، اور کفار کے نیک اعمال کے حبط ہو جانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کے اعمال ان کو دائمی عذاب سے نجات دلا نہ سکیں گے، کیونکہ کفار جب معاملات و جنایات (عبادات نہیں) کے بالاتفاق مکلف ہیں اور مکلف ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ان اعمال کے کرنے پر فائدہ و ثواب ہو، اور نہ کرنے پر عذاب ہو؟ اور ثواب کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عذاب میں تخفیف ہو۔

اب رہے ان کے اعمالِ شر، تو کفر معاف نہیں ہوگا، اور جو مؤمن کبائر سے بچتا ہے اس کے صغائر معاف ہیں، اور مؤمن کے کبائر اور ایسے مؤمن کے صغائر جو کبائر سے نہ بچتا ہو، تحت المشیئۃ ہیں، ﴿وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ [النساء: ۱۱۶] (اور شرک کے علاوہ معاف کرے گا جس کے لیے چاہے)۔ اور حضرت انس و حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہما کی مذکورہ احادیث میں اگر غور کیا جائے تو اس مذکورہ تقریر و بیان کے خلاف نہیں ہیں۔ علامہ شہاب الدین خفاجی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بیضاوی میں بھی اسی تفسیر کو سراہا اور پسند کیا ہے۔ [روح المعاني]

شانِ نزول اور فوائد:

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب آیت ﴿وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ﴾ [الانسان: ۸] (اور وہ اللہ کی محبت کی خاطر کھانا کھلاتے ہیں) اتری تو مسلمان یہ سمجھے کہ تھوڑی حقیر چیز دینے میں ثواب نہیں ملے گا، اس لئے جب ان کے دروازوں پر مسکین آتا اور کوئی بہتر اور اہم چیز موجود نہ ہوتی تو ایک آدھ کھجور یا چھوارہ نہ

دیتے (کیونکہ اس حقیر چیز میں ثواب نہ سمجھتے)، بلکہ سائل محتاج کو خالی ہاتھ واپس کرتے اور کہتے کہ ہم کو اس حقیر چیز دینے پر ثواب نہیں ملے گا، اگر ثواب کا وعدہ ہے تو اس سے بہتر چیز کے دینے پر جس سے ہمیں محبت ہو اور وہ چیز ہمارے پاس موجود دستیاب نہیں ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ یہ خیال کرتے کہ معمولی گناہوں (صغائر) پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ شانہ نے صرف کبائر پر عذاب جہنم کی وعید فرمائی ہے تو اس آیت: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ......﴾ نے بتادیا کہ چھوٹی نیکی کو حقیر اور چھوٹے گناہ کو معمولی نہ سمجھو نیکی اور بدی کا ایک ایک ذرہ سامنے آجائے گا۔ اس آیت مذکورہ کے نزول کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قلیل وکثیر جس طرح بھی ممکن ہوا صدقہ کرنے اور چھوٹی سے چھوٹی نیکی کی بڑی قدر کرنے لگے، اسی طرح معمولی سے معمولی صغیرہ گناہ کو بہت خطرناک خیال کرنے لگے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس جب ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسی ہزار درہم بھیجے، تو فوراً اہل مدینہ میں تقسیم فرمادیئے، اور اپنے افطار کے لئے ایک درہم بھی نہیں چھوڑا، باندی کے توجہ دلانے پر فرمایا: پہلے کہہ دیتی تو ایک آدھ درہم افطار کے لئے رکھ بھی لیتے، اور بعض اوقات سائل کو انگور کا ایک دانہ بھی دیدیا، اور جب عرض کیا گیا کہ اتنی معمولی چیز کیوں دے رہی ہیں؟ تو فرماتیں کہ یہ بہت سے ذرات سے بھی وزنی ہے، اور اسی آیت کی تلاوت فرماتیں۔

اسی قسم کی روایات حضرت عمر فاروق، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہیں۔ غالباً! ان حضرات کا مقصد دوسرے لوگوں کو اس کی تعلیم دینا ہوگا کہ تھوڑے صدقہ اور معمولی نیکی کو حقیر نہ سمجھو (یہی قطرہ قطرہ دریا کی مانند ہے) ہر نیک عمل خواہ ذرہ برابر ہو اس کی قدر کرو، روزِ قیامت یہی آدھ کھجور پہاڑوں کے برابر ظاہر ہوگی، اور ایک مرتبہ سبحان اللہ و الحمدللہ و لا إلٰه إلا اللہ و اللہ أکبر جیسے اذکار سے فضاء بھر جائے گی، جس غریب کو صدقہ کی گنجائش نہیں وہ انہی اذکار سے آخرت کی سعادت حاصل کرے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سائل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ نے اس کو ایک چھوہارہ دیدیا، سائل نے کہا کہ ایک نبی بھی ایک چھوہارہ دے رہا ہے؟ (تعجب کے طور پر کہا، اعتراض مقصود نہ تھا) ارشاد فرمایا: یہ بہت سے ذرات سے وزنی ہے۔ اور حدیث عدی بن حاتم عند البخاری و مسلم میں یہی حکم دیا: اتقوا

النَّارَ وَلَوْبِشِقِّ تَمْرَةٍ۔ (یعنی دوزخ سے بچو خواہ چھوہارہ کا ایک ٹکڑہ صدقہ ہی کرو) پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ [متفق علیہ]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تھوڑی بھلائی کو بھی حقیر نہ سمجھو، خواہ اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہی ہو۔ [متفق علیہ]

الأشياء تعرف بأضدادها اسی طرح کسی معمولی نہایت حقیر گناہ کو قلیل وحقیر نہ سمجھو، کیونکہ آگ کی معمولی چنگاری آبادیوں اور شہروں کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ دانا اور عقلمند لوگوں نے کہا ہے کہ معمولی آگ، معمولی بیماری، معمولی دشمنی، معمولی زبانی لغزش اتنی خطرناک ہوتی ہیں کہ چشمِ زدن میں معمورہ کو تباہ کر کے رکھ دیں گی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم لوگ کچھ ایسے عمل کرتے ہو جن کو بال سے باریک اور حقیر سمجھتے ہو، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم ان کو تباہ کن خیال کرتے تھے۔ [بخاري] پس واضح ہوا کہ اگر کھجور کا صدقہ روزِ قیامت پہاڑوں برابر ثواب کا ذریعہ بنے گا، تو یہی ایک معمولی حقیر گناہ بھی روزِ قیامت پہاڑوں جتنا بڑا معلوم ہوگا، قاله مقاتل وغيره من المشائخ فتذكر۔

واضح ہو کہ گناہوں کا بڑھنا اور پہاڑوں جیسی جسامت اختیار کرنا شاید ایک وعید ہے، اور اس کی کوئی حقیقت نہیں، کیونکہ نیکی کو تو پیارے معبود حقیقی اپنی رحمت کی مٹھی میں لے کر پالتے رہتے ہیں، جس سے اس کی جسامت پہاڑوں جتنی بن جاتی ہے، یہ محض کرم ہے، اور گناہ کو ربّ کریم اسی کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں، تاکہ ظلم کا پہلو نہ ہو، جبکہ ظلم وتعدّی سے ارحم الراحمین ایسا پاک ومنزہ ہے جیسا کہ باقی تمام عیوب سے پاک ومبرا ہے، یہی وجہ ہے کہ قیامت میں جنت کو پر کرنے کی خاطر ایک نئی مخلوق پیدا فرما کر بغیر عمل کے جنت میں داخل فرما کر اسے پر کر دیں گے، مگر دوزخ کی بھرائی کی خاطر ایک نئی مخلوق پیدا کر کے بغیر گناہوں کے اسے دوزخ میں ڈالے، یہ اس کی شان کے خلاف ہے، لہٰذا ایسا نہیں کریں گے، بلکہ انہی جہنمیوں کے بدن اور اجسام کی جسامت بڑھا کر جہنم کو بھر دیں گے۔ واللہ اعلم

دراصل اعمال کا وزن اگر زیادہ یا کم ہوتا ہے تو وہ نفس اعمال کی قلت وکثرت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اخلاص وتقویٰ ہی اصلی معیار ہے، ایک متقی اور مخلص انسان اگر اخلاص کی بناء پر ایک مرغی صدقہ کرتا ہے تو اس کا ثواب اس اونٹ کے ثواب سے کئی درجہ بڑا ہوتا ہے جس کو بغیر اخلاص کے صدقہ کیا گیا ہو، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے صحابہ کا نصف صاع جو کا صدقہ کرنے کا ثواب بعد میں آنے والے لوگوں کے پہاڑوں برابر سونا صدقہ

کرنے کے ثواب سے زیادہ ہوگا۔ [متفق علیہ]

کہاں آدھا صاع جَو اور کہاں پہاڑ برابر سونا کوئی مناسبت ہی نہیں، مگر فرق اخلاص اور تقویٰ ہی کا ہے جو کہ اعمال کی قبولیت کا اصلی اور بنیادی معیار ہے، یہی وجہ ہے کہ ساری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک عمل (غار ثور میں رفاقت) تمام امت کے سارے اعمال پر بھاری ہے، علیٰ ہٰذا القیاس۔ دوسرے ہر قسم کے اعمال اسی قانون وضابطہ کی بنیاد پر شرف قبولیت حاصل کر پائیں گے، کہیں دیکھو کہ ایک شخص کی دوگانہ نماز دوسروں کے ہزاروں رکعتوں پر بھاری ہے۔ واللہ اعلم

عبرت آموز واقعہ:

ایک مسافر کہیں جارہا تھا کسی قبرستان پر لوگوں کا بڑا ہجوم دیکھا، وہاں پہنچ کر دیکھا کہ میت کی تدفین کا عمل مکمل ہو چکا ہے، اس اجنبی مسافر کو دکھ ہوا، ادھر سے ایک دومشت خاک جمع کر کے قبر پر ڈال دی، وہ نہ میت کو جانتا تھا نہ حاضرین کو، یہ سب کچھ للہ فی اللہ کا جذبہ تھا، جب یہ شخص وفات پایا تو اس کی مغفرت ہوئی، پوچھا: میرے کس عمل کی وجہ سے؟ جواب ملا: تم نے اخلاص کی بنیاد پر مشت خاک کسی ناواقف کی قبر پر ڈالی تھی۔ [مرقات شرح مشکوۃ]

سُورَةُ الْعٰدِيٰتِ

مكية آياتها ١١ ركوعها ١

سورۂ عادیات مکی ہے، اس میں گیارہ (۱۱) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ العٰدیٰت ہے، پہلی آیت کے پہلے لفظ سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

حضرت ابن عباس، ابن مسعود، حضرت جابر، حسن بصری، عکرمہ، عطاء رضی اللہ عنہم اور جمہور کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ اور حضرت انس، قتادہ اور امام مالک رضی اللہ عنہم کے نزدیک مدنی ہے، ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایسی ہے۔ اس سورت کا نزول سورۃ العصر کے بعد ہے۔

تعدادآیات، کلمات وحروف:

اس کی گیارہ (۱۱) آیتیں، چالیس (۴۰) کلمات اور ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

سابقہ سورت میں قیامت کی سختیوں کا بیان تھا، اس سورت میں جہاد اور جہادی گھوڑوں کے اوصاف کا بیان ہے جس سے تمام سختیاں اور قیامتی پریشانیاں مجاہدوں کے کارناموں سے دور ہوسکتی ہیں، نیز مِثْقَالَ ذَرَّةٍ کی ایک اعلیٰ مثال کا بیان بھی ہے کہ قیامت کے روز میزانِ اعمال میں جہادی گھوڑوں کا پانی، خوراک اور تیز رفتاری پر اٹھنے والا

گردوغبار اوران کے گوبر، لید اور پیشاب وغیرہ ترازو میں وزن ہوں گے، اور ﴿ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ﴾ کی ایک اعلیٰ مثالی نمونہ کا ظہور ہوگا، نیز گزشتہ سورت میں ﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا﴾ فرمایا، اور اس سورت میں ﴿اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ﴾ ہے، دونوں میں مناسبت ظاہر ہے۔

مختصر موضوع:

شروع میں جہادی گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے، پھر انسان کی ناشکری کا بیان ہے، اور ناشکری کے اسباب کا ذکر اور حبِّ عاجلہ مال ومنال سے محبت کا ذکر اور اس پر تنبیہ ہے، اور محبت مال کے نقصانات اور روزِ قیامت کی پریشانیوں کا اجمالاً تذکرہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۭ﴿۸﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِيْرٌ ۧ﴿۱۱﴾

ترجمہ: ان گھوڑوں کی قسم جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں ① پھر ٹاپ مار کر چنگاریاں اڑاتے ہیں ② پھر صبح کے وقت حملہ کرتے ہیں ③ پھر اس وقت غبار اڑاتے ہیں ④ اور انبوہ میں جا گھستے ہیں ⑤ واقعی انسان اپنے ربّ کا بڑا ناشکرا ہے ⑥ اور وہ اس کی خود خبر رکھتا ہے ⑦ اور یقیناً وہ مال کی محبت میں پکا (مضبوط) ہے ⑧ کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں سے مردے اٹھائے جائیں گے؟ ⑨ اور جو دلوں میں چھپے ہوئے ہیں ظاہر کر دیئے جائیں گے ⑩ بیشک ان کا ربّ ان سے اس دن پورے طور پر خبردار ہوگا ⑪

معارف ومنازل

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کے لئے کسی مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ قسم کھانا صرف اس کی خصوصیت ہے، چنانچہ باری تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں مختلف مخلوقات کی قسمیں کھا کر ان کو مدعا و مطلب کے اثبات وپختگی پر بطور دلیل بیان فرماتے ہیں تاکہ ان قسموں کے ذریعہ بات کو یقینی اور محقق بنایا جائے۔ پھر

جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے وہ چیز دعویٰ کی دلیل اور مضمون کے ساتھ مربوط ہوجاتی ہے، اور مخاطبین ومخالفین پر ان کے عرف کے مطابق حجت قائم کرنے کا اتمامِ حجت واثبات مطلوب کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، جس کے انکار کا خصم کے پاس کوئی حیلہ وبہانہ کارگر نہیں ہوتا، اور وہ اسے ماننے اور تسلیم کرنے پر مجبور اور پابند ہوگا۔ اولین مخاطبین عرب یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ قسم کے بعد یقین نہ کرنا اور بات تسلیم نہ کرنا جرم اور زیادتی ہے، اسی بنیاد کو ملحوظ رکھ کر قرآنی قسموں کو ایک آخری حجت کا درجہ دیا گیا ہے، جس سے انکار وعدم تسلیم کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا﴾ قسم ہے غازیوں کے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ گھوڑے جب تیز رفتاری کے ساتھ دوڑتے ہیں تو ان کے سینے اور پیٹ سے آواز نکلتی ہے، جسے ضبح کہتے ہیں، بمعنی ہانپنا۔

﴿فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا﴾ پھر قسم ان گھوڑوں کی جو پتھریلی زمین پر ٹاپ لگا کر زوردار پاؤں سے ٹاپ مار کر آگ کی چنگاریاں نکالتے ہیں۔ قدح بمعنی ٹاپ مارنا، گھوڑے جب پتھریلی زمین پر تیزی سے دوڑتے ہیں تو ان کے نعل دار پاؤں (ٹاپوں) کی ٹکر سے آگ کی چنگاریاں ظاہر ہوتی ہیں۔ قدیم زمانے میں لوگ لوہے کا بنایا ہوا ٹکڑہ پتھر کے ساتھ زوردار ہاتھوں سے مارتے تھے تو چنگاریاں پیدا کر کے آگ حاصل کرتے تھے، جسے چقماق کہتے ہیں۔ لوہے میں پتھر کے ساتھ مارنے سے یہ آگ پیدا ہوتی ہے۔

﴿فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا﴾ پھر ان گھوڑوں کی قسم جو صبح کے وقت دشمنوں پر زبردست تاخت کے ساتھ دھاوا بولتے ہیں (حملہ کرتے ہیں)۔ یہ غازیوں کے گھوڑوں کا تیسرا وصف ہے کہ وہ راتوں کو دوڑ لگا کر چلتے ہیں، اور صبح ہوتے ہی دشمن پر کاری ضرب لگا کر انہیں تہس نہس کرتے ہیں۔

﴿فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا﴾ پھر ان گھوڑوں کی قسم جو صبح کے وقت گرد وغبار اڑاتے ہیں۔ یہ غازیوں کے گھوڑوں کا چوتھا وصف ہے۔ صبح کے وقت گرد وغبار کا اڑانا قوت وچابکدستی کی نشانی ہے، کیونکہ صبح کے وقت زمین شبنم سے تر ہوتی ہے، گرد وغبار دبا ہوا اور زمین کے ساتھ چمٹا ہوا ہوتا ہے، بخلاف شام کے کہ اس وقت خشکی ہوتی ہے، ذرا سی معمولی حرکت سے گرد وغبار اڑنے لگتا ہے۔ اس چوتھی صفت میں صفت مشبہ (اسم فاعل) کے بجائے فعل ماضی لایا گیا ہے تاکہ دوامی معنی پر دلالت معلوم ہوجائے۔

﴿فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا﴾ پھر وہ اس وقت میں دشمنوں کے انبوہ میں گھس جاتے ہیں۔ یہ غازیوں کے گھوڑوں کا پانچواں وصف ہے۔ اکثر مفسرین حضرات کے نزدیک یہ پانچوں اوصاف جنگی گھوڑوں کے ہیں۔ بعض

مفسرین نے یہ اوصاف حج کعبۃ اللہ کو جانے والے اونٹوں کے قرار دیئے ہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کی روایت منقول ہے۔

لطیفہ:

ناشکرانسان کی بیداری اور عبرت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ شانہ نے گھوڑوں کے حالات بیان کئے، خصوصاً آپ ان گھوڑوں کے اوصاف پر نظر ڈالئے کہ وہ میدانِ کارزار میں اپنے محسن انسان کے اشارے پر اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کیسی کیسی سخت خدمات انجام دیتے ہیں؟ یہی حال دیو ہیکل اونٹوں اور دیگر حیوانات کا بھی ہے کہ انسان کی خدمت گزاری اور فرمانبرداری میں شب وروز رواں دواں مصروف نظر آتے ہیں، مجال نہیں کہ سرِمو انحراف کریں، اور خدمات کی بجا آوری سے پہلوتہی کریں، حالانکہ انسان ان کا حقیقی مالک وخالق نہیں ہے، وہ ان کو جو گھاس دانہ اور خوراک دیتا ہے وہ بھی اس کا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔

اس کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے رزق وروزی ان تک پہنچا دیتا ہے، لیکن یہ بے زبان محض تابع اور بے اختیار جانور جو انسان سے کئی گنا طاقتور ہے انسان کے اتنے سے حقیر احسان کو کیسا پہچانتا اور مانتا ہے کہ اس کے ادنیٰ اشارہ پر یہ طاقتور جانور اپنی جان عزیز کو خطرات کے حوالہ کردیتا اور مصائب ومشکلات کو خوشدلی سے برداشت کرلیتا ہے۔یہی حال گھوڑے، اونٹ، گائے، بھینس اور زورآور ہاتھی تک سارے حیوانات اور جانوروں کا ہے کہ اس چھوٹے قد والے کمزور انسان کے ہاتھوں مسخر اور فرمانبردار ہیں۔

اس کے بالمقابل اس انسان کو دیکھئے، جس کو ربّ العٰلمین نے ایک ناپاک قطرۂ منی سے پیدا فرماکر بے شمار خوبیوں اور اعلیٰ سے اعلیٰ شکل وصورت اور بے مثال کمالات دیدیئے، اور قوتِ عقلیہ، قوتِ متصرفہ، قوتِ گویائی وغیرہ سے نواز کر ساری مخلوقات پر اُسے فضیلت وبرتری عطا فرمائی۔مزید برآں! اُسے جہاں پر حاکمیت دیدی، اور دیگر ان گنت الطاف وطرح طرح کی نعمتوں سے مالا مال فرماکر ساری مخلوقات کا سربراہ وپیشوا بنایا، اور پوری کائنات کو اس کی خدمت پر لگادیا۔مگر ان تمام عظیم واعلیٰ اور بے شمار انعامات کا مقابلہ وہ ناشکری ونافرمانی سے کرتا رہتا ہے۔

اور یہ مسلّم ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق جس مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے وہ تکوینی طور پر قیامت تک اپنے فرائض کی مکمل انجام دہی میں مصروف نظر آتی ہے، کہیں بھی اپنے مقصدِ پیدائش سے منحرف نہیں نظر آئے گی، سوائے انسان کے کہ وہ محض بندگی کیا، بلکہ اس نے اُلوہیت کے دعویٰ تک کرڈالا، اور کوئی شرم محسوس نہیں کی۔

تاریخ اقوام عالم اور موجودہ دنیا کے ناگفتہ بہ حالات اور کرۂ ارض پر مجموعی معاشرہ ہر انسان کے سامنے موجود ہے کہ پوری انسانیت باستثناء ایک محدود طبقہ کے ربّ العزّت کے قوانین واحکام کا باغی ہے، اور یہ طبقہ باغیہ ابھی تک اس کی اُلوہیت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہے۔ آنے والی آیت اسی مقصد کو تاکید کے ساتھ بیان کررہی ہے کہ ناشکری اور پروردگار سے بغاوت صرف انسان ہی کی بری خصلت ہے۔

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ﴾ بیشک انسان اپنے پروردگار کا ناشکر اور احسان فراموش ہے۔ یہاں انسان کی ناشکری کو دو تاکید حرف اِنَّ اور لام تاکید سے ثابت کیا جارہا ہے، یہ ناشکری صرف قدرت کی نعمتوں کے دائرہ میں نہیں، بلکہ محسنِ حقیقی عزّ شانہ کی اُلوہیت کے انکار پر مبنی ہے، لہٰذا یہ ناشکری ہر قسم ناشکریوں پر بھاری ہے، اور نہایت ناقابل معافی جرم ہے۔ یہاں الْاِنْسَانَ میں الف لام جنس کے لئے ہے، مراد اکثر اور جنس انسان ہے، اس سے انبیاء کرام علیہم السّلام، صالحین مؤمنین، اہل تقویٰ وغیرہ مستثنیٰ ہیں۔

كَنُوْد کے معنی تقریباً تین ہیں: ناشکر، بخیل کنجوس، نافرمان، پہلا معنی راجح ہے، اور یہ باقی دو کو بھی شامل ہے، کیونکہ ناشکری اپنے عام معنی کے لحاظ سے بہت سارے معانی پر مشتمل ہے۔

ناشکری کی اقسام:

(۱) اللہ تعالیٰ شانہ کی اُلوہیت سے انکار۔ (۲) اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار۔ (۳) اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مختصہ میں غیر اللہ کا اشتراک۔ (۴) اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے انحراف کرنا۔ (۵) اللہ تعالیٰ کی عطا فرمودہ نعمتوں کو اپنی کوششوں اور باطل معبودوں یا اسباب ظاہری کی طرف منسوب کرنا۔ (۶) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حق ادا نہ کرنا۔ (۷) انعاماتِ الٰہی کو بے محل بے موقع صرف کرنا۔ (۸) دنیوی لذّات وشہوات میں مستغرق رہنا وغیرہ، یہ سارے معانی كَنُوْد بمعنی ناشکر کے افراد ہیں، اور یہی جمہور علماء کا فیصلہ ہے۔

﴿وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ﴾ اور بیشک یہ اس پر خود گواہ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ناشکری کا خود اقرار کرتا ہے، خواہ یہ اقرار زبانِ قال سے ہو یا زبانِ حال کے ساتھ ہو، دنیا میں ہو یا آخرت میں، کیونکہ لوگ اپنی اور دوسروں کی ناشکری کا عام طور خود اقرار کرتے رہتے ہیں، اور ان کے اعمالِ بد ودیگر ہر قسم تباہ کن برے اعمال و معاصی میں انہماک زبانِ حال سے ان کی ناشکری کی علامت واقرار ہی ہے، اور عالمِ آخرت میں تو ہر کافر بہانگِ دھل اپنی بے ایمانی اور ناشکریوں کا برملا اقرار کرے گا، جیسے ارشاد ہے: ﴿يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا

لَقَد اضلنِیْ عَنِ الذّكرِ بعد اِذْجاءَنِیْ﴾ [الفرقان:٢٩] (ہائے شامت! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا، اس نے مجھ کو (کتاب) نصیحت کے میرے پاس آنے کے بعد بہکا دیا)۔

﴿قَالُوا بَلٰى قَدْ جَاءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ﴾ [الملک:٩] (وہ کہیں گے: کیوں نہیں، ضرور ہدایت کرنے والا آیا تھا، لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا، اور کہا کہ خدا نے تو کوئی چیز نازل ہی نہیں کی)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ۝﴾ [المدثر] (وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور نہ فقیروں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، اور اہل باطل کے ساتھ مل کر (حق سے) انکار کرتے تھے، اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے)۔

یہ تمام تقدیر اس بناء پر ہے کہ اِنَّهٗ کی ضمیر کا مرجع انسان ہو، لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک اِنَّهٗ کی ضمیر کا مرجع ربّ تعالیٰ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ہر نیک اور برے اعمال پر خبردار بھی ہے، گواہ بھی اور واقف بھی، پس آیت کا مفہوم ایک سخت وعید پر مشتمل ہوگا، کیونکہ جس برائی و بدعملی پر خود ربّ العزّت گواہ ہوگا، تو وہ کسی بھی صورت میں نہ چھپ سکے گا اور نہ ہی نظر انداز ہوگا، اللہ ربّ العزّت ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین

﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ اور انسان مال کی محبت میں بڑا سخت قوی (بیتاب) ہے۔ خیر کے معنی بھلائی کے ہیں، یہ کلمہ خیر کا اطلاق ہر بھلائی پر ہوتا ہے، مگر یہاں خیر سے مراد مال ہے، عرب لوگ مال کی تعبیر اکثر خیر سے کرتے ہیں، کیونکہ مال میں خیر ہی خیر کی صورت میں ہر قسم کا فائدہ ہوتا ہے، دنیا میں یہ مخصوص شرف اسی مال کو حاصل ہے کہ اس کے ساتھ سب لوگوں کی چاہت و محبت ہے، اور کسی کو اس سے عداوت و نفرت نہیں، گویا کہ اس کو محبوب کل و معشوق کل کا درجہ حاصل ہے۔

پس اگر یہ مال حلال ہو، کمائی کا ذریعہ شرعی ہو، حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی کا اس میں لحاظ ہو، اور شرعی مصرف میں اسراف و تبذیر کے بغیر صرف ہو، تو یہ مال اپنے مالک کے لیے ذریعۂ نجات و حصول درجات کا ذریعہ ہوگا، حدیث شریف میں ارشاد ہے: **نعم المال الصالح للرجل الصالح** (پاکیزہ مال پاکیزہ لوگوں کے لئے بہترین سرمایہ نعمت عظمیٰ ہی ہے)۔ [مشکوٰۃ]

ہاں! اگر مال میں یہ شرائط نہ ہوں، کسب حلال نہ ہو، انفاق فی سبیل اللہ سے خالی ہو، حقوق کی ادائیگی کا اس

میں لحاظ نہ ہو، مطلب یہ ہے کہ غیر شرعی مال ہو، تو یہ دنیا و آخرت دونوں میں وبالِ جان اور تباہی ایمان و استحقاقِ عذاب کا ذریعہ ہی ہوگا، بلکہ عام طور پر اسے قارون کے مال کے ساتھ لوگ تشبیہ دے کر پکارتے ہیں۔

آیت کریمہ میں گھوڑوں کے اوصاف کی قسمیں کھا کر انسان کا ناشکر گزار و احسان فراموش ہونے کا بیان کیا گیا، اور تعریض کے ساتھ تنبیہ کی گئی کہ ناشکرا انسان حیوانات سے بھی بدتر اور کمتر ہے، کیونکہ حیوانات معمولی احسان سے مطیع و فرمانبردار ہوجاتے ہیں، مالک کی اطاعت کرتے ہیں، مگر انسان احسان فراموش اور ناشکر ہے، وہ عظیم احسانات کو بھول جاتا ہے، اور اپنے خالق، رازق اور منعمِ حقیقی کو فراموش کرتا ہے۔

ان آیات میں ایسے ناشکر ناسپاس انسان کے لیے دنیا و آخرت میں سزا کی تجویز و استحقاق کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اس کے ساتھ جہاد کیا جائے، گھوڑوں کی ٹاپوں سے اسے روند کر ہلاک کیا جائے، اور جن نعمتوں کی ناشکری کر رہا ہے وہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں۔ دوسرے نمبر پر مال کی شدید محبت کی مذمت ہے۔ دراصل ناشکری اور حبِ مال دونوں شرعاً وعقلاً مذموم و ناپسندیدہ ہیں، ناشکری کا مذموم ہونا ظاہر ہے، جسے ہر آدمی سمجھتا ہے۔

مال کی محبت کو جو مذموم قرار دیا گیا ہے یہ نفس محبت مال کو نہیں، بلکہ شدت و کثرت محبت مال کو مذموم بتایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مال کی محبت میں اتنا مغلوب و مستغرق ہوجائے کہ وہ اللہ تعالیٰ شانہ کے احکام سے بھی غافل ہوجائے، اور تمام حقوق کی ادائیگی سے محروم رہے، اور حلال و حرام سے بھی جاہل بے پرواہ رہے، پس یہ بے سروپا غیر اخلاقی اور غیر شرعی محبت مال تباہ کن اور حرام ہے، باقی نفس محبت مال کہ جس سے آدمی حقوق شرعی سے غافل نہ ہو، یہ مذموم نہیں، بلکہ یہ فطرت کے عین مطابق ہے، کیونکہ عالمِ اسباب میں ہزاروں ضروریاتِ زندگی کا پورا ہونا اسی مال پر موقوف ہے، بغیر مال کے کوئی کار خیر سرانجام نہیں پاتا، اس لئے شریعت نے مال کے کسب و اکتساب کو محض حلال و جائز نہیں، بلکہ بقدرِ ضرورت فرض وواجب قرار دیا، اور بقدرِ ضرورت اکتساب کو محمود و پسندیدہ بتایا، اور کہا: طلب الرزق فریضۃ بعد الفریضۃ۔ اسی طرح: التاجر الصدوق مع النبین و الصدیقین۔ [مشکوٰۃ]

البتہ شدت محبت مال یہ مذموم ہے، اور محبت کا تعلق دل کے ساتھ ہے، جب شدت محبت مال دل میں پیدا ہو، تو حبک الشئ یعمي ویصم کے ضابطہ کے مطابق، پھر انسان ادائیگی حقوق سے چشم پوشی کرے گا، گونگے، بہرے بن کر کچھ نہ سنے گا، اور آنکھوں پر غفلت کا پردہ چڑھا کر تمام شرعی اور اخلاقی اقدار سے غافل رہے گا، بخل و کنجوسی کے گرداب میں گر کر ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ﴾ [الحج:۱۱] (دنیا اور آخرت دونوں کھو گیا) کے گڑھے

میں غرق ہو جائے گا، حتیٰ کہ اس پورے مال و سرمایہ کو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نہیں سمجھے گا، بلکہ ﴿اِنَّمَآ اُوۡتِیۡتُهٗ عَلٰی عِلۡمٍ عِنۡدِیۡ﴾ [القصص: ۷۸] (یہ مجھے دیا گیا ہے میرے علم کے مطابق) کا قارون کی طرح رٹ لگا کر اپنے فضل و کمال اور علم و ہنر کا استحقاق قرار دے گا، اور پرلے درجے کا ناشکر بن کر یہودی قوم کی طرح احمق بن کر کہے گا، اور یہود جیسے بولے گا، قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیۡرٌ وَّنَحۡنُ اَغۡنِیَآءُ﴾ [آل عمران: ۱۸۱] (خدا نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ خدا فقیر ہے اور ہم امیر ہیں)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مال اللہ تعالیٰ کی ایک بخشش و نعمت ہے، اس کی بدولت آدمی ہزاروں اور بے شمار کارہائے خیر انجام دیتا ہے، اور یہ حلال مال رضائے الٰہی اور حصول جنت کا ذریعہ بھی ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ: **من جهز جيش العسرة فله الجنة**۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے نو سو اونٹ اور گھوڑے مع تمام ضروری سامان کے دے دیئے، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عثمان کو آئندہ کسی عمل کی ضرورت و احتیاج نہ ہوگی۔ دیکھیں! جب مال کی شدت محبت نہ ہو تو بخل نہ ہوگا، اور وہ مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف ہوگا، شدت محبت مال کا مالک کنجوس، بخیل ہوگا، اس کا مال ہرگز راہ خدا میں صرف نہیں ہوگا، اس لئے شدت محبت مذموم قرار پائی، اور نفس محبت محمود بن کر **نعم المال الصالح للرجل الصالح** کی مصداق ٹھہری، اسی بات کو بنیاد بنا کر حضرت رومیؒ نے کہا: ؎

آب اندر زیر کشتی پشتی ست ☆ آب در کشتی ہلاک کشتی ست

[مثنوی]

کشتی پانی ہی میں چلتی ہے، اگر پانی کشتی کے نیچے ہو تو کشتی کے لیے مددگار ہے، مگر وہ پانی اگر کشتی کے اندر آیا تو کشتی کے لئے تباہ کن ہے۔ مسلمان کے لیے حلال مال مددگار معاون ہے، جس کی بدولت ہزاروں کار خیر اور ضروریات انجام پائیں گے، البتہ دل میں اس کی محبت کو اتارنا فائدہ مند نہیں۔ دل تجلیات حق کا مرکز ہے، اس میں صرف انوارِ الٰہی اور محبت باری تعالیٰ کو جگہ دینا محمود ہے، نہ کہ شدت محبت مال و منال کو۔ اس کے بعد ناشکر انسان اور محبت مال میں گمشدہ انسان دونوں کو تنبیہ ہے کہ احتیاط رکھیں، فرمایا:

﴿اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ اِنَّ رَبَّهُمۡ بِهِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ﴾

کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا کہ جو (مردے) قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لیے جائیں گے اور جو (بھید) دلوں میں ہیں

وہ ظاہر کر دیئے جائیں گے، بے شک ان کا پروردگار اس روز ان سے خوب واقف ہوگا۔ انسان کو معلوم نہیں کہ روزِ قیامت جب مردے زندہ کر کے قبروں سے اٹھائے جائیں گے، اور دلوں کی پوشیدہ باتیں چھپے ہوئے راز کھل کر سامنے آجائیں گے، اور ربّ تعالیٰ شانہ ان سب باتوں سے اس روز باخبر ہوگا، اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر بات، بلکہ جہاں کے ہر ذرے ذرے سے ہر وقت باخبر ہے، مگر اس دن کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ جزاء وسزاء کا دن ہے، وہاں ہر خیر وشر کا بدلہ ملنے کا یوم اور وقت ہے، تو بدلہ دینے کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ہر چیز سے باخبر ہو، اور قاضی کے لیے خبیر ہونا لازم ہے، تاکہ اعمال کے مطابق جزاء وسزاء ہو۔

مسلمان عقلمندی سے کام لے کر تیاری بھی کرے اور ناشکری و بے جا محبت مال سے پرہیز کر کے اپنی آخرت کو آباد وخوشحال بھی رکھے، مال کو شکاری کتے کی حیثیت دے دو، اس سے شکار حاصل کرو، منافع کماؤ، مگر دل کو اس کے ساتھ مشغول نہ رکھو۔ دراصل یہ دونوں خصلتیں جو کہ مذموم وناپسندیدہ ہیں کافروں کے اعمال اور خصلتیں ہیں۔

الْاِنْسَان میں الف لام عہد کا اگر مراد ہو تو بہتر ہوگا، اس سے مراد کافر انسان ہی ہوگا، البتہ بسااوقات مسلمان میں بھی غفلت کی وجہ سے کافر کی خصلت پیدا ہوجاتی ہے، مگر ضروری ہے کہ فوراً اس خصلت کو ترک کر کے اپنے وجود سے باہر پھینک دے، کیونکہ مسلمان کی یہ شان نہیں کہ اس کے پاکیزہ وجود میں کافر کی کوئی خصلت موجود ہو، اور اس کے دامنِ ایمان پر کفر ونفاق یا کسی فسق فجور کا نازیبا داغ ہو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے صاحبزادوں (حضرت حسنین کریمین رضی اللہ عنہما) کو نصیحۃً خبردار کیا اور فرمایا:

ابنيَ إنّ من الرجال بهيمة ★ في صورة الرجل السميع المبصر

فطن بكلّ رذيئة في ماله ★ وإذا أصيب بدينه لم يشعر

اے بیٹو! بعض انسان جانوروں کی طرح ہوتے ہیں کہ جب مال میں نقصان ہوجائے تو ذرہ بھر برداشت نہیں کرتے، مگر دین اگر سارا بگڑ جائے تو پرواہ نہیں کرتے، ایسے لوگ اگرچہ انسانی شکل وصورت رکھتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ انہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ [الفجر: ۲۰] (اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو)۔

﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ وہ تو مال سے سخت محبت کرنے والا ہے۔ جو مال کو معبود کا درجہ دے کر اللہ تعالیٰ شانہ کے حکموں سے غافل رہتے ہیں، اور روز قیامت شدید محبت مال کی وجہ سے شدید عذاب میں مبتلا ہوجائیں

گے۔بہر حال! مال ہو یا بدنی قوت واستعداد یا ظاہری و باطنی حواس، اگر یہ دینی امور میں اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق صرف ہوں تو موجب اجر وثواب اور اخروی فوز وفلاح کے ذریعہ ہوں گے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو موجب خسران اور اخروی تباہی کا سبب بنیں گے: ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

سُورَةُ الْقَارِعَةِ

مكيةٌ آياتها ١١ ركوعها ١

سورۂ قارعہ مکی ہے، اس میں گیارہ (۱۱) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ القارعۃ ہے، پہلی آیت کے پہلے کلمہ سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے، اس کا نزول سورۂ قریش کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس سورت میں گیارہ آیتیں، چھتیس (۳۶) کلمات اور ایک سو باون (۱۵۲) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

ماقبل کی سورت کی طرح یہ سورت بھی جزائے اعمال کے بیان میں ہے کہ بعض لوگوں کے اعمال وزنی ہوں گے، اور بعض کے ہلکے ہوں گے۔ نیز سابقہ سورت میں انسانوں کی ناشکری اور حبِّ مال کی مذمت مذکور ہوئی اس سورت میں اس طرف اشارہ ہے کہ ناشکری اور محبت مال دونوں میزان میں ہلکی ثابت ہو کر جہنم اور عذاب کا سبب بنیں گی، لہٰذا ان دونوں سے اجتناب اولیٰ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾ يَوۡمَ يَكُوۡنُ النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ﴿۴﴾
وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ؕ﴿۵﴾ فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾
وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۙ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ ؕ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: کھٹکھٹا دینے والی ① کیا ہے وہ کھٹکھٹا دینے والی؟ ② اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ کھٹکھٹا دینے والی کیا ہے؟ ③ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوجائیں گے ④ اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح ہوجائیں گے ⑤ پس بہرحال جس کے اعمال وزنی ہوں گے ⑥ پس وہ پسندیدہ عیش میں ہوگا ⑦ اور بہرحال! جس کے اعمال ہلکے ہوں گے ⑧ اس کا ٹھکانا جہنم کا گڑھا ہوگا ⑨ اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ گڑھا کیا ہے؟ ⑩ بھڑکتی ہوئی آگ ہے ⑪

معارف ومنازل

﴿اَلۡقَارِعَةُ﴾ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ تاء اس میں تانیث کے لیے ہے، أي الساعة القارعة، موصوف محذوف ہے یا تاء مبالغہ کے لیے ہے، یعنی بہت کھٹ کھٹا دینے والی۔ قیامت چونکہ نہایت ہولناک اور وحشتناک ہے، جہاں ''نفخ صور'' کے ساتھ پیدا ہونے والا زلزلہ، آسمانوں، زمینوں میں کھٹ کھٹاہٹ پیدا کرے گا، وہاں قلوب ودلوں کو بھی ہلا کر رکھ دے گا، اس لئے اس کو اَلۡقَارِعَة سے تعبیر فرمایا۔

حوادث الدهر کو بھی ''قوارع الدهر'' اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ عقلمندوں کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں، اور قرآن پاک کی اس قسم کی آیات یا حدیث پاک کے اس قسم کے مضامین کو جو طبع بشری کو جنبش دیتے ہوں قوارع القرآن وقوارع الحديث کہتے ہیں، اس سورت میں دلوں کو جنبش اور ہلا دینے والے مضامین ہیں، اسی وجہ سے اس کا نام سورة القارعة ہوا۔

﴿يَوۡمَ يَكُوۡنُ النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ﴾ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوجائیں گے۔ میدانِ محشر میں منتشر بکھرے ہوئے سرگرداں، افتاں وخیزاں اور پریشان انسانوں کو منتشر پروانوں سے چار چیزوں میں تشبیہ دی گئی ہے: (۱) بے قراری وبدحواسی میں۔ (۲) کثرت وضعف میں کہ وہ

فرشتوں کے مقابلہ میں پتنگوں کی طرح کمزور ہوں گے۔ (۳) بکھرنے اور ہر طرف دوڑنے میں۔ (۴) آگ میں گرنے میں کہ جس طرح پروانے آگ میں گرتے ہیں، اسی طرح کفار دوزخ میں گریں گے۔

﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین روئی کی طرح اڑتے ہوئے معلوم ہوجائیں گے۔ رنگین دھنی ہوئی پشم سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ مختلف رنگوں کے پہاڑ جب چورے چورے ہوجائیں گے تو ایک ایسی رنگت پیدا ہوجائے گی کہ گویا وہ دھنی ہوئی رنگین روئی ہیں۔

فائدہ مہمۃ:

اجسام میں ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ نے ثقل و بھاری پن رکھا ہوا ہے، اور یہی ثقل تمام اجسام کو قرار و سکون پر مجبور کرتا اور ان کو حیز طبعی کی طرف جھکالیتا ہے، پھر ثقل کی دو قسمیں ہیں: ایک ثقل حسی ہے دوسرا ثقل معنوی ہے۔

قسمِ اول تو تمام اجسام میں ظاہر و مشاہد ہے۔ دوسری قسم ادراک و حواس والے اجسام میں، خصوصاً حضرت انسان میں پائی جاتی ہے، اس کو وقار و حلم کہتے ہیں جس میں یہ صفت ہوتی ہے اس کو حلیم، باوقار، متحمل اور بھاری بھرکم، سنگین انسان شمار کیا جاتا ہے، انسان میں اس صفت کا نہ ہونا معیوب ہے، کفار قریش اپنی اس صفت تحمل و وقار پر بڑے نازاں تھے، وہ اس کی اتنی مشق کرتے تھے کہ اگر ان کے جسم پر زخم بھی لگ جائے تو وہ جس وضع پر بیٹھے ہوں اس میں کچھ فرق نہ آئے۔

انسان کے اس ثقل (حلم و وقار سنجیدگی) سے اخلاقِ حمیدہ و ملکاتِ فاضلہ میں ثابت قدمی حاصل ہوتی ہے، اور حسنات پر عمل اور معاصی سے اجتناب کی توفیق میسر آتی ہے، اور یہی انسان کا مقصود زندگی ہے، پھر یہ ثقل جس انسان میں جتنی زیادہ مقدار میں ہوگا اسی مقدار سے میزان میں اس کا وزن ہوگا، اور جس میں یہی ثقل نہ ہوگا میزان میں اس کا کوئی وزن نہ ہوگا۔

قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ [الکہف:١٠٥] (تو ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی تول نہ قائم کریں گے)۔ ایسے لوگوں کا وزن بہیمیت و جسمانیت ان کو اپنے حیز طبعی، مقامِ اسفل (ھاویۃ) کی طرف لے جائے گا (روحانیت اور ایمان کے فقدان کی وجہ سے)۔ قسمِ اول کا ثقل جو اجسام میں ظاہر و مشاہد ہے، پہاڑوں سے زائد نمایاں ہے کہ ان کو قدرت نے جہاں بٹھلا دیا (گھاڑ دیا) وہیں بیٹھے ہیں، ہلتے نہیں ہیں، اسی لئے ثابت قدمی حلم و وقار کو پہاڑوں کے ساتھ تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ فلاں شخص کوہ وقار ہے، اور سورۃ الغاشیہ میں

﴿وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ﴾ [الغاشية:۱۹] کے جملہ سے اسی طرف اشارہ مقصود تھا، یعنی ثبات واستقلال۔

حاصل یہ ہے کہ قیامت کے حادثہ کی شدت سے دونوں قسم کے ثقل زائل ہوجائیں گے، انسان جو حلم ووقار کے پہاڑ ہیں وہ پروانوں کی طرح بکھر جائیں گے، اور پہاڑ بھی ہواؤں پر اڑکر دھنی ہوئی روئی کی طرح ہلکے پھلکے ہوکر فضاؤں میں اڑتے پھریں گے، پھر اس عالمِ روحانی کے مناسب ثقل ثابت ہوکر میزان کو بھاری کردے گا، اور دوسری قسم کا ثقل انسان کو عالمِ اسفل کی طرف کھینچ کر ھاویة میں ڈال دے گا۔ صحیح بخاری میں حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ہے کہ بھاری بھرکم عظیم الجثہ، موٹے کافر کو میزان میں رکھا جائے گا، تو مچھر کے پَر کے برابر بھی وزن نہیں ہوگا، اسی طرح اس امت کے کسی اعلیٰ شخصیت (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کا وزن پوری امت پر بھاری رہے گا۔

تو کفارِ قریش اپنے حلم، وقار اور سنجیدگی پر نازاں رہتے تھے، وہ هَبَاءً مَّنْثُوْرًا ہوکر ﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ کا مصداق بنیں گے، ایک عقلمند انسان کیا یہ کہہ سکتا ہے کہ سونا جو پتھر سے پیدا ہوا ہے قیمت میں پتھر کے برابر ہوگا، پس یہ ﴿ثَقُلَتْ وَخَفَّتْ﴾ کیا محض اجسام کی ہوں گی، جس میں ایمان وکفر کا کوئی دخل نہ ہوگا؟ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک ادنیٰ بے عمل مسلمان دنیا کے سارے (کھربوں) کفار پر بھاری ہے۔

آئندہ آنے والی حدیث بطاقة سے اس کی تائید ہوتی ہے، اور لا الٰہ الا اللہ کے وزن کا آسمانوں زمینوں، بلکہ پوری کائنات کے وزن سے زیادہ بھاری ہونے کا بیان ہے۔ **فللّٰہ الحمد ولہ الشکر علی نعمة الإیمان**

قیامت اور وزنِ اعمال:

موازین موزون کی جمع ہے، مراد اس سے اعمالِ صالحہ کے موازین ہیں، انہیں کے ثقل وخفت کا بیان اور تشریح ہورہی ہے، اور میزان سے مراد ترازو ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ حضرت اقدس سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ شانہ نے میزان کے دو پلڑے آسمان زمین کی برابر پیدا فرمائے ہیں''۔ مَوَازِيْن کو جمع لانے کا مقصد موزونات کی کثرت ہے، یا اس لئے کہ ہر انسان کے لئے الگ میزان ہو یا اس لئے کہ ہر عمل کا میزان الگ ہو، یا یہ وجہ ہو کہ جمع تشریف کے لیے ہو۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ میزان (ترازو) ایک ہی ہے، اور جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے ہے۔ سلیمان جمل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ سب امتوں اور تمام اعمال کے لئے ترازو ایک ہی ہوگی، اور ترازو ایک مخصوص جسم ہے، جس میں دو پلڑے اور ایک ڈنڈی ہوگی، ہر پلڑہ مشرق سے مغرب تک جتنا وسیع ہوگا اور اس کی محل

جائے قیام جنت و دوزخ کے درمیان ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہاتھ میں ہوگا، اس کا داہنا پلڑہ نیکیوں کے لئے عرش الٰہی کی دائیں جانب اور بایاں پلڑہ برائیوں کے لئے عرش الٰہی کی بائیں جانب ہوگا۔ [کبیر]

﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ﴾ تو جس کی تولیں بھاری ہوئیں۔ اس میں صرف وہ مؤمن داخل ہیں جو مغفور ہوں یا معصوم ہوں، یا جن کے اعمالِ صالحہ سیآت سے زیادہ اور بھاری ہوں، اور ﴿اَمَّا مَنْ خَفَّتْ﴾ اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں، اس میں کافر و منافق اور وہ فاسق بھی داخل ہیں، جن کے معاصی کا پلڑہ نیکیوں سے بھاری ہو۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ثَقُلَتْ کا مصداق متقین ہیں فقط، اور خَفَّتْ کا مصداق کفار و منافقین ہیں، رہا گناہگار اور فاسق مؤمنین، وہ مسکوت عنہ کے درجے میں ہیں، کیونکہ وہ اعراف میں ہوں گے، یا اس لئے کہ جس طرح دنیا میں وہ پردہ پوشی کے تحت رہے، اسی طرح قیامت میں بھی امید ہے کہ ان کی مغفرت ہو، لیکن پہلا قول راجح ہے، جس کا آئندہ بیان ہوگا۔

انسانوں کے تین گروہ:

یہ تینوں گروہ مطلقاً عام انسانوں کے ہوں گے، علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آخرت میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے: (اول گروہ) متقیوں کا، وہ گروہ جن کے کبیرہ گناہ نہ ہوں گے، یعنی بالکل نہ ہوں گے یا معاف کردیئے ہوں گے، ان کی نیکیاں ایک نورانی پلڑے میں رکھی جائیں گی، اور وہ پلڑہ اوپر کو نہ اٹھے گا، البتہ دوسرا (گناہوں کا پلڑہ) خالی پلڑے کی طرح (گناہ نہ ہونے کے سبب یا قلیل ہونے کے سبب) اوپر اٹھ جائے گا۔

(دوم گروہ) کافروں کا گروہ ہوگا، ان کے کفر اور گناہوں کا بوجھ ظلمانی پلڑے میں رکھا جائے گا، اگر بالفرض کوئی نیکی ہو تو وہ دوسرے پلڑے میں رکھی جائے گی، مگر یہ پلڑہ خالی پلڑے کی طرح اوپر اٹھ جائے گا۔ آنحضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن بعض موٹے لمبے چوڑے آدمی آئیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا وزن مچھر کے پر کے برابر نہ ہوگا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت: ﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ [الكهف: ۱۰۵] (تو ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی تول نہ قائم کریں گے)۔ تلاوت فرمائی۔ [بخاري ومسلم]

(تیسرا گروہ) عام گناہگاروں کا ہوگا، ان کی نیکیاں نورانی پلڑے میں اور برائیاں ظلمانی پلڑے میں رکھی جائیں گی، اگر نورانی پلڑہ بھاری رہا تو جنت کے دخول کا فیصلہ اور اگر ظلمانی پلڑہ بھاری رہا تو دوزخ کے دخول کا فیصلہ

ہوگا، اس صورت میں اگر مشیت ایزدی مغفرت کا فیصلہ فرمائے، تو زہی سعادت۔ **فلذلک قال العلماء: هذا مفوض إلى مشية الحق سبحانه إن شاء غفر وإن شاء عاقب۔**

لیکن اگر معاملہ اعمالِ صالحہ اور سیئہ میں برابری کا پیش آیا، تو فیصلہ اعراف ہی کا ہوگا، بشرطیکہ سیآت کا تعلق حقوق اللہ تعالیٰ سے ہو، اگر وہ ظلمانی گناہ حقوق العباد میں سے ہوں تو ان کی نورانی حسنات سے حقوق العباد کی ادائیگی کا فیصلہ ہوگا، ایک درہم کے عوض سینکڑوں نمازیں اور پانچ چھ درہموں کے عوض حج جیسی عبادت کی کٹوتی ہوتی رہے گی، اگر اعمالِ صالحہ سے دوسروں کے حقوق کی ادائیگی ہوگئی تو خیر! ورنہ حقوق والوں کے معاصی ظلم و زیادتی شراب و کباب زنا و فجور والے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے اور سزا کا فیصلہ ہوگا۔ اللہ کی پناہ، یہ سودا مہنگا اور تباہ کن ہوگا۔ یہ جو کچھ بیان ہوا اور تینوں گروہ مؤمن و کافر و فاسق سب کے متعلق تھا۔

بعض علماء کرام نے صرف مسلمانوں کے متعلق کہا ہے کہ قیامت کے دن مؤمنوں کے تین گروہ ہوں گے: ایک فرقہ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے غنی ہوگا، دوسرا فرقہ اعمالِ صالحہ کے کم ہونے کی وجہ سے محتاج ہوگا، تیسرا فرقہ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے شروع میں غنی ہوگا۔ اخیر میں دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے بعد مسکین و محتاج ہوگا۔

دراصل اس امت کا مسکین یہی کہلائے گا جس کی نیکیاں پہاڑوں جتنے ہوں گی، مگر دوسروں پر تقسیم ہو جائیں گی، اگر اس کے اعمالِ صالحہ سے دوسروں کے حقوق کی ادائیگی ہوگئی تو خیر، ورنہ حقوق والوں کے گناہ اس پر ڈال کر اسے جہنم کا راستہ بتا دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ آمین

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے حقوق اللہ کے ستر گناہوں سے حقوق العباد کے ایک ہی گناہ کو زیادہ خطرناک شمار کیا، کیونکہ اس کی مغفرت کی امید بہت کم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس طرح دنیا میں ایک دانہ کی زیادتی سے وزن بھاری ہوگا، اور اسی طرح ایک حبہ کی کمی سے وزن میں کمی آسکتی ہے، قیامت کا وزن بعینہٖ اسی طرح کا ہوگا، ایک نیکی کی زیادتی سے ثقل اور کمی سے خفت کا فیصلہ ہوگا، پس ادنیٰ نیکیوں کو ہرگز حقیر مت سمجھو! ایک نیکی کی زیادتی سے جنت اور کمی سے دوزخ کا فیصلہ ہوسکتا ہے، اگر نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں تو اعراف کا فیصلہ ہوگا، ایسے لوگ پل صراط پر روکے جائیں گے، اور کچھ گناہوں کی سزا کاٹ کر نیکیاں بھاری ہو جائیں گی، تو کرمِ الٰہی سے جنت کا دخول ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ شانہ کے فضل و کرم کا کوئی اندازہ نہیں۔

سُورَةُ التَّكَاثُرِ

مكيةٌ آياتها ۸ ركوعها ۱

سورۂ تکاثر مکی ہے، اس میں آٹھ (۸) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ التکاثر ہے، یہ لفظ پہلی آیت میں موجود ہے، اسی سے سورت کا نام ماخوذ ہے، نیز سورۃ المقبرۃ بھی اس کا نام ہے۔

نزول:

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ سورت مکیہ ہے۔ صاحب بحرالمحیط نے اس کے مکیہ ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کا مکیہ ہونا زیادہ مشہور ہے۔ قتادہ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہما اسے مدنیہ کہتے ہیں کہ یہود کے تکاثر وتفاخر کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ انہوں نے غرور وتفاخر میں اپنی پوری زندگی تباہ کی، ان کے قابلِ افسوس حال سے مسلمانوں کو بیدار کر کے انہیں عبرت دی گئی ہے۔ حضرت آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو مختار قرار دیا، اور فرمایا کہ وعذاب القبر لم يذكر إلا في المدينة كما في المسلم والبخاري من حديث عائشة رضي الله عنها في قصة اليهودية، ولقوة الأدلة على مدنيتها قال بعض الأجلة: إنه الحق۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس سورت کی آٹھ آیتیں، اٹھائیس (۲۸) کلمات اور ایک سوتیس (۱۳۰) حروف ہیں۔ اس کا نزول سورۃ

کوثر کے بعد ہے۔

ربط ومناسبت:

سورۃ القارعۃ میں قیامت اور اس کے بعض احوال کا ذکر تھا، اس سورت میں قبر کا تذکرہ ہے جو کہ مبادی قیامت میں سے ہے، من مات فقد قامت قیامته۔ نیز اس سورت میں قیامت کی کامیابی کے اسباب کا اور اسی طرح ناکامی کے اسباب کا ذکر و بیان ہے۔ سورۃ القارعۃ میں حساب اور وزنِ اعمال کا بیان تھا، اس سورت میں بھی نعمتوں کے حساب پر تنبیہ ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت کے شروع میں غفلت کی مذمت اور حرص ولالچ سے پیدا ہونے والے انجامِ بد کا بیان ہے، اور عالمِ آخرت کی کامیابی و ناکامی کے اسباب کا تذکرہ ہے، اور غفلت ولاپرواہی کی مذمت کے ساتھ کثرتِ مال و کثرتِ افراد کی خرابی اور نعمتوں پر محاسبہ کا تذکرہ ہے۔

فضیلۃ السورۃ:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی میں یہ طاقت ہے کہ روزانہ کلام اللہ شریف کی ایک ہزار آیت تلاوت کرلیا کرے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایک ہزار آیات روزانہ کون پڑھ سکتا ہے؟ ارشاد فرمایا: کیا تم میں سے کسی میں اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھنے کی طاقت نہیں؟ کہ یہ ایک ہزار آیت کے برابر ہے۔ [حاکم، بیهقي]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص رات کو ایک ہزار آیات پڑھ لیا کرے تو وہ ربّ العزّت سبحانہ سے ایسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ شانہ اس کے سامنے ہنس رہا ہوگا، عرض کیا گیا: یارسول اللہ! ایک ہزار آیات کون پڑھ سکتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ آخر تک پڑھ کر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ سورت ایک ہزار آیات کے برابر ہے۔ [حوالہ بالا، وشعب الایمان للبیهقي]

شانِ نزول:

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ سورت انصار کے دو قبیلوں: بنو حارثہ اور

بنوحارث نے آپس میں ایک دوسرے پر فخر کیا، ایک قبیلہ نے کہا کہ ہمارے قبیلہ کی شخصیتیں تمہارے قبیلہ والوں سے بہتر ہیں، دوسرے قبیلہ نے اپنی شخصیتوں پر فخر کیا حتیٰ کہ قبروں اور مردوں پر فخر ومباہات شروع کیا، اسی طرح سرمایہ و مال پر فخر کرنے لگے، تو یہ سورت اسی بارے میں نازل ہوئی۔ کچھ لوگوں نے قریش کے بعض قبائل کے تکاثر وتفاخر کا تذکرہ کیا ہے۔ بہرحال! اسباب کچھ بھی ہوں اصل مقصد یہ ہے کہ عمومِ الفاظ کا اعتبار ہوگا، خصوصِ اسباب کا نہیں۔ تکاثر فی الاموال ہو یا تفاخر فی الانساب، دونوں مذموم ہیں، ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۳] (تم میں سے اللہ کے یہاں بہترین تم میں سے پرہیز گار ہے) پر فیصلہ ہوگا۔ واللہ اعلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝٢ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝٣ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ
تَعْلَمُوْنَ ۝٤ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝٥ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝٦ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ
الْيَقِيْنِ ۝٧ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝٨

ترجمہ: تم کو بہتات کی حرص نے غفلت میں ڈال دیا ① یہاں تک کہ تم قبرستان جا پہنچے ② ایسا ہرگز نہ چاہئے، بہت جلد تم کو معلوم ہو جائے گا ③ خبردار! بہت جلد تم کو پتہ چل جائے گا ④ نہیں نہیں، اگر تم کو یقینی طور پر معلوم ہو جاتا (تو ایسا نہ کرتے) ⑤ ضرور تم دوزخ کو دیکھو گے ⑥ پھر تم اس کو بالیقین دیکھو گے ⑦ پھر ضرور اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا ⑧

معارف ومنازل

﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ تکاثر کثرت سے مشتق ہے، اس کے معنی کثرت کے ساتھ مال دولت جمع کرنا ہے۔ اَلْهٰى کے معنی ہیں: غفلت میں ڈالنا، غافل کرنا۔ حضرت ابن عباس اور حسن بصری رضی اللہ عنہم نے تکاثر کے معنی زیادہ مال جمع کرنے کے بتائے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ پڑھ کر ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مال ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے، اور اس پر عائد

ہونے والے حقوق وفرائض کو ادا نہ کیا جائے۔ قتادہؒ نے تکاثر کا معنی تفاخر بتائے ہیں۔

دراصل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ حرص ولالچ غفلت کے بنیادی اسباب ہوتے ہیں، اور غفلت کی بنیاد پر جو مال جمع کیا جاتا ہے اس میں نہ حلال وحرام کا لحاظ ہوتا ہے، اور نہ ادائیگی حقوق کا، ایسے مال کا نتیجہ سوائے غرور وتفاخر کے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ حرام مال میں کبھی برکت ہی نہیں ہوتی، اور ادائیگی حقوق برکت کا حصہ ہوتی ہے۔

﴿حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ یہاں قبرستان پہنچ جانے کا مطلب یہ ہے کہ تم تکثیر مال وسرمایہ اور قبیلہ ونسب پر تفاخر میں ایسے ڈوب کر غافل ہوئے کہ مر کر قبروں میں دفن ہوگئے، اور موت تک اس غفلت سے تم باز نہ آئے۔ حدیث مرفوع میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر یہی منقول ہے۔ [ابن كثير]

یہ خطاب قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے عام ہے، جو مال ودولت، عزّت وجاہ اور قوم ونسب کی محبت اور دوسروں پر فخر وبرتری میں ایسے مست رہتے ہیں کہ ان کو اپنا انجام سوچنے کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں ہوتی۔ یہ عادتِ بد آج کل ناعاقبت اندیش دیندار لوگوں میں بھی سرایت کرگئی ہے کہ کچھ لوگ فخر ومباہات میں اتنے آگے نکلے ہوئے ہوتے ہیں کہ چند اعمال پر قناعت کرکے دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے سے شرم محسوس نہیں کرتے۔

حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ سورۂ تکاثر کی تلاوت فرمارہے تھے، اور یہ ارشاد فرمارہے تھے: يقول ابن أدم: مالي مالي، وهل لک من مالک إلا ما أكلت فأفنيت أو لبست فأبليت أو تصدّقت فأمضيت ، وفي رواية لمسلم وما سوى ذلك فذاهب وتاركه للناس۔ ابن آدم کہتا ہے: میرا مال میرا مال، حالانکہ اس تیرے مال میں تیرا حصہ اتنا ہی ہے جو تو نے کھایا پیا، یا پہن کر بوسیدہ کرکے پھاڑا، یا صدقہ کرکے آگے بھیج دیا، اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ تیرے ہاتھ سے جانے والا ہے، اور تو اس کو دوسروں کے لئے چھوڑنے والا ہے۔ [رواه مسلم والترمذي]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ تجھ سے پیچھے رہنے والا مال وارث کا ہے، تیرا نہیں۔ [مشكوٰة]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لو كان لابن آدم واديا من ذهب لأحب أن يكون له واديان ، ولن يملأ فاه إلا التراب ، ويتوب الله على من تاب۔ (اگر انسان کے لئے ایک وادی سونے سے بھری ہوئی ہو تو اس کی یہ خواہش ہوگی کہ دو وادیاں ہوجائیں، اور اس کے منہ کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی، اور اللہ ربّ العزت سبحانہ اس کی توبہ قبول فرمالیں گے جو توبہ کرے گا)۔ [بخاري]

ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں: لو کان لابن آدم وادیان من ذھب لابتغیٰ ثالثا و لایملأ جوف ابن آدم إلا التراب ویتوب اللہ علی من تاب۔ [الحدیث] ابن آدم کے پیٹ کو قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے اور کوئی نہیں، اس میں راز یہ ہے کہ مردہ قبر میں تین چار دن تک حسب موسم سلامت رہتا ہے، اس درمیان اس کا پیٹ متورم ہو کر بڑا ہو جاتا ہے، چوتھے پانچویں دن اس کا پیٹ زوردار دھماکے کے ساتھ پھٹ جاتا ہے اور لحد کے اوپر والے حصے کی مٹی اس میں گر کر اسے بھر دیتی ہے، اب یہ ہمیشہ کے لئے بھر گئی، لیکن یاد رہے کہ یہ کیفیت ہر میت کو پیش نہیں آتی، یہ مالدار حریص دنیادار بے عمل لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے، اللہ والے ایسے نہیں ہوتے۔

حکایت:

ہندوستان میں ایک قبر کی کھدائی ہوئی دیکھا گیا کہ میت بالکل سلامت ہے، اور قبر کے اندر سے نہایت عجیب خوشبو کی مہک پھیل رہی ہے، میت کے دل کے قریب پسلیوں کے درمیان سے گلاب کا پودا نکلا ہوا ہے اور مڑ کر اس کی ناک تک آیا ہوا ہے، اس پر سرخ رنگ کا شگفتہ پھول لگا ہوا ہے، اور اس کی مہک نہایت دلکش قابل دید ہے۔ یہ میت کون ہے؟ یہ مسلمان فرمانروا سلطان ہند علاؤالدین خلجی کی ہے، جس سے کبھی نماز باجماعت اور صلوٰۃ تہجد اور دوسرے اعمال نہیں چھوٹے اور ناغہ نہیں ہوئے۔ جب وہ تخت پر بیٹھ کر فیصلہ کرتے تھے تو سامنے میز پر اپنا کفن رکھتے تھے اور اس پر قرآن مجید رکھا ہوا ہوتا تھا۔ [دروس القرآن افغانی]

حضور انور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ التکاثر پڑھ کر گزشتہ الفاظ سے اس کی تفسیر فرمائی، اس سے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شبہ ہوا کہ یہ بھی قرآنی الفاظ ہیں، بعد میں پوری سورت سامنے آئی، تو اس میں الفاظ (لو کان لابن آدم) نہیں تھے، تو یہ شبہ ختم ہو گیا، چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حدیث کی مذکورہ عبارت کو قرآن کا حصہ سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اَلْھٰكُمُ التَّكَاثُرُ نازل ہوئی۔ [ابن جریر]

﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ یہ مکرر جملہ تفخیم شان اور تاکید احوال کے لیے ہے، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ [الانفطار: ۱۸] (آپ کو کیا پتا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ پھر آپ کو کیا پتا کہ جزا کا دن کیا ہے؟)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز بہت اہم اور ضروری ہو، اور اس کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں شکوک اور شبہات ہوں، یا کسی چیز میں یا اس کے ہونے میں شک و تردد ہو، یا لوگ کسی چیز کے بارے میں انکاری ہوں، تو بلاغتِ کلام کا تقاضا ہوتا ہے کہ شک دور کرنے کی خاطر اسی

انداز پر کلام مؤکد اور مکرر ہو، اس کے علاوہ زجر و توبیخ کے لئے بھی کلام کو مؤکد و مکرر لایا جاتا ہے، یہاں یہ ساری باتیں موجود ہیں، اس لئے کَلَّا کے ساتھ دو مرتبہ ﴿سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ کا ذکر ہوا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اول جملہ کا تعلق برزخ اور قبر کے ساتھ ہو، اور دوسرے ﴿تَعْلَمُوْنَ﴾ کا تعلق قیامت اور یومِ حساب کے ساتھ ہو۔ واللہ اعلم

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ﴾ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ آخرت کا حال ہمیں معلوم ہے، اس پر حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: کَلَّا ہرگز ایسا نہیں، تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

﴿لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ﴾ اگر تم کو آخرت کا یقینی علم ہوتا، تو تم فانی لذّتوں، ناپائیدار عزّتوں اور چار روزہ دولت، مال اور ثروت کے لئے اپنے گرانمایہ اوقات کا اور قیمتی سرمایہ اور خزانہ کو اس بے دردی اور بے رحمی سے ضائع و برباد نہ کرتے، بلکہ زندگی کا ہر لمحہ اور ہر سانس اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ابدی نعمتوں اور لافانی راحتوں کے حصول کے لئے وقف رہتا۔ ﴿لَوْ تَعْلَمُوْنَ﴾ کا جواب محذوف ہے: لماتکاثرتم و لاتغافلتم۔ علم الیقین، یعنی ایسا علم جو ایک یقینی بات کا ہوتا ہے۔

مراتب علم کا بیان:

علم کے تین مرتبے ہیں: اول علم الیقین، دوسرا عین الیقین، تیسرا حق الیقین، مثلاً کسی شخص کو یقینی علم حاصل ہو گیا کہ دریا کا بہت بڑا پانی ہے، جو میٹھا بھی ہے اور شب و روز جاری بھی ہے، یہ ہے علم الیقین، اسی بات پر وہ دریا کے پاس پہنچا تو اس کو دیکھا کہ وہ جاری ہے، یہ ہے عین الیقین، پھر اس نے چلو بھر کر اس کا پانی پیا اور اسے شیریں پایا، یہ ہے حق الیقین، جو کہ آخری بھی ہے اور پختہ بھی۔ علم الیقین ابتدائی درجہ ہے اور حق الیقین انتہائی اور آخری درجہ ہے۔

چونکہ انسان نفس و شیطان کے بہکانے پر دنیا کی لذّتوں اور فانی نعمتوں کے حصول میں شب و روز مصروف و منہمک ہے، آخرت پر ایمان اور یقین رکھتے ہوئے ابدی نعمتوں کے حصول سے غافل اور دوزخ کے عذاب سے مطمئن و بے خوف ہے، اس لئے تنبیہ فرما کر ارشاد فرمایا:

﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ﴾ قیامت کے دن تم جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ مؤمن بھی اسے دیکھیں گے اور کفار بھی، لیکن دونوں کے دیکھنے میں فرق ہوگا، فھي للكفار دار، پس وہ کفار کے لئے گھر اور منزل ہے۔ وہ یہیں ٹھہریں گے، ابدی جہنم میں رہیں گے، یہ ان کا مسکن و گھر ہوگا، وللمؤمنین ممرّ مؤمنین کے لئے گزرگاہ ہے، فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ [مریم: ۷۱] (تم میں سے کوئی نہیں مگر اس پر آنے والا ہوگا)۔ کئی مؤمن بجلی کی طرح

گزر جائیں گے، کوئی ہوا کی سرعت کے ساتھ، کوئی تیز رفتار گھوڑے کی تیزی کے ساتھ، کوئی پرندوں کی رفتار کے ساتھ، غرض یہ کہ لوگ اپنے اپنے درجاتِ اعمال کے مطابق وہاں سے گزر جائیں گے، اور صراط پر عبور انہیں نصیب ہوگا، جبکہ کافر عبورِ صراط سے محروم رہیں گے اور جہنم میں گر جائیں گے۔ نعوذ باللہ منها

﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ﴾ تم دیکھو گے جہنم کو۔ علم الیقین کے درجہ میں ابھی دنیوی زندگی میں بھی مؤمن اپنے ایمان سے جہنم کو دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، اور اس سے خوفزدگی کی وجہ سے ہر قسم معاصی اور گناہوں سے پرہیز کر رہا ہے، گویا کہ جہنم اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

﴿ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ﴾ پھر اس کو (ایسا) دیکھو گے (کہ) عین الیقین (آجائے گا)۔ یہ مرحلہ انبیاء علیہم السلام و مخلصین کو دنیاوی زندگی میں حاصل ہے، کیونکہ وہ صفائی باطن اور طہارتِ کاملہ کی بدولت دنیوی زندگی میں بھی جنت و دوزخ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، البتہ عام مؤمنین کے لیے یہ مرحلہ برزخ اور آخرت میں پیش آئے گا، جہاں وہ جنت کو اپنے مسکن اور گھر کی حیثیت میں دیکھیں گے، اور جہنم کو گزرگاہ اور عبرت کی حیثیت میں مشاہدہ کریں گے۔ کمافي الحديث

﴿ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾ پھر اس روز تم سے (شکر) نعمت کے بارے میں پرسش ہو گی۔ مفسرین کرام نے نعیم میں مختلف و متعدد اقوال کے ذریعہ طرح طرح کی تخصیص بیان کی ہیں، مگر محققین علماء نے النَّعِيمِ کو اپنے عموم پر رکھ کر ہر کسی تخصیص کو خلاف ظاہر قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللهِ لَا تُحْصُوهَا﴾ [إبراهيم: ۳۴] (اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو گن نہ سکو)۔ یہ نص قطعی اپنے عموم پر برقرار ہے کہ ظاہری، باطنی، جسمانی، روحانی، دینی، دنیوی، مال، اولاد، عزّت و سربلندی ایک ادنیٰ نعمت سے لے کر اعلیٰ نعمت تک سب کو شامل ہے، اور یہ بات ظاہر، بدیہی اور واضح ہے کہ انسان اگر اپنے بدن کے بالوں کا حساب لگائے اور گن کر شمار کرے، یا اپنے گھر و مسکن کے ذرات کو شمار کرنا چاہے تو ممکن ہے کہ ایک مرحلہ یہ گنتی و شمار مکمل معلوم ہو، مگر ربّ العزّت سبحانہ کی ہر قسم کی نعمتیں ہر شخص پر اتنی بکثرت زیادہ ہیں کہ مختصر عمر میں انہیں گن کر شمار نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔

پس روزِ قیامت حساب و کتاب کے مراحل میں ان تمام نعمتوں کے متعلق پوچھ گچھ سوال و جواب ضرور ہوگا، جس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہوگا، جب انبیاء کرام علیہم السلام اس پوچھ گچھ سے مستثنیٰ نہیں ہوں گے، تو دوسروں کی کیا

حیثیت؟ حتیٰ کہ ایک ایک قطرۂ آب جو کسی نے دنیا میں نوش جان کر کے پیا ہے ضرور اسے جواب دینا ہوگا، اگر کسی نے ان نعمتوں کی شکر گزاری میں اطاعت وفرمانبرداری کی زندگی گزاری تو وہ صاحب قسمت ہزاروں مغفرتوں کا یقیناً مستحق قرار پائے گا، اگر زندگی غفلت میں گزاری اور دنیوی ساز وسامان کا دل دادہ رہا، آخرت سے بے خبری، غفلت اور نعمتوں کی ناشکری میں قیمتی عمر ضائع کر لی تو بڑی ندامت ہوگی، اور طرح طرح کی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے اور رحم فرمائے۔ آمین

ایک عابد وزاہد کا واقعہ:

امام سیوطی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ایک عابد نے پانچ سو سال مسلسل روزہ رکھا، اور ساری رات عبادت میں گزاری، دریا کے کنارے پر پوری عمر گزاری، روزانہ ایک درخت پر انار کا پھل پیدا ہوتا، اس ایک انار اور ایک ہی گلاس پانی پر گزارہ کرتا رہا، یہ بے مثال زاہدانہ زندگی ایک روز پیغامِ موت سے ختم ہوگئی، اور اسے یہ کہہ کر جنت میں جانے کا حکم ملا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے جنت میں چلا جا، یہ حکم اسے ناگوار گزرا کہ یہ جنت محض فضل الٰہی کا نتیجہ ہوئی اور میری ریاضتوں، عبادتوں، پانچ سو سالہ روزوں کا کوئی تذکرہ وقدردانی نہیں ہوئی، فوراً فرشتوں کو حکم ہوا کہ ایک لمحہ اس کا رخ جہنم کی طرف پھیر دو، بس اتنا ہی تھا کہ اس پر دور سے ناقابلِ برداشت پیاس مسلط کی گئی، وہ نڈھال ہو کر بے قابو ہوا۔

سامنے سے فرشتہ گلاس پانی ہاتھ میں لے کر نمودار ہوا، یہ کہنے لگا: خدا کے لیے یہ پانی مجھے دیدو، فرشتہ نے کہا: قیمت کے بغیر نہیں ملے گا، کہنے لگا: اس کی قیمت کیا ہے؟ فرشتوں نے کہا: پانچ سو سالوں کی ریاضت وعبادات۔ کہنے لگے: مجھے منظور ہے، میں نے دیدیئے، اب اسے سمجھ آیا کہ زندگی کے تمام اعمال ایک ادنیٰ نعمت (گلاس پانی) کی قیمت بھی نہیں بن سکتے، اور یہ انسان بے شمار نعمتوں کا نہ شکر ادا کر سکتا ہے، نہ ان کی قیمت، پس وہ کہنے لگے: یارب مجھے محض اپنے فضل وکرم سے جنت میں داخل فرما۔ [درمنثور]

انسان کے ہر ہر رونگٹے پر اگر زبان ہو اور وہ ساری زندگی بلاوقفہ شب وروز تسبیح وتہلیل اور شکر گزاری میں کوشاں رہے بمشکل کسی ادنیٰ نعمت کا حق ادا ہو سکے، اس لئے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص اپنے اعمال کے بدلے جنت حاصل نہیں کر سکتا، دخولِ جنت محض فضل وکرم ربّ العزّت کا نتیجہ ہی ہوگا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں بھی یہی فرمایا۔ [متفق علیہ]

سُورَةُ الْعَصْرِ

مكية آياتها ۳ ركوعها ۱

سورۂ عصر مکی ہے، اس میں تین (۳) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام:

اس سورت کا نام سورة العصر ہے، پہلی آیت کے پہلے کلمہ سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

اس سورت کا نزول سورة الانشراح کے بعد ہے، یہ سورت جمہور مفسرین کے نزدیک مکیہ ہے، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔ البتہ حضرت مجاہد، قتادہ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک مدنیہ ہے، اور جمہور کا مذہب راجح ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس سورت کی تین آیتیں، چودہ کلمات اور اڑسٹھ (۶۸) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

سورة التکاثر میں اہل تکاثر وتفاخر والوں کے لئے زجر وتوبیخ کا تذکرہ تھا، جبکہ اس سورت میں ان لوگوں کا بیان ہے جو تکاثر وتفاخر سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ سورۂ تکاثر میں ناداں اور ناعاقبت اندیش لوگوں کا تذکرہ اور وعید شدید کا بیان ہوا، جبکہ اس سورت میں دانشمند اور عاقبت اندیش لوگوں کا تذکرہ ہے، جنہوں نے ایمان، عمل

صالح، تواصي بالحق اور تواصي بالخير کی نعمت حاصل کی، گویا کہ پہلی سورت میں زجر وتوبیخ وانذار ہے، اور اس سورتمیں بشارت وخوشخبری ہے۔

فضیلت:

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اگر لوگ اس سورت میں غور وفکر کریں تو یہ انہیں کافی ہے، اور اگر اس سوت کے سوا کچھ بھی نازل نہ ہوتا تو امورِ دین میں یہ سورت کافی ہوجاتی۔ یہ سورت تمام علومِ قرآنیہ اور مسائلِ مہمہ ضروریہ کی جامع ہے۔ [ابن کثیر، روح المعاني]

شانِ نزول:

کلدہ نامی کافر، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قدیمی دوست تھا، جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے راہ خداوند تعالیٰ میں اپنا وسرمایہ خرچ کیا اور کئی مسلمان غلام اور باندیوں کو ان کے مالکوں سے زرکثیر کے عوض خرید کر کے اللہ کے واسطے آزاد کرلیا، تو کلدہ نامی شخص نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو فقیر بنا کر خسارہ میں رہے، تمہاری یہ تجارت تمہیں فائدہ مند نہیں، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اس ناداں کافر سے کہا: میری تجارت نہایت فائدہ مند رہی، اس پر اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تجارت کو سراہا، اور اس جیسی جوان مردی کی تعریف فرمائی۔ الحمدللہ ربّ العٰلمین

مختصر موضوع:

انسان بحیثیت مجموعی اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتا ہے، مگر حقیقت اس طرح ہے کہ وہ شیر خوار بچوں سے بھی زیادہ ناداں ہے، وہ کامیابی وناکامی کے جو اصول وضع کرتا ہے وہ شریعت اور فطرت کے بالکل سراسر خلاف ہیں، وہ اپنی کامیابی مال ودولت، عزّت وجاہ، کثرتِ اولاد وسرمایہ میں سمجھتا ہے، اپنی گرانمایہ قیمتی زندگی کو ضائع کرنے کے درپے ہے، ربّ العزّت عزّشانہ نے اس کے نظریے کو خسارہ اور نقصان قرار دے کر اسے تنبیہ کی کہ یہ چیزیں ناپائیدار، نقصان دہ اور تباہ کن ہیں، اگر کامیابی اور ابدی سعادت کسی چیز میں مضمر ہے تو وہ یہ چار چیزیں ہیں: ایمان، عملِ صالح، وصیت بالخیر، وصیت بالصبر، یہی کامیابی کی بنیادی اصول ہیں، ان کے علاوہ دیگر تمام خود ساختہ اصول خسارے کے ہیں۔ فتدبر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِىۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾

ترجمہ: زمانہ کی قسم ① یقیناً سب انسان خسارے میں ہیں ② مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے کام کئے اچھے، اور ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی تاکید کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے ③

معارف ومنازل

عَصۡر کے بہت سے معانی میں سے، یہاں تین ہی مراد ہیں: (۱) زمانہ۔ (۲) وقت۔ (۳) صلوٰۃ عصر۔

الۡاِنۡسَان میں الف لام استغراق یا جنس کے لئے ہے، یہاں عصر کی قسم کھا کر فرمایا: سارے انسان یا بنی نوع انسان بڑے خسارے میں ہے، اور اس خسارے سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن میں یہ چار صفات ہوں (جو کامیابی اور مقصد برآوری کے اسباب ہیں): ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ حکیم وخبیر نے دارین کے خسارے سے بچنے کے لئے اور حصولِ سعادت کے لئے جو اکسیری نسخہ مرتب فرمایا وہ انہی چار چیزوں سے مرکب ہے، یہ چاروں اجزاء قرآنی تمام بیماریوں کے دفاع کے ضامن ہیں:

اول: إيمان بالله بجميع أحكامه وصفاته۔

دوم: عمل صالح بجميع أنواعه۔

سوم: تواصي بالحق۔

چہارم: تواصي بالصبر۔

اول دو کا تعلق اپنی ذات سے ہے، آخری دو کا تعلق ابنائے جنس سارے بنی نوع اور معاشرہ سے ہے۔

عصر سے کیا مراد ہے؟

عام مفسرین نے عصر سے مطلق زمانہ مراد لیا ہے، اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حسن بصری وقتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے دن کا آخری حصہ مراد لیا ہے، پھر حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے زوال سے غروب تک، اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے دن کی آخری گھڑی کو مراد لیا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ نماز عصر ہی مراد ہے، جس کو قرآن کریم نے صلوٰۃ الوسطیٰ کہا

ہے۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے شب وروز کو اس کا مصداق کہا ہے۔ یہ تعبیر کا فرق ہے، ورنہ یہ جمہور اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے موافق ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ عصر سے مراد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری حیاتِ طیبہ کا زمانہ ہے، کیونکہ وہ اشرف الاعصار ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حیاتِ طیبہ اور اس کے بعد قیامت تک کا زمانہ مراد ہے، جو پوری امت کی بقاء کا عرصہ ہے، اور سارے زمانہ کی مقدار گزشتہ زمانہ کی نسبت وہی ہے جو وقت صلوٰۃ عصر کا پورے دن کے ساتھ ہے۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إنما بقاء کم فیمن سلف قبلکم من الأمم کما بین صلوٰۃ العصر إلی غروب الشمس۔** اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود کے لئے صبح سے ظہر تک اور نصاریٰ کے لئے ظہر سے عصر تک اور اپنی امت کے لیے عصر سے غروب تک کا مختصر وقت ظاہر فرمایا، اور یہ مختصر زمانہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور آپ کی امت کا زمانہ ہے، اس لئے یہ خیر الاعصار شمار ہوا، جس کی مدت اگرچہ بہ نسبت یہود ونصاریٰ کے قلیل ہے، مگر فیوض وبرکات اس کے بہت زیادہ اور مثالی ہیں، جو قیامت تک قائم رہیں گے، کیونکہ یہ دین حنیف، ملت ابراہیمی اور خالص اسلام ہے، فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ﴾ [آل عمران:١٩] (دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔ ﴿وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ﴾ [آل عمران:٨٥] (اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا)۔

زمانہ پر قسم کھانے کا راز یہ ہے کہ ہر قسم سعادت کا حصول اسی کے ساتھ وابستہ ہے، زمانہ کا شب وروز، سال وماہ، ساعات ولمحات ہی عمر عزیز کے اوقات ہیں، چاروں اسباب ہدایت کا حصول اور تکمیل انہی کے ساتھ مربوط ہے، اسی قیمتی زمانہ وعمر کو اگر کوئی فضول کاموں میں ضائع کرے گا تو ابدی شقاوت اسے حاصل رہے گی، اور خسران وخسارہ کے سوا کچھ نہ پائے گا، مگر جو لوگ ان ایام ولمحات کو ایمان وعملِ صالح پر صرف کریں گے وہ خسارے سے نجات پائیں گے، اور ابدی وسرمدی سعادتوں سے مالا مال ہو جائیں گے، یہ ہے قسم اور جواب قسم کی تطبیق ومناسبت۔

اس اجمالی مضمون کی مزید تشریح وتفصیل یہ ہے کہ آخرت کی تجارت کا سرمایہ انسان کی عمر ہے، بدن کے سارے اعضاء اس تجارت کے لیے رأس المال کی حیثیت رکھتے ہیں، ربّ العزت سبحانہ نے ہر انسان کو زندگی کے اوقات کا ایک بیش بہا قیمتی سرمایہ دے کر تجارت پر لگا دیا ہے، پھر کرم بالائے کرم یہ کہ ایک ایک نیکی پر دس گنا سے

لے کر سات سو اور بعض روایات میں بیس لاکھ گنا ثواب کا وعدہ ہے۔ یہ وہ تجارت ہے کہ جس میں کسی خسارے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، پھر صحیح تجارت پر جو انعام ملنے کا وعدہ ہے یہ ایک زائد بخشش ہے، اب انسان کو چاہئے کہ وہ عقل وشعور سے کام لے کر اس سرمایہ کو ایک نفع بخش متاع پر لگا کر ابدی اور سرمدی منافع حاصل کرے، مٹھی بھر مٹی سے بے شمار اور ٹنوں کے حساب سے سونے موتی یاقوت مرجان جواہرات کمائے۔

حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے شرحِ مشکوٰۃ میں اسماءِ حسنیٰ کی بحث میں لکھا ہے کہ ایک مسافر قبرستان سے گزر رہا تھا، دیکھا کہ لوگ ایک میت کے دفنانے میں مصروف ہیں، ثواب کی نیت سے آگے بڑھا، دیکھا کہ لوگ فارغ ہو چکے ہیں، بس ادھر سے مٹھی بھر مٹی ہاتھ میں لے کر قبر میں گرائی اسی کی بدولت اسے جنت مل گئی۔ [مرقات المفاتیح]

چاہئے کہ انسان اپنے گرانقدر سرمایہ نیکیوں پر لگا کر ہر قسم ضرر رساں، ردی بے فائدہ کاموں سے پرہیز کرے، ورنہ وہ ایک ایسے عظیم خسارے سے دوچار ہو جائے گا، جس کی تلافی ہرگز ممکن نہیں ہوگی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: كلّ الناس يغدو فبائع نفسه فمعتقها أو موبقها۔ [مشکوٰۃ]

ہر شخص صبح اٹھ کر اپنی زندگی کا سرمایہ تجارت پر لگاتا ہے، پھر تو کوئی اپنے اس سرمایہ کو ہر قسم کے خسارہ سے آزاد کرا لیتا ہے، اور کوئی اس کو برباد کر ڈالتا ہے۔ خود قرآن پاک نے بھی ایمان وعملِ صالح کو انسان کی تجارت قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الصرف:۱۰] (کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتادوں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ [التوبۃ:۱۱۱] (خدا نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں (اور اس کے) عوض ان کے لیے بہشت (تیار کی) ہے)۔ اور کافروں کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ [البقرۃ:۱۶] (تو ان کی تجارت نے ان کو کچھ نفع نہیں دیا)۔ اور جب اوقات حیات انسان کا سرمایہ گرانمایہ قرار پائے تو عام حالات میں اس کے تاجر کا خسارہ میں رہنا اس کے لئے ظاہر ہے کہ اس بیچارے کا سرمایہ کوئی منجمد چیز نہیں، جس کو کچھ دنوں محفوظ رکھا جا سکے، بلکہ ایسا سیال سرمایہ ہے جو برف کی طرح ہر لحہ بہ رہا ہے، تاجر کو مستعد اور ہوشیار رہنا چاہئے تاکہ اس بہتی ہوئی چیز سے نفع کما لے۔

کہتے ہیں ایک بزرگ کسی برف فروش کی دکان پر گئے، تو فرمایا کہ اس کی تجارت کو دیکھ کر ''سورۃ العصر'' کی

تفسیر سمجھ میں آ گئی، یہ اگر ذرا سی غفلت کرے گا تو اس کا سرمایہ پانی بن کر بہہ جائے گا، اور یہ سراسر خسارہ میں رہ جائے گا۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے برحق کہا: ؎

عمر برف ست و آفتاب تموز ☆ اند کے ماند و خواجہ غرہ ہنوز

اس لئے اس خسارہ سے بچنے کا نسخہ قرآن حکیم نے بہتر تجویز فرمایا، جو چار اجزاء سے مرکب ہے، اپنی زندگی کا ہر لمحہ ان چار کاموں میں لگا دینے سے اس خسارہ سے ابدی نجات مل سکتی ہے۔

زمانہ کی قسم کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے، اس کی حیثیت (اس معاملہ پر جو جواب قسم ہے) ایک شاہد کی ہوتی ہے، اور زمانہ ایسی چیز ہے کہ اگر اس کی تاریخ اور اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اچھے برے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو ضرور اس یقین تک رسائی ہو جائے گی کہ صرف یہ چار کام ہیں، جن میں انسان کی فلاح و کامیابی مضمر و منحصر ہے، جس نے ان کو ترک کیا وہ ناکام خسارہ و نقصان میں پڑا رہا۔

دنیا کی تاریخ اس پر گواہ ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ عصر سے مراد زمانہ ہے، اور اللہ تعالیٰ شانہ نے زمانہ کی قسم اس لئے اختیار فرمائی کہ زمانہ بہت سے عجائبات اور نیرنگیوں پر مشتمل ہے، اسی وجہ سے زمانہ کو ابو العجائب کہتے ہیں، اور زمانہ جملہ انعامات اور حوادث و مصائب کو حاوی ہے، اس کے ساتھ انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ ہر قسم کا عروج و زوال حاصل ہو سکتا ہے، اور یہ ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی، اس کی نیرنگیاں انسانی عقل و سوچ میں نہیں سما سکتیں، اگر عصر سے مراد شام یا صلوٰۃ عصر ہو تو اس میں بھی بہت سی خصوصیات ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن اسی ساعت میں پیدا فرمایا گیا تھا، تو پیدائش کے وقت کی قسم کھا کر مقصدِ خلقت پر متوجہ کیا گیا، اسی طرح یہ وقت صلوٰۃ عصر کا بھی ہے جو کہ صلوٰۃ الوسطیٰ ہے عند الجمہور۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تارک صلوٰۃ العصر کے خسران پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: **من فاتته صلوٰة العصر فكأنما وتر أهله وماله۔** [متفق علیہ] ان وجوہات کے علاوہ دیگر بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ واللہ اعلم

چارگانہ اسباب نجات کا مختصر خلاصہ:

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان چاروں (ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق، تواصی بالصبر) امور میں اول دو کا تعلق اصلاحِ نفس اور تکمیلِ ذات سے ہے، دوسرے دو کا تعلق تکمیل و اصلاح خلق سے ہے، کیونکہ ان آخری دو سے بھی انسان کو بے حد کمالاتِ عالیہ حاصل ہو سکتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا اپنا ایمان و عملِ

صالح ایک مختصر وقت کے لئے ہوتا ہے، اور وصیت حق و وصیت صبر کا نفع خلقِ خدا میں سلسلہ وار قرنوں مدتوں تک جاری رہتا ہے جو کئی نسلوں پر حاوی رہتا ہے، اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امت میں سب سے افضل ہیں کہ ان کے منافع واجور کا سلسلہ قیامت تک امت میں جاری ہے۔

جب دربارِ رسالت سے انہیں حکم ملا کہ: فليبلغ الشاهد الغائب، تو یہ چھوٹی جماعت نے پورے اکناف و اطرافِ عالم کا رخ کیا، تعلیم وتربیت، اصلاحِ خلق، تواصی بالحق، تواصی بالصبر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد و فتوحات کے ذریعہ چاردانگ عالم میں وہ وہ کارنامے انجام دیئے جن کی نہ مثال ہے نہ نظیر۔ اگرچہ انہیں اصلاح و صلاحِ نفس، اعلیٰ درجہ کا ایمان وتقویٰ اور صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل حاصل تھا، مگر انہوں نے اس پر اکتفاء نہ کیا، اور پورے عالم میں پھیل گئے، اور زرین کارنامے انجام دیئے۔ رضوان اللہ علیہم أجمعین

اسی طرح علماء کرام جو کہ ورثۃ الانبیاء علیہم السلام کے مقام پر فائز ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد باقی امت پر انہیں وہ مقام و درجہ حاصل ہے جو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مجموعی امت پر حاصل تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیمات اور ان کے ایمانیات، سیرت وکرار، اخلاقیات اور دیگر قیمتی اعمال کی تفسیر وتشریح کا فریضہ علماء امت نے انجام دیا، اور اپنے علوم ومعارف سے دنیا کے تمام اکناف واطراف کو روشن کیا، تالیفات وتصنیفات، تبلیغ، تزکیۂ نفوس کے فوائد و منافع سے پورے عالم کو بھر دیا، یہ سب "تواصی بالحق وتواصی بالصبر" کے اقسام اور حصے ہیں۔

پھر فرمایا کہ روحانی ارشاد و تکمیل جسمانی طبابت کی مثل ومانند ہے، اور طبیب دو کام انجام دیتا ہے: اول دوا تجویز کرتا ہے۔ دوم: پرہیز بتاتا ہے، اسی طرح وصیتِ حق میں دوا تجویز کی گئی کہ وہ عقائد صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کا مجموعہ ہے، اور وصیتِ صبر میں پرہیز کی طرف اشارہ ہے، اسی طرح دونوں سے روحانی صحت حاصل ہو جائے گی۔ [عزیزی مع اضافات]

فائدہ:

لفظ تَوَاصَوْا وصیت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں: کسی کو تاکید کے ساتھ مؤثر انداز میں نصیحت اور نیک کام کی راہنمائی کرنا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ کثرت کے ساتھ مذکور ہے، اور تقریباً ہر جگہ اس کا یہی معنی ومطلب ہے۔ اسی معنی کی رُو سے مرنے والا شخص بعد والوں کو تحریری یا زبانی جو ہدایات جاری کرتا ہے اس کو بھی وصیت کہتے ہیں۔

اس کلمہ کا اطلاق حضرت حق سبحانہ کی طرف بھی شائع ہو گیا ہے: قوله تعالى: ﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ

اَوۡلَادِكُمۡ﴾ [النساء:۱۱] (خدا تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے)۔ اور پیغمبروں علیہم السلام کے لیے بھی، قوله تعالیٰ: ﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ﴾ [البقرة:۱۳۲] (اور ابرہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی)۔ سورۃ العصر میں جو "تواصي بالحق وتواصي بالصبر" مذکور ہیں وہ دونوں اسی معنی کے لحاظ سے ہیں، اور بہت ہی اہم ہیں۔

پھر ان دونوں میں کئی احتمالات ہو سکتے ہیں: اول یہ کہ حق سے عقائدِ صحیحہ واعمالِ صالحہ کا مجموعہ مراد ہو، اور صبر سے مراد تمام گناہوں اور برے کاموں سے بچنا ہو، تو "تواصي بالحق" کا حاصل أمر بالمعروف اور ﴿وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ﴾ کا حاصل نهي عن المنكر ہوا، اور دونوں کے مجموعہ کا حاصل پھر وہی ایمان وعملِ صالح ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ جس کام کو خود اختیار کیا ہے اسی کی وصیت ونصیحت دوسروں کو کرنی چاہیے۔

دوم یہ کہ حق سے مراد اعتقاداتِ حقہ ہیں، اور صبر کے مفہوم میں تمام اعمالِ صالحہ کا کرنا اور تمام گناہوں سے بچنا داخل ہے، اب اس سابقہ تشریح سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو صرف اپنی ذات کو قرآن وسنت کا تابع بنالینا، نیکیاں اختیار کرنے کے ساتھ گناہوں سے بچنا کہ جس کو اصلاحِ نفس وتقویٰ کہتے ہیں، کافی نہیں، بلکہ دوسروں کو خاص کر اپنے ماتحتوں اور رشتہ داروں، عزیز وقریبوں اور دیگر متعلقین کو بھی ایمان وعملِ صالح کی طرف دعوت دینا، اور مقدور بھر حسب گنجائش ان کی اصلاح کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ خصوصاً اپنے اہل وعیال وقریبی عزیزوں سے اس معاملہ میں غفلت برتنا اور انہیں نظر انداز کرنا جائز نہیں ہوگا۔

قرآن حکیم اور احادیثِ نبویہ نے اس سلسلے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو فرض قرار دیا ہے، قوله تعالیٰ: ﴿وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ﴾ [الشعراء:۲۱۴] (اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنادو)۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِيۡكُمۡ نَارًا﴾ [التحريم:٦] (اے مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل عیال کو آتش (جہنم) سے بچاؤ)۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی خبر گیری اور خیر خواہی واصلاح، نیز علمی اور عملی اصلاح کا ہر وقت خیال رکھنا نہایت ضروری اور فرض ہے۔ اس سے اصلاحِ احوال واصلاحِ معاشرہ وجود میں آکر اسلامی معاشرہ قرآن وسنت کے مطابق بن کر مسلمانوں کی زندگی جنت نظیر بن جائے گی، اور تمام مذہبی دینی اقدار کی پذیرائی سے تمام خدشات اور ہر قسم کے خطرات نیست ونابود ہو جائیں گے۔

الصبر صبر کی تینوں اقسام: (۱) الصبر على الطاعات۔ (۲) الصبر على المصائب والآفات۔

(۳) الصبر عن المعاصي والخطيآت پر مفصل کلام گزر چکا ہے، وہاں ملاحظہ ہو۔

لطیفہ:

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ جب خلیفہ تھے، ایک بدوی نے مجمع عام میں ان کو سخت نازیبا گالیاں دیں، سارے لوگ اس کو مارنے پر تیار ہوئے، امام صاحبؓ نے انہیں روکا اور کہا کہ بیچارہ مجبور ہے، بھوکا ہے، یا قرضدار مفلس ہے، اس کو کپڑے دے دو، خوراک دے دو اور پیسے دے دو، چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی، دوسرے روز پھر وہ شخص آیا تو حضرت امامؓ نے فرمایا: ابھی خوش ہو یا کوئی اور ضرورت بھی ہے؟ رو رو کر کہنے لگا: کچھ نہیں، صرف آپ کا امتحان کرنا چاہا کہ دیکھوں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا خون آپ میں کس قدر ہے؟ ان کے پاکیزہ خصائل اور اوصافِ حمیدہ سے آپ کو کیا حصہ ملا ہے؟ الحمد للہ! آپ صبر و استقامت کے پہاڑ ثابت ہوئے، مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

سُورَةُ الْهُمَزَةِ

مكية آياتها ۹ ركوعها ۱

سورۂ ہمزہ مکی ہے، اس میں نو (۹) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورة الهمزة ہے، پہلی آیت کے پہلے لفظ سے یہ نام ماخوذ ہے۔

نزول:

اس کا نزول سورة القيمة کے بعد ہے، یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت نو (۹) آیات، بیس (۲۰) کلمات اور ایک سوتیس (۱۳۰) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

سورۃ العصر میں تمام انسانوں میں خسارے کا بیان ہوا، بجز ان لوگوں کے جن میں چار اوصاف ہوں، اس سورت میں اس عمومی خسارے کے اسباب کا بیان ہے۔

گناہ کی دو اقسام ہیں: حقوق اللہ میں کوتاہی، جیسے ترکِ طاعات والتزامِ منہیات ومعاصی وغیرہ۔ دوم حقوق العباد میں کوتاہی اور ان کا ترک۔ قسم ثانی میں ایذا رسانی، حق تلفی، سب وشتم، عیب جوئی، آبرو ریزی، غیبت و بہتان، طعن وتشنیع وغیرہ کا شمار بڑے جرائم میں ہوتا ہے، جن سے پورا معاشرہ برباد ہوکر فتنہ وفساد کے پھیل جانے کا خطرہ پیدا

ہوجاتا ہے، اور اجتماعی زندگی تباہ ہوجاتی ہے، اور سارے حقوق ملیامیٹ ہوجاتے ہیں، جن سے دنیا وآخرت دونوں کا خسارہ جنم لیتا ہے، تو سورۃ العصر میں مطلق خسران کا ذکر تھا، یہاں خاسروں کے حالات (اسباب) کا ذکر و بیان اور ان سے اجتناب کے بیان کے ساتھ عذاب وتباہی کا تذکرہ ہے۔

شانِ نزول:

اصل شانِ نزول تو ان کمینہ اخلاق اور رزیل خصلتوں کا وجود ہی ہے کہ جب یہ برائیاں معاشرہ میں عام ہوجاتی ہیں تو قرآن حکیم مصلحانہ انداز میں ان پر گرفت کرنے کے ساتھ سختی سے تنبیہ کرتا ہے، اور سخت وعید وعقاب پر خبردار کرتا ہے۔ ابتداء نبوت اور رسالت کے شروع میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ روحي وأبي وأمي) پر سردارانِ قریش نے جو نا قابلِ برداشت طعن وتشنیع اور بہتانوں کا سلسلہ شروع کیا تھا انہیں سن کر جگر مایوف ہوجاتا ہے اور دل صدمہ سے نا کارہ ہوجاتا ہے۔

عقبہ بن ابی معیط، ابوجہل بن ہشام، ولید بن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث، امیہ بن خلف، عاص بن وائل، اخنس بن شریق اور نصر بن حارث وغیرہ ہمہ وقت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی بدگوئی، طنز ومزاح، غیبت و استہزاء سے کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے، آمنے سامنے آکر گالیاں دیتے، آنکھوں کے اشارے سے طنز کرتے حتیٰ کہ عقبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے پر تھوکا، وہ تھوک لوٹ کر اس کی اپنی پیشانی پر انگارہ بن کر چمٹا، جس سے اس ملعون کے چہرہ پر داغ اور بہت بدنما داغ پیدا ہوا، جو مدۃ العمر کھجلی بن کر رہا۔ اخنس نے منہ ٹھیرھا کرکے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آکر بکواس وبدگوئی کی اس کا منہ ٹھیرھا ہی رہا۔ یہ سورت مبارکہ ایسے لوگوں کے حق میں نازل ہوئی۔

الحمد للہ رب الغلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الأمین۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ۝۱ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۝۲ یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ۝۳
کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَۃِ ۝۴ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحُطَمَۃُ ۝۵ نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ ۝۶ الَّتِیۡ
تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ ۝۷ اِنَّہَا عَلَیۡہِمۡ مُّؤۡصَدَۃٌ ۝۸ فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ ۝۹

ترجمہ: بربادی ہے ہر عیب جوئی کرنے اور طعنہ دینے والے کے لیے ① جس نے مال اکٹھا کیا، اور اس کو گن گن کر رکھا ② وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشگی عطا کردے گا ③ ہرگز ایسا کبھی نہ ہوگا، اس کو ٹکڑے کرنے اڑا دینے والی آگ میں جھونک دیا جائے گا ④ اور آپ کو کیا معلوم کہ کیسی ہے ٹکڑے اڑا دینے والی آگ؟ ⑤ وہ اللہ تعالیٰ کی دہکائی ہوئی آگ ہے ⑥ جو دلوں تک اس کی حرارت جا پہونچے گی ⑦ بیشک وہ آگ ان پر لمبے لمبے ستونوں میں بند کردی جائے گی ⑨

معارف ومنازل

اس سورت میں تین بڑے بدترین گناہوں پر اجمالاً وعید شدید ہے، اس کے بعد وضاحت کے ساتھ دوزخ کے ایک خاص بدترین طبقہ ''حطمہ'' کے عذاب کی دھمکی ہے، یہ اتنی بڑی دھمکی ہے کہ اس کے سننے سے کان بہرے ہوجاتے ہیں، کلیجہ پھٹ جاتا ہے، دل دماغ ناکارہ ہوجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ شانہ بچائے اور رحم فرمائے۔ آمین

وہ تین گناہ یہ ہیں: (۱) همزة۔ (۲) لمزة۔ (۳) جمع مال۔

همزة: مبالغہ کا صیغہ ہے، بمعنی بڑا عیب جو، کثیر الغیبۃ، بہت طعنہ دینے والا وغیرہ۔

لمزة: یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے، بمعنی پس پشت غیبت کرنے، لعن طعن سب وشتم کرنے والا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک همزة ولمزة تقریباً ایک ہی ہیں، زبان سے، آنکھوں سے، یا سر کے اشارے سے عیب جوئی، چغلخوری، نکتہ چینی، غیبت، بہتان، طعنہ زنی، خواہ پیٹھ پیچھے ہو یا آمنے سامنے ہو۔ یہ دونوں گناہ نہایت سخت ناقابلِ معافی جرم ہیں، اور جمہور بھی یہی کہتے ہیں، کیونکہ اس طرح کی حرکات، دل شکنی، تفرقہ، اہانت، تذلیل، توہین پیدا کرتی ہیں، اور پورے معاشرے پر اثر انداز ہوکر ایک قسم کے ہیجان دشمنی اور بے اعتمادی پیدا کرتی ہیں، جس سے پورا ماحول مسموم ہوجاتا ہے، اور انسانی شرافت تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔

اس سلسلے میں مختلف ائمہ نے همز ولمز کے مختلف معانی بیان کئے ہیں، لیکن مطلب و مراد تقریباً سب کا ایک ہی ہے، اگرچہ تعبیریں مختلف ہیں، مآل سب کا ایک ہے۔ واللہ اعلم

جمع مال: یہ تیسرا بڑا گناہ ہے، تو فرمایا: ﴿الَّذِىْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَهٗ﴾ جس نے مال اکٹھا کیا، اور گن گن کر رکھا۔ مالدار لوگ بڑے حریص اور کنجوس ہوتے ہیں، روزانہ بار بار اپنے سرمایہ کا حساب کرکے خوش یا ناخوش

ہو جاتے ہیں، اور کبھی سیر ہونے کا نام نہیں لیتے ہیں۔ اگر اس پورے جہاں پر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو جو چیز پورے عالم پر حکمرانی کر رہی ہوتی ہے تو وہ یہی سرمایہ مال ہے، اس لئے فرمایا کہ مال جمع کیا اور شمار کر کر کے اسے رکھا، یعنی جس کو مال کی بے جا محبت اور شدید حرص ہے جس کی وجہ سے وہ اس کو گن گن کر رکھتا ہے، اور اس پر جو حقوقِ واجبہ ہوں انہیں ادا نہیں کرتا، چونکہ دوسری آیات وروایات اس پر شاہد ہیں کہ حلال وشرعی طریقہ پر مال جمع کرنا گناہ نہیں، اس لئے یہاں جمع مال سے مراد وہی جمع مال ہے جو حرام طریقہ پر غیر شرعی ہو، یا اس کے حقوقِ واجبہ ادا نہ کئے گئے ہوں، یا اس سے تکاثر وتفاخر مقصود ہو، اور اس کی محبت میں منہمک ہو کر دین کی ضروریات کو نظر انداز کیا گیا ہو۔

غیبت وطعنہ زنی اور عیب جوئی وبدگوئی جو کرتا ہے وہ خود کو بہتر وبرتر گمان کرتا ہے، اور اس کبر وتعلّٰی کے عموماً اسباب حسن وجمال، علم وکمال، حسب ونسب اور ہنر وکسب وغیرہ ہوتے ہیں، لیکن ان سب میں بڑا سبب مال ہوتا ہے، دولت کا نشہ بڑا خطرناک ہوتا ہے، جو آدمی کو اندھا، بے عقل اور ناداں کرتا ہے، اور غربت وافلاس میں تو سارے فخر وغرور خاک میں مل جاتے ہیں، اسی لئے آج تک کسی مفلس نے خدائی کا دعویٰ نہیں کیا، تو ساری برائیوں کی اصل وبنیاد خصوصاً مذکورہ جرائم کا منشاء مال ہی ہے، اسی لئے تیسرا جرم جمع مال کو قرار دیا گیا جو کہ جرم بھی ہے اور سارے جرائم کی اصل وبنیاد بھی ہے۔

﴿یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ﴾ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال سدا اس کے ساتھ رہے گا، یا اس کو ہمیشگی دے گا۔ یعنی اس کا یہ گمان ہے کہ مالدار کو طویل زندگی ملے گی، نادار بھوک سے مر جائے گا، اور مال اس کو باقی رکھے گا، اس کلام کا حقیقی مفہوم مراد نہیں ہے، کیونکہ کسی بھی مالدار کا یہ خیال نہیں ہوتا کہ وہ کبھی نہ مرے گا، مرنے کا تو سب کو یقین ہے، بلکہ اس مین باین انداز موت سے اس کی غفلت اور لمبی امیدوں کو بیان کیا گیا ہے، یا یہ کلام تعریض ہے کہ حقیقت میں دوامی زندگی عطا کرنے والا مال نہیں، بلکہ ایمان وعملِ صالح ہے۔

یا اس کا انہماک، مثلاً تعمیرات کرنا، بڑے بڑے قلعے وبنگلے بنانا، باغات لگانا اور لمبے چوڑے ٹاٹ باٹ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے شاید اس کو مرنا نہیں، اگرچہ اس کا یقین ایسا نہ ہو، مگر اس کے طرز زندگی سے کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ مرنے کے موڈ میں نہیں، یا یہاں استفہامی معنی مراد لیا جائے، پھر معنی یہ ہوگا کہ کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ مال اس کو دوام بخشے گا؟ اور وہ مال کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا؟ ہرگز نہیں! پس یہ استفہام انکاری کے معنی میں ہوا۔ واللہ اعلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چوکور لکیر کھینچی اور مربع خط کے درمیان باہر کو نکلتی ہوئی ایک لکیر اور کھینچی، اور اس وسطی لکیر کی جانب دونوں طرف سے آتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لکیریں متعدد بنادیں، اور فرمایا: وسطی لکیر انسان ہے، اور باہر کو نکلا ہوا حصہ انسان کی طول امل اور آرزو ہے، اور یہ چھوٹی لکیریں انسانی اغراض ہیں، اب اگر ایک طرف والی لکیر سے بچ جاتا ہے تو دوسری طرف والی لکیر اس کو پکڑ کر نوچتی ہے، اور اگر اس سے بچ جاتا ہے، تو یہ اسے نوچتی ہے۔ [مشکوٰۃ، مظهري]

﴿كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ﴾ ہرگز نہیں! اس کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے، اس کو ضرور حطمة میں پھینکا جائے گا۔ حطمة جہنم کا نام ہے، حطم کے معنی توڑنا، ریزہ ریزہ کرنا، روندنا، کیونکہ جہنم کے اندر جو چیز ڈالی جائے گی جہنم کی آگ اسے ریزہ ریزہ، توڑ مروڑ اور روند کر شکستہ کر کے رکھ دے گی، کیونکہ اس کی شدت نہایت سخت اور نا قابل تصور ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کی جلائی ہوئی آگ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آگ ہزار برس تک بڑھکائی گئی، یہاں تک کہ سرخ ہوگئی، پھر ہزار برس بڑھکانے کے بعد سفید ہوگئی، پھر ہزار برس تک بڑھکائی گئی تو سیاہ ہوگئی، اب وہ سیاہ تاریک ہے۔ [ترمذي]

غافل انسان کو جھنجوڑ کر بیدار کیا جارہا ہے کہ ذرا دنیاوی آگ کا تصور کر کے اندازہ لگاؤ، یہ دنیوی آگ جس میں لوہے، پتھر، تانبے وغیرہ پگھل کر پانی کی طرح سیلان وجاری ہوتے ہیں، یہ آگ جہنم کی آگ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، جہنم کی آگ اس دنیاوی آگ سے ستر گنا تیز ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوزخی کو اگر جہنم کی آگ سے نکال کر دنیا کی کسی بڑی آگ میں ڈال دیا جائے، تو اسے سکون کی نیند آجائے اور وہ آرام سے سوجائے، کیونکہ یہ آگ اس جہنمی آگ کے مقابلے میں پانی کی طرح سرد ہے۔ اے ابن آدم! ذرا اپنے اوپر ترس کھاؤ، اپنے نرم ونازک بدن پر رحم کرو، تم دنیا کی معمولی آگ کا ایک معمولی چھنگاری برداشت نہیں کر سکتے، پس جہنم کے عذاب سے بچو، ایمان وعملِ صالح اختیار کر کے جنت اور اس کی لازوال راحتوں تک پہنچنے کی کوشش کرو۔

﴿الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ﴾ وہ آگ دلوں پر پہنچے گی۔ یوں تو ہر آگ میں یہ خاصیت موجود ہے کہ جو بھی اس میں ڈالی جائے، وہ اس کے تمام اجزاء تک پہنچ کر اسے جلا کے فنا کرتی ہے، تو انسان کو جب آگ میں ڈالا جائے گا تو اس کے تمام اجزاء کے ساتھ دل بھی جل جائے گا، مگر یہاں دوزخ کی آگ کی یہ خصوصیت اس لئے بیان کی گئی کہ دنیا کی آگ جب انسانی بدن کو لگتی ہے تو دل تک پہنچنے سے پہلے ہی انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے، اور دوزخ

میں چونکہ موت نہیں آئے گی تو اس کی دل تک بحالت حیات پہنچ جائے گی، اور دل جلنے کی تکلیف بحالت حیات محسوس ہوگی۔ ایک حدیث میں ہے کہ جہنم کی آگ دوزخیوں کو کھالیتی ہے یہاں تک کہ جب دل تک پہنچ جائے گی تو رک جائے گی، پھر دوزخی کو دوبارہ پہلی حالت پر لوٹا دیا جائے گا، پھر آگ اس کو جلا کر دل تک پہنچے گی تو رک جائے گی، علیٰ ہذا القیاس یہ سلسلہ ابدالآباد چلتا رہے گا۔ نعوذ باللہ

اس کے علاوہ یہ وجہ بھی ہے کہ تمام بدن میں سب سے زیادہ حساس دل ہے، اور غلط عقائد کفر وشرک معاصی وغیرہ کا محرک ومرکز چونکہ دل ہے، اس لئے شدتِ عذاب کا تعلق اسی سے زیادہ ہوگا، اور ''نار اللہ'' کی آماجگاہ وہی ہوگی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی آگ اگر کسی انسان پر مسلط ہوگی تو اول ظاہری اعضاء کو جلائے گی، پھر قلب ودیگر اعضاء باطنی تک پہنچے گی، مگر جہنم کی آگ اپنی ہمہ گیر تیزی اور لطافت کی وجہ سے براہ راست دل پر حملہ آور ہوگی، اس کی مثال بجلی ہے، کرنٹ لگنے کے ساتھ اول وپہلی دفعہ دل پر حملہ آور ہونے سے فوراً موت واقع ہوجاتی ہے۔

﴿اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ﴾ وہ آگ دوزخیوں پر بند کی جائے گی۔ تاکہ اس کی تیزی برقرار رہے، اور اس کی حرارت میں کوئی کمی نہ آئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دوزخی جب دوزخ میں ہمیشہ کے لیے ڈالے جائیں گے تو ان کو لوہے کے بڑے صندوق میں بند کیا جائے گا، اور صندوقوں میں لوہے کی کیلیں ٹھوک دی جائیں گی، پھر ان صندوقوں کو دوسرے آہنی صندوقوں میں بند کر کے جہنم کی زیرین تہہ میں پھینک دی جائے گی، اور کوئی جہنمی کسی دوسرے کے عذاب کو نہ دیکھ سکے گا۔

﴿فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾ وہ بڑے بڑے آگ کے ستونوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے۔ نہ حرکت کر سکیں گے، نہ انہیں اکھیڑ سکیں گے، ہمیشہ جلتے گھٹتے رہیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ دوزخیوں کو ستونوں میں داخل کرے گا، پھر ستونوں کو ان پر تانا جائے گا، ان کی گردنوں میں زنجیریں پڑی ہوں گی، اور اوپر سے ایک ستون کے ذریعہ ان پر دروازے بند کر دئے جائیں گے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ عَمَدٍ دوزخ کے کواڑوں کی وہ کیلیں ہیں کہ دوزخیوں کو اندر کر کے دوزخ کے کواڑوں کو بند کر دیا جائے گا، اور وہ کیلیں ٹھوک دی جائیں گی۔ اللھم أجرنا وجمیع المسلمین من النار۔ آمین

فائدہ:

دوزخ کے طبقات جو قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں وہ تقریباً سات طبقے ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

① جهنم۔ ② السعير۔ ③ لظی۔ ④ الحطمة۔ ⑤ السقر۔ ⑥ الجحیم۔ ⑦ الهاوية۔ [ابن کثیر، درمنثور، البدور السافرة]

اور دوزخ کے طبقات کا سات ہونا اس لئے ہے کہ کفار، مشرکین، منافقین، فجار و فاسقین کے جرائم مختلف ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ فرعون و نمرود جیسے مدعیانِ اُلوہیت اور ایک عام کافر کا جرم ایک جیسا نہیں ہوتا، ہم دنیا کے اندر رہتے ہیں، دور و نزدیک سے مختلف قسم کے جرائم کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو بہت بڑا فرق معلوم ہوتا ہے، انہیں جرائم کے پیش نظر جہنم کے درکات بھی مختلف ہوئے ، اور ہر جرم کی سزا بھی مختلف ہوگی، پھر اکثر جہنم کی سزا تقریباً اپنے متعلق کی مثالی شکل کی طرح ہوگی۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معیت میں دوزخ کے مختلف طبقات اور مختلف جرائم کی مختلف کیفیت کی سزاؤں کا بھی معائنہ کیا اور ہر سزا کو اس کے متعلق جرم کی شکل میں مجھے دکھایا گیا۔

سورۂ ہمزۃ میں ہمز و لمز اور جمع مال جیسے جرائم کی سزا جو تجویز ہوئی، جسے قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا، اس کا پس منظر بھی کچھ یوں معلوم ہوا کہ ہمز و لمز سے لوگوں کی توہین اور کسر شان ہوتی ہے، اس کی سزا حطمة قرار دی گئی، جو اس مجرم کی دھجیاں اس طرح اڑا دے گی جس طرح اس نے لوگوں کی دھجیاں اڑا کر ان کی تذلیل و بے عزتی کی اور عیب جو طعنہ دینے والے نے خود کو برتر اور اعلیٰ سمجھا، اور دوسروں کو حقیر و کمتر سمجھا، تو اس کی سزا نبذ في النار منتخب ہوئی، وہ کتے کی طرح حقیر و خوار ہو کر بدترین آگ میں ڈالا گیا۔

اور جب تمام برائیوں کا سبب حبِّ مال ہے اور محبت مال کا مرکز دل رہا، تو اس کی سزا: ﴿تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ﴾ کی شکل میں سامنے آئی کہ جہنم کی آگ براہ راست اس کے قلب پر حملہ آور ہوگی، اور مالِ حرام کو گن گن کر بکسوں، الماریوں اور تجوریوں میں بھر بھر کر رکھنے کی سزا یہ مقرر ہوئی کہ جہنم کے ستونوں میں جکڑ دیا جائے، اور ہر طرف سے آگ اس پر بند کی جائے گی، جیسا عمل ویسی سزا۔ نعوذ باللہ من النار

یاد رہے العبرة لعموم الألفاظ لا لخصوص الأسباب سورت کریمہ کا نزول اگرچہ چند مجرموں (جن کے نام شان نزول کے تحت بیان ہوئے) کے بارے میں ہے، مگر قیامت تک جو بھی شخص ان جرائم کا ارتکاب کرے گا وہ انہی سزاؤں میں مبتلا رہے گا۔ فاعتبروا یا أولی الأبصار۔

سُورَةُ الفِيل

مكيةٌ آياتها ٥ رکوعها ١

سورۂ فیل مکی ہے، اس میں پانچ (۵) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الفیل ہے، پہلی آیت میں یہ لفظ مذکور ہے، اسی سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے، اس کا نزول سورۃ الکٰفرون کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس سورت اس میں پانچ (۵) آیات، بیس (۲۰) کلمات اور چھپن (۵۶) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

(۱) اس سورت میں کَیۡدَهُمۡ کا کلمہ مذکور ہے۔ کفار مکہ کا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت، طعنہ زنی اور عیب جوئی ایک کید تھا، جس کا اخروی انجام پہلی سورے میں بیان کیا گیا، اس سورۂ فیل میں ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ دنیا میں بھی اس جرم کا انجام بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں، جس طرح اصحاب فیل نے کعبۃ اللہ شریف کے ساتھ کید کیا تو وہ برباد ہوئے، تم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کید کررہے ہو، جن کی عظمت وشان اللہ تعالیٰ شانہ کے نزدیک بیت اللہ شریف سے بدرجہا بڑھ کر ہے، تو تمہارا انجام اصحاب فیل سے بھی بدتر ہوگا۔

(۱) سابقہ سورت میں برے اعمال کا اخروی انجام بیان ہوا، جبکہ اس سورت میں جرائم کے دنیوی انجام کا تذکرہ ہے۔

(۳) جرائم کا منشاء مال ودولت ہے، اس کے متعلق یہ خیال لغو اور باطل ہے کہ مال ہمیشہ ساتھ رہے گا یا ساتھ دے گا، یا موت وہلاکت کے پنجہ سے چھڑالے گا، جیسا کہ سورتِ سابقہ میں اس پر تنبیہ کی گئی، اس سورت میں اس کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے کہ ابرہہ اشرم کے مال ودولت اور بادشاہت نے نہ اس کا ساتھ دیا اور نہ ہی تباہی وہلاکت سے اس کو بچاکر اس کو ہمیشگی ودوام بخشا۔

(۴) سابقہ سورت میں اہل مکہ کو ڈرایا گیا تھا کہ وہ اطاعت پر آمادہ ہوں، اس سورت میں ایک مخصوص نعمت کا ذکر ہورہا ہے کہ شاہ ابرہہ کے ظلم وتعدّی سے تمہارے معبد (کعبۃ اللہ) کو اور تم کو اللہ تعالیٰ شانہ نے محفوظ رکھا، کیونکہ جس طرح وعید انسان کو اطاعت پر آمادہ کرتی ہے، اسی طرح انعام واحسان بھی آدمی کو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔

اصحاب فیل کا واقعہ:

اس واقعہ کی شہرت اتنی عام ہے کہ کتب حدیث وتفسیر، سیرت وتاریخ نے اس واقعہ کو مختلف انداز میں بسط وتفصیل کے ساتھ عمدہ طریقے پر بیان کیا ہے۔ مورخ کبیر مفسر ابن کثیر دمشقی نے اس واقعہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ یمن پر ملوک حمیر (عرب) کا قبضہ تھا، یہ لوگ مشرک تھے، ان کا آخری بادشاہ ذونواس تھا، جس نے اس زمانہ کے اہل حق نصاریٰ پر شدید مظالم کئے، اسی نے ایک طویل عریض خندق کھدواکر اس کو آگ سے بھردی اور جتنے نصرانی مؤمن بت پرستی کے خلاف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے ان سب کو اس آگ کی خندقوں میں ڈال کر جلادیا، جن کی تعداد بیس یا ستر ہزار کے قریب تھی، یہی وہ خندق کا واقعہ ہے جس کا ذکر اصحابُ الاخدود کے نام سے سورۃ البروج میں گزرا ہے۔

ان میں سے دو آدمی کسی طرح اس کی گرفت سے بچنے میں کامیاب ہوئے، اور یہ دونوں وہاں سے نکل بھاگے، اور قیصر ملک شام سے جاکر فریاد کی کہ ذونواس حمیری نے نصاریٰ پر ایسا ظلم کیا ہے کہ انہیں خندقوں میں ڈال ڈال کر جلاڈالے، آپ ان کا انتقام لیں، قیصر ملک شام نے شاہ حبشہ کو خط لکھا، یہ بھی نصرانی تھا اور یمن سے قریب تھا کہ آپ اس ظالم سے انتقام لیں، اس نے اپنا عظیم لشکر دو کمانڈروں (امیر ارباط اور ابرہہ) کی قیادت میں یمن کے بادشاہ کے مقابلہ پر بھیج دیا، لشکر اس کے ملک پر ٹوٹ پڑا اور پورے یمن کو قوم حمیر کے قبضہ سے آزاد کرالیا۔

ملک حمیر ذونواس بھاگ نکلا اور دریا میں غرق ہوکر مرگیا، اس طرح ارباط وابرہہ کے ذریعہ یمن پر شاہ حبشہ کا قبضہ ہوگیا۔

پھر ارباط وابرہہ میں باہمی جنگ ہوکر ''ارباط'' قتل ہوا اور ابرہہ غالب آگیا، اور یہی ابرہہ شاہ نجاشی کی طرف سے ملک یمن کا حاکم (گورنر) مقرر ہوگیا، اس نے یمن پر قابض ہوکر ارادہ کیا کہ یمن میں ایک ایسا شاندار کنیسہ بنائے جس کی نظیر دنیا میں نہ ہو، اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ یمن کے عرب لوگ جو حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ جاتے ہیں اور بیت اللہ شریف کا طواف کرتے ہیں، وہ اس کنیسہ کی عظمت وشوکت سے مرعوب ہوکر کعبہ کی بجائے اس کنیسہ میں جانے لگیں۔

اس خیال پر اس نے بہت بڑا خوبصورت عالیشان کنیسہ اتنا اونچا تعمیر کیا کہ اس کی بلندی پر نیچے کھڑا ہوا آدمی نظر نہیں ڈال سکتا تھا، اور اس کو سونے چاندی اور جواہرات سے مرصع کیا تھا، اور پوری مملکت میں اعلان کرادیا تھا کہ آئندہ یمن سے کوئی کعبہ شریف کے حج کے لئے نہ جائے۔

عرب میں اگرچہ بت پرستی غالب آگئی تھی، مگر دینِ ابراہیمی وکعبہ شریف کی عظمت ومحبت ان کے دلوں میں پیوست تھی، اس لئے عدنان وقحطان وقریش کے قبائل میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی، یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے رات کے وقت کنیسہ میں داخل ہوکر اس کو گندگی سے آلود کیا، اور بعض روایات میں ہے کہ ان میں سے ایک مسافر قبیلہ نے کنیسہ کے قریب اپنی ضرورت کے لئے آگ جلائی اس کی آگ کنیسہ میں لگ گئی اور کنیسہ کو سخت نقصان پہنچ گیا، ابرہہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی اور بتایا گیا کہ کسی قریشی نے یہ کام کیا ہے تو اس نے قسم کھائی کہ میں ان کے کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہوں گا۔

ابرہہ نے اس کی تیاری شروع کی اور شاہ نجاشی سے اجازت مانگی اس نے اپنا خاص ہاتھی، جس کا نام ''محمود'' تھا ابرہہ کے لئے بھیج دیا کہ وہ اس پر سوار ہوکر کعبۃ اللہ پر حملہ کرے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ سب سے بڑا عظیم الشان ہاتھی تھا، جس کی کوئی نظیر نہیں پائی جاتی تھی، اور اس کے ساتھ آٹھ ہاتھی دوسرے بھی اس لشکر کے لئے شاہ حبشہ نے بھیج دیئے تھے، ہاتھیوں کی یہ تعداد بھیجنے کا منشا یہ تھا کہ بیت اللہ شریف کے شہید کرنے میں ہاتھیوں سے کام لیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ بیت اللہ شریف کے ستونوں میں لوہے کی مضبوط وطویل زنجیریں باندھ کر ان زنجیروں کو ہاتھیوں کے گلے میں باندھیں اور ہنکا دیں، تو سارا بیت اللہ (معاذ اللہ) زمین پر آگرے گا۔

عرب میں جب اس حملے کی خبر پھیلی تو سارا عرب مقابلہ کے لئے تیار ہو کر آ گیا۔ یمن کے عربوں میں ایک شخص ''ذونفر'' نامی تھا اس نے عربوں کی قیادت اختیار کی اور عرب لوگ اس کے گرد جمع ہو کر مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے، اور ابرہہ کے خلاف جنگ کی مگر اللہ تعالیٰ شانہ کو یہ منظور تھا کہ ابرہہ کی شکست ورسوائی نمایاں ہو کر دنیا کے سامنے آئے، اس لئے یہ عرب مقابلہ میں کامیاب نہ ہوئے۔ ابرہہ نے ان کو شکست دیدی، اور ''ذونفر'' کو قید کر لیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

اس کے بعد جب وہ قبیلہ خثعم کے مقام پر پہنچا، تو اس قبیلے کے سردار نفیل ابن حبیب نے پورے قبیلہ کے ساتھ ابرہہ کا مقابلہ کیا، مگر ابرہہ کے لشکر نے ان کو بھی شکست دیدی، نفیل بن حبیب کو بھی قید کر لیا، اور ان کے قتل کا ارادہ کیا، مگر پھر یہ سمجھ کر ان کو زندہ رکھا کہ ان سے ہم راستوں کا پتہ معلوم کر لیں گے، اس کے بعد جب یہ لشکر طائف کے قریب پہنچا تو طائف کے باشندے (قبیلہ ثقیف) جو پچھلی جنگ اور ابرہہ کی فتح کے واقعات سن چکے تھے، انہوں نے اپنی خیر منانے کا فیصلہ کیا، اور یہ کہ طائف میں جو ہم نے ایک عظیم الشان بت خانہ لات کے نام سے بنا رکھا ہے، یہ اس کو نہ چھیڑے، تو ہم اس کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ انہوں نے ابرہہ سے مل کر یہ بھی طے کر لیا کہ ہم تمہاری امداد اور راہنمائی کے لئے اپنا ایک سردار ''ابورغال'' تمہارے ساتھ بھیج دیتے ہیں، ابرہہ اس پر راضی ہو گیا اور ابورغال کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ کے قریب ایک مقام ''مغمس'' پہنچ گیا (یہ مقام عرفات کے ساتھ ہے) جہاں قریش مکہ کے اونٹ چر رہے تھے۔

ابرہہ کے لشکر نے سب سے پہلے ان پر حملہ کر کے اونٹ اپنے قبضہ میں لے لئے، جن میں سے دوسو (۲۰۰) اونٹ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب (رئیس قریش) کے بھی تھے، ابرہہ نے یہاں پہنچ کر اپنا ایک سفیر حناط حمیری کو شہر مکہ میں بھیجا کہ وہ سرداران قریش کو مطلع کر دے کہ ہم تم سے جنگ کرنے نہیں آئے، ہمارا مقصد صرف کعبہ شریف کو ڈھانا ہے، اگر تم نے اس میں رکاوٹ نہ ڈالی تو تم کو کوئی نقصان نہ ہو گا۔ حناط حمیری جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو سب نے اس کو عبدالمطلب کا پتہ دے دیا کہ وہ قریش کے سب سے بڑے سردار ہیں، حناط نے عبدالمطلب سے گفتگو کی اور ابرہہ کا پیغام پہنچا دیا۔

ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق عبدالمطلب نے یہ جواب دیا کہ ہم بھی ابرہہ سے جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، نہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم اس کا مقابلہ کر سکیں، البتہ میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے،

اور اس کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے، وہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے، اللہ تعالیٰ سے جنگ کا ارادہ ہے تو چاہے کرے، پھر دیکھے کہ اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے؟ کیا کچھ معاملہ ہوگا؟

حناط حمیری نے عبدالمطلب سے یہ کہا کہ تو پھر آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو ابرہہ سے ملاتا ہوں، ابرہہ نے جب عبدالمطلب کو دیکھا کہ بڑے وجیہہ آدمی ہے، تو ان کو دیکھ کر اپنے تخت سے نیچے اتر کر بیٹھ گیا، اور عبدالمطلب کو اپنے برابر بٹھایا، اور اپنے ترجمان سے کہا کہ عبدالمطلب سے پوچھو کہ وہ کس غرض سے میرے پاس آئے ہیں؟ عبدالمطلب نے کہا کہ میری ضرورت تو بس اتنی ہے کہ میرے اونٹ جو آپ کے لشکر نے گرفتار کر لئے ہیں وہ چھوڑ دیں۔

ابرہہ نے ترجمان کے ذریعہ عبدالمطلب سے کہا کہ جب میں آپ کو اول مرتبہ دیکھا تو میرے دل میں آپ کی بڑی وقعت و عظمت پیدا ہوگئی، مگر آپ کی گفتگو نے اس کو بالکل ختم کر دیا کہ آپ مجھ سے صرف دوسو اونٹوں کی بات کر رہے ہیں، اور یہ معلوم ہے کہ میں آپ کا کعبہ، جو آپ کا دین ہے اس کو ڈھانے کے لیے آیا ہوں، اس کے متعلق آپ نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ اونٹوں کا مالک تو میں ہوں، مجھے ان کی فکر ہے اور بیت اللہ کا مالک میں نہیں، بلکہ اس کا مالک ایک عظیم ہستی ہے، وہ اپنے گھر کی حفاظت خود جانتا ہے۔ ابرہہ نے کہا کہ تمہارا خدا اس کو میرے ہاتھ سے نہ بچا سکے گا، عبدالمطلب نے کہا کہ پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔

اور بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطلب کے ساتھ اور بھی قریش کے چند سردار گئے تھے، اور انہوں نے ابرہہ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ اگر آپ بیت اللہ پر دست اندازی نہ کریں، اور واپس ہو جائیں تو ہم پورے تہامہ کی ایک تہائی پیداوار آپ کو بطور خراج ادا کرتے رہیں گے، مگر ابرہہ نے اس کے ماننے سے انکار کر دیا اور عبدالمطلب کے اونٹ ابرہہ نے واپس کر دیئے۔

وہ اپنے اونٹ لے کر واپس چلے آئے اور بیت اللہ کے دروازہ کا حلقہ پکڑ کر دعا میں مشغول ہو گئے، قریش کی ایک بڑی جماعت بھی ان کے ساتھ تھی، سب نے اللہ تعالیٰ شانہ سے دعائیں کیں، کہ ابرہہ کے عظیم لشکر کا مقابلہ ہمارے بس میں نہیں، آپ ہی اپنے گھر کی حفاظت کا انتظام فرمائیں۔ الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرنے کے بعد عبدالمطلب مکہ مکرمہ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مختلف پہاڑوں پر چلے گئے اور شہر خالی کر گئے، ان کو یہ پورا یقین تھا کہ ابرہہ کے لشکر پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا، اسی یقین کی بناء پر انہوں نے ابرہہ سے خود اپنے اونٹوں کا مطالبہ

کیا تھا، اور کعبہ شریف کا معاملہ اس کے ربّ عز شانہ پر چھوڑ دیا تھا، اور بیت اللہ کے متعلق گفتگو کرنا اس لئے پسند نہ کیا کہ خود اس کو مقابلہ کی طاقت نہ تھی، اور دوسری طرف یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ دشمن کی قوت کے مقابلہ میں ان کی بے بسی پر رحم فرما کر خود اس کے عزائم کو خاک میں ملا کر انہیں ضرور کوئی عبرتناک عذاب سے دوچار فرمائیں گے۔

جب صبح ہوئی تو ابرہہ نے بیت اللہ شریف پر چڑہائی کی تیاری شروع کی، اور اپنے ہاتھی محمود کو آگے چلنے کے لئے تیار کیا، اس وقت وہ اپنے غرور وسرکشی میں ہر نتائج سے بے پرواہ نظر آتا تھا۔ نفیل بن حبیب جس کو راستے سے ابرہہ نے گرفتار کیا تھا وہ آگے بڑھے اور ہاتھی کا کان پکڑ کہنے لگے کہ تو جہاں سے آیا ہے وہیں صحیح وسالم واپس چلا جا، کیونکہ تو اللہ تعالیٰ کے محفوظ شہر میں ہے، یہ کہہ کر ہاتھی کا کان چھوڑ دیا۔ ہاتھی یہ سنتے ہی بیٹھ گیا، ہاتھی بان نے اس کو اٹھا کر چلانا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا، اس کو بڑے بڑے آہنی تیروں سے مارا مگر اس نے کوئی پروانہ کی اس کی ناک میں لوہے کا آنکڑا ڈال دیا گیا، پھر بھی وہ کھڑا نہ ہوا، تب ان لوگوں نے اس کو یمن کی طرف لوٹانا چاہا، تو فوراً کھڑا ہو گیا، پھر شام کے طرف چلانا چاہا، تو چلنے لگا، پھر مشرق کی طرف چلایا، تو چلنے لگا، ان سب اطراف میں چلانے کے بعد اس کو مکہ مکرمہ کی طرف چلانا چاہا تو وہ پھر بیٹھ گیا۔

وہ سارے اسی کشمکش میں رہے کہ قدرت خداوندی کا یہ کرشمہ تو یہاں ظاہر ہوا، عین اسی لمحہ دوسری طرف دریا (وہاں سے دریا نزدیک ہے) سمندر کی طرف سے کچھ پرندوں کی قطاریں اڑتی ہوئی دکھائی دیں، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ تین کنکریاں چنے مسور کے برابر کی تھیں، ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں۔

واقدی کی روایت میں ہے کہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے، جثہ میں کبوتر سے چھوٹے تھے، ان کے پنجے سرخ تھے، ہر پنجہ میں ایک کنکر اور ایک چونچ میں لئے آتے دکھائی دیئے، اور فوراً ہی ابرہہ کے لشکر پر چھا گئے، یہ کنکریاں جو ہر ایک کے ساتھ تھیں ابرہہ کے لشکر پر بندوق کی گولیوں کی طرح پھینک دئیں، ایک ایک کنکر نے وہ کام کیا جو ریوالور کی گولی بھی نہیں کر سکتی کہ جس پر پڑتی اس کے بدن کو چھیدتی ہوئی زمین میں گھس جاتی تھی، یہ عذاب دیکھ کر ہاتھی سب بھاگ کھڑے ہوئے، صرف ایک ہاتھی رہ گیا تھا جو ایک کنکری سے ہلاک ہوا اور لشکر کے تمام آدمی اس وقت ہلاک نہیں ہوئے، بلکہ مختلف اطراف میں بھاگے، ان سب کا یہ حال ہوا کہ وہ راستہ میں مر مر کر گر گئے۔

ابرہہ کو چونکہ سخت سزا دینی منظور تھی اس لئے وہ فوراً ہلاک نہیں ہوا، بلکہ اس کے جسم میں ایسا زہر سرایت کر گیا

کہ اس کا ایک ایک جوڑ گل سڑ کر گرنے لگا، اسی حال میں اس کو یمن واپس لایا گیا۔

دار السلطنت صنعاء پہنچ کر اس کا سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہہ گیا اور وہ مر گیا، ابرہہ کے ہاتھی محمود کے ساتھ وہ دو ہاتھی بان یہیں مکہ میں رہ گئے، مگر اس طرح کہ وہ اندھے، اپاہج اور معذور ہو گئے تھے، ان کو نشانہ عبرت بنا کر قدرتِ الٰہی نے زندہ رکھا تھا کہ لوگ ان سے تمام ماجرا اور صورت حال سن کر خوش ہو جائیں اور عبرت پکڑیں، کیونکہ میدانِ عذاب کے یہی دونوں چشم دید گواہ تھے، انہوں نے ستر ہزار (۷۰۰۰۰) لشکر کی تباہی کا اپنی آنکھوں سے نظارہ و مشاہدہ کیا تھا۔ فاعتبروا... وقولوا: ﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ [البروج: ۱۲]

زحکمش دو نیم ست دریائے نیل ☆ بمرغان کشد فیل واصحاب فیل

نظامی

یہ دونوں ہاتھی بانوں نے ذلّت و خواری کی لمبی عمر پائی، زمانہ رسالت اور کچھ اور زیادہ ایام تک مکہ مکرمہ میں زندہ رہے، حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ان کو دیکھا۔ مورخ محمد بن اسحٰق نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے ان دونوں فیل بانوں کو مکہ میں اس حالت میں دیکھا کہ وہ اندھے اور اپاہج تھے، لوگوں سے بھیک مانگتے تھے، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی انہیں دیکھا تھا کہ وہ اپاہج اندھے تھے اور بھیک مانگتے تھے۔

یہ واقعہ اصحاب فیل ابرہہ اشرم کے لشکر کی تباہی کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بروزِ یکشنبہ (اتوار) ۲۲ محرم سید المرسلین امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت میمونہ باسعادت سے تقریباً پچاس (۵۰) روز پہلے پیش آیا، ابھی تک وہ آثار باقی تھے کہ آپ دنیا میں تشریف لائے۔ اکثر علماء و مورخین کا یہی قول ہے اور یہی معتمد علیہ اور صحیح ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ ابراہیم بن المنذر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں علماء اسلام میں سے کسی ایک کو بھی شک نہیں، اور اسی پر اجماع ہے، اور اس کے خلاف جس سے بھی منقول ہے وہ غلط ہے، مثلاً مقاتل نے کہا کہ یہ واقعہ ولادت باسعادت سے چالیس سال پہلے پیش آیا، کسی نے کہا کہ تیس سال پہلے، کسی نے کہا: ستر سال پہلے، کسی نے کہا: دس سال پہلے، کسی نے کہا: پندرہ سال پہلے، اور کلبی نے تیئس سال پہلے کا کہا، یہ سب اقوال غیر صحیح ہیں، مگر جمہور کا قول وہ پہلا صحیح راجح قول ہے، اور یہی ابن حبان رحمہ اللہ کی تاریخ میں ہے۔

امام سہیلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کانت في محرم والولادة السعيدة في ربيع الأول بعد خمسين يومًا۔ وقال الحافظ الدمياطي: بخمسة وخمسين يوما، وقيل بأربعين يوما، وقيل بشهر، والمشهور ما قال السهيلي وهو المنقول عن الحبر أي ابن عباس رضي الله عنه۔ والله أعلم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ۱ اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍ ۲ وَّاَرۡسَلَ
عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ ۳ تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۴ فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ۵

ترجمہ: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے ربّ نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ ۱ کیا ان کی تدبیر کو اس نے ملیامیٹ نہیں کر دیا؟ ۲ اور ان پر غول کے غول پرندے بھیج دیئے ۳ جو ان پر جھانوے کے پتھر (کنکریاں) پھینکتے تھے ۴ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا ۵

معارف ومنازل

﴿اَلَمۡ تَرَ﴾ میں خطاب مخصوص ہے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، اور یہ بھی صحیح ہے کہ خطاب عام ہو قیامت تک سارے مخاطبین کے لئے، لہٰذا دونوں معنی درست ہیں۔ اگر تَرَ میں رؤیت بصری مراد ہو گی بھی صحیح ہے، اگر رؤیت قلبی بمعنی علم کے ہو، یہ سب سے بہتر ہے جو کہ قیامت تک آنے والوں کے لئے ہو گا۔

اَلَمۡ تَرَ کے معنی ہیں: ألم تعلم بمعنی رؤیت علمی کے۔ بظاہر جو واقعہ یقینی ہو اس کے ثبوت میں کوئی شک وشبہ نہ ہو، اور عام طور پر لوگوں نے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہو، یا تواتر کے ساتھ منقول ہو تو اس کے علم کو بھی لفظ رؤیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اتنا پختہ اور یقینی ہے گویا اس کو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، اور ایک حد تک یہ ثابت بھی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک اس واقعہ کے آثار ونشانات بھی موجود تھے، خاص کر وہ دونوں اندھے اپاہج ہاتھی بان جو چشم دید گواہی دیتے رہتے تھے۔

اگر خطاب کو خاص رکھا جائے اور رؤیت سے رؤیتِ بصری ہو، تو اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہو گی اور تسلی بھی، اور اس کے نہ ماننے والے کفار مکہ کے لیے ایک قسم کی وعید وتوبیخ بھی کہ جس طرح کعبہ پر حملہ آوروں

پر عذاب نازل ہوا اسی طرح تم جیسے حملہ آور دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔

﴿اَبَابِیۡلَ﴾ ایک خاص پرندہ کا نام ہے، یہاں وہ مراد نہیں، بلکہ ابابیل کے معنی ہیں: پرندوں کا غول، جماعت، پرندوں کا جھنڈ۔ یہ پرندے کبوتر سے کچھ چھوٹے تھے، ان کا رنگ سبز تھا اور چونچیں زرد، دغول درغول جھنڈ (اجتماع) کے ساتھ سمندر سے آئے، اور چند لمحوں میں چابکدستی کے ساتھ پورے لشکر پر چھا گئے اور انہیں نیست ونابود کر کے رکھ دیا۔ اس قسم کے پرندے نہ پہلے کسی نے دیکھے تھے اور نہ آئندہ کسی نے دیکھے۔ قتادہ نے کہا کہ ان کے رنگ سیاہ تھے۔ سعید بن جبیر کی روایت میں وہ سبز رنگ کے تھے، اور اس میں یہ راز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ضعیف وکمزور مخلوق کے ذریعہ ایک بڑے جرار لشکر کی تباہی کا فیصلہ فرمایا، جنہیں اپنی کثرت، ظاہری اسباب وسلاح اور دیوہیکل ہاتھیوں پر غرور گھمنڈ تھا، وہ اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے، اسی طرح نمرود بن کنعان کے لاکھوں فوجیوں پر مشتمل لشکر کو مچھروں کے ذریعہ تباہ وبرباد کر دیا گیا، تا کہ انہیں عبرت کا سبق سکھا کر بتا دیا جائے کہ ہر طاقتور مسلح زور آور نافرمان اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں نہایت کمزور وعاجز ہے، اگر وہ چاہے، تو نہایت کمزور مخلوق کے ذریعہ اسے تختہ مشق بنا کر تہس نہس کر دے، تو وہ اس پر قادر ہے۔

اگر غارِ ثور میں وہ اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت ادنیٰ ترین کمزور مکڑی اور کبوتر سے کرے، وہ اس حیران کن حفاظت پر بھی قادر ہے، یہی مطلب ہے: ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ﴾ [ھود: ۴] کا۔

﴿تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ﴾ مجاہد اور فریابی نے کہا کہ سجیل معرب ہے سنگ گل کا، قوم لوط علیہ السلام کی تباہی بھی انہیں سجیل پتھروں کی بارش سے ہوئی، لقوله تعالیٰ: ﴿ وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ﴾ [الحجر: ۷۴] (اور ان پر پتھر کی تہہ بہ تہہ (یعنی پے در پے) کنکریاں برسائیں)۔ اس کو جھانوہ کہتے ہیں، مٹی کے گارے کو چنے برابر گول کر کے آگ (یہاں جہنم کی آگ مراد ہے) پر اینٹ کی طرح پکاتے ہیں، پس یہ ایک قسم کا پتھر بن جاتا ہے، جس میں پتھر اور آگ دونوں کی خاصیت آجاتی ہے، انہیں پتھروں سے بموں کا کام لیا گیا، اور ننھے منے چھوٹے پرندوں کے ذریعہ پھینکے گئے اور مارے گئے جو شہسواروں کے بدن کو چھید کر ان کی سواری کے جسم کو پار کر کے زمین میں گھس جاتے اور انہیں نیست ونابود کر کے جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرتے، تا کہ مکہ مکرمہ کی زمین ان کے ناپاک جسموں سے گندہ نہ ہو، اور کوئی بھی تعفن وبدبوئی پیدا نہ ہو۔

جس طرح عام حالات میں لوگ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو آگ لگاتے ہیں وہ سارا گند جل کر راکھ بن جاتا

ہے، اور تعفن جاتی رہتی ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ ستر ہزار کا لشکر سواریوں سمیت راکھ بن کر سرزمین مکہ وعرفات کو اس کے تعفن گند اور بدبوئی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاک رکھا گیا۔ فسبحان من بيده خزائن الرحمة وسوط العذاب۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہر پرندہ کا مخصوص شکار ہوتا تھا، اور اس کے کنکر پر اسی مجرم کا نام لکھا ہوا ہوتا تھا، ان پرندوں نے اندھا دھند تیر ماری نہیں کی، بلکہ ہر پرندہ اپنے مخصوص شکار پر حملہ آور ہوا، اور اسے راکھ بنا کر چھوڑ گیا۔

﴿عَصْف﴾ بھوسے کو کہتے ہیں، ہر خشک گھاس کے چھوٹے چھوٹے منتشر اجزاء کو بھی کہتے ہیں، اور جانور انہیں کھاتے ہیں تو فنا ہو جاتے ہیں، پھر لید و گوبر میں تبدیل ہو کر اور بھی کم ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر ایک اونٹ یا گائے کو ایک من گھاس کھلاؤ تو ایک من گھاس سے گوبر اور لید بمشکل اس کے پیٹ سے تین چار کلو کی مقدار خارج ہو جائے، یہی حال دیگر کھانے والوں کا بھی ہے، اس میں بلیغ تشبیہ ہے کہ ہر لشکری سپاہی کا راکھ اتنا مختصر نکلا اور ہواؤں نے اسے اڑا کر سرزمین مکہ مکرمہ کو ہر قسم کے تعفن و گند سے پاک رکھا۔

الحمدللہ آج بروزِ جمعرات، ٦ شعبان، سرزمین مکہ میں سورۃ الفیل کی تفسیر مکمل ہوئی۔

سید عبدالستار شاہ

سُورَةُ قُرَيْشٍ

مکیۃٌ آیاتھا ۴ رکوعھا ١

سورۂ قریش مکی ہے، اس میں چار (۴) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ قریش ہے، یہ نام پہلی آیت میں لفظِ قُرَيْشٍ سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے، اور اس کا نزول سورۂ تین کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت چار (۴) آیتوں، سترہ (١٧) کلمات اور تہتر (٧٣) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

اصحاب فیل کے اس عجیب وغریب واقعہ نے (جس کا ذکر سورۂ فیل میں ہوا) تمام عرب قوم کے دلوں میں قریش کی عظمت بڑھا دی تھی، اور سب نے تسلیم کیا تھا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لوگ ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں (ابرہہ اور اس کے لشکر) کو ہلاک فرمایا، اس عظمت کا اثر یہ ہوا تھا کہ قریش کے لوگ عرب کے مختلف ممالک کا بغرض تجارت امن وسلامتی کے ساتھ سفر کرتے رہتے تھے، تمام ممالک کے راستوں میں دورانِ سفر انہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ درپیش نہ ہوتا تھا، اور سب لوگ ان کا تحفظ واحترام کرتے تھے، حالانکہ دوسروں کے لیے یہ

راستے پرخطر رہتے تھے، اور ہر قسم کا لوٹ مار قتل وغارت جاری رہتی تھی۔قریش کے ان مامون سفروں کا ذکر اس سورت میں بیان فرما کر ان کو شکر نعمت کی دعوت دی گئی ہے، اس سے دونوں سورتوں میں ایک خاص ربط معلوم ہوتا ہے۔

اس پر مفسرین کا اتفاق ہے کہ مضمون کے لحاظ سے یہ سورۂ قریش سورۂ فیل سے بہت ہی مناسبت رکھتی ہے، شاید اسی شدید مناسبت کی وجہ سے بعض مصاحف میں ان دونوں سورتوں کو اس طرح ایک کر کے لکھا گیا ہے کہ ان کے درمیان میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" بھی نہیں لکھی گئی ہے، چنانچہ ایک گروہ نے دونوں کو ایک ہی سورت خیال کرلیا، اور اسی قسم کی چیزوں سے استدلال کیا، مثلاً: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ان دونوں کے درمیان میں بسم اللہ کا فصل نہ تھا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز مغرب میں پہلی رکعت میں سورۂ تین پڑھی، اور دوسری رکعت میں اَلَمْ تَرَ كَيْفَ اور لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ دونوں کی تلاوت کی، اور دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں پڑھی۔

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ یہ استدلال صحیح نہیں، کیونکہ مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی نقل میں اختلاف ہے، بعض میں بسم اللہ ہے، بعض میں نہیں اور مثبت نفی پر مقدم ہوتا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قراءت میں بھی احتمالات ہیں، ممکن ہے راوی نے بسم اللہ نہ سنی ہو، اور آپ نے پڑھی ہو، یا آہستہ سے پڑھی ہو وغیرہ، وإذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

لیکن صحیح وثابت یہی ہے کہ سورۂ قریش ایک مستقل علیحدہ سورت ہے، کیونکہ جامع قرآن حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے جب تمام مصاحف قرآن کو یکجا جمع کر کے ایک نسخہ تیار کیا اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع منعقد ہوا۔ جمہور علماء اسی مصحف عثمانی کو امام کہتے ہیں، تو اس مصحف عثمانی میں دونوں کو دو مستقل سورتیں قرار دیا گیا، اور درمیان میں بسم اللہ شریف بھی لکھی گئی۔

قریش کی سات خصوصیات:

حضرت ابن عباس اور حضرت ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ شانہ نے قریش کو سات ایسی خصوصیات کے ذریعہ فضیلت عطا فرمائی کہ وہ خصوصیات نہ ان سے پہلے کسی کو ملیں نہ ان کے بعد کسی کو ملیں گی:

(١) میں ان میں پیدا ہوا۔ (٢) نبوت ان میں ہوئی۔ (٣) کعبہ کی دربانی ان کے لئے مخصوص رہی۔ (٤) حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت ان کو دی گئی۔ (٥) اصحاب فیل کے مقابلے میں ان کو کامیابی ہوئی۔ (٦) سات اور

ایک روایت میں دس برس تک قریش کے سوا کسی نے اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کی، یعنی نبوت کے ابتدائی سات یا دس سال میں ان کے علاوہ اور کوئی مسلمان نہیں ہوا (قوم کے غلام و باندی قوم ہی کے افراد شمار ہوں گے، کوئی اشکال نہیں رہا)۔ (۷) قریش کے متعلق مستقل ایک سورت نازل کی گئی، جس میں ان کے علاوہ کسی اور کا ذکر نہیں کیا گیا، اور وہ سورت لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ہے۔ [رواہ الحاکم والطبراني، والبخاري في التاریخ]

اس حدیث سے بھی اس سورت کا استقلال معلوم ہوا، علاوہ ازیں دونوں سورتوں کا طرز و مضمون الگ الگ ہے، تو مصحف امام میں جب الگ الگ سورتیں لکھی ہوئی ہیں، تو پھر کسی اور دلیل کی احتیاج نہیں۔

خاصیت سورۂ قریش:

حضرت ابوالحسن قزوینی کہتے ہیں کہ جس شخص کو کسی دشمنی یا کسی اور مصیبت کا خوف ہو، اس کے لئے اس مبارک سورت کا ورد جاری رکھنا امان ہے، اس کو امام جزری نے نقل کیا اور فرمایا کہ یہ عمل مجرب ہے۔

صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ مجھے میرے شیخ (حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ) نے خوف و خطر کے وقت اس سورت کے پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہر بلا و مصیبت کو دفع کرنے کے لیے اس کا پڑھنا مجرب ہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے بھی اس کا بارہا تجربہ کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سفر میں اس کا پڑھنا آرام و راحت کا سبب ہے۔ بندہ ناچیز راقم الحروف کے معمولات میں شامل ہے، میرا تجربہ ہے کہ مذکورہ فوائد کے علاوہ اطمینانِ قلب اور دفعِ بلا و کشائش رزق کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ فلیجرّب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾

ترجمہ: چونکہ قریش خوگر ہو گئے ہیں ﴿۱﴾ یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہو گئے ہیں ﴿۲﴾ تو ان کو چاہیے کہ وہ اس خانہ کعبہ کے ربّ کی عبادت کیا کریں ﴿۳﴾ جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا، اور ان کو خوف میں امن دیا ﴿۴﴾

معارف ومنازل

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ﴾ یہ لام حرف جار جو کہ سورت کے شروع میں آیا ہے، اس کا تعلق تین چیزوں سے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے:

(۱) اس کا تعلق ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ۵﴾ [القریش] کے ساتھ اگر مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ: ''ہم نے ہاتھی والوں کو جو قریش کے دشمن تھے اس لئے ہلاک کیا کہ قریش گرمی وسردی کے سفروں کے خوگر عادی تھے تاکہ ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ بنے، اور سب کے دلوں میں ان کی عزّت واحترام پیدا ہو جائے''۔ فصار الکلام فجعلهم یا أهلکناهم لایلف قریش۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق فعل محذوف اعجبوا کے ساتھ مانا جائے تو مطلب اس طرح ہوگا کہ: ''تم قریش کے معاملہ سے تعجب کرو، خوش ہو جاؤ کہ وہ کس طرح گرمی سردی میں بے خوف وخطر آزادانہ سفر کرتے رہتے ہیں''۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ مابعد میں واقع فعل ﴿فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ﴾ کے ساتھ متعلق ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ: ''قریش اگر دوسری بے شمار نعمتوں کی بناء پر اللہ ربّ العزّت کی عبادت نہیں کرتے تو اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کے طور پر ان کو ضرور عبادت الٰہی میں لگ جانا چاہئے کہ ان کو سردی وگرمی کے دو سفروں سے خاص لگاؤ پیدا کر دیا ہے، جس سے بلا خوف وخطر ان کے معاش کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو امن میں رکھا، جبکہ سفروں میں بہت سارے خطرات ہوتے ہیں، اور ان کے دشمن ابرہہ کو ہلاک کر کے کعبۃ اللہ کو محفوظ رکھا، اور ان کی قدر وقیمت تمام قبائلِ عرب کے دلوں میں پیدا کر دی، جس سے ان کے سر فخر ومباہات سے بلند ہوئے۔

بہرکیف! قریش کا مسکن ایک غیر ذی ذرع وادی (مکہ مکرمہ) ہوتا تھا، جہاں کھانے پینے اور دیگر اسبابِ معاش سارے مفقود تھے، یہ لوگ گرمی کے موسم سرد علاقہ (ملک شام) اور سردی کے موسم گرم علاقہ (ملک یمن) کے سفروں کے عادی تھے۔ وہ اپنے پورے سال کی معاشی ضروریات انہی دو سفروں سے پوری کرتے تھے۔ سو (۱۰۰) دوسو (۲۰۰) اونٹوں کا قافلہ ملک شام ویمن جا کر خریداری کر کے پورے سال کی معاشی ضروریات کی تجارت کر کے مکہ مکرمہ لاتے تھے۔ ان ہی سفروں کی بدولت ان کی تجارت عروج پر تھی، جس کی بدولت قریش کے بیشتر خاندان

بڑے بڑے سرمایہ دار اور دراہم ودنانیر کے مالک شاہوکار ہوتے تھے، ایک ایک شخص ہزاروں اونٹوں کا مالک شمار ہوتا، اور لاکھوں کروڑوں دراہم ودنانیران کی تجارت وکاروبار کا سرمایہ ہوتا تھا۔ کعبۃ اللہ کی دربانی کی بدولت تمام قبائل عرب میں عزّت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور پورا جزیرہ ان کا احترام کرتا تھا۔

قریش کون ہیں؟

قبیلہ کنانہ کی ایک شاخ عرب میں خاندان قریش کے ساتھ مشہور تھی، اسلام سے پہلے دیگر تمام قبائل عدنان پر اس کو برتری حاصل تھی، طلوعِ اسلام کے بعد تو پوری ملت اسلامیہ نے اس کی عظمت وشرافت تسلیم کرلی۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے قبیلہ قریش کو وہ عروج وفضیلت حاصل ہوئی جو پورے عرب، بلکہ سارے جہاں پر اس کی عظمت وشرف کو چار چاند لگ گئے، اور یہ قبیلہ ساری ملت اسلامیہ کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کے مورث اعلیٰ تک تیرہ پشتیں ہیں، اور اس سے اوپر عدنان تک سات پشتیں ہیں، وہ اس طرح حضرت خاتم الانبیاء سید عالم محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت عبداللہ، عبدالمطلب، ہاشم، عبدمناف، قصی، کلاب، مرہ، کعب، لوی، غالب، فہر، مالک، نضر، قریش کا مورث اعلیٰ یہی نضر ہے، اسی کو قریش کہا جاتا ہے، اس سے اوپر کا سلسلہ یہ ہے: کنانہ، خزیمہ، مدرکہ، الیاس، مضر، نزار، معد، عدنان، ہے، وهو أصح الأقوال وأثبتها عند القرطبي۔ وقيل: وعليه الفقهاء لظاهر ماروي أنه عليه الصلوة والسلام سئل عن قريش فقال: من ولد النضر وقيل: ولد فهربن مالک بن النضر، وحكي ذلک عن الأكثرين بل قال الزبير بن بكار: أجمع النسابون على أن قريشاً إنماتفرقت عن فهرواسمه عندغير واحد قريش وفهر لقبه ويكنى بأبي غالب۔ [روح المعاني]

قبائل قریش کی تین شاخیں تھیں: کچھ قبائل تو وادی کے اندر آباد تھے، جن کو قریش بطحاء یا ''قریش اباطح'' کہا جاتا تھا۔ ان میں مندرجہ ذیل قبائل شامل تھے: بنی عبدمناف، بنی اسد بن عبدالعزیٰ، بنی زہرہ، بنی تیم، بنی مخزوم، کچھ وادی کے باہر بالائی حصوں میں آباد تھے، ان کو قریش ظواہر کہا جاتا تھا۔ ان میں بنی ادرم بن غالب، بنی محارب، بنی فہر، اور بنی مصیص شامل تھے۔ تیسری شاخ مکہ مکرمہ کی سکونت ترک کردی تھی، بنی اسامہ بن لوی عمان میں جا کر بس گئے تھے اور بنی خشعم یمامہ میں آباد ہوئے۔

☆☆☆

قریش کی وجہ تسمیہ:

حضرت معاویہؓ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے قریش کی وجہ تسمیہ پوچھی، تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قریش ایک بڑا دریائی جانور ہوتا ہے، جس طرف اس کا گزر ہوتا ہے اگر کوئی موٹا یا دبلا جانور ہوتا ہے جو اس کے سامنے آجاتا ہے تو یہ اس کو کھالیتا ہے، مگر اس کو کوئی جانور نہیں کھاسکتا، وہ سب پر غالب آتا ہے، اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اس جانور کو قریش اور قرش بھی کہتے ہیں۔ صاحب قاموس کہتے ہیں یہ قرشۃ سے ماخوذ ہے، بمعنی جمع کرنا، کاٹنا، ضم کرنا، قریش چونکہ سب ہی حرم شریف میں جمع تھے اور ہر طرف، شام، عراق، یمن اور مصر سے تجارتی مال جمع کرنے کے عادی تھے، وغیرہ۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد اسماعیل میں سے کنانہ کو، اور کنانہ میں سے قریش کو، اور قریش میں سے بنی ہاشم کو، اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمالیا ہے۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ تمام آدمی قریش کے تابع ہیں، خیر میں بھی اور شر میں بھی، اور فرمایا جب تک قریش دین کو قائم رکھیں گے یہ امر خلافت ان میں رہے گا، جو ان سے دشمنی رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کو منہ کے بل گرادے گا۔ [بخاري]

﴿رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ﴾ مکہ مکرمہ جہاں اللہ پاک عزّ شانہ کا گھر ہے وہاں نہ زراعت ہوتی ہے، اور نہ باغات ہیں کہ وہاں کے باشندوں کے لئے غلہ، پھل اور میوے دستیاب ہوں، اسی لئے بیت اللہ شریف کے بانی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے فرزند (اسماعیل) اور بیوی (ہاجرہ) کو اس مقام پر چھوڑتے وقت یہ دعا فرمائی تھی: ﴿رَبَّنَآ اِنِّيۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِيۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِۙ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ﴾ [إبرهيم:٣٧] (اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو میدان (مکہ) میں جہاں کھیتی نہیں تیرے عزت (وادب) والے گھر کے پاس لابسائی ہے، اے پروردگار! تا کہ یہ نماز پڑھیں تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کردے کہ ان کی طرف جھکے رہیں، اور ان کو میووں سے روزی دے)۔

دوسری جگہ ہے: ﴿وَارۡزُقۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ﴾ [البقرة:١٢٦] (ان کے کھانے کو میوے عطا کر) یعنی یہاں کے باشندوں کو پھلوں سے روزی عطا فرمایئے۔ اس لئے اہل مکہ کے معاش کا مدار اس پر رہا کہ وہ تجارت کے لیے ہر طرف سفر کریں اور شام یمن وغیرہ سے اپنی ضروریات مہیا کریں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اہل مکہ بڑے افلاس اور تکلیف میں تھے، یہاں تک کہ سرور عالم صلی

اللہ علیہ وسلم کے جدامجد ہاشم نے قریش کو دوسرے ملکوں میں تجارت پر آمادہ کیا، اور ملک شام ویمن کی طرف وہ حسب موسم سردی وگرمی میں تجارت کر کے بہت سے منافع حاصل کرتے رہے۔ یہ دونوں ملک ہر طرح سرسبز اور آباد تھے، وہاں ہر قسم کا مال بکثرت دستیاب ہوا کرتا تھا، اور چونکہ بیت اللہ کے خادم ہونے کا شرف انہیں حاصل تھا اس لئے تمام عرب ان کا احترام اور عزّت کرتے تھے، ان کے ساتھ ہر قسم کے مدارات کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اور ہر قسم کی لوٹ مار کرنے والے قزاقوں سے محفوظ و مامون رہتے تھے، شامی اور یمنی لوگ لین دین کے معاملات میں بھی ان کے ساتھ مشفقانہ و ہمدردانہ طرز وطریقہ اختیار کر کے انہیں فائدہ پہنچاتے تھے۔

حضرت ہاشم چونکہ ان کے سردار تھے اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ اس تجارت میں جو منافع ہوتے وہ قریش کے امیروں اور غریبوں سب ہی پر تقسیم کرتے تھے، اس طرح ان کا غریب آدمی بھی مالداروں کے برابر سمجھا جاتا تھا، پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے ان پر مزید یہ احسان فرمایا کہ ان کے دشمن ''ابرہہ'' کو مع اس کے لشکر وساز وسامان کے ابابیل پرندوں کے ذریعہ تباہ و برباد فرمایا، اور مختصر مدت کے بعد انہی کی نسل سے شہر مکہ میں سید کائنات برکت ورحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر انہی کی زبان میں ہدایت عالم کی خاطر قرآن حکیم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔

یہ وہ نعمتیں ہیں کہ سارا جہاں ایک طرف اور یہ نعمت پوری دنیا پر بھاری اور قیمتی ہے، بلکہ ساری خدائی ایک طرف اور یہ نعمت ایک طرف، وہ الگ داستان ہے کہ قریش کے صنادید اس نعمت کی قدردانی میں ناکام رہے، مگر ان کی نسل نے اپنے بڑوں کے برخلاف اس نعمت کی قدردانی کی اور تاریخ میں محیر العقول کارنامے نقش کئے۔ رضی اللہ عنہم

﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ﴾ پس ان کو چاہئے کہ (اس نعمت کے شکر میں) اس گھر کے مالک کی عبادت کریں۔ یہاں تذکیر بانعامِ اللہ کے ضمن میں انہیں ہدایت کا پیغام دیا جارہا ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے ربّ کی عبادت کریں، جس ربّ نے کعبہ کے طفیل انہیں گوناگوں نعمتوں سے نوازا، اور کعبہ کی برکت سے ان کے دشمنوں کو برباد کیا، اور کعبہ کے طفیل سب سے بڑی نعمت جو امن وسلامتی ہے انہیں عطا فرمائی، ان تمام نعمتوں کا سرچشمہ چونکہ کعبہ شریف ہے، اس لئے ﴿رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ﴾ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہوا۔ کعبہ ان کے لئے، بلکہ قیامت تک کے لوگوں کے لیے برکات وفضائل، امن وسلامتی اور دیگر بے شمار انعامات اور کرامات کا سرچشمہ اور مرکز ہی ہے، اور ﴿وَهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران:۹۶] (اور جہان کے لیے موجب ہدایت ہے) کا شرف وبزرگی اسے حاصل ہے۔

الكعبة ونبذة من تاريخها وفضائلها وتعميرها وبناءها إلى يومنا هٰذا:

بیت اللہ شریف کا نام کعبۃ اللہ بھی ہے اور بغیر اضافت الکعبۃ بھی ہے۔ کعبۃ اللہ شریف انبیاء علیہم السلام کا اور مسلمانوں کا قبلہ صلوٰۃ ہے، اور یہ بہت بڑا عظیم شرف ومنزلت ہے۔ یہ مقدس کعبۃ اللہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور عظیم انوار وبرکات کا مرکز ومنبع ہے، یہاں صبح وشام برکات رحمانیہ کا ظہور ونزول ہوتا رہتا ہے، روئے زمین پر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے جو گھر تیار ہو کر بنایا گیا وہ کعبۃ اللہ شریف ہی ہے، جو مرکز تجلیات ہے۔

اور یہی کعبۃ اللہ زمین کا وہ پہلا مبارک خطہ ہے جو آفرینشِ ارض کے وقت پانی پر خشک ٹیلے کی صورت میں ظاہر ہوا تھا، اور پھر یہیں سے اللہ تعالیٰ نے چاروں طرف خشک زمین کو پھیلا دیا، قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران: ۹۶] (پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکے میں ہے، بابرکت اور جہاں کے لیے موجبِ ہدایت ہے)۔

بیت اللہ شریف کے فضائل وبرکات لامحدود اور نہایت زیادہ ہیں، مثلاً اول یہ کہ:

قال كعب الأحبار: كانت الكعبة غثاء على الماء قبل أن يخلق الله السمٰوٰت والأرض بأربعين سنة ومنها دحيت الأرض۔ وعن مجاهد قال: خلق الله هٰذا البيت قبل أن يخلق شيئا من الأرضين۔ وعن عطاء عن ابن عباس أنه قال لما كان العرش على الماء قبل أن يخلق الله السمٰوٰت والأرض بعث الله تعالىٰ ريحا هَفَّافَةً فصفقت الماء فأبرزت عن خشفة (الخشفة حجارة تنبت في الأرض نباتا) في موضع هٰذا البيت كأنها قبة فدحى الله تعالىٰ الأرضين من تحتها فمادت ثم مادت فأوتدها الله الجبال فكان أول جبل وضع فيها أبو قبيس فلذلك سميت مكة أم القرىٰ۔ وعن مجاهد قال: لقد خلق الله عزوجل موضع هٰذا البيت قبل أن يخلق شيئا من الأرض بألفي سنة وأن قواعده لفي الأرض السفلىٰ۔ [أخبار مكه اذرقي وفاكبي علیہ السلام]

ایک روایت میں ہے کہ مکہ مکرمہ زمین کے وسط میں واقع ہے اور یہ زمین کی ناف ہے، اس لئے اسے "ام القریٰ" کہا جاتا ہے، اور کعبہ شریف بیت المعمور کا سایہ ہے۔ [کبیر، تاریخ القویم]

اس کے علاوہ احادیث میں ہے کہ بیت اللہ کی سمت اور سیدھ پر ساتوں آسمانوں میں اور ساتوں زمینوں

میں اسی طرح کی کعبۃ اللہ و بیت اللہ ہیں، اسی طرح ہر آسمان کے فرشتے اور ہر زمین کے باشندے اپنے اپنے کعبہ کی زیارت کے لئے آکر اس کا طواف کرتے ہیں: فعن ليث بن معاذ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: هذا البيت خامس خمسة عشر بيتاً سبعة منها في السماء إلى العرش وسبعة منها إلى تخوم الأرض السفلى لكلّ بيت منها حرم كحرم هذا البيت۔ [أخبار مكة اذرقي] آسمانوں میں موجود کعبہ کا نام ''بیت المعمور'' ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس کا نام ''ضراح'' ہے، بعض روایات میں ہے کہ بیت معمور سماء سادسہ میں ہے، ابن کلبی روایت کرتے ہیں: أن بيتاً في السماء يقال له ضراح بحيال الكعبة يدخله كلّ يوم سبعون ألف ملك من الملئكة ما دخلوه قط قبلها۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ زمین میں پہلے اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کو بنایا، اور کعبۃ اللہ اول اول ایک مجوف سرخ جنتی یاقوت تھا، اس کا ایک دروازہ شرقی اور ایک غربی تھا۔ طوفان نوح علیہ السلام کے وقت اللہ تعالیٰ نے اسے اوپر آسمان کی طرف اٹھالیا، اور حجر اسود کو جبل ابو قبیس میں بطور امانت محفوظ رکھا: فروى ابن جريج كان بمكة البيت المعمور فرفع زمان الغرق فهو فى السماء۔ محقق و صحیح قول یہ ہے کہ کعبۃ اللہ تمام انبیاء علیہم السلام کا قبلہ رہا:

> فعن أبي العالية كانت الكعبة المكرمة قبلة الأنبياء وكان موسىٰ عليه السلام يصلى الى صخرة بيت المقدس وهى بينه وبين الكعبة وذكر العلماء ان ذلك مما كتمه اليهود وذلك كما هو دأب اليهود فى كتمان الحق وتحريف الكتب واحكام التورٰة حيث صلوا الى الصخرة وادعوا انها القبلة وهو قول الزهرى كذافى السيرة الحلبية وطاف بالبيت سبع اشواط وفى بعض الروايات اربعين يوما سفينة النوح على نبينا وعليه السلام والتحية كمامر فى سورة نوح وهو مروى عن ابن عباس ومحمد بن كعب القرظى وغيرهم كذافى اخبار مكة للارزقى وغيره۔

بحث نفيس في تعمير الكعبة المشرفة:

مفسرین و محققین اور علماء مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام بیت اللہ شریف کے پہلے معمار نہیں ہیں، بلکہ وہ کعبۃ اللہ شریف کے قواعد اور بنیادوں کو جو پہلے سے موجود تھیں بلند کرنے والے ہیں: کما قال

اللہ تعالیٰ: ﴿وَإِذۡ يَرۡفَعُ إِبۡرَٰهِـۧمُ ٱلۡقَوَاعِدَ مِنَ ٱلۡبَيۡتِ وَإِسۡمَٰعِيلُ﴾ [البقرة:۱۲۷] (اور جب ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کررہے تھے)۔ جمہور علماء ومورخین نے لکھا ہے کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر دس مرتبہ ہوئی ہے، اور بعض نے گیارہ مرتبہ لکھی ہے:

تعمیر اول: بناء ملائکہ۔ عن علی بن الحسن قال: إن الله بعث ملائكة فقال لهم: ابنوا لي بيتا في الأرض بمثاله وقدره أي مثال البيت المعمور۔ [سيرة حلبية]

تعمیر دوم: بناء حضرت آدم علیہ السلام۔ روي البيهقي في دلائل النبوة عن عبدالله بن عمرو مرفوعًا بعث الله جبريل إلى آدم وحواء فأمرهما ببناء الكعبة فبناه آدم ثم أمره بالطواف به وقيل له أنت أول الناس وهذا أول بيت وضع للناس۔

تعمیر سوم: بناء شیث بن آدم علیہم السلام۔ حضرت شیث پیغمبر حضرت آدم علیہم السلام کے بیٹے اور جانشین تھے۔

تعمیر چہارم: بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے پانچ پہاڑوں سے پتھر کاٹ کر لاتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پتھروں کو رکھ کر اونچی دیوار تعمیر کرتے تھے، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام انہیں ایک ایک پتھر دے کر ان کی مدد کرتے تھے۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ایک سو دس سال تھی، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر بیس سال تھی۔ جن پانچ پہاڑوں سے فرشتوں نے پتھر جمع کئے وہ یہ ہیں: جبل حراء، جبل ثبیر، جبل لبنان، جبل طور، جبل اُحمر۔ بعض روایات میں ''جبل جودی'' کا نام بھی مذکور ہے۔ واللہ اعلم

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ شریف کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا، سب سے پہلے یمن کا بادشاہ تبع، جس کا نام ''اسعد حمیری'' ہے انہوں نے کعبہ شریف کا دروازہ لگایا، اور قفل کے ساتھ اسے بند کیا، اور سفید ریشم کا غلاف بنا کر کعبہ شریف کو پہنایا، اس سے قبل غلاف کا کوئی وجود و رسم نہیں تھا۔ حضرت تبع اسعد حمیری مسلمان تھا، اور اس کی قوم بت پرست تھی جو ہلاک ہوئی۔ حضرت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری جلد ہشتم تفسیر سورۃ حمٓ الدخان کے تحت اس پر مفصل کلام کیا ہے۔

تعمیر پنجم: بناء عمالقہ۔ یہ قوم عمالقہ کتب آثار و تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم جرہم سے پہلے مکہ مکرمہ میں آباد تھی، پھر کثرتِ معاصی اور فسق و فجور نے انہیں ذلیل کر کے سرزمین مکہ شریف سے نکال باہر کیا، اور وہ مختلف علاقوں میں دربدر ہو کر منتشر ہوئے۔

تعمیر ششم: بناء جرہم۔ یہ لوگ خالص عرب تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے انہی سے زبان سیکھی، اور انہی میں شادی کی، اگر یہ روایت صحیح ہو جیسے کہ اکثر علماء و مؤرخین کا خیال ہے تو ان کی تعمیر پانچویں نمبر پر اور عمالقہ کی تعمیر چھٹے نمبر پر شمار ہوگی۔ اور بعض علماء یہاں تک کہتے ہیں کہ قوم عمالقہ نے صرف کعبہ شریف کی دیواروں کی مرمت کی ہے، اور مکمل کوئی تعمیر نہیں کی، لیکن تواریخ مکہ میں دونوں قول مذکور ہیں۔ واللہ اعلم

تعمیر ہفتم: بناء قصی بن کلاب۔ قصی رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد کے سلسلے میں واقع ہیں۔ سلسلہ نسب شریف یہ ہے: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب۔

تعمیر ہشتم: بناء قریش۔ قریشی تعمیر میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حصہ لیا تھا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف تقریباً پینتیس سال تھی، اور حجر اسود کے رکھنے (نصب کرنے) پر جو شدید اختلاف پیدا ہوا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت دانشمندی سے اُسے حل فرما کر پوری قوم کو خون ریزی سے بچا لیا تھا۔

بناء قریش کی چند خصوصیات:

(۱) انہوں نے کعبۃ اللہ پر چھت ڈالی، اس سے پہلے تمام تعمیرات میں چھت نہیں تھی، صرف چار دیواری تھی، جس پر شاہ تبع نے سفید یمنی ریشم کا غلاف پہنایا تھا، جو مرورِ زمانہ کے ساتھ جاری رہا۔

(۲) قریش نے کعبہ کا دروازہ بہت اونچا رکھا، تا کہ ان کی اجازت و مرضی کے بغیر کوئی اس میں داخل نہ ہو۔

(۳) قریش نے کعبہ کا شرقی دروازہ اونچا رکھ کر باقی رکھا، اور غربی دروازہ کو مکمل بند کیا۔

(۴) قریش نے چھت اٹھانے کے لئے کعبہ کے اندر دو لائن میں چھ ستون بنائے (دو قطار میں)۔

(۵) مال حلال اور عمارتی لکڑی کی کمی کی وجہ سے انہوں نے پورے بیت اللہ پر چھت نہیں ڈالی، بلکہ شمال میں کچھ حصہ بغیر چھت کے چھوڑ دیا، جو آج تک حطیم کے نام سے یاد ہوتا ہے۔ (حجر)

(۶) قریش نے حطیم کو الگ کر کے کعبہ شریف کو مربع شکل میں بنایا، جبکہ ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر میں اس کی شکل مربعہ نہ تھی، بلکہ مستطیل تھی۔

(۷) قریش نے کعبہ شریف کے اندر چھت پر چڑھنے کے لئے لکڑی کی سیڑھی بنائی، جو نئی ایجاد ہے۔

(۸) قریش نے کعبہ شریف کی چھت پر پرنالہ (میزاب رحمت رکھا) تا کہ بارش کا پانی حطیم کے اندر گر جائے۔

(۹) ساگوان کی قیمتی اورخوبصورت لکڑیوں کو کعبہ کی دیواروں میں پتھروں کے درمیان چسپاں کردیا۔اس طرح کی تعمیرات کا عرب میں خاص رواج ہوتا تھا،جس کا مقصد حسن وآرائش ہوتی تھی۔

(۱۰) قریش نے مطاف کوخوبصورت پتھروں سے فرش بنا کر طواف کرنے والوں کے لیے آسانی اور سہولت پیدا کی۔

(۱۱) قریش نے کعبۃ اللہ پر دوچھت بناء کر اسے دومنزلہ عمارت تعمیر کیا،اس سے پہلے وہ بغیر چھت کے ایک منزلہ تھا،ابھی اس وقت یہی دومنزلہ عمارت قائم ہے۔پہلی منزل کے لیے کوئی دروازہ نہیں،وہ ہمیشہ بند ہے،اس میں کعبہ کا خزانہ محفوظ ہے،اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا امام مہدی علیہ السلام نکال کرمجاہدین پر تقسیم فرمائیں گے۔

تعمیرنہم: بناء حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ۔حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد یزید کی بیعت سے انکار کرتے ہوئے مکہ مکرمہ چلے گئے۔حجاز،یمن،نجداورعراق کےلوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر کعبۃ اللہ شریف کو ازسرنوتعمیر کیا، اور قریش کی تعمیر کو ساقط کر کے حطیم شریف کو کعبہ میں شامل کر کے شرقی غربی دونوں دروازے فرش (زمین) پر رکھوا کر حضرت اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جومشورہ دیا تھا اس پرعمل کر کے کعبہ شریف کی بناء مکمل کی۔رضی اللہ عنہ

عام کتب تاریخ اورتواریخ مکہ مکرمہ میں اس کی عجیب تفصیلات ہیں وہاں دیکھا جائے۔

تعمیردہم: حجاج بن یوسف بامر عبدالملک بن مروان الحمارالاموی۔حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی عمارت کو گرا کر دوبارہ اپنے آباء واجداد قریش کی عمارت پر تعمیر کردی،آج تک یہ تعمیر قائم وباقی ہے،اور حطیم کعبۃ اللہ کی چھت سے الگ تھلگ ہے۔یہ آخری تعمیر جو حجاج نے عبدالملک کے حکم پر بنائی اس میں کیاراز ہے؟اس کی حکمت صاحب کعبہ ربّ العزّت عزّ مجدہٗ ہی کو معلوم ہے،،ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور فخر موجودات رحمتِ دارین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کو برقرار رکھنا بنوامیہ کے حکمرانوں کی تقدیر وقسمت میں نہ تھا،عبدالملک نے صاف کہا تھا کہ ہم ابن زبیر کے باقیات الصالحات کو باقی رکھنا نہیں چاہتے،اسی بنا پر کعبہ کوشہید کر کے قریشی کفار کی دلجوئی کی،اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش والی روایت جسے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کی تھی اسے تسلیم نہیں کیا۔

پھر کسی زمانہ میں ابوجعفر منصور عباسی بقول ابن جریر خلیفہ ہارون الرشید نے ارادہ ظاہر کیا کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر پر کعبۃ اللہ کو شہید کر کے بنائے، مگر حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے منع فرمایا، اور کہا کہ آئندہ یہ رسم بادشاہوں میں جاری ہو جائے گا، ہر ایک سابق تعمیر کو گرا کر اپنی تعمیر کو نام آوری کی خاطر قائم کرے گا، اس طرز عمل سے کعبۃ اللہ کی بے احترامی ہوگی۔

تعمیر یازدہم: بناء ۱۰۳۹ھ میں طوفانی سیلاب اور بارشوں سے کعبہ شریف کو نقصان پہنچا، تو سلطان عثمانی ترکی سلطان مراد خان بن سلطان احمد خان نے کعبہ شریف کی از سرنو تعمیر کی، لیکن بعض مورخین اس کو تعمیر سے تعبیر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ ایک جزوی مرمت ہے۔ واللہ اعلم

کعبہ شریف کی پیمائش اور طول وعرض:

(۱) دیواروں کی موٹائی ۳ فٹ ہے۔

(۲) کعبہ شریف کی بلندی ۴۰ فٹ ۶ انچ ہے۔

(۳) مشرقی دیوار ۳۹ فٹ ہے۔

(۴) مغربی دیوار ۳۹ فٹ ہے۔

(۵) شمالی دیوار ۳۳ فٹ ہے۔

(۶) جنوبی دیوار ۳۰ فٹ ہے۔

(۷) دروازہ کی بلندی ۶ فٹ ۱۰ انچ ہے۔

(۸) دروازہ کا عرض ۴ فٹ ہے۔ واللہ اعلم

﴿الَّذِیٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ انسانی راحت وسکون اور عیش وعشرت کی بنیادی چیزیں، جو ایک متنفس کے لیے ضروری ہوں یا قیام وطعام کھانے پینے اور رہنے سہنے کے لیے ضروری ہوں یا ان کی فراوانی اور عام دستیابی ہوں، وہ اکل وشرب کی اشیاء کی دستیابی اور مہیا ہونا ہے، اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے پڑوس میں رہنے والوں کے لئے وافر مقدار میں یہ سب کچھ مہیا فرمایا۔ دوسری اہم چیز جسے انسانی حیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، وہ امن وامان اور سلامتی ہے، جو کہ تمام نعمتوں کا سرچشمہ اور بنیاد ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت بھی انہیں عطا فرمائی، اس نعمت کا تذکرہ دوسری جگہ اس طرح فرمایا: ﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ

النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللهِ يَكْفُرُوْنَ﴾ [العنكبوت:٦٧] (کیا اُنہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے، اور لوگ اس کے گردونواح سے اُچک لئے جاتے ہیں، کیا یہ لوگ باطل پر اعتقاد رکھتے ہیں اور خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں)۔

مکہ کے لوگ اللہ تعالیٰ کے گھر کے طفیل دشمنوں سے پناہ میں تھے، اور ہر طرح محفوظ تھے، حالانکہ سارے ملک عرب میں چاروں سمت فساد وکشت وخون کا بازار گرم تھا، یہ لوگ کتنے نادان ہیں کہ بتوں کے جھوٹے احسان مانتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا سچا احسان نہیں مانتے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نعمت اللہ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کا مشرکوں نے انکار کیا۔ [بخاري]

فائدہ:

سورۂ قریش سے آخرِ قرآن تک تمام سورتوں کا خلاصہ بالترتیب یہ ہے۔

☆......سورۂ قریش کا موضوع ہے: ترغیب اور باری تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا شکر۔

☆......سورۃ الماعون کا موضوع: زجر وتوبیخ ومذمتِ بخل وکنجوسی۔

☆......سورۃ الکوثر کا موضوع ہے: تسلی وتسلیم ورضا اور انعاماتِ باری تعالیٰ۔

☆......سورۃ الکافرون کا موضوع ہے: سلام متارکت قطع تعلق مع الکفار والمعاندین۔

☆......سورۃ النصر کا موضوع ہے: اعلانِ فتح اور بشارتِ نصرتِ الٰہی واستغفار۔

☆......سورۃ اللہب کا موضوع ہے: دشمن کی تباہی وہلاکت۔

☆......سورۃ الاخلاص کا موضوع ہے: خالص توحید باری تعالیٰ عزّ شانہ۔

☆......سورۃ الفلق والناس (معوذتین) کا موضوع ہے: استعاذہ اور دشمنوں کے شر سے رب تعالیٰ کی پناہ کی طلب۔

انسان کا سب سے بڑا عیار وبے رحم دشمن اس کا نفس اور شیطان ہیں، ان دونوں کا پروگرام اور راستہ ایک ہی ہے، یہ دونوں آپس میں متحد ویکجا اور اتحادی ہیں، ان کا اصلی مقصد یہ ہے کہ وہ اولادِ آدم کو کسی نہ کسی ذریعہ سے جہنمی اور ابدی دوزخی بنادیں، اس سے کم پر ان کی رضامندی نہیں ہوتی، لہٰذا معوذتین کا صبح وشام تین تین مرتبہ تلاوت جاری رکھنا، نہایت ضروری ہے۔

سُورَةُ الْمَاعُوْنِ

مكيةٌ آياتها ۷ ركوعها ۱

سورۂ ماعون مکی ہے، اس میں سات (۷) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الماعون ہے، ساتویں آیت میں الْمَاعُوْنَ کے لفظ سے سورت کا نام مأخوذ ہے۔ نیز اسے سورۃ ارئیت، سورۃ التکذیب اور سورۃ الدین بھی کہتے ہیں۔ ان ناموں کے الفاظ بھی سورت میں موجود ہیں۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس سورت میں سات (۷) آیات، پچیس (۲۵) کلمات اور ایک سو پچیس (۱۲۵) حروف ہیں۔

نزول:

اس کا نزول سورۃ التکاثر کے بعد ہے۔ جمہور کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ درمنثور میں حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے بھی یہی منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت اور قتادہ وضحاک کا مسلک یہ ہے کہ یہ سورت مدنیہ ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اس سورت کا نصف اول مکی ہے، جو عاص بن وائل کے بارے میں نازل ہوا، اور نصف آخر مدنی ہے، جو عبداللہ ابن ابی منافق کے بارے میں نازل ہوا، مگر جمہور کا قول راجح اور قوی ہے۔

شانِ نزول اور "یَدُعُّ الْیَتِیْمَ" کا قصہ:

رأس المشرکین ابوجہل بن ہشام کا طرز وطریق یہ ہوتا تھا کہ اس کی قوم کا جب کوئی مالدار بیمار ہوتا تو وہ بار بار اس کی عیادت کرتا، اور اسے یہی کہتا کہ آپ اپنے یتیموں کو میرے سپرد کریں اور ان کا متروکہ حق میرے حوالہ کریں، میرے پاس ان کا حصہ بطور امانت رکھ دیں، میں ان کی ایسی خبر گیری اور خدمت کروں گا کہ آپ کے ورثاء نہیں کر سکتے، اس بہانے سے یتیموں کا مال اپنے قبضے میں لے لیتا اور پھر یتیموں کو اپنے دروازے سے دھتکار کر بھگا دیتا، پھر وہ در بدر ٹھوکریں کھاتے اور گلی کوچوں میں بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ ابوجہل کے خلاف ان کی بات نہ کوئی سنتا تھا اور نہ کچھ کر سکتا تھا، کیونکہ وہ قوم کا سردار ورئیس تھا۔

یہ سلسلہ برابر چلتا رہا یہاں تک کہ ایک دن ایک رنجیدہ اور پریشان حال یتیم مشفق ومہربان سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آہ وفغان کی، اور ملعون ومردود ابوجہل کی شکایت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس ابوجہل کے پاس تشریف لے گئے، ان کو فہمائش کی، سمجھایا اور آخرت کے حساب سے انہیں ڈرایا، مگر اس ملعون نے ایک نہ سنی، بلکہ قیامت وحساب کو جھٹلایا، اور آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ رنجیدہ خاطر اور پریشان ہو گئے اور واپس گھر لوٹے۔ اس موقع پر اس سورت کا نزول ہوا۔ [تفسیر عزیزی] اور بعضوں نے اسی طرح کا واقعہ عاص بن وائل کے متعلق بھی بیان کیا ہے۔

دراصل یہ لوگ ابوجہل، عاص بن وائل، امیۃ بن خلف سارے اسی قسم کے لوگ ہوتے تھے، جو یتیموں کا مال ہڑپ کر کے انہیں محروم رکھتے تھے، اور بیکسوں اور ناداروں پر ظلم وزیادتی روا رکھتے تھے، واقعہ کسی کا بھی ہو اعتبار عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے، نہ کہ خصوصِ اسباب کا۔

ربط ومناسبت:

سورۂ قریش میں ربّ البیت کی عبادت کا حکم تھا، اور یہاں سب سے بڑی اور اہم عبادت نماز سے غفلت پر وعید ہے۔ وہاں قریش پر انعامات کا ذکر تھا اور وہ قیامت وبعث پر ایمان نہیں رکھتے تھے، یہاں اسی قیامت کی تکذیب پر سرزنش وتہدید ہے، وہاں ﴿أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوعٍ﴾ [قریش: ۴] (ان کو بھوک سے کھانا کھلایا) کا تذکرہ تھا، یہاں اطعامِ مسکین پر عمل نہ کرنے اور دوسروں کو ترغیب نہ دینے پر وعید ہے، اور یہ بھی ہے کہ سابقہ انعام وذرہ نوازی کا تقاضا شکر ہے، اور یہاں عملی ناشکروں کی مذمت ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ﴿۲﴾ وَلَا یَحُضُّ
عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ﴿۳﴾ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ
سَاہُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ﴿۶﴾ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ٪﴿۷﴾

ترجمہ: کیا آپ نے اس کو دیکھا جو جزا کا انکار کرتا ہے؟ ﴿۱﴾ سو وہ شخص وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے ﴿۲﴾ اور محتاج کو کھانا دینے کی ترغیب بھی نہیں دیتا ﴿۳﴾ پھر خرابی ہے ان نمازیوں کے لئے ﴿۴﴾ جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں ﴿۵﴾ جو لوگ دکھلاوا کرتے ہیں ﴿۶﴾ اور زکوٰۃ (خیر وبھلائی) روکتے ہیں ﴿۷﴾

معارف ومنازل

اس سورت میں ربّ العزّت شانہ نے چند افعالِ قبیحہ وذمیمہ کی مذمت کے ساتھ ذکر فرمایا، اور ان کے مرتکبین پر سختی سے زجر اور وعیدِ شدید کا بیان فرمایا، اور ان کے لیے ویل کے عذاب کی تہدید سنائی۔ وہ افعال یہ ہیں:

(۱) یتیم کے ساتھ بدسلوکی اور توہین وایذاءرسانی۔ (۲) باوجود قدرت کے محتاجوں کو کھانا نہ دینا، اور دوسروں کو ترغیب نہ دینا۔ (۳) نماز پڑھنے میں غفلت ولاپرواہی برتنا۔ (۴) ریاکاری اور دکھلاوا کرنا۔ (۵) زکوٰۃ ادا نہ کرنا اور ایسی کنجوسی وبخل کرنا کہ عام معمولی چیزوں سے دوسروں کو نفع نہ پہنچانا۔

یہ سارے اعمالِ بد اپنی ذات کے اعتبار سے بھی بہت مذموم اور سخت گناہ ہیں، اور جب کفر وتکذیب کے نتیجہ میں یہ گناہ سرزد ہوں تو ان کا وبال وسزا دائمی عذابِ جہنم ہے، چونکہ شروع سورت میں تکذیب بالدین کا اولاً ذکر ہے، اور قیامت وجزاء کا منکر کفار ہی ہوتے ہیں، اور یہ سخت وعید انہی کے حق میں وارد ہے۔

رہا مؤمن! اول تو وہ ان کافرانہ اعمال وافعال سے بہت ہی دور رہتا ہے، کیونکہ مؤمن ہوتے ہوئے کوئی مسلمان ان اعمالِ قبیحہ کا ارتکاب نہیں کرتا، کیونکہ یہ افعالِ مذمومہ مؤمن کی شان کے خلاف ہیں، بالفرض! اگر یہ برے اعمال سارے یا ان میں سے بعض کسی مؤمن میں موجود ہوں تو بڑی دکھ کی بات ہوگی، چاہئے کہ پہلی فرصت میں مسلمان ان سے توبہ کر کے انہیں ہمیشہ کے لئے ترک کردے، بصورت دیگر وہ سخت گناہگار ہوگا اور مستحق عذاب بھی، مگر اسلام سے تصدیق قلبی کی وجہ سے خارج نہیں ہوگا، اور نہ ہی دائمی عذاب کا مستحق ہوگا۔

﴿أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ﴾ کیا آپ نے اس کو دیکھا جو جزا کا انکار کرتا ہے؟ استفہامِ تقریری ہے، اور رؤیت سے بصری اور قلبی دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ یہ خطاب خاص بھی ہے اور عام بھی۔ یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ [تفسیر عزیزی] عاص بن وائل کے بارے میں۔ [مقاتل] عمرو بن عامر مخزومی کے بارے میں۔ [ضحاک] یا ولید بن مغیرہ کے بارے میں۔ [ابن کیسان، سدی]

ان تمام اقوال کی بناء پر سورت کا اول حصہ مکی ہے، کیونکہ یہ سارے مکہ کے باشندے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت ہے کہ یہ ایک منافق (عبداللہ بن ابی) کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس روایت کے پیشِ نظر پوری سورت یا اس کا ایک حصہ مدنی ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی۔

دین سے مراد جزاء، جیسے: ﴿ملك يوم الدين﴾ [الفاتحۃ:۳] (انصاف کے دن کا حاکم پروردگار) میں روزِ جزا مراد ہے، نیز دین سے مراد اسلام بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو یا حقوق اللہ و حقوق العباد کی پامالی اور حق تلفی ہو، ان کا ارتکاب وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں روزِ جزا پر یقین نہ ہو، پھر وہ شترِ بے مہار کی طرح ہر وادی میں دوڑتے رہتے ہیں، اگر کسی کو اسلام پر پختہ عقیدہ ہو اور روزِ جزا کے حساب پر حقیقی یقین ہو، تو وہ اکثر و بیشتر معاصی اور ظلم و زیادتی سے دور رہنے اور اجتناب کرنے کی کوشش کرے گا۔

ان سارے معاصی کی بنیاد غفلت اور عقیدہ کی کمزوری ہے، اور اجتناب کی بنیاد عقیدہ کی درستی ہے، اللہ تعالیٰ سے حقیقی ڈرنے والا شخص کبھی غلط کام نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے لوگ یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور ناداروں کی سرپرستی کرتے ہیں، انہیں ہر قسم کی مالی معاشی فائدہ پہنچاتے ہیں، ان کی دلجوئی و خیالداری کرتے ہیں، اور اسے سعادت اور غیر مترقبہ نعمت سمجھتے ہیں، ایسے ایماندار لوگ بھی ہیں جو اپنے بچوں کی خبر گیری پر فقراء و ناداروں کو ترجیح دیتے ہیں، لہٰذا اس سے بڑھ کر بدنصیب اور محرومِ آخرت اور کون ہو سکتا ہے جو یتیموں کا مال ہضم کر کے ضائع کرے، یا ان پر ظلم و زیادتی کرے؟ نعوذ باللہ اگر شرک کے بعد کسی گناہ کا درجہ ہو تو وہ یہی اکلِ مالِ یتیم ہی ہو گا۔

﴿يَدُعُّ الْيَتِيمَ﴾ یتیم کو دھتکارتے ہیں، دھکا دیتے ہیں، ان پر ہاتھ اٹھاتے ہیں اور برا بھلا و بیہودہ گالی دیتے ہیں، اور بخیل و کنجوس اتنے بڑے ہیں کہ خود تو کیا دوسروں کی ترغیب دینے میں بھی بخل کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات دوسروں کے دینے پر بھی اظہارِ ناخوشی کرتے ہیں۔ یہی مراد ہے:

﴿وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ﴾ (اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا)

کا۔ حدیث شریف میں ہے کہ بخیل خدا کا دشمن ہے اگرچہ عبادت گزار کیوں نہ ہو، اور فرمایا کہ عبادت گزار عابد وزاہد بخیل سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک فاسق سخی بہتر ہے۔ [مشکوٰۃ]

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أي داء أدوأ من البخل؟ (بخل سے بڑھ کر اور کونسی بیماری ہے؟) یعنی یہ بیماری تمام بیماریوں سے بڑھ کر ہے، کیونکہ ہر بیماری کے لیے کوئی نہ کوئی علاج ضرور ہے، مگر یہ بخل مکمل لاعلاج مرض ہے۔ [معالم، ابن کثیر، خازن]

﴿فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ﴾ پس ویل وتباہی ہو ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں)۔ ان مصلین سے مراد منافقین ہیں جو لوگوں کو دکھلانے اور اپنے اسلام کو ثابت کرنے اور مسلمانوں کی نظروں میں آنے کی خاطر نماز پڑھتے ہیں۔ درحقیقت انہیں نماز کے ساتھ کوئی محبت ہے نہ شوق، کیونکہ وہ نماز کی فرضیت واہمیت ہی کے منکر ہیں، اسی وجہ سے وہ نہ اوقات نماز کی پابندی کرتے ہیں، نہ اس کی شرائط وافعال کی، جہاں دکھلانے کا موقع ملا تو نماز پڑھ لی، ورنہ ترک کردی۔ اس طرح کی نماز سیاسی ہوتی ہے، جیسے: بعض سیاستدان لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر اور ان کی نظروں میں اپنے ایمان اور نمازی اور دینداری ثابت کرنے کی خاطر عیدین اور جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں، مقصد لوگوں میں اپنا مقام ثابت کرنا ہوتا ہے۔

﴿عَنۡ صَلَاتِهِمۡ﴾ میں لفظ ''عَنۡ'' کا مفہوم یہی ہے کہ وہ نفس نماز ہی سے بے پرواہی کرتے ہیں۔ رہا نماز میں سہو ونسیان کا ہوجانا، وہ یہاں مراد نہیں ہے، کیونکہ یہ سہو ونسیان نفاق کی علامت نہیں، اور یہی ہر شخص کو پیش آتا ہے، بلکہ نمازیوں کے سردار سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کئی مرتبہ پیش آیا، اگر یہ مراد ہوتی تو لفظ ''عَنۡ'' کے بجائے لفظ ''في'' کا استعمال ہوتا، یعنی في صلاتهم۔ صحیحین کی صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے اندر متعدد بار سہو واقع ہوا۔ حدیث ذوالیدین اس بارے میں بہت مشہور ہے۔ حضرت انس اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہما کا قول مذکور ہے، ان دونوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کا شکر ہے کہ ﴿عَنۡ صَلٰوتِهِمۡ سَاهُوۡنَ﴾ فرمایا، في صلاتهم ساهون نہیں فرمایا۔

امام بغوی نے مصعب بن سعد کی روایت نقل کی ہے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿عَنۡ صَلٰوتِهِمۡ سَاهُوۡنَ﴾ کا مطلب پوچھا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا مطلب ہے نماز کو ضائع کرنا۔ ابو یعلی کی روایت میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ساھون'' وہ لوگ ہیں

جونماز کواس کے وقت سے مؤخر کر دیتے ہیں۔ حضرت ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ ''ساھون'' وہ لوگ ہیں جو مقررہ وقت پر نماز نہیں پڑھتے، اور رکوع وسجدہ کو پورا ادا نہیں کرتے ہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو پروا نہیں ہوتی کہ نماز پڑھی یا نہیں پڑھی۔

بعض نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو نماز پڑھ کر ثواب کی امید نہیں ہوتی، اور نہ پڑھ کر عذاب کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ حضرت مجاہدؒ نے کہا: یہ لوگ نماز میں غفلت وسستی کرنے والے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ وہ لوگ ہیں جو دکھلانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں، جب نماز فوت ہو جاتی ہے، تو انہیں افسوس نہیں ہوتا۔ یہ عبارتیں اگرچہ مختلف ہیں لیکن مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے کہ وہ بے یقینی و بے ایمانی سے پیدا ہونے والی غفلت وسستی اور بے اعتنائی ولا پرواہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم

فائدہ:

ساھون صیغہ جمع مذکر اسم فاعل بمعنی بھولنے والے، مصدر سھو ہے۔ غفلت سے جو خطا سرزد ہوتی ہے اس کا نام سھو ہے، اگر سبب غیر اختیاری ہو تو قابلِ مواخذہ نہیں ہے، جیسے پاگل شخص کا کسی کو گالی دینا یا کوئی غلط حرکت کرنا، کیونکہ سبب دیوانگی ہے اور وہ غیر اختیاری ہے، اور اگر سبب اختیاری ہو تو قابل مواخذہ ہوگا، جیسے شراب پینے والے شخص کا کسی کو بحالت نشہ گالی دینا یا کوئی غلط حرکت کرنا، بیوی کو طلاق دینا، یہاں سبب شربِ خمر و نشہ ہے، اور یہ اختیاری ہے، جس کی مذمت قرآن وحدیث میں واقع ہے۔ سھو کے معنی ہیں: بھولنا، غافل و بے خبر ہونا۔

سہواور نسیان میں فرق یہ ہے کہ سہو میں بات ذہن سے نکل جاتی ہے، قوتِ حافظہ سے نہیں جاتی، اور نسیان میں قوت حافظہ سے بھی نکل جاتی ہے، تو نسیان مرکب ہوا اور سہو مفرد ہی رہا، اسی لئے سہو میں دوبارہ محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، اور نسیان میں دوبارہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے کہ خدانخواستہ غفلت سے کوئی حافظ قرآن کو بھول جائے تو دوبارہ محنت ضروری ہوگی، یہ نسیان ہے۔

﴿الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ﴾ جو ریا کاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں عاریتاً نہیں دیتے۔ ماعون کے مختلف معانی آتے ہیں، مثلاً: حسن سلوک، پانی، بارش، بھلائی، گھر کا سامان، فرمان برداری، عام استعمال کی کم قیمت اشیاء اور زکوٰۃ وغیرہ۔ حضرت علی، حضرت ابن عمر، قتادہ، ضحاک، حسن بصری رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ ماعون سے مراد زکوٰۃ ہے، وجہ یہ ہے کہ ماعون کے اصل معنی ''تھوڑی'' چیز کے آتے

ہیں، اور زکوٰۃ بھی مال کا تھوڑا سا حصہ ہوتا ہے۔ یہی تفسیر جمہور مفسرین سے منقول ہے۔

دوسرے بہت سے حضرات نے ماعون سے ایسی استعمال کی چیزیں مراد لی ہیں جو عادۃً ایک دوسرے کو عاریۃً دی جاتی ہیں، اور جن کو باہم لین دین عام انسانیت و مروت کا تقاضا خیال کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، سعید بن جبیر، مجاہد، محمد بن کعب قرظی اور کلبی رضی اللہ عنہم وغیرہ سے یہی منقول ہے، اور یہ معنی بہت مشہور ہے۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ ہر اعلیٰ و ادنیٰ چیز اس میں شامل ہے، اعلیٰ چیز تو زکوٰۃ ہے، اور ادنیٰ چیز ہر گھریلو سامان ہے۔

بعض علماء نے کہا کہ ماعون سے مراد وہ معمولی کم قیمت اشیاء ہیں جن کا منع کرنا اور روکنا مروت کے خلاف ہے، جیسے بیلچہ، ماچس، نمک، پانی، دیگچی وغیرہ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! پانی تو خیر معمولی چیز ہے، نمک اور آگ میں کیا بات ہے؟ فرمایا: خمیرا جس نے آگ دے دی گویا اس نے اس آگ سے پکایا ہوا کھانا دے دیا، اور جس نے نمک دے دیا تو اس نے گویا اس نمک سے بنایا ہوا کھانا دے دیا، اور جس نے ایسے مقام پر جہاں پانی ملتا ہے کسی مسلمان کو پانی پلایا گویا اس نے ایک غلام آزاد کر دیا، اور اگر ایسے مقام پر پانی پلا دیا جہاں پانی نہیں ملتا اس نے گویا اس کو زندہ کر دیا۔ [ابن ماجۃ]

لیکن جمہور کا قول ہی درست ہے، اور ماعون سے مراد زکوٰۃ ہی ہے، کیونکہ اس کے نہ دینے پر یہاں ''ویل'' جہنم کی وعید مذکور ہے، جو ترک فرض پر ہی ہوسکتا ہے، اور استعمالی اشیاء کا دینا اگرچہ ثواب اور انسانی مروت کا تقاضا ہے مگر فرض وواجب نہیں، جس کے ترک پر جہنم کی وعید ہو، اور جن روایات میں اس کی تفسیر استعمالی اشیاء اور نمک، پانی، برتنوں وغیرہ سے کی گئی ہے، ان کا مطلب ایسے لوگوں کی انتہائی خست کا اظہار ہے کہ یہ لوگ زکوٰۃ تو کیا دیتے ایسی معمولی اشیاء جن کے دینے میں کچھ حرج نہیں ہوتا ہے، اس میں بھی وہ کنجوسی اور بخل کرتے ہیں، تو وعید صرف ان اشیاء کے نہ دینے پر نہیں، بلکہ فرض زکوٰۃ کی ادائیگی نہ کرنے پر ہے، اور اس کے ساتھ مزید بخل شدید پر بھی بغرض تعریض و تنبیہ مقصود ہے۔

اس مختصری چھوٹی سورت میں اللہ تعالیٰ شانہ نے بہت مخفی اور تباہ کن اعمال واخلاق سے پردہ اٹھا کر ان کے مہلک اور تباہ کن انجام سے اپنے نیک متقی بندوں کو بچنے کا راستہ تعلیم کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی کا نام تقویٰ ہے، اور یہی تقویٰ عذاب جہنم سے نجات کا ذریعہ ووسیلہ ہے، اور بغیر تقویٰ کے کسی بھی شریعت میں، یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کے شرائع میں ناکامی کے سوا کچھ نہیں، اگر یہود

ونصاریٰ گمراہ وگم گشتہ رہے،تو ان کی گمراہی کا اصل سبب یہی معلوم ہوا کہ انہوں کے تقویٰ نے خلاف کام کیا،اور برگشتہ ہوئے۔

موضوع سورت پر ایک ضروری تجزیہ:

(۱) پہلی بات یہ کہ تکذیب دین جو کہ تمام معاصی کی جڑ ہے،اس کے ہوتے ہوئے پورا معاشرہ برباد ہوگا۔

(۲) دوسری بات یہ کہ نادار، کمزور، یتیم اور بے سہارا لوگوں پر ظلم وزیادتی اور بے رحمی بھی پورے معاشرے کے لیے تباہ کن ہے۔

(۳) مفلس ومسکینوں، لاچار اور نچلے طبقہ کے لوگوں سے بے اعتنائی اور دوری سے ملک وقوم اور شہری واجتماعی زندگی پر برا اثر پڑے گا،جس سے سارے اقدار ملیامیٹ ہوجائیں گے،اور طوائف الملوکی جیسی بدامنی، فساد، قتل وغارت، چوری، ڈاکہ وغیرہ جنم لیں گے،جس سے پورا معاشرہ برباد ہوجائے گا، جیسے موجودہ وقت کے اکثر وبیشتر ممالک میں یہ سلسلہ روز وشب جاری ہے۔

(۴) انسانی شرافت اور اسلامی اعمال واخلاق اس طرح تباہ ہوجائیں گے کہ عوام تو عوام ہے،خواص اور دیندار طبقہ بھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے،لوگ ایک دوسرے سے ناامید ہوجائیں گے،خود اخلاق سے عاری رہیں گے،مگر دوسروں سے مدارات کا طلبگار رہیں گے جو کہ محال ہے۔

(۵) مذہبی اقدار برائے نام باقی ہوں گے،مگر اکثر وبیشتر اعمال عدمِ اخلاص کی وجہ سے بے روح اور بے جان رہیں گے، اگرچہ لوگوں میں مذہبی اور دینی اقدار کچھ موجود ہوں گے،لیکن وہ بھی ریا اور دکھاوے کے نذر ہوں گے،مذہبی تعلیمات پر ریاکاری کا غلاف چڑھا ہوا معلوم ہوگا،اور داعیانِ حق وانصاف اور وارثانِ علومِ نبوت میں بددلی اور افتراق کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(۶) بخل وکنجوسی اتنی عام ہوگی کہ ایثار کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا،حتیٰ کہ پیر، علماء، خانقاہ وغیرہ میں بھی ان اقدار کا فقدان ہوگا، حبِّ مال وحبِّ جاہ لوگوں کا محبوب ومرغوب مشغلہ ہوگا، کبر وغرور اور لاپرواہی تک مہلک امراض خواص میں بھی بکثرت پیدا ہوں گے،مگر وہ اس کا نام خودداری رکھ کر اس میں گم ہوجائیں گے، وغیرہ وغیرہ۔

[الكشف والتبيين للغزالي مع زيادات]

سُورَةُ الْكَوْثَرِ

مكية آياتها ۳ ركوعها ۱

سورۂ کوثر مکی ہے، اس میں تین (۳) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورة الکوثر ہے، پہلی آیت میں اَلْكَوْثَرَ کے لفظ سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

اکثر علماء ومفسرین کے نزدیک یہ سورت مکی ہے، اور مشہور بھی یہی قول ہے جو کہ حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت مقاتل، امام کلبی رضی اللہ عنہم وغیرہ سے منقول ہے۔ مگر حسن بصری، مجاہد، عکرمہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات کہتے ہیں کہ سورۃ الکوثر مدنیہ ہے، اور اس کا نزول مدینہ میں ہوا۔ علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں اور حافظ سیوطی نے الاتقان میں اسی کو ترجیح دی ہے۔

نزولِ سورت کے اسباب سے تقریباً دونوں قولوں کی تائید ہوتی ہے۔ علامہ خفاجی نے شرح بیضاوی میں فرمایا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک اس کا نزول دو مرتبہ ہوا: ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں، اور دوسری مرتبہ مدینہ منورہ میں، تو پھر تعارض واشکال کچھ بھی نہیں رہے گا۔ اس کا نزول سورۃ العادیات کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس کی تین آیات ہیں، اور قرآن حکیم میں سب سے چھوٹی اور مختصر سورت یہی سورۂ کوثر ہے، اس میں دس

(۱۰) کلمات اور بیالیس (۴۲) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

ماقبل سورت میں بے دین لوگوں اور منافقوں کے چار برے اوصاف بیان ہوئے: یعنی (۱) کنجوسی وبخل۔ (۲) ترکِ صلوٰۃ۔ (۳) منعِ زکوٰۃ۔ (۴) ریاودکھلاوا، جبکہ اس سورت میں ان چار بری خصلتوں کے مقابل چار پسندیدہ خصلتوں کا تذکرہ ہے: (۱) الکوثر یعنی خیر کثیر کی بخشش وعطاء۔ (۲) مداومت علی الصلوٰۃ۔ (۳) پابندی کے ساتھ اداءِ زکوٰۃ۔ (۴) اخلاص عمل لوجہ اللہ، وترک ریا۔

دوم یہ کہ سورۃ الماعون میں تہذیب وحکمت کی تمام اقسام بیان ہوئی ہیں، جس طرح وہاں تفصیل گزر چکی، اس حکمت کا اشارہ اس طرف بھی تھا کہ بدقسمت لوگ بیان شدہ اخلاق واوصاف سے تہی دامن ومحروم ہوتے ہیں، جن کا ذکر خیر اقوامِ عالم میں نہ باقی رہے گا، اور نہ کوئی بہتر یادگار ان کی ہوگی۔

ان کے مقابلہ میں اس سورۃ الکوثر میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین وخوشخبری کے ساتھ کہا جارہا ہے کہ آپ کو تمام جہاں پر یہ فضیلت وبرتری حاصل رہے گی کہ قیامت تک پورے عالم میں اور اسی طرح قیامت کے دن پورے محشر میں آپ کا ذکر خیر جاری رہے گا، اور آپ کی شفاعت وتعلیمات سے دنیا وآخرت کے تمام لوگ مستفید ومستفیض رہیں گے، اور آپ کی جسمانی نسبی وروحانی نسلیں رہتی دنیا تک، بلکہ دخول جنت تک رہیں گی، اور آپ کے قائم کردہ فیوض وبرکات کے چشموں سے مستفیض ہوتے رہیں گے، اور اس دنیوی کوثر (خیر وبرکت عامہ) سے اخروی کوثر (حوض کوثر) تک پہنچ جائیں گے، جس کی طرف اشارہ کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ومنبري على حوضي۔ کہ اس منبر سے وابستہ رہنے والا حوض کوثر تک اتباعِ شریعت اور اتباعِ سنت کے طفیل یقیناً پہنچ جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِنَّاۤ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ۝۳

ترجمہ: بیشک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمائی ۝۱ پس آپ اپنے رب کی نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے ۝۲ یقیناً آپ کا دشمن (بدخواہ) ہی بے نام ونشان رہے گا ۝۳

شانِ نزول سورۃ الکوثر:

امام بیہقی اور ابن ابی حاتم نے حضرت محمد بن علی (زین العابدین) بن حسین بن علی (کرم اللہ وجہہ) سے نقل کیا ہے کہ جس کی مذکر (مرد) اولاد مر جاتی تو اہل عرب اس کو اَبتَر (مقطوع النسل) کہتے، جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے قاسم یا ابراہیم رضی اللہ عنہما کا انتقال ہو گیا تو کفارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اَبتَر کہہ کر طعنہ دینے لگے، خاص کر ''عاص بن وائل'' ایسے کہنے والوں میں سب سے پیش پیش رہا، اور کہتا رہا کہ اس شخص کا نہ کوئی تذکرہ کرو اور نہ اس کے دینی پروگرام سے گھبراؤ، کیونکہ وہ اَبتَر ہے، جب اس کا انتقال ہو جائے گا تو اس کا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

اگر اس روایت پر اعتماد ہو تو سورۂ کوثر کے مکی ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ ہوگا، مگر یہ روایت اپنے معنی کے لحاظ سے اگرچہ درست ہے مگر سند کے اعتبار سے کمزور ہے، کیونکہ اس روایت کی سند میں ایک راوی ''جابر جعفی'' ہے، جو کہ انتہائی جھوٹا اور ضعیف ہے، امام مسلم نے مقدمہ صحیح میں اس کی تصریح کی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس روایت میں صاحبزادہ ابراہیم کا ذکر ہے، جو کہ امام بخاری و مسلم اور دوسرے ائمہ حدیث سب نے ان کی وفات کی مدنی زندگی میں تصریح کی ہے، ۱۰ھ میں۔ رہے حضرت قاسم، ان کی وفات بعضوں نے نبوت سے پہلے یا نبوت کے بعد مکی زندگی بتائی ہے، اور یہی صحیح ہے، جیسے امام واقدی نے لکھا ہے۔

بعض روایات (رواہ البزار عن ابن عباس رضی اللہ عنہ) میں ہے کہ کعب بن اشرف (یہودی سردار) ایک مرتبہ مکہ مکرمہ آیا تو قریش مکہ اس کے پاس آ گئے اور کہا کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے کہ میرا دین برحق ہے، اور سب دینوں سے افضل ہے، حالانکہ ہم لوگ کعبۃ اللہ کی پاسبانی اور حجاج کی خدمت کرتے ہیں اور اپنے آباء و اجداد کے دین پر رہتے ہیں، اس کے باوجود یہ شخص ہمیں گمراہ اور کافر کہتا ہے، تم اہل کتاب ہو یہودیوں کے سردار ہو، بتاؤ کہ اس کا دین برحق ہے یا ہمارا؟ کعب بن اشرف نے کہا: نہیں، تم اس سے بہتر ہو اور تمہارا دین برحق ہے، اس پر یہ سورت نازل ہوئی، اس بات سے بھی اس سورت کا مکی ہونا متیقن ہے۔

مگر صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ایک دن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، اچانک آپ پر ایک کیفیت (بیخودی) طاری ہو گئی (عام طور پر نزولِ وحی کے وقت اس طرح کی کیفیت پیش آ جاتی تھی) کچھ دیر بعد مسکراتے ہوئے سر اٹھایا، ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (صلی اللہ

علیہ وسلم) آپ کے مسکرانے کا سبب کیا ہے؟ فرمایا: ابھی ایک سورت اتری ہے، پھر آپ نے وہ سورت تلاوت فرمائی اور کہا: ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَالْاَبْتَرُ﴾ اور کوثر کے معنی ارشاد فرمائے۔ (الحدیث) اس صحیح روایت سے یہ معلوم ہوا کہ سورۃ الکوثر کا نزول مدینہ میں ہوا، اور یہ مدنی سورت ہے۔

علامہ ابن جریر طبری نے سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ حدیبیہ کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا کہ آپ قربانی کریں اور لوٹ کر واپس مدینہ چلیں، اس حکم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا، اور خطبہ میں قربانی کرنے اور حلق کا حکم دے دیا، پھر دو رکعت نماز پڑھی اور جا کر اونٹوں کو ذبح کیا۔ [مظهري]

خلاصہ یہ کہ صاحب مظہری بھی اس کا قائل ہے کہ اس سورت کا نزول صاحبزادہ قاسم یا ابراہیم کی وفات کے موقع پر نہیں ہوا، لہٰذا روایاتِ مذکورہ کی روشنی میں صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سورت کا نزول دو مرتبہ ہوا: ایک بار مکہ میں جیسے روایت بزار عن ابن عباس کا مطلب ہے، بموقع کعب بن اشرف، اور ایک دفعہ مدینہ میں ہوا، کما رواہ مسلم عن انس رضی اللہ عنہ، اور علامہ خفاجی اور دیگر حضرات نے بھی یہی کہا، جیسے پہلے گزرا۔

اس قول سے ہر قسم کے اشکالات بھی رفع ہو جائیں گے، اور روایات واقوال میں تطبیق بھی ہو جائے گی۔ حاصل یہ ہے کہ کفار ومشرکین اور سارے معاندین، بشمول یہود ومنافقین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اَبْتَر ہونے کا جو طعنہ دیتے تھے، یا دوسری وجوہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخیاں کرتے تھے۔

ان سب خرافات کے جواب میں اس سورت کا نزول ہوا، اور دشمنانِ نبوت پر واضح کیا گیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل دختری اور نسل روحانی دائمی وابدی ہے، جو کہ قیامِ قیامت تک سمندروں کی طرح جاری رہے گی، اور تمام انبیاء سابقین علیہم السلام کے متبعین سے کئی درجہ زیادہ علماء وفضلاء، محدث ومفسر، مفکر، مصلحین، وصالحین، روحانی اولاد کا وہ نابغۂ روزگار ونمونہ اعلیٰ دنیا میں جاری رہے گا جس پر آسمانی فرشتے بھی رشک کریں گے، اور ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ [الشرح: ۴] (اور ہم نے آپ ذکر بلند کر دیا) کا چار دانگ عالم میں وہ سلسلہ رہے گا جس کی مثال آسمانوں نے اپنی تخلیق کے بعد آج تک نہ دیکھی ہوگی۔ اس کے برعکس تم لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں ناکام اور بے نام وبے نشان رہو گے۔ قرونِ اولیٰ (عاد وثمود) کی طرح ایسے مٹ جاؤ گے کہ کرۂ ارض پر تمہارا کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ الحمد للہ ایسا ہی ہوا، اور قیامِ قیامت تک یہی سلسلہ جاری رہے گا۔

معارف ومنازل

﴿الْكَوْثَرَ﴾ جو چیز مقدار، تعداد، قدر و مرتبہ اور برکت میں زیادہ ہو اہل عرب اس کو کوثر کہتے ہیں، مگر یہ بات ملحوظ رہے کہ عرب کے نزدیک یہ استعمال خیر کے ساتھ مخصوص ہے، شر میں اس کا استعمال نہیں ہوتا، اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں الکوثر کس معنی میں ہے اور اس کا حقیقی مصداق کیا ہے؟ اس سلسلے میں روایات، اقوالِ ائمہ اور آثار بہت زیادہ ہیں، صاحب تفسیر کبیر اور صاحب روح المعانی اور دیگر مفسرین حضرات بارہ (۱۲) سے سترہ (۱۷) اقوال تک ذکر کر چکے ہیں۔

اگر چند دیگر تفاسیر کے جزوی اور متفرق اقوال کو ساتھ ملا کر بیان کیا جائے تو تقریباً ستائیس (۲۷) اقوال بن جائیں گے، اکثر و بیشتر اقوال تاویلی اور احتمالی مقاصد پر مبنی ہیں۔ اگر ان سارے اقوال کو تفصیلاً بیان کیا جائے تو مضمون خاصا طویل ہو جائے گا، بہتر یہ ہے کہ ان میں سے چند ایک کی اختصار کے ساتھ نشاندہی اور بیان ہو، تا کہ اس اجمال کو بآسانی یاد رکھا جا سکے۔

(۱) امام بخاری نے کتاب التفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ کوثر وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہے، اس پر ان کے شاگرد سعید بن جبیر سے کسی نے پوچھا: کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے، تو سعید نے جواب دیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس کے منافی نہیں، کیونکہ وہ جنتی نہر کوثر بھی اس خیر کثیر کا فرد ہے، اور خیر کثیر میں داخل ہے۔

(۲) بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ کوثر جنت کی وہ نہر ہے جو آپ کو شب معراج میں دکھائی گئی تھی، جس کے کنارے موتیوں کے خیمے تھے، اور اس کا پانی مشک کی طرح خوشبودار برف سے سفید اور ٹھنڈا، شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: یہ وہی کوثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی، اسی طرح امام احمد و ترمذی وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ کوثر کا پانی دودھ سے سفید اور شہد سے زیادہ شیرین ہے، اس میں ایسے پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر تو وہ بڑے لطیف ہوں گے؟ ارشاد فرمایا: اے عمر! ان کا کھانا ان سے زیادہ لطیف ہے۔ [أحمد و ترمذي]

اسی قسم کی روایات بقول صاحب مظہری تقریباً پچاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، مثلاً: حضرت عائشہ

صدیقہ، حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت صدیق اکبر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت امام حسن بن علی، حضرت حمزہ سید الشہداء اور ان کی زوجہ محترمہ، حضرت ام سلمہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت حذیفہ، حضرت انس، حضرت ابن عمر، حضرت جابر وغیرہ رضوان اللہ علیهم أجمعين

حضرت حافظ سیوطی نے ''درمنثور اور البدور السافرۃ'' میں حوض کوثر اور اس کی مختلف صفات وفضائل کے متعلق عجیب وغریب ستر سے زائد احادیث مبارکہ درج کی ہیں، اسی طرح دیگر بعض تفاسیر نے بھی روایات نقل کی ہیں، تقریباً یہ کثیر روایات حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، جن پر ایمان لانا ضروری اور فرض ہے۔ حضرت آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض کتابوں میں یہ دیکھا ہے کہ کوثر ایک حوض ہوگا جو ایک عظیم الجثہ فرشتے کی کمر پر ہوگا، جہاں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے، وہ آپ کے ساتھ ہوگا اور یہ کوئی بعید نہیں، ولا یعجز اللہ شیء۔ [روح المعاني]

بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور دیگر کتب حدیث میں یہ بھی وارد ہے کہ کوثر کے پانی پینے کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے (بعض اصحاب باطن کا قول ہے کہ پینے والے لوگوں کی تعداد کے برابر ہوں گے) اس وقت بعض لوگوں کو فرشتے پکڑ پکڑ کر حوض سے ہٹادیں گے، تو میں کہوں گا: اے میرے پروردگار! یہ تو میرے امتی ہیں، اللہ تعالیٰ شانہ ارشاد فرمائیں گے: آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا نئی نئی باتیں پیدا کی تھیں؟ پس میں یہ سن کر کہوں گا: ان کے لیے ہلاکت اور دوری ہو۔

علماء ومفسرین فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دین سے پھر گئے یا جنہوں نے سنتوں کو چھوڑ کر نئی بدعات گڑھ لیں، اور صحیح دین میں بدعات داخل کر کے دین کو مسخ کرلیا، جیسے ہمارے زمانہ کے اہل بدعت قبر پرست لوگ ہیں، جو مزاروں کو عبادت گاہ بنا کر اپنی دکانداری کی خاطر آئے دن عرس مناتے اور قبروں پر طواف کر کے خوب نذر ونیاز کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں، تیجا، گیارہویں، اکیسویں، چالیسویں، چراغاں، تہواروں پر مرمٹتے اور ناچ گانوں نعتوں اور قوالیوں سے اپنے پیٹ پال رہے ہیں، جن چیزوں کا کتاب وسنت اور خیر القرون میں نام ونشان تک نہیں، اور انہیں اصل دین بتا بتا کر پوری امت کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں وہ جزاء دے جس کے وہ اہل اور حقدار ہیں۔

احادیث صحیحہ میں حوض کوثر کے پانی کی صفائی، شیرینی، اس کے کناروں کا موتیوں، سونے، جواہرات وغیرہ سے مرصع ومزین ہونا اس کے آبخورے، گلاس، برتنوں کی تعداد آسمانی ستاروں کے برابر ہونا اور ایک دفعہ اس کا پانی

پینے سے پھر کبھی اسے پیاس نہ لگنا، یہ وہ اوصاف ہیں جن کو دنیا کے کسی بھی پانی یا مشروب پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جنتی نعمتیں پانی ہو یا کھانا، لباس ہو یا کرسی، تکیہ، تخت، فرش ہو یا اور کوئی چیز، وہ سب کے سب قیاس وعقل سے ماوراء اور بالاتر ہیں۔ علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حوض کوثر کی صفت میں روایات حدیث میں آیا ہے کہ اس میں دو پرنالے آسمان سے گریں گے، جو نہر کوثر کے پانی سے حوض کو بھر دیں گے۔

بعض علماء نے مختلف روایات حدیث سے یہ اخذ کیا ہے کہ حوض کوثر محشر میں ہوگا، یعنی پل صراط سے پہلے اور بعضوں نے یہ کہا کہ حوض دو ہوں گی: ایک محشر میں، دوسری پل صراط کے بعد دخول جنت سے پہلے، نام دونوں کا کوثر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جنتی نہر ہی کوثر ہے، محشر میں وہیں سے لائی جائے گی، اور حدیث انس رضی اللہ عنہ عند المسلم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل حوض کوثر جنت میں ہے، اور یہ حوض کوثر میدان محشر میں ہوگی اس میں دو پرنالوں کے ذریعہ نہر کوثر کا پانی ڈالا جائے گا۔ اس سے ان تمام روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حوض کوثر محشر میں ہے یا بعد الصراط ہے، یا جنت میں اور امت محمدیہ کا ورود اس پر جنت سے پہلے ہوگا یا جنت میں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جسے امام بخاری نے تخریج کی ہے کہ الکوثر کے معنی خیر کثیر کے ہیں، اور حوض کوثر خیر کثیر کا ایک حصہ ہے جو کہ اس میں داخل ہے، پس اس عمومی معنی میں دین وشریعت، قرآن کریم، شفاعتِ کبریٰ، مقامِ محمود، شرحِ صدرِ نبوی، ختمِ نبوت، نعمت علم الاولین والآخرین، معجزۂ معراج، خلق عظیم کی نعمت، دولت توحید، فتوحات کثیرہ، وہ سارے کمالات وصفاتِ عالیہ جن سے آپ متصف تھے، ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ [الضحی:۵] (اور آپ کا پروردگار جلد آپ کو وہ کچھ دے گا جس سے آپ راضی ہو جائیں) کا گرانقدر مژدہ وغیرہ، جنہیں مختلف علماء نے خیر کثیر کہا، یہ سارے کے سارے اس الکوثر بمعنی خیر کثیر کے افراد ہوں گے، اور خیر کثیر میں شامل رہیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ عبد العزیز اور دیگر اکابرین امت کا یہی فیصلہ ہے۔

فالکوثر هو الخیر الکثیر مقام القرب الذي لا مقام فوقه فجمیع المزایا مندرجة فیه وتبع له۔ واللہ أعلم

فائدہ:

کتب حدیث اور کتب تفسیر میں حوض کوثر کے متعلق بڑی تفصیلات ہیں، اور یہ گوشہ بھی ملحوظ نظر ہو کہ میدانِ محشر میں یہ اعزاز سارے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کو حاصل رہے گا، اور ہر پیغمبر کا اس کی امت کی قلت وکثرت

کے اعتبار سے حوض کوثر کا الگ اہتمام ہوگا۔

أخرج الترمذي عن سمرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن لكل نبي حوضا وإنهم يتباهون أيهم أكثر واردة وإني أرجوان أكون أكثرهم واردة۔ [البدور]

وأخرج الطبراني عن سمرة بن جندب أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن الأنبياء يتباهون أيهم أكثر أصحابامن أمته فأرجوأن أكون يومئذ أكثرهم كلهم واردة، وإن كل نب ۵ منهم يومئذ قائم على حوض ملأن معه عصا يدعو من عرف من أمته ولكل أمة سيما يعرفهم بها نبيهم۔ [البدور، مجمع الزوائد] أخرج الطبراني في الأوسط عن أبي هريرة وجابر بن عبدالله قالا: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: على بن ابى طالب صاحب حوضي يوم القيامة۔ [البدور، مجمع الزوائد، كنز العمال]

﴿إِنَّآ أَعۡطَيۡنَٰكَ ٱلۡكَوۡثَرَ﴾ شروع میں إِنَّآ اور پھر أَعۡطَيۡنَا ارشاد فرما کر ایک بہت بڑے معطی و منعم کی طرف سے عظیم عطاء و بخشش کی طرف اشارہ ہوا، اور معطی عموماً اپنی شان کے مطابق عطا کرتا ہے۔

اولاً اپنی ذات کی طرف متوجہ فرما کر پھر بخشش کا ذکر فرما کر یہ بتادیا کہ عاشق صادق کا مقصود اصلی اس کی ذات پاک ہے، پھر عطاء بخشش۔ ''کاف'' ضمیر واحد مذکر کا مقصد تخصیص ہے کہ یہ بخشش مخاطب کے ساتھ مخصوص ہے، پھر اس کی وساطت سے دوسروں کو بخشش ہوتی رہے گی، ماضی کا صیغہ لا کر اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ صرف وعدہ نہیں، بلکہ یہ عطا واقع ہو چکا ہے، اور تقدیر مبرم میں لکھا جا چکا ہے۔

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ﴾ میں لام تخصیص کے لیے ہے، یعنی صرف اپنے ربّ کے لیے نماز پڑھیں جیسے ﴿إِيَّاكَ نَعۡبُدُ﴾ ﴿وَلَكَ نُصَلِّي﴾ یا ﴿ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ﴾ میں۔ کامل و اکمل ہستی کو کامل عبادت نماز کا حکم دیا گیا، پھر اس عظیم نعمت کوثر جو کہ خیر کثیر ہی ہے اس پر کامل شکر اداء صلوٰۃ کا حکم مع الاخلاص سے توحید الٰہی کا سبق دیا گیا کہ ہر عبادت خصوصاً نماز، رکوع و سجدہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے۔

دنیا میں سجدے تو بہت بکثرت مروج ہیں، مگر جو سجدے اس ذات پاک کے لیے نہ ہوں وہ کھوٹے اور جھوٹے شمار ہوں گے، پھر اس مخصوص نماز کو کوثر سے جو مناسبت ہے کہ اس میں اپنے خالق و مالک سے مناجات، دست بستہ، عجز و نیاز، شہد سے زیادہ شیریں ہے، اور نمازی پر جو انوار و برکات نازل ہوتے ہیں وہ دودھ سے زیادہ روشن و

چمکدار اور لذیذ تر ہوتے ہیں، اور نمازی کے قلب پر جو سرور وسکون وارد ہوتا ہے وہ برف سے زیادہ سرد وخنک ہوتا ہے، جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے، فرمایا: وجعلت قرة عيني في الصلوة۔ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی)۔ اور نماز کے آداب وسنن، قیام وقعود اور دیگر اعمال کوثر کے کناروں پر لگے ہوئے جواہرات وموتیوں کی مانند ہیں، اوراذکار وتسبیحات کی مثال کوثر کے آبخورے اور نورانی برتنوں کے مشابہ ہیں۔

یہ ساری چیزیں کوثر کے بدنی شکر شمار ہوں گے، مالی شکر کا بیان ﴿وَانْحَرْ﴾ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اپنے ربّ کے نام پر مالی شکر پیش کیجئے! صرف اس کی رضاء کے لئے قربانی کیجئے! نحر صرف اونٹ کی قربانی کا نام ہے، مگر یہاں ہر جانور کی قربانی کو شامل ہے، خواہ نحر ہو یا ذبح، نحر کی تخصیص اس لئے ہے کہ عرب میں زیادہ تر اونٹ کی قربانی کا رواج ہوتا تھا۔

دینِ الٰہی سراسر قربانیوں سے عبارت ہے، جان ومال، اولاد ووطن، اوقات، غرض یہ کہ جب تک ہر چیز کی قربانی پر اقدام نہ ہو کوئی مقام ومرتبہ حاصل نہ ہوگا، اور ہر قربانی کے لیے اخلاص ورضا اوّلین شرط ہے، اگر یہ چیز بطیب خاطر ذوق وشوق کے ساتھ نہ ہو تو قبولیت کا مقام شاید حاصل نہ ہو، یہ مقام ورتبہ ہر کس وناکس کی قسمت میں کہاں؟ اِلّا یہ کہ کسی پر نظر رحمت وشفقت ہو، یہ الگ بات ہے، ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ﴾ [الجمعة: ۴] (یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے)۔

سورت کی پہلی آیت میں کفار کے زعمِ باطل کی تردید کرنے کے لیے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر، یعنی دنیا وآخرت کی ہر خیر اور وہ بھی کثیر مقدار میں عطا فرمانے کی خوش خبری دی گئی، اور پھر اس عطا کے شکر کے لئے دو چیزوں کی ہدایت کی گئی: ایک نماز، دوم قربانی، جس طرح نماز بدنی عبادتوں میں سب سے بڑھ کر ہے، اسی طرح قربانی بھی مالی عبادتوں میں اس بنا پر خاص امتیاز واہمیت رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی کرنا بت پرستی کے خلاف عظیم جہاد بھی ہے، کیونکہ کافروں کی قربانیاں تمام تر بتوں کے لیے ہوا کرتی تھیں، اسی لئے قرآن کریم میں ایک اور آیت میں بھی نماز کے ساتھ قربانی کا تذکرہ ہوا ہے: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنعام: ۱۶۲] (یہ بھی) کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے ربّ العالمین ہی کے لیے ہے)۔

جمہور علماء کے نزدیک یہاں نحر سے مراد قربانی ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، عطاء، حسن بصری رضی اللہ عنہم وغیرہ

سے مستند روایات سے یہ ثابت ہے، مگر بعض حضرات نے وَانْحَرْ کے معنی نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے بعض ائمہ تفسیر کی طرف منسوب کئے ہیں، اس کے متعلق حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ روایت منکر (نا قابل اعتبار) ہے۔

پھر قربانی بھی عام ہے، حج کے موقع پر ہو یا عید الاضحیٰ کے دن ہو یا عقیقہ کے طور پر ہو، جس طرح فَصَلِّ میں مطلق نماز فرض ہو یا نفل، یا سنت وواجب، کیونکہ مکہ مکرمہ میں نماز بھی فرض ہوچکی اور آپ نوافل بھی بکثرت پڑھتے تھے اور قربانی بھی عہد ابراہیمی سے مسلسل چلی آرہی تھی، اگرچہ کافروں نے ابراہیمی طریقہ میں تبدیلی وتحریف کردی تھی کہ قربانی بتوں کے لئے کرتے تھے، بتوں کے نام پر قربانی اتنی عام ہوچکی تھی کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی یکسر چھوڑ چکے تھے، جس طرح کہ نماز میں تالیاں بجاتے کودتے تھے اور دوڑ لگاتے تھے، قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً﴾ [الأنفال: ۳۵] (اوران لوگوں کی نماز خانۂ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی)۔ اس طرح آیت کریمہ میں دونوں قسم کی عبادتوں کی اصلاح بھی فرمائی گئی۔

﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ الحمد للہ یہ پیشینگوئی پوری ہوئی کہ آپ کے سارے دشمن مٹ گئے، اور مکمل بے نام ونشان ہو گئے، اور آپ کی نسبی وروحانی نسل سے سارا جہاں آباد ہوا، اور پورے عالم میں آپ کا ذکر خیر اور چرچا عام ہوا، کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صبح وشام تذکرہ نہ ہو، اور آخرت میں مقامِ محمود وشفاعتِ کبریٰ کے مراتب آپ ہی کے لیے مختص رہے، اور یہ بھی طے ہوا کہ آپ کی پیروی اور اتباع ہی کی بدولت ہر قسم کی سعادت میسر رہے گی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور پیروی کے بغیر کوئی نجات ممکن نہیں ہوگی، اور آپ کا مخالف ہر خیر سے ہمیشہ کے لئے محروم ہی رہے گا۔

خلاف پیغمبر کسے راہ گزید ☆ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

فائدہ:

سورۃ الکوثر بہت بڑی بابرکت ہے، اس کی بار بار بکثرت تلاوت اور پڑھنے کے وہی فوائد ہیں جو کہ کثرت کے ساتھ درود شریف پڑھنے کے فوائد ہیں۔ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اور دیگر اکابرین فرماتے ہیں کہ جو شخص اس مبارک سورت کی کثرت سے تلاوت کرے اور شب جمعہ بصد ادب ایک ہزار مرتبہ پڑھ کر باوضو آرام کرے، تو زیارت باسعادت سے مشرف ہوگا، سات جمعہ تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

سُورَةُ الْكٰفِرُوْنَ

مكيةٌ آياتها ٦ ركوعها ١

سورۂ کافرون مکی ہے، اس میں چھ (٦) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام

اس سورت کا نام سورۃ الکفرون ہے، پہلی آیت میں الْكٰفِرُوْنَ کے کلمہ سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

جمہور علماء کے نزدیک یہ سورت مکیہ ہے، حضرت ابن عباس، ابن مسعود، حسن بصری اور عکرمہ رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے، ایک روایت قتادہ سے بھی یہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر، ضحاک اور قتادہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہ سورت مدنیہ ہے، مگر جمہور علماء کا قول راجح ہے اور یہی مشہور ہے، اس سورت کا نزول سورۃ الماعون کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات و حروف:

یہ سورت چھ (٦) آیات، چھبیس (٢٦) کلمات اور چورانوے (٩٤) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط و مناسبت:

سورۃ الکوثر میں خیر کثیر فی الدارین کی بشارت ہے، جس میں شوکت و عظمت اور کثرت اتباع و متعلقین کی خوشخبری ہے، پھر نماز و قربانی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک کو مضبوط و محکم رکھنے کا بیان ہے، اس سورۃ الکفرون میں تمام دنیا کے بت پرستوں اور اہل باطل کے سامنے کھلے الفاظ میں عام اعلانِ براءت ہے کہ تم کافر ہو،

تمہارا طور وطریقہ شر وفساد پر مبنی ہے، جس میں کسی خیر کا نام ونشان تک نہیں، لہٰذا میں تمہارے طور وطریق سے بیزار ہوں، تمہارے معبودوں سے جس طرح اس وقت بیزار ہوں ان کی عبادت نہیں کرتا ہوں، آئندہ بھی ان کی عبادت نہیں کرسکتا، جس طرح کہ تم میرے معبود کی عبادت نہیں کرسکتے، اور یہ خوب سمجھو! خیر وشر کا اجتماع ہرگز ممکن نہیں ہوسکتا۔

شان نزول:

محمد ابن اسحٰق نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، امیۃ بن خلف، اسود بن عبدالمطلب، (بعض روایات میں ابوجہل بن ہشام اسود بن عبدیغوث کے نام بھی ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا (بعض روایات میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعہ پیغام بھیجا) کہ آیئے! ہم آپس میں اس بات پر صلح کرلیں کہ ایک سال آپ ہمارے بتوں کی عبادت کیا کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ [قرطبي] اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے طبرانی کی روایت میں ہے کہ کفار مکہ نے اول تو باہمی مصالحت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ صورت پیش کی کہ ہم آپ کو اتنا مال دیدیتے ہیں کہ آپ مکہ میں سب سے زیادہ مالدار ہوجائیں، اور جس عورت سے آپ چاہیں آپ کا نکاح کرادیں، آپ صرف اتنا کریں کہ ہمارے معبودوں کو برا نہ کہا کریں، اور اگر آپ یہ نہیں مانتے تو پھر ایسا کرلیں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کیا کریں، اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کیا کریں۔ [مظهري]

ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ کفار مکہ نے باہمی مصالحت کے لیے یہ صورت پیش کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں میں سے بعض کو صرف ہاتھ لگادیں، تو ہم آپ کی تصدیق کرنے لگیں گے، اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام سورۃ الکٰفرون لے کر نازل ہوئے، جس میں کفار کے اعمال سے براءت اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم ہے، اور یہی سنتِ ابراہیمی ہے۔

شان نزول کے جو متعدد واقعات بیان ہوئے، ان میں کوئی تضاد نہیں ممکن ہے کہ یہ سب واقعات پیش آئے ہوں، اور سب کے جواب میں اس سورت کا نزول ہوا ہو، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسی مصالحتیں ممنوع و ناکارہ ہیں۔

اس مضمون پر پہلے کلام ہوچکا ہے وہاں دیکھا جائے۔ [سورۃ القلم کے فوائد]

"سورۃ الکٰفرون" کے فضائل:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہت بہتر ہیں وہ دونوں

سورتیں جو فجر کی سنتوں میں پڑھی جاتی ہیں، یعنی سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص۔ [مظهري] تفسیر ابن کثیر میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح کی سنتوں میں اور مغرب کے بعد والی سنتوں میں بکثرت یہ دونوں سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ امام احمد، ابن حبان، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے پچیس بار اور بعض روایات میں ہے کہ ایک ماہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دونوں سورتیں فجر کی اور بعد مغرب کی سنتوں میں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ [روح المعاني]

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمیں کوئی دعا بتادیجئے! جو ہم سونے سے پہلے پڑھا کریں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھنے کی تلقین فرمائی، اور فرمایا کہ یہ شرک سے براءت ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ سورت چوتھائی قرآن کے برابر اجر رکھتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے مقصودی مضامین چار ہیں: احکامِ شرعیہ، احوالِ آخرت، امر بعبادة اللہ تعالیٰ، نہی عن عبادة غیر اللہ۔ اس سورت میں چوتھی قسم کا مضمون بیان ہوا ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس صرف توحید اور براءت عن الشرک کی نعمت ہو تو ابدی جنت کے لیے یہی کافی ہے، اگرچہ اعمالِ صالحہ کوئی نہ ہو، اسی طرح خلود فی النار کے لیے صرف کفر و شرک ہی کافی ہے، اگرچہ دیگر معاصی کچھ بھی نہ ہو، پس یقین کرنا چاہئے کہ جنت کی وراثت صرف ایمان پر موقوف ہے، اور دوزخ کا کفر و شرک پر۔ [کبیر]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۵ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے: اے کافرو! ۝۱ میں تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کرتا ہوں ۝۲ اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرتے ہو ۝۳ اور نہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا ۝۴ اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرو گے ۝۵ تم کو اپنا دین پسند ہے، اور مجھ کو اپنا دین پسند ہے ۝۶

معارف ومنازل

کسی کلام میں اگر بغیر کسی فائدہ کے کوئی تکرار ہوتو عام طور پر اُسے معیوب سمجھا جاتا ہے، اگر تکرار کسی ضرورت یا خاص فائدہ کے لیے ہو، یا الفاظ میں تکرار ہو مگر معنی ومطلب میں تکرار نہ ہوتو یہ معیوب نہیں، بلکہ مستحسن ہے۔قرآن حکیم اپنے نظم ومعانی کے اعتبار سے ہر قسم کے عیوب ونقائص سے بہت بلند وبالا ہے، اور ہر قسم کی کمی و نقصان سے پاک ہے، لیکن اس کے الفاظ ومعانی میں اگر کوئی تکرار واقع ہوتو وہ کسی ضروری فائدہ، بلکہ کئی فوائد کے لئے ہوگا۔

اس قسم کے تکرارات اگر چہ سرسری نظر میں مکرر معلوم ہوتے ہوں مگر غور وفکر کے بعد ایسا معلوم ہوگا کہ کوئی تکرار نہیں، مثال کے طور پر سورۃ الرحمن میں اکتیس مرتبہ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ کا تکرار بظاہر نظر آتا ہے، مگر حقیقت میں ہر آیت کا مقصد ومنشاء ایک دوسرے سے الگ ہے، لہٰذا لفظی تکرار کسی الگ معنی ومطلب کے لئے ہے، معنوی تکرار کوئی نہیں، بلکہ کلام میں حسن وخوبصورتی اور جامعیت کی علامت کے ساتھ نہایت مؤثر انداز میں تذکیر ونصیحت پر مبنی ہے، چونکہ سورۃ الکٰفرون میں چند کلمات اگر چہ بظاہر مکرر معلوم ہوتے ہیں، مگر یہ تکرار نہیں یہ ایک اہم اور بلند مقصد کے اثبات پر گواہی ہے، لہٰذا علماء کرام مفسرین حضرات نے اس کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں، اور وہ یہ ہیں:

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ یہاں سرے سے تکرار ہی نہیں، بلکہ جیسا مرض ویسا علاج والا نسخہ کارگر ہے، کیونکہ جب کوئی مطلب اہم ہو اور مخاطب اس کی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو اور وہ زور دار ضد وہٹ دھرمی پر تلا ہوا منکر ہو تو ایسی صورت میں اس کے انکار کا تقاضاء ہی یہ ہوتا ہے کہ کلام میں شد ومد کے ساتھ تکرار ہو، تا کہ وہ اپنے انکار سے باز آجائے، یہ تکرار عین مصلحت ہے اور بلاغت کے اصولوں کے ساتھ مطابق ہے، اور یہاں یہی مصلحت پیش نظر کار فرما ہے، **کماھو الظاھر**

(۲) دوم توجیہ یہ ہے (جسے امام بخاری نے بہت سے مفسرین سے نقل فرمایا ہے) حضرت حکیم الامت تھانوی اور دوسرے حضرات نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور اسی توجیہ کو سامنے رکھ کر ان آیات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ (ذرا ایک نظر ترجمہ کو دوبارہ ملاحظہ کیا جائے) وہ یہ ہے کہ یہ کلمات پہلی بار آیت ۲ اور ۳ میں زمانہ حال کے لئے ہیں اور دوسری بار آیت ۴ اور ۵ میں زمانہ مستقبل کے لیے ہیں، اس لئے تکرار نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو فی الحال ایسا

ہے کہ میں تمہارے معبودانِ باطلہ کی عبادت کروں، اور تم میرے معبودِ برحق کی عبادت کرو اور نہ آئندہ ایسا ہوسکتا ہے کہ میں اپنی توحید پر اور تم اپنے شرک پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے کے معبود کی عبادت کریں۔

مگر امام بخاری کی تفسیر میں ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ کی تفسیر میں ''دِيْن'' بمعنی مذہب، یعنی اسلام وکفر سے کی ہے، اور مطلب یہ قرار دیا ہے کہ مصالحت کی مجوزہ صورت قابلِ قبول نہیں، میں تو اپنے مذہب برحق پر قائم ہوں اور رہوں گا، تم بھی اپنے دین باطل پر مصر ہو تو تم جانو۔ اس کا انجام خود تم کو بھگتنا پڑے گا اور حکیم الامت نے ''دِيْن'' کو بمعنی جزاء قرار دیا ہے، اس لئے ان کے نزدیک اس آیت کے معنی وہ ہیں جو ﴿لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ [البقرة:۱۳۹] (ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں، اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں) کے ہیں، یعنی تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ (جزاء) ملے گا، اور مجھ کو میرے اعمال کا۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ یہ ہے: آپ کہہ دیجئے: اے کافرو! نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں، اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرتے ہو، اور نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا، اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کروگے، تم کو تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرا بدلہ ملے گا۔

(۳) سوم ان آیات کی تیسری تفسیر وہ ہے جس کو حافظ ابن کثیر نے اختیار فرمایا ہے کہ حرف ''ما'' لغت عرب میں جس طرح ''الَّذي'' کے معنی (موصول) آتا ہے اسی طرح مصدری معنی میں بھی آتا ہے کہ وہ فعل پر داخل ہو کر اس کو مصدری معنی میں کر دیتا ہے۔ اس سورت میں آیت ۲ اور ۳ میں تو حرف موصولہ (بمعنی الَّذي) ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جن معبودانِ باطلہ کی تم پرستش کرتے ہو میں ان کی پرستش نہیں کرتا، اور جس معبودِ برحق کی میں پرستش کرتا ہوں اس کی تم نہیں کرتے، اور آیت ۴ اور ۵ میں ''ما'' مصدریہ ہے، اور آیتوں کے معنی یہ ہیں: **ولاأنا عابد عبادتكم ولاأنتم عابدون عبادتي**۔ ہماری تمہاری عبادتوں کے طریقے مختلف ہیں، میں تمہارے طرز کی عبادت نہیں کرسکتا، اور تم (جب تک کفر میں ہو) میرے طرز کی عبادت نہیں کرسکتے۔ اس تفسیر میں آیت ۲ اور ۳ میں معبودوں کا اختلاف بتایا گیا، اور آیت ۴ اور ۵ میں عبادت کے طرز وطریق کا اختلاف ظاہر کیا گیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ نہ ہمارے تمہارے معبودوں میں اشتراک ہے، اور نہ طرز عبادت میں اشتراک ہے، کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنوں کا طریقِ عبادت تعلیم خداوندی کے مطابق ہے، اور کفار کا طریقِ عبادت منگھڑت وخود ساختہ ہے۔ اس تفسیر کے پیشِ نظر بھی تکرار کا اعتراض رفع ہوسکتا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس تفسیر کو راجح قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ کلمہ "لا إله إلا الله محمد رسول الله" سے یہی مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور طریقۂ عبادت وہی معتبر ہوگا جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اور:

﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ کی تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسا دوسری جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَاِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ﴾ [یونس: ۴۱] (اور اگر یہ تمہاری تکذیب کریں تو کہہ دو کہ مجھ کو میرے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا)۔ تم میرے عمل کا جواب دہ نہیں ہو، اور میں تمہارے عملوں کا جوابدہ نہیں ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ لفظ دین کو ابن کثیرؒ نے بھی اعمالِ دین کے معنی میں لیا ہے، اور اس کا مقصود وہی ہوا جو حکیم الامتؒ نے بیان کیا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے اچھے برے عمل کی جزاء وسزا بھگتنی پڑے گی۔

(۴) بعض مفسرین نے یہ تفسیر اختیار کی ہے کہ حرف ''ما'' دونوں جگہ موصولہ ہی ہے، اور حال واستقبال کا بھی فرق نہیں، بلکہ یہ تکرار مفید ہے جیسا کہ ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ [الشرح: ٦] (بیشک سختی کے ساتھ آسانی ہے، بیشک سختی کے ساتھ آسانی ہے) میں ہے۔

یہاں اس تکرار کا فائدہ تاکید ہے، جو تقاضائے بلاغت ہے، پھر کفار کی طرف سے مصالحت کی پیش کش متعدد مرتبہ ہوئی تھی، تو مکرر تردید بھی برمحل اور ضروری ہے۔ یہ توجیہ بعینہٖ اول توجیہ ہی ہے، صرف الفاظ کا فرق ہے۔

بعض علماء نے اس توجیہ کی تشریح میں یہ فرمایا ہے کہ جب مشرکین نے یہ کہا تھا کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت میں آپ کے ساتھ شریک ہوجائیں، اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت میں ہمارے ساتھ شریک ہوجائیں، تو ہر شرکت کی تردید ایک بار کی گئی، اس طرح یہ تکرار برمحل اور تقاضائے بلاغت ہے، یہ صرف الفاظ کا فرق ہے، اور بعینہٖ پہلی توجیہ ہے، کما مرّ۔

مشرکین کے ساتھ مصالحت اور قطع تعلق:

قرآن کریم نے "الحب في الله والبغض في الله" کے تحت متعدد مقامات میں یہود ونصاریٰ اور مشرکین واعداء اللہ واعداء الاسلام کے ساتھ محبت ودوستی اور ہر قسم مدارات وتعلقات رکھنے پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر سختی سے پابندی عائد فرما کر انہیں دشمنانِ اسلام سے دور رہنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿فَلَا

تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ [الفرقان:۵۲] (توتم کافروں کا کہانہ مانو، اوران سے اس قرآن کے حکم کے مطابق بڑے شدومد سے لڑو)۔

﴿وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا﴾ [الدھر:۲۴] (اوران لوگوں میں سے کسی بدعمل اورناشکرے کا کہانہ مانو)۔ ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ﴾ [القلم:۱۰] (اورکسی ایسے شخص کے کہے میں نہ آجانا جو بہت قسمیں کھانے والاذلیل ہے)۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ [الممتحنة:۱] (اے مؤمنو! میرے اوراپنے دشمنوں کودوست نہ بناؤ)۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ [الأنفال:۷۳] (بیشک منافقین بعض بعض کے دوست ہیں)۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ﴾ [المائدة:۵۱] (اے مؤمنو! یہود و نصاریٰ کودوست نہ بناؤ)۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ [لقمان:۱۸] (اورخداکسی اترانے اور شیخی بگھارنے والے کودوست نہیں رکھتا)۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [آل عمران:۳۲] (خداکافروں کودوست نہیں رکھتا۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [آل عمران:۵۷] (اوراللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کوپسند نہیں کرتا)۔

﴿لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ﴾ [الکافرون] (میں اس چیز کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو)۔ ﴿لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ [البقرة:۱۳۹] (ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں، اورتمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں)۔ ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ [الکافرون] (تم کواپنادین پسند ہے، اورمجھ کواپنا دین پسند ہے)، وغیر ذلک من الآیات۔

اسی طرح بے شماراحادیثِ صحیحہ مرفوعہ موقوفہ ذخیرۂ احادیث میں متصل سندوں کے ساتھ شاہد عدل اورگواہی دے رہی ہیں کہ مسلمانوں کوکسی طرح دشمنانِ اسلام کے ساتھ محبت ودوستی رکھنے کی اجازت نہیں، بلکہ ان کے خلاف اورشریعتِ مطہرہ کی حمایت اور بالادستی کی خاطر جہاد کرنا فرض اورضروری ہے، اسی جذبۂ جہاداورعملِ جہاد کی بدولت اسلام کوترقی ہوئی، اوردینِ اسلام کواقوامِ عالم پرغلبہ وعروج ہوا۔

یہ جہادہی کی برکت ہے کہ سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے مختصر عرصہ میں پورے جزیرۂ عرب تک اسلام پھیل گیا، اورآپ کی وفات حسرت آیات کے بعد باوجوداسباب ووسائل اورافرادی قوت کے فقدان وکمی کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زرین پاکیزہ دورکی مختصر مدت میں اس وقت کے عظیم متمدن اورترقی یافتہ سلطنتوں

''فارس وروم'' کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جذبۂ جہاد کی بدولت تہہ وبالا اور نیست ونابود کیا، اور ایک بڑے عرصہ تک وہ جہادی معرکوں میں حصہ لیتے رہے، اور اقدامی پوزیشنوں میں بڑھتے گئے، کبھی زمانہ اور دشمنوں کی عظمت وشوکت یا کثرت نے انہیں دفاعی پوزیشنوں کے اختیار کرنے پر مجبور نہ کرسکے۔

خلافتِ فاروقی میں رومیوں نے ہرقل روم کی قیادت میں نولاکھ ساٹھ ہزار مسلح لشکروں کو صحرائے سینا (یرموک) کے میدان میں اتاردیا۔ ادھر سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایمان ویقین سے مسلح چھتیس ہزار جان نثاروں کا لشکر ان رومیوں کے ساتھ مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ زبانِ حق بیانِ نبوت سے پہلے پیشینگوئی ہوچکی تھی، جس کے سہارے پر یہ بہادرانِ اسلام ابابیل پرندوں کی طرح رومیوں پر یلغار کرکے ابرہہ اشرم کی فوج کی طرح انہیں کاٹ کاٹ کر ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ﴾ [الفیل: ۵] (پس ان کو ایسا کردیا جیسے کھایا ہوا بھوس) کے گرداب میں اتاردیئے۔ فرضي الله عنهم وجزاهم عن سائر الأمة كماهم أهله۔

سورۃ الکافرون میں کفار کی طرف سے پیش کی ہوئی چند صورتوں کو بالکل رد کرکے براءت کا کھلے الفاظ میں اعلان کردیا گیا، مگر قرآن کریم ہی میں دوسری جگہ یہ ارشاد بھی ہے: ﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ [الأنفال: ۶۱] (کفار اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی صلح کی طرف مائل ہوجائیں) یعنی معاہدہ صلح کرلیجئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود سے معاہدہ صلح کیا، اور مقامِ حدیبیہ میں بھی مشرکین قریش کے ساتھ معاہدہ صلح کیا، اس لئے بعض علماء نے سورۃ الکفرون کو منسوخ مانا ہے، اور منسوخ ماننے کی بڑی وجہ آخری آیت: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ کو قرار دیا ہے، کیونکہ یہ آیت بظاہر احکامِ جہاد کے خلاف ہے، تو گویا اس کا نسخ آیات جہاد سے ہوا، لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔

اول وجہ تو یہ ہے کہ ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ دو جملے خبریہ ہیں، اور اصول یہ ہے کہ خبر میں نسخ جاری نہیں ہوتا، ورنہ قائل کا کذب لازم آئے گا۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں بلکہ پوری سورت میں نسخ کا قطعاً احتمال ہی نہیں۔ دوسرے ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ کا یہ مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کفار کو کفر کی اجازت یا کفر پر برقرار رہنے کی ضمانت دیدی گئی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ﴿وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ [الزمر: ۷] (اور اللہ اپنے بندوں کے کفر کرنے سے راضی نہیں ہوتا) کا فرمان جاری ہوچکا ہے، بلکہ معلوم ہوچکا کہ اس کا حاصل وہی ہے، ﴿لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۳۹] (ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں، اور تمہارے لیے تمہارے اعمال

ہیں) کا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جیسا کروگے ویسا بھروگے، یا مطلب یہ ہے کہ ہماری تمہاری عبادت میں اشتراک اس لئے نہیں ہوسکتا کہ تم کو اپنا دین اور طریقہ عبادت پسند ہے، اور مجھ کو اپنا دین اور طریقہ عبادت پسند ہے، اور جب ایک دوسرے کا مذہب ایک دوسرے کو پسند نہیں تو شرکت کیسی؟

گویا یہ آیت پچھلے مضمون (عدمِ اشتراک) کی دلیل ہے، اس لئے یہ صحیح مسلک جمہور علماء ہی کا ہے کہ یہ سورت منسوخ نہیں، جس قسم کی مصالحت کافروں نے چاہی تھی اور اس کی تردید اس سورت میں ہوئی ہے، وہ مصالحت جیسے اُس وقت حرام وممنوع تھی آج بھی حرام وممنوع ہے، اور جس مصالحت کی اجازت ﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ [الأنفال: ٦١] (کفار اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی صلح کی طرف مائل ہوجائیں) وغیرہ آیت سے معلوم ہوئی اور جو صلح حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود یا مشرکین مکہ سے کی وہ جس طرح اُس وقت جائز تھی، آج بھی جائز ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ صلح نہ تو ہر موقع پر مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ہر موقع پرنا جائز ہے، بلکہ صلح کے کچھ اصول وضوابط اور شرائط ہوتے ہیں، اسی طرح موقع ومحل بھی ہوتا ہے، جن کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صلحِ حدیبیہ کے موقع پر صلح کا ایک جامع اصول بیان فرمادیا کہ ہم کو ہر صلح قبول وتسلیم ہے اور ہر شرط ماننے کو ہم تیار ہیں إلّا صلحاً أحل حراماً أو حرم حلالاً۔ مگر وہ صلح ہمیں ہرگز تسلیم نہیں جو کسی حرام کو حلال یا کسی حلال کو حرام کردے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر صلح کی جاسکتی ہے مگر وہ صلح جائز نہیں جس میں شریعت اسلامیہ کے کسی اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہو، یا جس میں کوئی شرعی اصول پائے مال ہوتا ہو، وہ صلح ہرگز جائز نہیں ﷺ

اب قابل غور یہ بات ہے کہ کفار مکہ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں ان سب میں کم ازکم کفرواسلام میں التباس واشتباہ یقینی تھا، اور بعض صورتوں میں تو اصولِ اسلام کے خلاف شرک کا ارتکاب لازم آتا تھا، ایسی صلح سے سورۂ کافرون کے ذریعہ اعلانِ براءت کیا گیا ہے، جو قیامت تک کے لیے غیر منسوخ ہے۔ پرستارانِ توحید قیامت تک نہ کفر کی تائید پر راضی ہوسکتے ہیں، نہ معبودانِ باطل کی پرستش پر تیار ہوسکتے ہیں، اور جن نصوص میں صلح کو جائز قرار دیا، یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے یا مشرکین سے جو صلح کی ان میں ایسی کوئی صورت نہیں جس سے اصولِ اسلام کی کوئی خلاف ورزی و پائے مالی لازم آتی ہو، یا کفرواسلام کی حدود میں اشتباہ والتباس ہوتا ہو۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام سے زیادہ صلح جوئی، سالمیت، حسنِ اخلاق، رواداری اور انسانی ہمدردی کی دعوت

تمام دنیا میں کسی مذہب نے نہیں دی، اور یہ امن وسلامتی، صلح ورواداری اسلام ہی کا طرۂ امتیاز رہا، اور اگر اسلام نہ ہوتا اور اس کے زرین اصول چاردانگ عالم میں پھیلے ہوئے نہ ہوتے تو سارے اکناف واطراف عالم میں سوائے خون ریزی وتباہی کے کچھ نہ ہوتا۔ یہودیت ونصرانیت نے جانوروں، جنگلوں، سمندروں، دریاؤں کو تحفظ دینا تو درکنار اشرف المخلوقات کو خاک وخون میں تڑپا کر دم لیتے، اور بے دردی سے بستیوں، شہروں، مردوں، عورتوں، بچوں اور بیگناہوں کو ابدی موت کی نیند سلادیتے۔ لاکھوں انسانوں کے خون سے ہولی کھیل کر انہیں موت کی گھاٹ اتار دیتے۔ ابھی اس زمانے میں اگر بغور دیکھا جائے تو واضح نظر آتا ہے کہ پورا جہاں ان کی درندگی سے جہنم کا منظر پیش کر رہا ہے۔

جنگ عظیم اول ودوم میں بلا وجہ لاکھوں بستیاں کھنڈرات میں تبدیل ہوئے، لاکھوں بے گناہ عصمت مآب عورتوں کی پردہ دری ہوئی، بیس کروڑ بے گناہ لوگ خاک وخون میں تڑپائے گئے، اور اسی تعداد میں لوگ اندھے اپاہج ہاتھ پاؤں سے معذور ہوئے، کھربوں پدموں روپیہ ودیگر مالیت وسرمایہ مٹی میں تبدیل ہو کر تباہ ہوئے، جو لوگ خود کو امن وسلامتی کا علمبردار کہتے رہتے ہیں اور اس طرح کے دعوؤں سے نہ شرماتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں، انہوں نے عراق وافغانستان اور دیگر اقوامِ عالم کو بموں گولہ بارود وگولیوں سے خاکستر میں تبدیل کئے۔

اسلام اگر نہ ہوتا تو آج یہ عالم جہنم کا منظر پیش کرتا، اسلام صلح وآشتی اعمال واخلاق اور کردار سے پھیلا اور عام ہوا، زمانۂ رسالت میں پورے جزیرۂ عرب پر اس کا قبضہ ہو گیا، مگر ان تمام معرکوں میں مخالفین کے صرف ایک ہزار چالیس افراد مارے گئے، اور دوسو کے قریب مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔

مصر کے شہر ''فسطاط'' آج بھی اس پر گواہ ہے کہ مسلمان سپہ سالار کے خیمہ کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا، جہاں ایک پرندہ نے گھونسلہ بنا کر انڈے دیئے تھے، تاکہ اس کی حق تلفی اور تباہی نہ ہو، اس سے بڑھ کر رحم وکرم کیا ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی بدھ، صابی، عیسائی، یہودی، ہندو وغیرہ اس کی مثال اپنی تاریخ میں پیش کر سکتا ہے؟ تاریخ کبھی جھوٹ نہیں کہتی (الا یہ کہ مورخ کوئی یہودی مستشرق ہو، جن کا سارا سرمایہ جھوٹ ہی ہے) تمام اقوامِ عالم کی شرقاً غرباً تاریخ گواہ ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا، بلکہ اخلاق واعمال اور سنہرے قیمتی اعمال اور عدل وانصاف ومساوات کی بدولت پھیلا اور عام ہوا اور پورے جہاں پر سایہ فگن رہا۔

سُورَةُ النَّصرِ

مدنيةٌ آياتها ٣ رکوعها ١

سورۂ نصر مدنی ہے، اس میں تین (٣) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ النصر ہے، اور سورۃ الفتح وسورۃ اذاجاء بھی اس کے نام ہیں، وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ان کے مصحف میں لکھا ہوا ہے کہ اس سورت کا چوتھا نام ''سورۃ التودیع'' بھی ہے۔ اس سورت میں خلاصہ کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے رخصت ہونے کا اشارہ ہے، اس لئے اسے ''سورۃ التودیع'' بھی کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے متعدد روایات میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی، تو فخر موجودات سید کائنات جناب والا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس میں مجھے میری موت کی خبر دی گئی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اس سورت میں مجھے میری موت کی خبر دی گئی ہے، وہ روئیں، کچھ بعد ہنس پڑیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: تمہارے رونے اور پھر ہنسنے کا کیا سبب تھا؟ کہنے لگیں: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مجھے اپنی موت کی خبر سنائی تو میں رونے لگی، پھر فوراً مجھے خوشخبری سنائی تو میں ہنس پڑی، وہ یہ فرمایا کہ میرے اہل وعیال میں سب

سے پہلے تم مجھ سے جاملوگی، میں خوشی میں ہنسنے لگی۔[الحدیث] اسی قسم کی روایت مرض موت کے موقع پر دوبارہ اسی طرح پیش آیا۔[بخاری] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر ملال کے چھ ماہ بعد سیدۃ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔ رضي الله عنها وعن جميع أولادها۔ آمین

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جناب حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم دونوں نے اس سورت کے نزول سے یہی معلوم کیا کہ اس میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اشارہ ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مدنیہ ہے، اس مشہور اصطلاح کے مطابق کہ بعد از ہجرت جن سورتوں کا نزول ہو وہ مدنی شمار ہوں گی، ورنہ تو روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بموقع حجۃ الوداع مکہ مکرمہ میں اس سورت کا نزول ہوا، یہ بات آئندہ آنے والی ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس سورت کی آیات تین ہیں، اس کے کلمات سترہ (١٧) اور حروف ستتر (٧٧) ہیں، اور اس کا نزول سورۃ التوبۃ کے بعد ہے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان

ربط ومناسبت:

سورۂ کوثر میں جس شان وشوکت عظمت اور کثرت اتباع وذریت کی بشارت وخوشخبری دی گئی تھی اور اسی وعدہ کی پختگی وقوت یقین پر سورۂ کافرون میں کفار مکہ سے براءت وبیزاری کا کھلے الفاظ میں اعلان کیا گیا تھا، اب اس سورۂ نصر میں اسی وعدہ کے ایفاء میں اور بشارت کے وقوع وظہور کی خوش کن خبر دی جارہی ہے، اسی طرح نہر کوثر اور مزید خیر کثیر کے سفر کی تیاری کا حکم ہے، کما مرّ۔ جیسے کہ جس کا سورۂ کوثر میں وعدہ ہو چکا تھا علاوہ ازیں جس ناسازگار اور صبر آزما ماحول میں کفار مکہ ومشرکین سے اظہار برائت وبیزاری کرایا گیا تھا، وہ انسانی عقل سے وراء الوریٰ تھا۔

کوئی شخص (جو کمزور اور بے سروسامان ہو) ایسے وقت میں (جب دشمن طاقتور ہو) سب سے ترکِ تعلق اور برائت کو مصلحت وفائدہ مند خیال نہیں کرسکتا، لیکن اللہ پاک عزّ شانہ جس کی قبضہ قدرت میں سب کچھ ہو، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ مچھروں اور پرندوں اور کمزوروں کے ذریعہ بڑے بڑے لشکروں کو تہہ وبالا کرسکتا ہے، اور اس کی حمایت پروردہ کمزور لوگ بڑے بڑے عظیم بادشاہوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کو چیلنج کرسکتے ہیں۔ یہی وہ عقیدۂ

راسخہ اور ہمت عالیہ ہے کہ سورۃ الکافرون میں کھلے الفاظ میں صنادید قریش سے اعلان برائت کیا جارہا ہے، اور یہ سورۂ نصر اس کام کی تکمیل کی خوشخبری ہے، اور اشارہ ہے کہ جس مقصد کی تکمیل کی خاطر آپ دنیا میں تشریف لائے تھے وہ اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے، مزید اس دار فانی منبع لہو ولعب میں آپ کا رہنا بہتر ہے اور نہ آپ کے منصب عالی کی شایان شان ہے۔ آپ اپنے ربّ ذوالجلال کے پاس آیئے اور مطمئن رہیے، آپ کے عظیم فرزند جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم جنہیں ﴿یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ﴾ [الفتح:۱۷] (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے) کا تمغۂ بسالت وجانفروشی ملا ہے، وہ آپ کے شجرۂ طیبہ کی خوب آبیاری خدمت کریں گے، اور اس کے پھلوں کو پوری دنیا کی منڈیوں تک پہنچا کر سارے جہاں کو سیر وسیراب خوشحال وآباد کریں گے، اور آپ کے پیغام کو سینوں سے لگا کر ہر شجر ممنوعہ اور ظلمتوں کی جڑی بوٹیوں کو کاٹتے رہیں گے اور آگے بڑھتے رہیں گے، ہر وَبر و مَدَر کی آبادی تک آپ کا پیغام پہنچا کر دم لیں گے، پس ایسا ہی ہوا۔

شان نزول سورۂ نصر:

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ سورۃ النصر قرآن حکیم کی آخری سورت ہے باعتبار مکمل نزول کے، یعنی اس کے بعد اگرچہ کچھ آیتوں کا مختلف اوقات میں نزول ہوتا رہا، مگر مکمل کوئی سورت نازل نہیں ہوئی، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ کو قرآن مجید کی پہلی سورت اسی معنی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ مکمل سورت سب سے پہلے یہی نازل ہوئی ہے، اگرچہ سورۂ اقراء وسورۂ مدثر کی چند آیات کا نزول سورۂ فاتحہ سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ النصر حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے درمیان مقامِ منیٰ میں نازل ہوئی، یعنی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین ماہ چند دن پہلے اس کا نزول ہوا، اس کے بعد سورۃ المائدہ کی آیت: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ [المائدۃ:۳] کا نزول ہوا۔ ان دونوں کے نزول کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاں میں صرف اَسّی یا اکیاسی دن رہے، ان دونوں کے بعد آیت کلالۃ کا نزول ہوا، جس کے بعد آپ کی عمر شریف کے صرف پچاس ۵۰ روز باقی رہ گئے تھے، اس کے بعد سورۃ التوبہ کی آخری آیتیں: ﴿لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ﴾ [التوبۃ:۱۲۸] نازل ہوئیں۔ اس کے بعد آپ کی عمر شریف کے صرف پینتیس دن باقی رہ گئے تھے، اس کے بعد آیت: ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَہُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ﴾

[البقرة:۲۸۱] نازل ہوئی، جس کے بعد عمر شریف کے صرف اکیس روز باقی رہ گئے تھے۔ امام مقاتل فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول سے صرف سات روز بعد آپ کا وصال ہوا۔ واللہ اعلم

عام طور پر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ النصر کا نزول فتح مکہ سے کچھ پہلے ہے، کیونکہ لفظ اذا جاء سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ صاحب روح المعانی نے ''تفسیر بحر محیط'' سے یہی نقل کیا ہے کہ غزوۂ خیبر سے واپسی پر یہ سورت نازل ہوئی، اور فتح خیبر فتح مکہ سے پہلے اور صلح حدیبیہ کے بعد ہے۔ فتح خیبر محرم ۷ھ میں ہوئی، اور فتح مکہ رمضان ۸ھ میں ہوئی۔

صاحب روح المعانی نے بسند عبد بن حمید قتادہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کے نزول کے بعد دو سال دنیا میں تشریف فرما رہے۔ تو اس کا حاصل یہی معلوم ہوا کہ اس کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہے، اس لئے کہ فتح مکہ سے وفات تک کی مدّت دو سال سے کم ہے۔ فتح مکہ رمضان ۸ھ میں ہے، اور وفات ربیع الاول ۱۰ھ میں ہے، اور جن روایات (جیسے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت جو گزر گئی وغیرہ) میں اس کا نزول فتح مکہ یا حجۃ الوداع میں ہونا بیان کیا گیا ہے، ان روایات کا غالباً شاید یہ مطلب ہوگا کہ ان موقعوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے (مجمع میں) اس سورت کی خصوصیت کے ساتھ تلاوت فرمائی ہو، کیونکہ اس میں بڑی عظیم بشارت بھی ہے، اور آپ کے وصال کی خبر و اشارہ بھی، جس سے کچھ لوگوں نے سمجھ لیا ہو کہ اس کا نزول ابھی ہوا ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ اختلافی رہا، قرائن دونوں طرف کے موجود ہیں، مگر پہلا قول راجح معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سورۃ النصر ثواب میں چوتھائی قرآن مجید کے برابر ہے۔ [ترمذي]

فائدہ:

بعض علماء کرام سے منقول ہے کہ فتح مہمات و کشائش رزق کے لئے یہ سورت اکسیری فوائد کی حامل ہے، جو اُسے فجر کی نماز کے بعد بارہ مرتبہ پڑھے اور آخر میں یہ دعا پڑھے تو اس کی روزی میں برکت ہوگی، اور فتوحات کے دروازے کھل جائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ، دعاء یہ ہے: اللّٰهم يامسبب الأسباب ويامفتح الأبواب! يسر علينا الحساب إن كان رزقي في السماء فأنزله وإن كان في الأرض فأخرجه وإن كان بعيداً فقربه وإن كان عسيرا فيسره وإن كان قليلا فكثره وطيبه وبارك لي فيه لا إله إلا أنت عليك توكّلت ولا حول و

لا قوۃ إلا بک یا فتاح، ۳ مرتبہ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۝۱ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ
اَفۡوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آجائے ۱ اور آپ لوگوں کو اسلام میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں ۲ تو آپ اپنے ربّ کی تسبیح وتحمید کیجئے، اور اسی سے مغفرت کی دعا کیجئے، بیشک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے ۳

معارف ومنازل

نَصۡر کے معنی ہیں: ''تحصیل مطلوب میں اعانت'' اور فتح کے معنی ہیں: ''تحصیل مطلوب''۔ نَصۡر فتح کا سبب ہوتی ہے، جب اللہ پاک نصرت کا فیصلہ کرتا ہے، تو فتح وکامیابی حاصل ہوجاتی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتۡحٌ قَرِيۡبٌ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ [الصف: ۱۳] (خدا کی طرف سے مدد (نصیب ہوگی) اور فتح عنقریب ہوگی اور مؤمنوں کو (اس کی) خوشخبری سنادو)۔

اس لئے فتح کو نصر پر عطف کیا گیا، پھر نصر واعانت عام ہے کہ اسباب ظاہری کے تحت ہو یا بغیر اسباب کے من جانب اللہ ہو، کیونکہ ربّ العزّت کی مدد ونصرت کسی سبب واسباب کی محتاج نہیں، وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے اپنے بندگانِ خاص کو فتح ونصرت سے نوازتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡاَشۡهَادُ﴾ [المؤمن: ۵۱] (ہم اپنے پیغمبروں کی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں، اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے (یعنی قیامت کو بھی)۔

ہاں! یہ بات واضح ہے کہ دنیا چونکہ دار الاسباب ہے اور اسباب بہت سارے مختلف ہوتے ہیں، تو اکثر وبیشتر نصرت وفتح اسباب کے تحت حاصل ہوجاتی ہیں، جیسے دشمنوں پر فتح پانے کے لئے لشکر جنود واعوان وانصار کا مہیا ہونا اور ان کی ضروریات (اسلحہ وسامان حرب) کا بندوبست کردینا، خود فرمایا: ﴿وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ﴾ [الأنفال: ۶۰] (اور جہاں تک ہوسکے (فوج کی

جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو، ان سے ان کے دلوں میں دھاک بٹھاؤ، جو اللہ کے اور آپ کے دشمن ہیں)۔

اسی طرح دشمنوں کی مدافعت کے اسباب پیدا کر دینا، جیسے مخالفین کے دلوں میں بزدلی، رعب وخوف وہیبت، انتشار، سوءِ تدبیر ڈال دینا اور مؤمنین منصورین کے دلوں میں بہادری، عزیمت، دبدبہ، جرأت، قوت حسن تدبیر پیدا کر دینا جس طرح غزوۂ بدر اور کئی دوسرے معرکوں میں ہوا۔

یہ سب نصرتِ الٰہی کے کرشمے اور نمونے ہیں، ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ [آل عمران:١٢٦] (مدد تو خدا ہی کی ہے جو غالب (اور) حکمت والا ہے)۔ اسی طرح: ﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ [آل عمران:١٦٠] (اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا)۔

اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ایک مؤمن مخلص کا تمام زندگی میں سب سے بڑے عیار و مکار دشمن نفس وشیطان سے مقابلہ رہتا ہے، وہاں بھی اللہ ربّ العزّت کی نصرت ومدد کی اشد ضرورت ہوتی ہے، جبکہ اس کی نصرت کے بغیر، ان مکار وعیار دشمنوں کو زیر کرنا اور ان پر فتح پانا نہایت سخت اور مشکل ہے، یہاں تہذیب نفس، عملِ صالح، تقویٰ، طہارتِ ظاہر وباطن، اتباعِ شریعت، اتباعِ سنت جیسے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے، بغیر ان روحانی اسباب کے نفس وشیطان پر قابو پانا اور انہیں مغلوب و بے بس کرنا نہایت مشکل ہے، اور یہ میدان کارزار ظاہری دشمنوں، کافروں، منافقوں اور ملحدوں سے مقابلے کی بہ نسبت زیادہ کٹھن اور سخت ہے، بلکہ دراصل یہ روحانی اسباب ہی دونوں قسم کے ظاہری وباطنی دشمنوں پر فتح پانے کے لئے نہایت ضروری اور اہم ہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بڑے سے بڑے ہتھیار روحانی قوت کے مقابلے میں ہیچ ہیں، اور جنگی میدانوں کا جیتنا اسلحہ وافرادی قوت کی کثرت پر موقوف نہیں، بلکہ اخلاص وصداقت اور روحانی قوت پر موقوف ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بے سروسامانی کے باوجود اپنے سے سوگنا مسلح طاقتور فوجوں پر جو تاریخی کامیابیاں اور نصرت وفتح حاصل کی ہے، تو یہی قوت وجذبہ ایمانی وہاں کارفرما رہا ہے۔ ان کے بعد مسلمان جرنیلوں اور فاتحین موسیٰ بن نصیر، یوسف تاشفین، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر، محمد بن قاسم، مسلم بن عقبہ، اور عقبہ بن نافع، جیسے مجاہدین نے اسی ایمانی قوتِ تقویٰ وطہارت کی بناء پر افریقہ، خراسان، ہندوسندھ، کشمیر، سمرقند، تاشقند، کاشغر اور چین تک کابل، آذربیجان، جزائر بلقان تک فتوحات حاصل کیں، اور بڑے بڑے لشکروں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ کاٹ کر

رکھ دیا، اور پوری آبادی پر اسلام کا علم لہرایا، جو بھی مقابلے پر میدان میں آیا خس وخاشاک کی طرح بہہ گیا۔

ان کے بعد محمود غزنوی فاتح سومنات، صلاح الدین ایوبی، نورالدین زنگی، جناب محمد فاتح وغیرہم جتنے جان نثار سرفروش سپاہیانِ اسلام جو گزرے ہیں وہ سب کے سب تقویٰ وایمان اور اتباعِ شریعت کے علمبردار سپوت گزرے ہیں، اگر موجودہ زمانہ میں گزشتہ اسلاف کا نمونہ کوئی دیکھنا چاہے تو یہ معدودے چند نہتے بھوکے پیاسے، غیر مسلح طالبان جنہوں نے دنیا کے سپر پاور امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو جو فضائی، زمینی اور ہر قسم کے تباہ کن اسلحہ سے لیس ہیں، انہیں لوہے کے چنے چبانے پر مجبور کئے ہوئے ہیں ''نہ جائے ماندن نہ راہ گریختن'' کی کشمکش میں مبتلا ہیں، یہ سب کچھ کیا ہے؟ ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ [محمد:۷] (اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا) کا ڈیڑھ ہزار سال گزرا ہوا وعدہ الٰہی اور اس کی نصرت کا کرشمہ ہے، فرمایا: ﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ [آل عمران:۱۶۰] (اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا)۔ علامہ اقبال نے فرمایا:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو ☆ اتر سکتے ہیں آسمان سے قطار اندر قطار اب بھی

آج اگر ہو ہم میں ایمان ابراہیم پیدا ☆ آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا

ہمارا دشمن اتنا عیار ہے کہ ہمیں نماز پڑھنے، روزہ، زکوٰۃ، حج، پیری مریدی، عرس مبارک وچراغاں کرنے سے کبھی نہیں روکتا، مگر جہاد کے نام لینے سے روکتا بھی ہے اور پریشان بھی ہے، فتدبر۔

حضرات مفسرین نے مختلف سورتوں کے مختلف مقامات اور مختلف آیات کے تحت فتح ونصرت کے ظاہری وباطنی اتنے اسباب ودواعی اور معانی وحقائق بیان کئے ہیں جنہیں ایک جگہ جمع کرنے اور ترتیب دینے کے لیے وسیع علم ومطالعہ اور روان قلم واستعداد کی ضرورت ہے، جو میرے بس سے باہر ہے، میں اپنی بے علمی اور بے مائیگی پر سوائے افسوس کے کچھ نہیں جانتا اور کچھ نہیں کرسکتا ہوں۔

اس مقام پر سورۂ نصر میں جو فتح ونصرت مذکور ہے اس سے مراد مخصوص معنی ہی ہوں گے، سو عرض ہے کہ جمہور مفسرین حضرات کہتے ہیں کہ یہاں نصر سے مراد وہ تائید واعانت ہے جو فتح مکہ کے سلسلے میں حاصل ہوئی، اور فتح سے مراد فتح مکہ ہی ہے، جو راجح قول کے مطابق رمضان ۸ سنہ ھ کو ہوئی، سرور عالم رئیس الفاتحین سید المجاہدین صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لیے مدینہ طیبہ سے بدھ کے دن دو رمضان کو بعد العصر روانہ ہوئے، اس مبارک سفر میں انصار مدینہ، مہاجرین اور باقی عرب کے مختلف مجاہدین کا لشکر جو دس ہزار کے قریب تعداد میں تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے، اور

راستے میں دوسرے قبائل کے کچھ لوگ بھی اس قدسی فوج میں شامل ہو گئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو فتح سے پہلے ''مرالظہر ان'' کے قریب حضرت عباس اور حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہما آئے اور اسلام قبول کیا، پھر دخولِ مکہ کے ساتھ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو چند مجاہدین کے ساتھ مکہ کے نشیبی حصہ پر مامور فرمایا۔

قریش کے لڑنے والوں سے اس کی جھڑپ ہوئی، اور کچھ قریشی مارے گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے صرف دو حضرات شہید ہوئے، باقی اطراف سے لوگ خوف کے مارے اس پاکیزہ فوج کے مقابلے میں اترنے کی جرأت نہیں کی، حتیٰ کہ فتح مکمل ہوئی۔ کتب سیرت میں پوری تفصیل شرح و بسط کے ساتھ موجود ہے، وہاں مطالعہ کیا جائے، اور یہ نہایت ایمان افروز داستان ہے۔

فائدہ:

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہاں فتح سے مراد فتح خیبر ہے، جو صلح حدیبیہ ۶ سنہ ھ کے بعد اور آخر محرم ۷ سنہ ھ میں ہوئی، اس فتح کے بعد مسلمانوں کو معاش کے سلسلہ میں کچھ فراخ دستی حاصل ہوئی، ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں فتح سے مراد تمام فتوحات ہیں، یعنی فتح خیبر، فتح مکہ، فتح حنین، فتح طائف وغیرہ جو پے در پے حاصل ہوئیں، جن سے اسلامی حلقہ وسیع تر ہوتا چلا گیا، اور کفر کا غرور خاک میں مل گیا، اور شوکت اسلامی کو شباب اور قوت نصیب ہوئی، اور فتح سے وہ روحانی اقدار اور مراعات غیبیہ بھی ظاہر ہوئے جو ختم نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں، جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی کو نہیں ملے، جس کے ساتھ ﴿ هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ [الفتح: ۲۸] (وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت (کی کتاب) اور دین حق دے کر بھیجا، تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے، اور حق ظاہر کرنے کے لئے خدا ہی کافی ہے) والا وعدہ پورا ہوا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا (یعنی خیبر کے بعد جیسے پہلے گزرا) تو حرف اِذَا اپنے استقبالی معنی پر ہوگا، اور یہ سورت ایک پیشینگوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک واضح دلیل ہوگی، اور اگر اس کا نزول بعد الفتح مانا جائے تو کلمہ اِذَا بمعنی إذ ظرفیہ کے ہوگا، جو ماضی کے لئے ہوتا ہے، اور قرآن مجید میں بکثرت بہت سے مقامات پر اِذَا بمعنی إذ آیا ہے، جیسے: ﴿اِذَا جَاۗءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ [ھود: ۴۰] (یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور جوش مارنے لگا)۔

اور: ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ﴾ [الکھف: ۸۶] (یہاں تک کہ جب سورج ڈوبنے کی جگہ

پہنچا)۔اس صورت میں إذا "فَسَبِّحْ" کا ظرف نہ ہوگا، بلکہ أتمّ النعمة، یا کمل الأمر فعلِ مقدر کا متعلق ہوگا۔

بعض نے اس دوسری صورت میں بھی إِذَا کو مستقبل ہی کے لئے قرار دیا ہے، اس اعتبار سے کہ فتح کو عام معنی میں رکھا جائے کہ فتح مکہ اور اس کے بعد کی جتنی ظاہری و باطنی فتوحات ہیں وہ سب کو یہ لفظ شامل ہے، گو اُم الفتوح فتح مکہ ہے، مگر اس فتح کی تکمیل مستقبل میں ہونے والی تمام فتوحات سے ہوئی۔ واللہ اعلم

﴿وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ یہاں رؤیت سے مراد رؤیت بصری و رؤیت قلبی دونوں ہوسکتی ہیں، فتح مکہ سے پہلے بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر اور اسلام کی حقانیت پر یقین حاصل ہوگیا تھا، مگر خوف کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کرتے تھے، اور بہت سے لوگوں کو تردد تھا جو کہتے تھے کہ اگر یہ نبی برحق ہیں تو مکہ ضرور فتح ہوگا، تو وہ اس فتح مکہ کے منتظر رہتے تھے، جب مکہ فتح ہوا تو دونوں قسم کے لوگ فوج در فوج آئے اور اسلام میں داخل ہوگئے۔

یمن سے سات سو لوگ مسلمان ہو کر اذان دیتے اور نماز پڑھتے ہوئے اور تسبیح و تہلیل ورد کرتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل یمن تمہارے پاس آئے ہیں وہ بہت رقیق القلب اور ایمان کے بڑے نرم و نازک خوش اخلاق ہیں۔ حکمت یمنی ہے، فخر و غرور اونٹ والوں میں ہوتا ہے، اور سکون و بردباری بکریوں والوں میں ہوتی ہے۔ [متفق علیه]

صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ جب مکہ شریف فتح ہوا تو ہر قوم مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دوڑ کر آئی، اور قبائل عرب اسلام لانے کے لئے فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی قوم (قریش) کو چھوڑ دو، اور وہ اگر برحق نبی ہیں تو ضرور اپنی قوم پر غالب آئیں گے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ فتح مکہ کے بعد عرب آپس میں یہ کہنے لگے: اے مکہ کے حرم کے باشندو! جب محمد تم پر فتح یاب ہوگئے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کے حملہ سے تم کو محفوظ رکھا تھا اور ان کو شکست دی تھی، تو اب محمد کے اتباع کے بغیر تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ یہ طے کر کے وہ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہونے لگے، اور اس سے پہلے وہ ایک ایک، دو دو، مسلمان ہوتے تھے۔

حافظ ابو عمرو بن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جب ہوئی اس وقت سارے عرب اسلام میں داخل ہو چکے تھے، یعنی مشرک و بت پرست عرب مراد ہے، کیونکہ بنی تغلب کے نصاری مسلمان نہیں ہوئے

تھے، بلکہ جزیہ ادا کرتے تھے، اور جزیرۃ العرب کے یہودی بھی مسلمان نہیں ہوئے، یہاں تک کہ امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں جزیرۃ العرب سے نکال باہر کیا۔ كمافي كتب التاريخ والسير انتهى۔

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ تو اپنے ربّ کی ثناء کرتے ہوئے اس کی پاکی بولو اور اس سے بخشش چاہو۔ تسبیح سے مراد صرف زبانی تسبیح نہیں، بلکہ حق سبحانہ وتعالیٰ کو عیوب واوصاف محدثہ مذمومہ سے پاک ومنزہ اور مبرا سمجھنا اور قلب ولسان دونوں سے اس کی پاکی کا اقرار واعتراف کرنا، اور تحمید سے مراد یہ ہے کہ ان تمام صفاتِ کمالیہ واوصافِ عالیہ کا اس کے لئے ثابت کرنا جو اس کی شایان شان ہے، اور اسی کے ساتھ اس کا شکر بجالانا اور اس کی ساری نعمتوں پر اس کی حمد بجالانا۔

اس موقع پر تسبیح وتحمید اور استغفار کا جو حکم بیان ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم نصرت وفتح اور بے مثال کامیابی کے متعلق آپ کے دل میں کبھی اس خیال کا شائبہ تک نہ آئے کہ یہ میرے کمال اور محنت کا نتیجہ ہے، بلکہ اس فتح کو سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور عنایت تصور کریں، اور اس پر اس کا شکر ادا کرو، اور قلب وزبان سے اس بات کا اعتراف کریں کہ اس عظیم فتح کی ساری تعریف اللہ تعالیٰ ہی کو پہنچتی ہے، جس نے اس کٹھن معاملے کو آپ کے لئے ہموار فرمایا۔ اور خاص کر تسبیح کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اس سے پاک ومنزہ سمجھیں کہ اس کے کلمہ کا بلند ہونا، آپ کی کسی سعی وکوشش کی محتاج یا اس پر منحصر تھا۔ اس کے برعکس آپ کا قلب مبارک اس یقین کے ساتھ لبریز رہے کہ آپ کی سعی وکوشش کی کامیابی اللہ ربّ العزّت کی نصرت وتائید پر منحصر تھی، وہ اپنے جس بندے سے چاہے اپنے دین کا کام لے سکتا تھا، اور یہ اس کا احسان وانتخاب ہے کہ اس نے یہ عظیم خدمت آپ سے لے لی، اور آپ کے ہاتھوں آپ کی سرکردگی میں اپنے دین کا بول بالا کر دیا، اور ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ [الفتح:۲۸] (کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے) کے وعدے کا ایفاء فرمایا، البتہ اپنے ربّ کریم سے استغفار اور دعا ضرور مانگیں کہ جو عظیم الشان خدمت اس نے آپ کے سپرد کی ہے اس کو انجام دینے میں کبھی آپ سے کوئی سہو، بھول چوک یا کوئی کوتاہی بھی ہوئی ہو تو اس سے درگزر اور چشم پوشی فرمائیے۔

یہ ہے وہ ادب وانکساری جو اسلام اپنے پیروکاروں کو سمجھاتا اور سکھاتا ہے کہ اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے بڑی سے بڑی تاریخی خدمت انجام دو، یا کفر کی شان وشوکت تہہ بالا کر کے اس کی سلطنت پر قبضہ کرو، یا اس کی دار الحکومت میں فاتحانہ طور وطریقے پر داخل ہو جاؤ، تو ایسی کامیابیوں پر فخر وغرور نہ کرو، اور اسے اپنا کمال

ودانشمندی تصور نہ کرو، بلکہ ربّ العزّت کا احسان وعنایت سمجھو، جس نے تمہیں فضل وکرم کے ساتھ نوازا، اور فتح ونصرت عطا فرمائی۔ دنیادار اور بے دین لوگ تو ایسی کامیابیوں پر شیطانی جشن مناتے ڈھول بجاتے ناچتے اور خلاف شریعت کام کرتے ہیں، لیکن تمہیں یہ حکم ہو رہا ہے کہ ربّ العزّت کی تسبیح وتحمید بیان کریں، اور ہر طرح سے توبہ واستغفار کا اہتمام کریں، سجدۂ شکر بجالائیں، انکساری وتواضع اختیار کریں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ فتح مکہ کے روز سرور عالم سید کائنات فاتح مکہ مکرمہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ آج سارے لوگ موافق ومخالف میرے ہاتھوں (حکم) کے نیچے ہیں، اور ہر طرف سے میرا خیر مقدم ہو رہا ہے، اور شہر وآبادی مکہ پر میرا قبضہ وگرفت مستحکم ہو رہا ہے، تو آپ ﷺ نے انکساری اور عاجزی کے ساتھ سر مبارک نیچے جھکایا اور اونٹ کے کجاوہ کی لکڑی پر پیشانی رکھ کر ربّ العزّت کا شکر بجالایا۔ [رواہ الحاکم عن انس رضی اللہ عنہ]

بیشمار آیات واحادیث سے استغفار کی محبوبیت معلوم ہوتی ہے، اسی بناء پر محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ اپنے لئے اور پوری امت کے لیے معافی مانگیں اور استغفار کریں، آپ ہر نشست، ہر محفل، ہر مجلس اور اکثر اوقات میں کثرت سے استغفار کرتے تھے، اور لوگوں کو اس کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رکوع وسجدہ ودیگر عام اوقات میں **سبحنک اللّٰھم ربنا وبحمدک اللّٰھم اغفرلي** پڑھا کرتے تھے، اسی طرح **سبحان اللہ بحمدہ سبحان اللہ العظیم** بکثرت پڑھتے تھے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ بکثرت یہ تسبیح پڑھتے تھے، اور اس کی بڑی فضیلت بیان فرماتے تھے:

سبحان اللہ وبحمدہ عدد خلقه ورضا نفسه وزنة عرشه ومداد کلماته۔ [الحدیث ترمذي]

مغفرت کا تعلق اگر عام لوگوں کے ساتھ ہو تو معنی درگزر و بخشش اور چھپا لینے وغیرہ کے لیے ہوں گے، اور اگر انبیاء ومعصومین کے ساتھ استغفار کا تعلق ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے حق میں دوام معصومیت ہو، اور ہر وقت وہ گناہوں سے دور ہوں، اور کسی گناہ کا اختلاط ان کے ساتھ نہ ہو۔ نیز یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ استغفار میں تعلیم للامۃ کے علاوہ انابت الی اللہ کا پہلو بھی ہر وقت ملحوظ رہتا ہے، اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ ہر پیغمبر کو دنیا وآخرت دونوں میں حکم ہے کہ اپنی امت کے لیے استغفار کرے، معافی مانگے اور شفاعت کرے۔ **استغفر اللہ العظیم وأتوب إلیه**

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت **سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم** پڑھا کرتے تھے، جب میں نے اس کثرت کی وجہ پوچھی تو آپ نے یہی

سورت تلاوت فرمائی۔ اسی طرح کی روایت حضرت عائشہ صدیقہ وحضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے بھی ہے، جس میں زیادہ طاعات اور کثرت صلوٰۃ کا بھی ذکر ہے۔ [ابن جرير وقرطبي، مسند احمد، ابن ماجة وغيره]

﴿إِنَّهُۥ كَانَ تَوَّابًا﴾ بیشک وہ بڑا اور بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔ محض قبولیت توبہ اس کی صفت اور شان نہیں، بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ قبولیت کے ساتھ راضی اور بڑے خوش بھی ہوتے ہیں، اور بار بار گناہ کرنے اور بار بار توبہ کرنے سے بیزار نہیں ہوتے، کسی عارف نے کہا: ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ کردی باز آ ☆ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
این درگہ ما درگہ نومیدی نیست ☆ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جب شرک وکفر اور بت پرستی کی معافی توبہ کے ساتھ ہوسکتی ہے، تو دوسرے گناہوں کا کیا کہنا؟ یہ دسترخوانِ نعمت وبخشش رات دن بچھا ہوا ہے، دوست ودشمن سب مزہ لے رہے ہیں، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سائل، تائب، معافی کے خواستگار، طالب حاجات بڑے بڑے امیر لوگوں کے دروازوں پر دستک دے کر صدا لگاتے ہیں، مگر یہاں معاملہ برعکس ہے، دونوں جہانوں کا مالک خود چل کر عرش سے نزول فرما کر اپنے بندوں اور محتاجوں کے دروازہ پر صدا لگاتا ہے (ہر شب) فرماتے ہیں: هل من مستغفر فاغفر له هل من تائب فاتوب عليه هل من مسترزق فارزقه؟ [الحديث، مشكوة بحواله ترمذي وغيره] ”ہے کوئی حاجتمند میں اس کی حاجت پوری کروں؟ ہے کوئی معافی مانگنے والا میں اسے معاف کروں؟ ہے کوئی رزق مانگنے والا میں اسے دیدوں؟ ۔ یہ سلسلہ روزانہ نصف شب کے بعد صبح تک جاری رہتا ہے، مانگنے والا جتنا بڑا مجرم ہوگا، اتنا ہی بکثرت زیادہ انعام کا مستحق ہوگا، یہ کبھی نہیں فرمایا کہ مغفرت صرف نیکیوں پر منحصر ہے۔ اے! ہمارے سب کا مہربان رب! ہماری مغفرت فرما۔ آمین

وعن أبي موسى الأشعري قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى يبسط يده بالليل ليتوب مسيء النهار، ويبسط يده بالنهار ليتوب مسيء الليل حتى تطلع الشمس من مغربها۔ [مسلم]

وعن الأغر بن يسار المزني قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يايها الناس! توبوا إلى الله فإني أتوب إلى الله في اليوم مائة مرة أو كما قال۔ [مسلم] طوبى لمن وجد في صحيفته استغفارا كثيرا۔ [مشكوة]

استغفار سے محض یہ نہیں کہ گناہ معاف ہوتے ہیں، بلکہ عمر، اولاد، رزق وروزی وغیرہ میں بھی برکت آجاتی

ہے، اگر دعا مانگنے سے پہلے استغفار کا التزام ہو تو دعا کی قبولیت میں پیشرفت ہو جاتی ہے، اسی طرح ہر عمل کے شروع واختتام پر اگر استغفار اور صلوٰۃ وسلام درود شریف کا التزام ہو، تو دعا کو پرندہ کی طرح پر لگ جاتے ہیں اور قبولیت یقینی ہو جاتی ہے۔

سُورَۃُ اللّھَب

مکیۃٌ آیاتھا ۵ رکوعھا ۱

سورۂ لہب مکی ہے، اس میں پانچ (۵) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کے نام سورۃ المسد اور سورۃ اللّھب دونوں ہیں۔

نزول:

اس کا نزول سورۃ الفاتحہ کے بعد ہے۔

تعداد آیات کلمات وحروف:

اس میں پانچ (۵) آیتیں، بیس (۲۰) کلمات اور ستتر (۷۷) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

سورۃ النصر میں نصرتِ خداوندی کا بیان تھا، اس سورت میں اس کی ایک جزوی مثال کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ النصر عالمِ اسلام کے لئے خوشخبری کا پیغام لے کر اتری ہے، اور سورۃ اللھب میں بدترین دشمن کی تباہی کا پیغام ہے، جو عالمِ اسلام کی خوشخبریوں میں ایک اضافہ اور زیادتی ہے، نیز سورۃ النصر میں خوش قسمتوں کا تذکرہ ہے، جبکہ یہ سورت بدقسمتوں کے بیان میں ہے۔

☆☆☆

مختصر موضوع مع شان نزول:

صحیحین کی حدیث ہے کہ جب آیت: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] (اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ) کا نزول ہوا تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے قبائل وبطون اور بنی ہاشم اور دیگر کو آواز دی، بعض روایات میں ہے کہ یا بنی عبد مناف! یا بنی عبد المطلب! یا عباس! یاصفیة! یا فاطمة بنت محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ کر آواز دی اور خطاب فرمایا، اس پر سب قریش جمع ہو گئے، تو آپ نے فرمایا: تم لوگوں نے مجھے کیسے پایا؟ ساری عمر تمہارے اندر رہا، کیا میں نے کبھی جھوٹ بولا؟ سب نے بیک آواز ہو کر کہا: آپ نے ہمیشہ سچ بولا اور آپ بالکل سچے ہیں، آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا وغیرہ، اس اطمینان وتصدیق کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا: اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے دشمن تم پر حملہ کرنے والا ہے، کیا تم میری تصدیق کریں گے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم ضرور تصدیق کریں گے، کیونکہ آپ نے کبھی بھی جھوٹ نہیں بولا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں ایک عذاب شدید سے ڈراتا ہوں (جو کفر وشرک پر مقرر ہے اور حیات بعد الموت کا حصہ ہے)، یہ سن کر خبیث ابولہب نے کہا: تبألك ألهذا جمعتنا؟ (تیرے لئے ہلاکت ہو، کیا تو نے ہم کو اسی لئے جمع کیا؟) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مارنے کے لئے پتھر اٹھا کر آگے بڑھا، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۞ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۞ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۞ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۞ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۞

ترجمہ: ابولہب کے دونوں ہاتھ تباہ ہو گئے، اور وہ خود بھی ہلاک ہو گیا ① اسے کچھ کام نہ آیا اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا ② وہ عنقریب شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا ③ اور اس کی بیوی بھی (شعلہ مارنے والی آگ میں داخل ہوگی) جو لکڑیاں اٹھانے والی ہے ④ اس کی گردن میں رسی ہے (مونج یا کھجور کے پتوں کی) مضبوط بٹی ہوئی ⑤

☆☆☆

معارف ومسائل

﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ﴾ دونوں ہاتھوں سے مراد ذات بھی ہوسکتی ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرة: ۱۹۵] (اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ یہاں ﴿أَيْدِي﴾ سے مراد جانیں ہیں، اسی طرح ﴿بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ﴾ [الحج: ۱۰] (ان اعمال کے سبب جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے)۔ یہاں ''يَدَا'' سے مراد ذات ہی ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ ''يَدَا'' سے مراد دونوں ہاتھ ہیں، کیونکہ ابولہب دونوں ہاتھوں کو ہلا ہلا کر شدت سے مخالفت پر اتر آیا تھا، اور دونوں ہاتھوں سے پتھر اٹھا کر مارنا شروع کیا تھا۔ عموماً انسان کی قوت دونوں ہاتھوں کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے محاورہ میں اکثر و بیشتر دونوں ہاتھوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ بعض علماء نے دونوں ہاتھوں سے مراد دنیا و آخرت مراد لیا ہے، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ سعادت کے حصول کے لیے انسان کے پاس دو ہی اسباب ہوتے ہیں: قوتِ نظریہ یا قوتِ عملیہ، ان دونوں کو بسا اوقات ''يَدَيْن'' سے تعبیر کرتے ہیں، اگر دونوں ہاتھوں سے مال و دولت اور قومی عزّت و سرداری مراد ہو تو یہ بھی صحیح ہے، معنی یہ ہوں گے کہ ابولہب کا مال و سرمایہ اور قومی عزّت دونوں برباد و تباہ ہوئے، پھر اس کی تفسیر ﴿مَآ أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ﴾ کے ساتھ مذکور ہے۔

ابولہب کا نام ''عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب'' ہے۔ امام مقاتل نے کہا کہ حسن وخوبصورتی کے وجہ سے اس کی کنیت ابولہب ہوگئی تھی (شعلہ رُو اور چمکدار)۔ اس جگہ اس کی کنیت کے ذکر سے اس کی مذمت منظور ہے، اور دوزخی ہونے کی وجہ سے اس کی کنیت کا لغوی معنی اس کے حال کے مناسب ہے، گویا اس کا لغوی معنی دوزخی ہوگیا۔

﴿سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ ''لهب'' اس کی تفسیر ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ لفظ ''ابولہب'' سے اس کی کنیت مراد نہیں، بلکہ اس کے جہنمی ہونے کا وصف مقصود ہے، جس طرح شریر آدمی کو عرب میں ''اخوالشر وابوالشر'' کہا کرتے ہیں، اور اسلام دشمنی کی وجہ سے یہ کنیت اس کے دوزخی ہونے کی علامت بن گئی۔

یہ راندۂ درگاہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمیشہ عداوت وعناد اور سخت دشمنی کے ساتھ پیش آتا تھا، اور آپ پر پتھر پھینکتا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں اس دشمن کا گھر واقع تھا، دونوں مکانوں میں صرف ایک دیوار حائل تھی، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر میں عبادت کرتے تو یہ خبیث مردہ جانوروں کے بدبودار اوجھ، سڑی ہوئی آنتیں اور بدبودار اوجھڑی اٹھا کر لاتا اور آپ پر پھینک دیتا،

اور نالیوں کے بدبودار کیچڑ جمع کرتا اور پھر آپ کے مکان کے اندر اور گزرگاہ پر ڈال دیتا۔ ان کے ساتھ اس کی بیوی ''ام جمیل کانی'' بھی ہر طرف سے کانٹے اور خاردار لکڑیاں جمع کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راہ گزر اور راستے میں پھینک دیتی، مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت و رحمت شامل حال رہتی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کانٹوں سے ایسے گزر جاتے جیسے کوئی ریشم کے فرش پر قدم رکھ کر گزر جاتا ہو۔ ابولہب کی بیوی کا نام ''اروی'' کنیت ام جمیل ہے، کانی آنکھوں والی، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بہن تھی، اس زمانے میں ان کا شمار بڑے مخالفین میں ہوتا تھا، میاں بیوی دونوں مخالفت وعداوت میں اور ہر قسم ایذا رسانی میں پیش پیش رہتے، یہاں تک کہ دوزخ جا پہنچے۔

﴿وَتَبَّ﴾ اور وہ ہلاک ہوگیا۔ یہاں تکرار تاکید کے لئے ہے، یا ﴿تَبَّتْ﴾ بددعا کے لیے ہو، اور ﴿وَتَبَّ﴾ خبر دینے کے لیے، (ابولہب ہلاک ہوجائے اور وہ ہلاک ہوگیا) آئندہ ابولہب یقینی طور پر ہلاک ہونے والا تھا، اس لئے بجائے مستقبل کے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اقرباء کو اسلام کی دعوت دی، تو ابولہب نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کچھ کہہ رہا ہے، یعنی عذاب سے ڈرا رہا ہے، اگر وہ واقعی سچ ہے تو میں اپنا مال اور اپنی اولاد اپنے عوض دے کر اپنی جان کو بچاؤں گا، اس پر ﴿مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ﴾ کا نزول ہوا۔ [مظهري]

ابولہب کا عبرت آموز انجامِ بد:

یہ بزدل جنگ بدر میں خود شریک نہ ہوا، ایک شخص اس کا مقروض تھا، اس کو قرض کے عوض اپنی جگہ روانہ کیا، وہ تھا ''عاص بن ہشام''، جب اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی اور کفار قریش شکست خوردہ واپس لوٹے، تو اس منحوس پر غموں کا بوجھ آیا، اس دوران اس کے بدن پر چیچک یا اس قسم کی ایک زہریلی گلٹی (عدسہ) طاعون کی طرح نکلی، مرض لگ جانے کے خوف سے سب گھر والوں نے اس کو گھر سے نکال کر باہر میدان میں ڈال دیا، یہ وہیں بے کسی کے عالم میں مرگیا اور سڑ کر اس کے تعفن سے پورا میدان بدبودار ہوگیا، تین چار یوم تک کوئی اس کی لاش کے پاس نہیں گیا آخر کار لوگوں نے اس کے ورثاء کو طعنہ دینا شروع کیا، حتیٰ کہ وہ لوگ حبشی غلاموں کو کچھ مزدوری معاوضہ دے کر اس کے دفنانے پر رضامند کیا، مزدوروں نے وہاں گڑھا کھود کر اس کو گڑھے میں دھکیل کر اس پر مٹی ڈال دی، اس طرح وہ اپنے انجامِ بد کو پہنچ گیا اور جہنم رسید ہوا۔

قرآن کریم نے جو بیان کیا تھا وہ پورا ہوا، اور مکہ والوں نے اس کا مشاہدہ کیا: من عادى لي ولياً فقد

أذنته بالحرب۔ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) جوکوئی میرے دوست کوضرر پہنچائے تو میری طرف سے اس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔[الحديث] سرورِ دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت وعداوت نے صرف ابولہب اور اس کی بیوی کو نہیں، بلکہ سارے صنادید قریش، کفار اور مکہ کے چیدہ چیدہ سرداروں کو ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بنادیا۔ ہاں! وہ چند خوش قسمت افراد جو فتح مکہ یا اس سے قبل مسلمان ہوئے وہ اس رسوائی اور تباہی سے بچ گئے، جیسے حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن العاص، حضرت ابوسفیان، حضرت یعلی بن امیہ، وغیرهم رضوان الله عليهم أجمعين۔

قرآن حکیم نے سورۃ اللھب میں ابولہب اور اس کی کانی بیوی کے انجامِ بد کا تذکرہ فرمایا، لیکن ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى﴾ [الإسراء: ۱۵] (اورکوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں آٹھائے گا) بھی حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتوں کی داستان اور خوشخبری بھی ہے۔

ابولہب کے تین بیٹے: عتیبہ، عتبہ، معتب اور ایک لڑکی تھی، عتیبہ اور عتبہ دونوں کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از نبوت دونوں بیٹیوں (شہزادیوں) حضرت ام کلثوم اور حضرت رقیہ کو نکاح میں دیا تھا، (یا ان کے نام پر کردیا تھا دو قول ہیں)، ابولہب کے کہنے پر دونوں (عتیبہ اور عتبہ) نے آپ کی شہزادیوں کو قریش کی ایک بھری مجلس میں طلاق دے دی تھی، اور عتیبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں سخت بے ادبی کرکے آپ کے چہرۂ انور کی طرف تھوکنے کی گستاخی کی تھی، وہ تھوک واپس لوٹ کر اس خبیث کی پیشانی پر چسپاں ہوگئی تھی، آپ کی زبان حق بیان سے یہ کلمات نکلے تھے: اللّٰهمّ سلّط عليه كلبا من كلابك۔ (اے اللہ! اس پر ایک کتا مسلط کر آپ کے کتوں میں سے)۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ملکِ شام کی تجارتی سفر میں سارے قافلے والے سامان رکھ کر اس پر عتیبہ کو سلایا اور چاروں طرف خود سوگئے، رات کو جنگل سے شیر نکلا اور سب کو سونگھ کر چھوڑ دیا اوپر چلانگ لگا کر عتیبہ کے سر بدن سے جدا کرکے نیچے گرادیا اور نعرہ لگا کر چلا گیا۔ اس طرح وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ رہا عتبہ اور معتب اور ان کی ہمشیرہ، یہ تینوں فتحِ مکہ کے روز مشرف باسلام ہوگئے، اور دونوں بھائی غزوۂ حنین وطائف میں شریک رہے اور جہاد کیا۔

الإسلام يعلو ولا يعلى، ويهدم ما كان قبله۔ [الحديث]

آنزابری از صومعہ دردار گبران افگنی ☆ این راکشی از بتکدہ سرحلقۂ رندان کنی

چون وچرا با کار تو عقل زبون راکے رسد ☆ اے قادر مطلق توئی ہر آنچہ خواہی آن کنی

پسر نوح بابدان بنشست ☆ خاندان نبوتش گم شد

سگ اصحاب کہف روزے چند ☆ پئے نیکان گرفت ومردم شد

﴿مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ﴾ اسے کچھ کام نہ آئے گا اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا۔ کمائی میں اولاد بھی شامل ہے، ابولہب بڑا مالدار تھا اور مال ومویشی کے علاوہ اس کے پاس کافی سونے چاندی کا ذخیرہ تھا، شاہ ایران نے کعبۃ اللہ کے خزانے میں دو ہرن سونے کے تحفہ بھیجے تھے، جنہیں ابولہب نے چرا کر لے گیا تھا، یہ بہت بڑا مال تھا جو اس کے پاس تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عباس، مجاہد، عطاء اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ ﴿مَا كَسَبَ﴾ سے مراد اولاد ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن أطيب ماأكل الرجل من كسبه وولد الرجل من كسبه۔ [ابوداؤد] یعنی اپنی کمائی سے کھانا تمہارے لئے بہترین پاکیزہ کھانا ہے، اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسب کا اطلاق جس طرح عام مال اور تجارت پر ہوتا ہے اسی طرح اولاد پر بھی ہوگا۔ ابولہب کی سرکشی اور غرور کے یہی دونوں چیزیں ظاہری سبب ہوئے، اور انہیں یہ چیزیں کوئی فائدہ نہیں دیئے اور کام نہ آئے، تو اس کا حشر یہ ہوگا:

﴿سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ وہ عنقریب قبر میں یا قیامت کے دن یا دونوں جگہ بھڑکتی ہوئی شعلہ زن آگ میں داخل ہوجائے گا۔ پھر یہ اکیلا جہنم میں نہیں جائے گا، بلکہ ﴿وَامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے کے جائے گا، وہ بیوی جو لکڑیاں اٹھانے والی ہے۔

﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ یعنی لکڑیاں اٹھانے والی۔ وہ اس طرح کہ یہ میاں بیوی دونوں مالدار ہونے کے باوجود بڑے کنجوس تھے، اور معاشرے میں بہت گرے ہوئے خسیس شمار ہوتے تھے، میاں کا حال یہ تھا کہ اس نے خزانہ کعبہ سے سونے کے ہرن چوری کر کے اس پر قبضہ جمایا، بیوی کا حال یہ کہ خود جا کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر مونج کی رسیوں سے باندھ کر گھٹہ سر پر کبھی پیٹھ پر اٹھا کر لانا اس کا معمول رہا۔ ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ کا حقیقی معنی یہی ہے۔

بعضوں نے کہا کہ ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَب﴾ بمعنی "ہزم کش"، یعنی چغلخوری، اس کی امتیازی صفت تھی۔

بعض حضرات حطب کے معنی گناہ اور جنایات کے کئے ہیں کہ یہ عورت گناہوں میں سب سے سبقت کرتی رہتی تھی۔

﴿فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ "مسد" بٹی ہوئی مونج کی مضبوط رسی کو کہتے ہیں، ہوسکتا ہے اس سے مراد قیامت کے روز جہنم میں اس کے عذاب کی تصویر مراد ہو، جس طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ

ذَرۡعُهَا سَبۡعُوۡنَ ذِرَاعًا فَاسۡلُكُوۡهُ﴾ [الحاقة: ٣٢] (پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے جکڑ دو)۔ یا یہ مراد ہو کہ قیامت کے روز جہنم میں اس کی گردن میں لوہے کے زنجیروں سے تیار شدہ ایک مخصوص قسم کا طوق ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس کے گلے میں بیش قیمت موتیوں کا ہار ہوتا تھا، وہ ہر وقت کہتی تھی کہ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اور اس کی مخالفت میں خرچ کروں گی وغیرہ، تو اللہ تعالیٰ نے اسی ہار کو جہنم میں طوق بنا کر اس کی گردن میں ڈال دیں گے۔

قدرتِ الٰہی اور انتقام کا یہ پہلو قابلِ عبرت ہے کہ ایک دن لکڑیوں کا گھٹہ جنگل سے مضبوط رسی میں باندھ کر لا رہی تھی اور رسی کو مضبوط سے کندھوں پر ڈال کر ایک پتھر پر تھوڑی دیر آرام کر کے تکیہ لگا کر بیٹھ گئی، پیچھے سے ایک فرشتے نے آکر رسی کھینچ لی یا بوجھ کی وجہ سے وہ گر گئی اور رسی اس کے گلے میں اٹک گئی، جس کی وجہ سے وہ گلا گھٹ کر مرگئی اور جہنم پہنچ گئی۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ لوگوں نے ہر چند کوشش کر کے لکڑیوں کے گھٹہ کو اس سے الگ کرنا چاہا مگر نا کام رہے، آخر کار اسی گھٹے سمیت اسے گڑھے میں ڈال کر دفن کیا۔ فاعتبروا یاأولی الأبصار۔

اس بات میں کسی کو تردد اور شک نہیں ہونا چاہئے، اس میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی پاداش میں عذاب الٰہی کا ایک نمونہ ظاہر ہوا، اور یہ ایک معجزہ قرار پایا، اور یہ واقعہ عقل ونقل کے عین مطابق ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے زمانے میں ایسا ہی عبرتناک واقعہ رمضان شریف میں پیش آیا، ایک لڑکی نے رمضان شریف کی بے احترامی کی اور ٹیلیویژن کھول کر دیکھنا شروع کیا، اس کے ساتھ اسلامی شعائر قرآن و رمضان کے بارے میں اچھی خاصی گستاخی کی اور مرگئی، لوگوں نے اس کی لاش اٹھانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا تو اسے نہ اٹھا سکے، آخر کار ٹیلیویژن ساتھ لگایا تو کامیاب ہوئے، نتیجہ یہی ہوا کہ ٹیلیویژن سمیت اسے دفنائے۔ پوری تفصیل بکھرے موتی کتاب میں دیکھی جائے۔ اسی طرح چند وقت بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس قسم کا ایک واقعہ مسقط وعمان میں بھی پیش آیا جو بہت مشہور ہوا، اور ہر خاص وعام نے اس پر یقین کیا، اور اخبارات نے اسے شائع کیا۔ واللہ اعلم

سُورَةُ الْإِخْلَاصِ

مكيةٌ آياتها ۴ ركوعها ١

سورۂ اخلاص مکی ہے، اس میں چار (۴) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام:

اس سورت کے مندرجہ ذیل نام ہیں:

سورة الإخلاص، سورة التوحيد، سورة النجاة، سورة النور، سورة الكفاية، سورة الشفاء، سورة المانعة، سورة الأساس، سورة الصمد، سورة البراء ة، سورة الولاية، سورة الإيمان، سورة المذكرة، سورة الكرامة، سورة الجمال، سورة المعرفة، سورة التجريد، سورة التفريد، سورة النسبة۔ [كبير، روح المعاني وغيره]

سب سے مشہور نام سورة الإخلاص ہے۔ اخلاص کا مطلب دل کو اللہ کی وحدانیت ومعرفت کے لیے خاص کرنا۔ دراصل یہی چیز سرمایۂ ایمان ہے، جسے ﴿مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [العنكبوت:٦٥] (عقیدہ اسی کے لیے خالص کرنے والے) سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نزول:

سورۃ الاخلاص جمہور مفسرین کے نزدیک مکیہ ہے، اور نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر بائیسواں (۲۲) ہے، اور اس کا نزول سورۃ الناس کے بعد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حسن بصری، عکرمہ، عطاء، قتادہ اور مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ

حضرات سے یہی منقول ہے۔ حضرت ابن عباس، محمد بن کعب قرظی، ابوالعالیہ، ضحاک اور سدی رضی اللہ عنہم وغیرہ اسے مدنیہ کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے یوں تطبیق دی ہے کہ اس سورت کا نزول مکرر ہے، جیسے پہلے چند سورتوں کے بارے میں کہا گیا تھا۔

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ مکہ کے مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں پوچھا، تو یہ سورت نازل ہوئی، اس سے مکیہ ہونے کا پہلو راجح ہوگا، اور بعض روایات میں ہے کہ یہ سوال یہود مدینہ یا کعب بن اشرف نے یا نصاریٰ نجران وغیرہ نے کیا، تب سورت کا نزول ہوا، یہ بات مدنیہ ہونے کے لیے قرینہ ہے، لیکن سورت کا مکیہ ہونا راجح ہے، اور یہی معتمد علیہ قول ہے۔

اس کی ایک توجیہ یہ ہے کہ یہ سورت نازل تو مکہ مکرمہ میں ہوئی، جب مشرکین کا ایک گروہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ جس ربّ پر ایمان لانے کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو، اس کا نسب نامہ ہمارے سامنے بیان کرو، تا کہ ہمیں اس کی پہچان ہوجائے۔ [رواہ أحمد وغیرہ] لیکن جب اسی قسم کے سوالات مدینہ کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں نے پوچھے تو ان کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ اخلاص کی تلاوت فرمائی، اسی کو بعض لوگوں نے نزول سورت سے تعبیر کیا۔ واللہ اعلم

نجران کے عیسائیوں نے یہاں تک پوچھا تھا: فقالوا: صف لنا ربک أمن زبرجد أو یاقوت أو ذهب أو فضة؟ فقال: إن ربي لیس من شيء لأنه خالق الأشیاء فنزلت: قل هو الله۔ یہ سورت بہت بڑی بابرکت ہے، جس پر دین اسلام کی بنیاد قائم ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس سورت کی چار (۴) آیتیں، پندرہ (۱۵) کلمات اور اڑتالیس (۴۸) حروف ہیں۔

فضیلت:

یہ مبارک سورت اتنی بابرکت ہے کہ اس میں جنت کی ضمانت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اس سورت قل ہو اللہ احد سے محبت ہے، فرمایا: اس کی محبت تجھے جنت میں لے گئی۔ [ترمذي] اسی معنی کی حدیث صحیح بخاری میں بھی ہے، اسی طرح کی روایت ترمذی، نسائی، موطأ میں امام مالکؒ نے بھی روایت کی ہے۔

ربط ومناسبت:

سورۃ الاخلاص کا ربط قرآن حکیم کے تمام مضامین وسورتوں کے ساتھ واضح طور پر قائم ہے، اس سورت میں دین اسلام کی بنیادی مرکزی مضمون توحید باری تعالیٰ کا بیان ہے، جوکہ سورۃ الفاتحہ سے لے کر ختمِ قرآن پاک تک تمام سورتوں کے مضامین کا موقوف علیہ ہے۔

مختصر موضوع:

سورۃ الاخلاص میں تمام باطل عقائد ونظریات کی تردید وابطال ہے، وہ اس طرح کہ اگر اقوامِ عالم کے مذہبی عقائد ونظریات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو انسان نہایت ششدر وپریشان ہوجاتا ہے، خالق کائنات جل شانہ کے بارے میں ایسے ایسے غلط، گمراہ کن نظریات اور بے سروپا عقائد سننے میں آئیں گے جنہیں تسلیم کرنا نہایت بھیانک ہوگا، جنہیں سننے اور دیکھنے کے بعد دل انسانی ڈوب جائے گا، عقل کام چھوڑ دے گی، دماغ چکرائے گا، حواس ناکارہ ہوجائیں گے۔ ذیل میں باطل عقائد رکھنے والے چند گروہوں کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

چند باطل فرقے:

(۱) **دہریہ:** ایک طبقہ کا خیال یہ ہے کہ اس کائنات کا نہ کوئی خالق ہے، نہ مدبر ومالک یا متصرف، پوری کائنات کی تمام چیزیں خود بخود بن گئی ہیں، ان کا کوئی موجد نہیں، اور نہ آئندہ یہ کسی شکست وریخت کے متحمل ہیں، یہ لوگ عرفِ عام میں ''دہریہ'' کہلاتے ہیں، جیسے موجودہ زمانہ کے دہریہ، کمیونسٹ، روسی، چینی اور دیگر اقوام کا یہ نظریہ ہے۔ دراصل یہ کفر کا بدترین قسم ہے، انہی کی تردید میں عارف رومی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ؎

ہیچ چیزے خود بخود پیدا نشد ☆ ہیچ آہن خود بخود تیغے نشد

(۲) **فلسفی وفلاسفر:** کچھ دوسرے لوگ وہ ہیں جو فلسفی، فلاسفر اور سائنسدان کہلاتے ہیں، جیسے یونانی فلسفی ارسطو، فیثاغورث، بطلیموس وغیرہ، اور دیگر مغربی اقوام (موجودہ یورپ)۔ یہ لوگ اگرچہ خالق کو تسلیم کرتے ہیں، مگر خالق تعالیٰ کی تمام صفات کے منکر ہیں، اور وہ خالق کو علم وحکمت اور حسن تدبیر سے یکسر عاری تصور کرتے ہیں، اور پھر مختلف متضاد نظریات پر قائم رہتے ہیں، کہیں تثلیث، کہیں ابنیت وابوت، کہیں: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المائدۃ: ۱۸] (اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں)، کہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ [آل عمران: ۱۸۱] (جو کہتے ہیں کہ خدا فقیر ہے اور ہم امیر ہیں)، کہیں عقیدۂ کفارہ وغیرہ کے قائل

ہیں، اور قیامت کے منکر خرق والتیام کو محال سمجھتے ہیں۔خالق کائنات کو مجبور بے اختیار اور اپنے آپ کو قادر وطاقتور خیال کرتے ہیں۔قرآنی اصطلاح میں یہ لوگ مغضوب علیهم وضالین ہی ہیں، اور حضرت مسیح علیہ السلام وحضرت عزیر علیہ السلام کو ابناء اللہ شمار کرتے ہیں۔وغیرہ ذلک من الخرافات۔

(۳) **صابی:** یہ تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو کائنات کے خالق کو تسلیم تو کرتے ہیں، مگر اس کے ساتھ علویات، کواکب اور ستاروں کو شریک اور متصرف مانتے ہیں، دنیا میں ہر قسم کے خیر وشر کے انقلابات اور تبدیلیوں کا سبب و بنیادی علت انہی ستاروں کو گردانتے ہیں، یہ لوگ ''صابی'' کہلاتے ہیں، ستارہ پرست۔

(۴) **ثنویہ و مجوس:** یہ ایک طبقہ ہے جنہیں ''ثنویہ'' اور ''مجوس'' کہتے ہیں، وہ کائنات کے لیے دو خالق مانتے ہیں، اور دونوں کو قدیم مانتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہی دونوں کائنات میں مدبر و متصرف ہیں، اور یہی دونوں اصل عالم اور خالق خیر وشر، نفع وضرر، صلاح وفساد اور تقسیم کرنے والے ہیں۔ایک اصل کا نام نور ہے، اور دوسرے کا نام ظلمت ہے، فارسی میں نور کا نام ''یزدان'' ہے، اور یہی خالق خیر ونفع وصلاح ہے، اور دوسرے کا نام فارسی میں ''اہرمن ہے'' اور یہی شر وضرر وفساد کا خالق ہے، پھر اس نور کا نام اللہ ہے، اور ظلمت واہرمن کا نام شیطان ہے۔

اس فرقہ کا بانی زردشت بن یوراسپ ہے جو کشتاسپ بن لہراسپ بادشاہ فارس کے زمانے میں ظاہر ہوا تھا، اور اکثر ملوک فارس، مثلاً افریدون، دارا، جمشید وغیرہ یہی مجوسی زردشتی عقیدہ رکھتے تھے، اور یہ لوگ ''زردشت'' کو نبی مانتے ہیں، اور ایک کتاب اس کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کا نام ''زنداوستا'' ہے۔

(۵) **بت پرست:** پانچواں طبقہ بت پرست قوموں کا ہے، ان میں ہنود تو کروڑوں بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور بدھ مت بھی سینکڑوں اصنام وبتوں کی پوجا کرتے ہیں، جبکہ بابل وقدیم مصر وشام والے تقریباً تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

• جب عمرو بن لحی بن قمہ خزاعی نے ملک شام سے بتوں کا ایک کھیپ حجاز منتقل کیا تو پورے جزیرۂ عرب نے بشمولِ یمن واطراف کے بت پرستی شروع کی، اور ملت ابراہیمی کو ترک کر کے شرک میں مبتلا ہوئے، چنانچہ زمانہ رسالت کے دور میں مشرکین قریش نے کعبۃ اللہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے تھے، جنہیں فتح مکہ کے روز ہمیشہ کے لئے نیست ونابود اور ختم کر دیا گیا، چونکہ ان کے یہ بت پتھر لوہے، تانبے، سونے اور چاندی وغیرہ کے بنے ہوئے تھے، اسی کے پیش نظر انہوں نے حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ ذرا ہمیں بتائیں کہ جس رب کی

عبادت کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو وہ کس قسم کا ہے؟ اور کن چیزوں سے بنا ہوا ہے؟ تو ان کے جواب میں سورۂ اخلاص نازل ہو کر ان تمام مزعوماتِ فاسدہ اور عقائد باطلہ کی تردید فرمائی، اور جتنے باطل مذاہب و گمراہ طبقوں کا رواج جاری تھا اللہ تعالیٰ نے سب کو باطل فرما کر خالص توحید کا اعلان فرمایا، اور اپنی ذاتی توحید خالص اور اُلوہیت حقہ کو ساری مخلوقات عالم کے لیے ضروری اور لازمی قرار دیا، اور اس کے علاوہ جتنے مذاہب و ادیان مروج تھے سب کو باطل و گمراہ کن قرار دیا، اور انہیں جہنمی بتایا، اور تمام اقسام شرک خواہ قولی ہوں یا فعلی عملی اعتقادی اور مالی ہوں سب کی تردید وابطال ہوگئی۔

چونکہ شرک کے اجزاء مختلف ہیں: شرک في الذات، شرک في الصفات، شرک في التدبیر، شرک في التصرف وغیرها، تمام کے تمام باطل اور ناجائز ٹھہرے، اور سورۂ اخلاص نے ہر قسم شرک کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور خالص توحید کی تعلیم دے کر اسلام کے بنیادی عنصر کو واضح فرمایا۔ دراصل کلمہ طیبہ کے اثبات ونفی میں جو اجمال ہے سورۂ اخلاص میں اسی نفی واثبات کی تشریح وتفسیر ہے، البتہ اجمال میں نفی مقدم ہے، اور تفصیل میں اثبات اس لئے مقدم ہے کہ یہ معاندین کے سوالوں کا جواب ہے۔

فضیلت و برکت سورۂ اخلاص:

اس سورت مبارکہ کی فضیلت کے لئے یہی کافی ہے کہ اس میں اسلام کی بنیادی چیز توحید الٰہی کا مکمل بیان ہے، سلف سے منقول ہے کہ اگر کوئی اللہ کی نظر رحمت ومغفرت کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہے تو اس سورت کی کثرت سے تلاوت جاری رکھے، اسی طرح اگر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اپنی طرف جاری رکھنا چاہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کثرت سے درود شریف پڑھا کرے۔ [مواعظ]

حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۂ ''اذا زلزلت الارض'' نصف قرآن کے برابر ہے، اور سورۂ ''قل ھو اللہ احد'' ثلث قرآن کے، اور ''قل یا ایھا الکافرون'' ربع قرآن کے برابر ہے۔ [ترمذي]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص روزانہ دو مرتبہ سورۂ اخلاص کی تلاوت کرے گا اس کے پچاس سال کے گناہ معاف کردئے جائیں گے، مگر یہ کہ اس پر کسی کا قرض ہو۔ [ترمذي، دارمي]

اس کے علاوہ سورۂ اخلاص کے اتنے بے شمار فضائل وبرکات ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو ایک دفتر مرتب ہوجائے گا۔ اس سلسلے میں کتب تفسیر، جیسے ابن کثیر، روح المعاني، درمنثور، قرطبی وغیرہ نے بکثرت احادیث نقل کی

ہیں، فلیراجع۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سورت صفتِ رحمٰن پر مشتمل وحاوی ہے، اس میں ایمان کی بنیاد توحید کا ذکر ہے، اور یہ سورت رضائے الٰہی اور جنت کی ضمانت ہے، اس کے پڑھنے والوں کے لئے خاتمہ بالخیر کی بشارت ہے، جو شخص گھر سے نکلتے اور داخل ہوتے وقت اس کی تلاوت کرے گا اس کو رزق کی فراخی حاصل ہوجائے گی، رات کو بستر پر سوتے وقت جو تین مرتبہ اسے تلاوت کرے گا صبح تک شیاطین کے شر سے محفوظ رہے گا وغیرہ۔ بعض اصحاب باطن کا قول ہے کہ سخت پریشانی ومصائب کے وقت اکیس مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھنے سے ہر قسم پریشانی دور ہوجاتی ہے، اور سکون واطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ① اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ② لَمۡ يَلِدۡ ۙ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ۙ ③ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ④

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ یکتا (اکیلا) ہے① اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے② اس کی اولاد نہیں، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے③ اور نہ کوئی اس کے برابر ہے④

معارف ومنازل

سورۃ الاخلاص میں چار بڑے مسائل کا تذکرہ ہے:

(۱) جمیع مذاہب باطلہ کے عقائد فاسدہ کا مختصر جامع الفاظ میں (نہایت شائستہ وعمدہ پیرایہ میں) مکمل ابطال وتردید ہے۔

(۲) جامع اسلوب میں توحید فی الذات والصفات کا عجیب وغریب طرز کے ساتھ اثبات وبیان ہے۔

(۳) ذات باری تعالیٰ شانہ کی تنزیہ عن جمیع النقائص وصفات المخلوقات۔

(۴) اثبات رسالت وحقانیت اسلام۔

جب ربّ العزّت شانہ نے نبی اکرم سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ختم نبوت کا تاج سجایا، تو آپ کو

توحید واحکامِ شریعت کے بیان وتبلیغ پر مامور فرمایا، چنانچہ ارشاد ہوا: قُلْ (آپ (ان چشمِ بصیرت سے محروم عقل کے اندھے پوچھنے والوں سے) کہہ دیجئے!) کہ میں جس معبود برحق جل شانہ کی طرف تمہیں دعوت دے کر بلا رہا ہوں، جس کی حریم قدس تک تمہیں لے جانا چاہتا ہوں، وہ تمہارے بے جان، اندھے بہرے بتوں کی طرح پتھر، تانبے، سونے، چاندی، لکڑی کا بنا ہوا نہیں ہے، وہ ''اللہ'' ہے، جو اکیلا اور تنہا ہے ''اَحَدٌ'' ہے، یکتا ہے۔ ''اَحَدٌ'' اس ایک کو کہتے ہیں جس کا دوسرا نہ ہو، نہ ذات میں نہ صفات میں نہ کمالات میں۔

وہ اتنا بلند وبالا عظیم، قدیم، ازلی، ابدی، حی وقیوم، سمیع وبصیر، علیم وخبیر ذات واحد لاشریک ہے جس کا نہ کوئی ہمسر، نہ کوئی مثال، نہ برابر اور نہ ضد ومقابل ہے، کائنات کا ہر ذرہ اس کا محتاج ہے، اور وہ کسی چیز کا محتاج نہیں، پس اس اعلان کے ہوتے ہی پتھر، سونے، چاندی، لکڑی اور تانبے کے بنے ہوئے بے جان وبے حرکت معبودانِ باطلہ جو صدیوں سے خدائی کی مسند پر بڑے کروفر سے براجمان تھے یک لخت کے بل زمین پر اوندھے گر پڑے اور شرک واوہام پرستی کے اونچے اونچے قلعے زمین بوس ہو گئے، جس طرح تاریخ کے اوراق اس پر شاہد عدل ہیں، اور یہ واقعات آبِ زر سے لکھنے کے حقدار ہیں۔

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اس میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کو اللہ ربّ العزّت کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کا حکم ہوا ہے۔ ﴿قُلْ﴾ اس لفظ کو سن کر مخاطب کو ایک قسم کا شوق وانتظار بھی پیدا ہوتا ہے کہ دیکھئے عالم غیب سے اس کے بعد کیا اشارہ ہوتا ہے، اسی طرح جو مضمون اس کے بعد آنے والا ہے، یہ لفظ اس کی عظمت واہمیت پر بھی دلالت کرتا ہے۔

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ ''ھو'' ضمیر میں دو احتمال ہو سکتے ہیں: پہلا یہ کہ یہ ضمیر شان ہے، جس کا کوئی مرجع نہیں ہوتا، اور مابعد کا جملہ اس کی وضاحت وتفسیر کرتا ہے، یعنی ﴿اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اس کی تفسیر ہے، دوسرا یہ کہ اس کا مرجع ربّ تعالیٰ شانہ ہے، جو سوال کرنے والوں کے سوال میں مذکور تھا، اس صورت میں ''ھو'' مبتداء اور ﴿اَللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اس کی خبر ہے۔

﴿اَللّٰهُ﴾ قرآن مجید میں دو ہزار چھ سو اٹھانوے (۲۶۹۸) مرتبہ مذکور ہے۔ علم لذات واجب الوجود المستجمع لجمیع صفات الکمال المنزہ عن الشرک والنقائص والزوال۔ (یہ عَلَم ہے پاکیزہ نام ہے، حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کا جو کہ واجب الوجود ہے، جمیع پاکیزہ صفات کمال کے ساتھ متصف ہے، ہر قسم کے عیوب

ونقائص اور شریکوں کے تصور سے منزہ و پاک ہے)۔

﴿اَحَدٌ﴾ اکیلا، یکتا، ایک۔ أحد واحد کے متعلق خلیل بن احمد کا قول ہے کہ یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں، یہاں أحد کا مفہوم وہ مخصوص وحدت ہے جس میں کسی اشتراک وتعدد کا شائبہ بھی نہ ہو، اسی طرح مادہ، ترکیب، مجانست، مماثلت اور مشابہت وغیرہ کا نہ کوئی امکان نہ تصور ہو، کیونکہ أحد یہاں صفت ذات کے مرتبے میں واقع ہے، اور جمیع صفات حق تعالیٰ سے متصف ہے، اور مخلوقات کی تمام صفات سے منزہ و پاک ہے۔

اس لفظ ''اَحَدٌ'' سے ان لوگوں کا جواب ہو گیا جو اللہ تعالیٰ کے متعلق سوال کرتے تھے کہ اس کا نسب نامہ کیا ہے؟ اور وہ کس چیز سے بنا ہے؟ جواب اس طرح ہوا کہ تمہارے تمام مزعومات وتصورات ظنون واوہام اور ہر قسم کے خیالات سے بلند و بالا بے مثل و بے مثال ہے، جس طرح پہلے بیان ہوا۔ وباللہ التوفیق

لطیفہ:

دنیا میں بندوں کی تین قسمیں ہیں:

(۱) مقرّبین واصلین۔ (۲) اصحاب الیمین۔ (۳) اصحاب الشمال۔

قسم اول وہ لوگ ہیں کہ انہیں کائنات میں سوائے باری تعالیٰ کے کوئی چیز نظر نہیں آتی، وہ ہر چیز میں قدرت کے مظاہر وعجائبات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ع بخدا غیر خدا در دو جہان چیزے نیست

تو ایسے لوگوں کے لئے صرف لفظ ھو اپنے اجمالی معنیٰ کے ساتھ کافی ہے، وہ کسی تفصیل کے عادی وخوگر نہیں ہوتے۔ دوسرا طبقہ ذرا اس طبقہ اولیٰ سے کم ہیں، جب تک ان کے سامنے تفصیل و وضاحت نہ ہو وہ چندان حقائق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ ان کے پاس انوار و برکات محدود ہوتے ہیں، اور کبھی ان سے غیر شرعی اعمال کا صدور بھی ہوتا رہتا ہے، تو ان کو بیدار کرنے کے لئے صراحۃ اسم ذات اللہ ذکر فرما کر ان کی رہنمائی کی گئی۔

تیسرا طبقہ کفار ومشرکین منافقین ہیں، جن کے پاس ظلمتوں کے سوا کچھ بھی نہیں، وہ کبھی دہریت، کبھی تثلیث، کبھی مجوسیت اور کبھی اصنام پرستی کی زنجیروں میں مقید ہیں، تو ان کو حقیقت سمجھانے کی خاطر اور ان کے مزعوماتِ باطلہ پر ضرب لگانے کی خاطر، لفظ أحد ذکر ہوا، تاکہ اس وحدت سے ان کی رہنمائی کے ساتھ ان کے غلط عقائد کا ابطال ہو۔ واللہ اعلم

﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ لغت میں صمد کے دو معنی ہیں: پہلا معنی قصد وارادہ کے ہیں، اس تقدیر پر صمد بمعنی ''مصمود'' یعنی صفت بمعنی مفعول (مقصود) ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ ''صمد'' وہ سردار ہے کہ تمام حوائج ومعاملات میں اس کی طرف رجوع وقصد کیا جائے۔ دوسرا معنی ہیں: ٹھوس، کہ اس پر کوئی تغیر نہیں آتا، وہ قوی اور مستقل ہے، اس صورت میں وہ واجب الوجود کے ہم معنی ہوگا، یہ تحقیق لغوی معنی کے اعتبار سے ہے، مگر اصطلاح (عرف عرب) میں یہ لفظ بہت سے معانی میں مستعمل ہے، اس لئے مفسرین حضرات نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے اس کی تقریباً اٹھارہ معانی بیان کئے ہیں، صاحب روح المعانی نے واجب الوجود معنی کو ترجیح دی ہے۔ علامہ علی قاریؒ نے کہا ہے:

حاصله الغنى المغنى الذي لايحتاج إلى شيء ويحتاج إليه كل واحد۔ [الدر الثمين]

صاحب مظہری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صمد کے معنی مقصود کے ہیں سردار کو صمد اسی لئے کہتے ہیں کہ رعایا اس کا قصد کرتی ہے، اور اَلصَّمَد کا الف لام اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ صمدیت کے اس اعلیٰ مقام پر ہے، جہاں کسی اور کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ مفسرین کرام کے مختلف اقوال میں صمد کی جتنی بھی تشریحات کی گئی ہیں وہ صمد کے اصل معنی (مقصود) کے لوازمات ہیں۔ مقصود مطلق صرف حق تعالیٰ جل جلالہ ہوسکتا ہے، جس کے سب محتاج ہیں، اور وہ کسی کا محتاج نہیں، لامحالۃ اس میں تمام کمالات ہوں گے، اور وہ ہر قسم کے عیوب ونقائص سے پاک ومبرا ہوگا، ہر طرح کی سیادت اور حقیقی قدامت اسی کو حاصل رہے گی، وہ ہر قسم تغیرات آفات والد، ولد اور ہر قسم کے ہم جنس وہمسر سے منزہ وپاک ہے۔ [مظهري]

حافظ ابو القاسم طبرانی [كتاب السنة] میں صمد کی مختلف تفسیروں (جو سلف سے منقول ہیں) کو جمع کرکے نقل فرماتے ہیں کہ یہ سب معانی صحیح ہیں، اور یہ سب ہمارے ربّ تعالیٰ کی صفات ہیں، وہ وہی ہے کہ جس کی طرف تمام حاجات میں رجوع کیا جاتا ہے، یعنی سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں، اور وہ وہی ہے جس کی بزرگی اور فوقیت تمام کمالات اور خوبیوں میں انتہاء کو پہنچ چکی ہے۔ [ابن كثير] مطلب یہ ہے کہ مفسرین حضرات نے صمد کے اٹھارہ معانی جو بیان کئے ہیں، وہ اسی قبیل سے ہیں۔ ے

عباراتنا شتى وحسنك واحد ★ وكل إلى ذاك الجمال يشير

وہ سارے معانی ایک ہی مفہوم کے ترجمان ہیں، یعنی بے نیاز جو کسی کا محتاج نہ ہو، اور ساری خلقت اس کی محتاج ہو۔ ے

ہزار بار بشویم دہان بمشک وگلاب ☆ ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

﴿لَمْ يَلِدْ﴾ نہ کسی کا باپ ہے۔ اس میں ان کفار کی واضح تردید ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ولد ثابت کرتے تھے، جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اور یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے ہیں، اور مشرکین عرب و مکہ جو فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، فرمایا: ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۚ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا﴾ [الکہف:۵] (بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے (اور کچھ شک نہیں) کہ یہ جو کہتے ہیں محض جھوٹ ہے)۔

﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝٩٠ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝٩١ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۝٩٢﴾ [مریم] (قریب ہے کہ اس (افتراء) سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں کہ انہوں نے خدا کے لئے بیٹا تجویز کیا، اور خدا کو شایاں نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے)۔ یعنی کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کی ہے، مثلاً: نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اور بعض یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہا ہے، اور مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ العیاذ باللہ

یہ ایسی بھاری بات کہی گئی اور ایسا سخت گستاخانہ کلمہ منہ سے نکالا گیا جسے سن کر اگر آسمان زمین اور پہاڑ ارے ہول کے پھٹ پڑیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو کچھ بعید نہیں، اس گستاخی پر اگر غضب الٰہی بھڑک اٹھے تو سارا عالم تہہ و بالا ہو جائے، اور آسمان و زمین تک کے پرخچے اڑ جائیں، محض اللہ پاک کا حلم (بردباری) مانع ہے کہ ان بیہودگیوں کو دیکھ کر دنیا کو یکدم تباہ نہیں کرتا، جس خداوند قدوس کی توحید پر آسمان، زمین، پہاڑ، غرض ہر علوی و سفلی چیز شہادت دے رہی ہے، انسان کی یہ جسارت کہ اس کے لئے اولاد کی احتیاج ثابت کرنے لگے، العیاذ باللہ۔

اس ناداں، ناشکرا اور نا عاقبت اندیش، ظلوم و جہول انسان شرافت و ادب کی تمام حدود کو پار کر کے کتنا آگے قدم رکھا؟ بس ربّ العزّت کا حلم و صبر ہی ہے کہ ان گستاخیوں کے باوجود وہ انسان کو مسلسل رزق و روزی فراہم کرتا رہتا ہے، اور اسے اولاد بھی دیتا ہے، اور مسلسل ظاہری و باطنی نعمتوں سے نوازتا رہتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایذا دینے والی باتوں کو سنتے ہوئے صبر کرنے میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ صابر کوئی نہیں، لوگ اس کی اولاد بتاتے ہیں اور پھر بھی وہ انہیں روزیاں دیتا ہے، اور عافیت و تندرستی عطا فرماتا ہے۔ صحیح بخاری کی

دوسری روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابن آدم مجھے جھٹلاتا ہے، حالانکہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے، مجھے گالیاں دیتا ہے اور اسے یہ لائق بھی نہیں، اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے جس طرح اولاً اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کیا ہے ایسے ہی مجھے دوبارہ نہیں لوٹائے گا، حالانکہ پہلی مرتبہ کی پیدائش دوسری مرتبہ کی پیدائش سے بہت آسان تو نہ تھی، جب میں اس پر قادر ہوں تو اس پر کیوں نہیں؟ اور اس کا مجھے گالیاں دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے، حالانکہ میں تنہا و اکیلا ہوں، میں ایک ہی ہوں، میں صمد ہوں، نہ میری اولاد نہ میرے ماں باپ نہ مجھ جیسا کوئی اور۔ [بخاري]

﴿وَلَمۡ يُوۡلَدۡ﴾ اور نہ وہ کسی کا جنا ہوا ہے۔ کیونکہ ولادت ایک ایسی چیز ہے جس میں ہر قسم کا احتیاج مضمر ہے، اور یہ محدثات ومخلوقات کا خاصہ لازمہ ہے، جبکہ باری تعالیٰ ازلی ابدی اور قدیم ہے، اور مخلوقات کی تمام صفات وخصائص سے منزہ و پاک ہے۔ ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ﴾ [الشوریٰ:۱۱] (اس جیسا کوئی نہیں) اس کی صفت ذاتی ہے، احدیت وصمدیت والی ذات جو اسی قسم کے علائق سے پاک ہے۔

﴿وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ نہ کوئی اس کی مثل ومماثل ہے، نہ کوئی اس سے مجانست مشاکلت ومشابہت رکھتا ہے۔ لَهٗ کی تقدیم مفید للحصر ہے، آخری تینوں جملے جو عطف کے ساتھ لائے گئے ہیں اسی مقصد کے لئے، تاکہ ہر قسم کی مماثلت ومشاکلت کا مستقلاً و بالقصد نفی ہوجائے۔ منکرین توحید کے جتنے گروہ ہیں اور ان کے جتنے فاسد نظریات اور باطل عقائد ہوسکتے ہیں سورۂ اخلاص میں علیٰ وجہ الاتم ان کی تردید ہوگئی ہے، اور خالص توحید فی الذات والصفات کے تمام پہلو بہتر اور واضح طور پر پوری قوت ودلائل کے ساتھ ثابت ہوئے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ کی صفات مقدسہ کا بیان:

علماء کرام عام طور پر صفات باری تعالیٰ کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں: (۱) ثبوتیہ۔ (۲) سلبیہ۔

صفات ثبوتیہ: جیسے: حي، قيوم، عليم، خبير، حكيم وغیرہ۔

صفات سلبیہ: جیسے: ﴿لَمۡ يَلِدۡ ۙ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ۝ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ . لَا يَنَامُ وَلَا يَمُوۡتُ﴾ وغیرہ پھر صفات ثبوتیہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اضافیہ۔ (۲) غیر اضافیہ۔

اب مجموعی اعتبار سے صفات کی کل تین قسمیں ہوجاتی ہیں:

(۱) **صفات ثبوتیہ اضافیہ:** یعنی وہ صفات جن کا تفصیلی ظہور اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ ذات باری تعالیٰ کے علاوہ دوسری کوئی چیز اثر قبول کرنے والی نہ ہو، یا اس طرح کے لیے کہ وہ صفات جن کا تعلق کسی دوسری چیز سے وابستہ ہو، جیسے خالق سمیع، رزاق، ناصر وغیرہ کہ ان کا تعلق و تعقل مخلوق مسموع مرزوق منصور سے وابستہ ہے۔

(۲) **صفات ثبوتیہ غیر اضافیہ:** یعنی وہ صفات جن کا تعلق و تعقل کسی دوسری چیز سے وابستہ نہ ہو، بلکہ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ براہ راست اس کا وجود ہو، جیسے: **الحي، الأزلي، الأبدي، الماجد** وغیرہ۔

(۳) **صفات سلبیہ:** وہ صفات ہیں جو حق تعالیٰ کی تنزیہ پر دال ہیں، جیسے: **لَمْ يَلِدْ، لَمْ يُوْلَدْ، لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ، وَّلَا نَوْمٌ، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ، لیس بجسم ولا جوهر ولا غيره، هكذا۔**

﴿هُوَ اللّٰهُ﴾ ذات اور تمام صفات ثبوتیہ اضافیہ و غیر اضافیہ پر دال ہے۔ ﴿اَحَدٌ صَمَدٌ﴾ سے لے کر آخر سورت تک تمام صفات سلبیہ پر دلالت و تصریح ہے۔

﴿اَحَدٌ﴾ کے معنی ایک ہونا، یہاں کثرت اور تعدد کی نفی ہے، واجب الوجود ہونا، امکان و حدوث کی نفی ہے۔

﴿الصَّمَدُ﴾ بے نیاز ہونا، احتیاج کی نفی ہے، **و كذلك الباقي۔**

اصحاب باطن کہتے ہیں کہ سورۂ اخلاص ہر مؤمن کے قلب پر لکھا ہوا ہے، جو حسن خاتمہ اور دخول جنت کی ضمانت ہے۔ **اللّٰهم ارزقنا و جميع المؤمنين بفضلك۔ آمين**

سُورَةُ الْفَلَقِ وَالنَّاسِ

مَكِّيَّتَان، سُوْرَةُ الْفَلَقِ خَمسُ آيَاتٍ وَسُوْرَةُ النَاسِ سِتُّ آيَاتٍ

سورۂ فلق اور سورۂ ناس دونوں مکی ہیں، سورۂ فلق کی پانچ آیتیں اور سورۂ ناس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

الفلق اور الناس، سورتوں کے نام قرار پائے ،کلمہ ﴿أَعُوْذُ﴾ کی وجہ سے دونوں کا تخلص معوذتین قرار پایا۔ یہ دونوں مستقل سورتیں ہیں۔ مصحف عثمانی میں الگ الگ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کے ساتھ لکھی ہوئی ہیں۔ مشترک نام کی وجہ یہ ہے: (۱) کلمہ اعوذ دونوں کے شروع میں ہے۔ (۲) دونوں کا نزول ایک ساتھ ہوا ہے۔ (۳) مضمون ومطلب دونوں کا ایک ہے۔ (۴) سبب نزول دونوں کا متحد ہے، وغیرہ۔

نزول:

حضرت حسن بصری، جابر بن زید، عطاء، عکرمہ وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں کہ معوذتین مکی ہیں، یہی ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ہے، مگر ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مدنی ہیں اور یہی قول حضرت ابن زبیر اور قتادہ رضی اللہ عنہما کا بھی ہے۔ اس دوسرے قول کو جو روایات تقویت پہنچاتی ہیں ان میں سے ایک مسلم، نسائی، ترمذی اور مسند احمد میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز مجھ سے فرمایا: ألم تر آيات أنزلت الليلة لم ير مثلهن: أعوذ برب الفلق وأعوذ برب الناس۔ (تمہیں خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آج رات مجھ پر ایسی آیتیں نازل فرمائی ہیں، جن کی مثال پہلے نہیں آئی، وہ أعوذ برب الفلق و أعوذ برب الناس ہیں۔

یہ حدیث اس بناء پر معوذتین کے مدنی ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ایمان لائے تھے، جیسا کہ ابوداؤد ونسائی نے خود ان کے اپنے بیان سے نقل کیا ہے۔ دوسری روایت جو اس قول کی تقویت کی موجب بنی ہیں، وہ محی السنۃ، بغوی، بیہقی حافظ ابن حجر، ابن سعد، امام نسفی، حافظ عینی، عبد بن حمید وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کی نقل کردہ یہ روایات ہیں کہ جب مدینہ طیبہ میں یہود (لبید بن اعصم) نے جادو کیا تھا، اور جادو کے اثر سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے تھے، اس وقت معوذتین کا نزول ہوا تھا۔ ابن سعد نے واقدی سے نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ ے ھ کو پیش آیا تھا، اس بنا پر سفیان بن عیینہ نے بھی ان سورتوں کو مدنی کہا ہے۔

ان روایات مرفوعہ اور تصریحات ائمہ سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورتیں مدنی ہیں، لیکن جو حضرات ان سورتوں کے بارے میں مکی ہونے کا قول اختیار کر چکے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ سورۂ اخلاص وغیرہ کی طرح ان سورتوں کا نزول مکرر ہو، یا یہ وجہ ہو کہ کسی سورت یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں موقعہ پر نازل ہوئی تھی، بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک سورت یا آیت پہلے نازل ہو چکی ہوئی تھی، اور پھر کوئی خاص واقعہ یا صورت حال پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کی طرف دوبارہ بلکہ کبھی کبھی بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو توجہ دی جاتی تھی، جیسے کہ سورۃ النصر کے شان نزول کے موقع پر اس طرف اشارہ ہوا۔

ایسا معاملہ معوذتین کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ ان دونوں سورتوں کا مضمون صاف بتلا رہا ہے کہ یہ ابتداءً مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی اور لوگ آپ کو ایذا پہچانے کے درپے تھے، بعد میں جب مدینہ طیبہ میں یہود و منافقین اور مشرکین کی مخالفت کے طوفان اٹھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر انہی دونوں سورتوں کے پڑھنے اور استعاذہ کی تلقین کی گئی، جیسا کہ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت میں ذکر آیا ہے۔

اس کے بعد جب آپ پر جادو کیا گیا اور آپ کی علالت مزاج نے شدت اختیار کی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرئیل علیہ السلام نے آکر پھر یہی سورتیں پڑھنے کی آپ کو ہدایت کی، اس لئے ان مفسرین حضرات کا بیان ہی زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکی قرار دیتے ہیں۔ جادو کے ساتھ ان کو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھی مانع ہے کہ اس کے ساتھ سورۂ فلق کی صرف ایک آیت یعنی ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ﴾ ہی تعلق رکھتی ہے، اور سورۂ فلق کی باقی آیات اور پوری سورۃ الناس کا اس معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے، جیسے کہ کلمات والفاظ اس پر

دال ہیں، اس کے علاوہ جو بات مشہور ہے کہ مکی سورتوں کی تعداد چھیاسی اور مدنی سورتیں اٹھائیس ہیں۔
اگر ان دونوں سورتوں کو مدنی شمار کیا جائے تو یہ مشہور متواتر تعداد غلط ہو جائے گی جیسے کہ ظاہر ہے، اس کے علاوہ قرآن مجید کے تمام نسخے جو سینکڑوں سالوں سے مسلسل طبع ہوتے جارہے ہیں ان سب میں یہی لکھا ہوا نظر آتا ہے کہ سورة الفلق مكية وسورة الناس مكية اور یہ شہرت تواتر کے درجے میں ہے۔ نیز اس کے علاوہ علوم قرآن کے موضوع پر لکھی ہوئی تمام کتابوں میں تصریح ہے کہ سورۃ الفلق کا نزول سورۃ الفیل کے بعد ہے، اور نزولی ترتیب کے اعتبار سے معوذتین کا نمبر ۲۰ و ۲۱ ہے، اور سورۃ الفیل کا نمبر ۱۹ جبکہ سورۃ الاخلاص کا ۲۲ ہے۔ یہ فہرست سورۃ الناس کی تفسیر کے بعد آنے والی ہے، ان شاء اللہ۔

بیانِ سابق کی تائید وتقویت کی خاطر ایک ضروری وضاحت:

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر نبوت کا اعلان فرمایا یہ ذرا غور طلب بات ہے کہ وہ معاشرہ کیسا تھا؟ اس معاشرے میں دینی ومذہبی اقدار تو درکنار انسانی شرافت علم وادب کا نام ونشان بھی نہ تھا، وہ معاشرہ جنگلی درندوں اور بے حس جانوروں کا معاشرہ تھا، صدیوں سے لوگوں نے دین الٰہی اور توحید کے پیغام کا نام تک نہیں سنا تھا، پورے افق پر کسی آسمانی صحیح اور حقیقی کتاب کی ہدایات کا وجود نہ تھا، شرک وبت پرستی، زنا وشراب، سود وخیانت کا دور دورہ تھا، مخرّب اخلاق اور دیگر ناگفتہ بہ جرائم اپنے عروج پر تھے، اور شرافت واخلاق بالکل ناپید ہو چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ ایسے سڑے ہوئے گندے معاشرہ میں دین الٰہی کا پیغام کسی کے لئے بھی قابل قبول نہ تھا، جو لوگ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ومانوس تھے اور چالیس سالہ رفاقت کے ہر نشیب وفراز سے واقف رہتے ہوئے حسنِ عقیدت سے آپ کو انہوں نے امین ومحسن کا لقب دیا ہوا تھا، اور آپ کے وجود اقدس پر قومی سطح پر فخر ومباہات کے کلمات کہنے سے نہیں تھکتے تھے، اعلانِ نبوت کے ساتھ وہ یک لخت بدل گئے اور آپ کے جانی دشمن بن گئے اور ساحر وشاعر ومجنون کہنے سے نہیں شرمائے، آپ کو اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو طرح طرح کی ایذاء دینے، دبانے اور بے بس کرنے کی کوششوں میں لگے رہے، اور ظلم وزیادتیوں کا وہ بھیانک سلسلہ شروع کیا جنہیں سن کر ہر انسان لب بدنداں ہوا۔

ایسے حالات میں ربّ العزّت نے آپ کے عزائم وپائے استقامت میں بے مثال عزم وہمت کی دستگیری

فرمائی، لیکن کفار مکہ شدید مخالفت کے باوجود ایک غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلاء رہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح شاید کوئی مصالحت ہوجائے اور وہ اپنے پروگرام تبلیغ دین میں اور ہمارے معبودوں کے برا بھلا کہنے میں کچھ نرمی کرے، تو ہم بھی مخالفت میں کمی کریں گے، قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَدُّوا لَوۡ تُدۡهِنُ فَيُدۡهِنُونَ﴾ [القلم: ۹] (یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم نرمی اختیار کرو تو یہ بھی نرم ہوجائیں)۔

انہیں ہر وقت یہ خیال رہا کہ شاید کوئی مصالحت عمل میں آئے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں صاف صاف جواب دے کر مایوس کیا اور سورۃ الکافرون کے نزول پر مزید انہیں یہ کہہ کر جواب دیا کہ جن بتوں کی تم بندگی کرتے ہو میں ہرگز ان کی بندگی نہیں کروں گا، اور جس معبود برحق عزّ شانہ کی میں بندگی کرتا ہوں، اس کی بندگی کرنے والے تم نہیں ہو، اس لئے میرا راستہ الگ ہے اور تمہارا الگ ہے۔

اس اعلان کے بعد کفار مکہ کی دشمنی اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی، پس انہوں نے توحید و رسالت کی آواز کو دبانے میں ہر قسم کے حربے استعمال کرنا شروع کئے، اور ہر قسم امکانی تدبیروں اور ہتھکنڈوں کے ساتھ مقابلے پر اُتر آئے، اپنی ترکشوں سے جتنی شرارتی تیر چلا سکتے تھے چلالئے، کچھ ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کیں، جو نظر لگانے میں بڑے ماہر تھے کہ آپ کو نظر بد کے ذریعہ راستہ سے ہٹائیں۔

یہود مدینہ کعب بن اشرف اور اس کی جماعت سے مدد مانگی، اور یہ پروگرام تیار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید جادو کرکے (العیاذ باللہ) آپ کے خلاف گنڈے عقدے، گرہ، منتر استعمال کریں، تاکہ آپ یا تو وفات پاجائیں یا شدید بیماری میں مبتلا ہوں، یا دیوانے اور فاتر العقل بن جائیں۔ ساتھ اس کے مختلف قبائل کے لوگوں کے ذریعہ آپ کو شہید کرنے کے پروگرام بھی تیار کیا، اسی موقع پر ربّ العزّت عزّ شانہ نے اسباب کے تحت اپنے حبیب اعظم سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ دونوں سورتیں معوذتین نازل فرمائیں، اور حاسدوں دشمنوں کی شرارتوں سے آپ کی حفاظت کا انتظام فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ سورتیں آپ کو ہر قسم خطرات سے ایک مکمل ڈھال کی حیثیت سے حفاظت کا سامان مہیا کیا، اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبردست استقامت اور اولوالعزمی کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کیا، اور اپنے دینی پروگرام کو جاری رکھ کر خوب آگے بڑھایا، جس کا نتیجہ اور ہر قسم کی فوز و فلاح سارے عالم میں پھیل کر سب کے سامنے آئی۔ الحمد للہ رب العلمین

پھر مدنی زندگی میں جب یہود نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تو دوبارہ ان معوذتین کا نزول ہوا، یا یہ کہ جبریل امین نے آپ کو یاد دہانی کے طور رہنمائی کی کہ انہیں سورتوں کے ذریعہ آپ استعاذہ کریں تا کہ جادو کا اثر باطل ہو جائے۔ واللہ اعلم

معوذتین کی قرآنیت:

گزشتہ سطور سے یہ واضح ہوا کہ معوذتین کا شمار قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں ہے، اور قرآن حکیم کے ایک سو چودہ سورتوں مین ان کا شمار ہے، اور یہ مسئلہ اجماعی واتفاقی ہے، لیکن چونکہ حدیث وتفسیر کی کتابوں میں ان کے متعلق ایسے مباحث آگئے ہیں جو دلوں میں شبہات پیدا کر سکتے ہیں، اس لئے یہ بہت اہم ضروری ہے کہ ان شبہات کو مکمل صاف کر کے اطمینان حاصل کیا جائے، اور یہ مباحث کل تین ہی ہیں:

اول قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا ان دونوں سورتوں کا قرآنی سورتیں ہونا قطعی طور پر ثابت ہے، یا اس میں کسی شک کی گنجائش ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے عظیم المرتبہ صحابی سے متعدد روایتوں میں یہ موجود ہے (منقول ہے) کہ وہ ان دونوں سورتوں کو قرآنی سورتیں نہیں مانتے تھے، اور انہوں نے اپنے مصحف سے ان کو ساقط کر دیا تھا۔

"أخرج أحمد والبزار والطبراني وابن مردوية من طرق صحيحة عن ابن مسعود رضي الله عنه أنه كان يحک المعوّذتين من المصحف ويقول: لاتختلطوا القرآن بماليس منه أنهما ليستا من كتاب الله أنما أمر النبي صلى الله عليه وسلّم أن يتعوّذ بهما وكان ابن مسعود رضي الله عنه لايقرأبهما"۔ [الدر المثور]

یعنی (امام احمد بزار، طبرانی، ابن مردویہ نے صحیح طریقوں (سندوں) سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ معوذتین کو مصحف سے محو کر دیا کرتے تھے، اور کہا کرتے تے کہ قرآن حکیم کے ساتھ ایسی چیزیں خلط ملط نہ کرو جو اس میں سے نہیں ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان دو سورتوں کے ساتھ فقط پناہ مانگنے کا حکم دیا تھا، نیز حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان دونوں سورتوں کی تلاوت نماز میں نہیں کیا کرتے تھے)۔ [درمنثور]

علماء کرام کہتے ہیں کہ اس میں تو کلام نہیں، یہ اور اس کے علاوہ روایات اخبار آحاد ہیں۔ اصول حدیث کے ماہر علماء کرام نے یہ مسلمہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ اخبار آحاد کی صحت کے لئے صرف راویوں کی عدالت اور قوتِ حافظہ ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخبار آحاد کا درایت کے معیار پر پورا پورا اترنا بھی ضروری ہے، اور ان میں سے

ایک یہ ہے کہ وہ روایت بداہت عقل کے خلاف نہ ہو، اور کسی مرفوع روایت یا اجماعی فیصلے کے ساتھ متصادم نہ ہو، اگر اس قاعدہ کو پیش نظر رکھا جائے تو ان روایات آحاد کو بنیاد بنا کر انکار کی عمارت استوار کرنا کوئی دانشمندی نہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض محققین ائمہ نے جیسے امام نووی، امام ابن حزم، اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہم نے سرے سے اس بات ہی کو جھوٹ اور باطل قرار دیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایسی کوئی بات کہی ہے۔

البتہ اگر مستند تاریخی حقائق کو تسلیم کیا جائے تو یہ جواب کافی شافی ہوگا کہ یہ روایات سب کی سب آحاد ہیں، اوران کی بنا پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ خیال، اور خیال بھی ایسا جس سے فقط حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر ہی اعتراض وارد نہیں ہوتا، بلکہ فتنہ کا ایک ایسا دروازہ کھل جاتا ہے، جس سے کفار وملحدین اور دشمنانِ اسلام کو تمام قرآن کریم کے بارے میں زبان طعن دراز کرنے کی سند مل جاتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآنی سورتوں پر کوئی اجماع منعقد نہیں ہوا، وغیر ذلک من الأوهام والشکوک۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایات سے قرآن حکیم کی سورتوں اوران کی تعداد کے متعلق جو اشتباہ پیدا ہوا اس کو کس طرح دور کیا جائے؟ تو اس بارے میں جوابات یہ ہیں:

جواب(۱): معوّذتین کی قرآنیت پر امت کا اجماع ہے، اجماع کے خلاف کوئی بات مسموع نہیں۔

جواب(۲): قال البزار: لم یتابع ابن مسعود أحد من الصحابة۔ [درمنثور]

جواب(۳): صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہوا کہ قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتیں ہیں، اور معوّذتین دونوں مستقل آخری سورتیں ہیں، باقی سورتوں کی طرح ان کے شروع میں بھی ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' مکتوب ہے۔

جواب(۴): تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی اور اتفاق پر خلیفہ راشد جامع قرآن حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے جو نسخے (مصحف عثمانی) مرتب کئے اور خلافتِ اسلامیہ کی طرف سے دنیائے اسلام کے مراکز میں سرکاری طور پر بھیج دیئے، ان میں بغیر کسی فروگزاشت کے یہ سورتیں بھی اسی طرح درج ہوئیں جس طرح باقی ایک سو بارہ سورتیں درج ہوچکیں، اب یہ مسئلہ اجماعی بھی ہے اور قطعی متواتر بھی، پس اگر کوئی اس کا انکار کرے گا تو عقائدِ اسلامیہ کی رو سے وہ شخص کافر کہلائے گا۔

پس واضح ہوا کہ خیر القرون سے آج تک جو اتفاق مسلسل چلا ہے کسی ایک فرد کے قول سے اس میں کوئی رخنہ پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر چہ وہ فرد کتنی بڑی جلالت شان کا مالک کیوں نہ ہو۔

جواب(۵): قوی امکان یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے قول سے رجوع کیا، اور یہ کہا: قال ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: قال: لقد أنزل علی آیات لم ینزل علی مثلهن المعوذتين۔ [درمنثور بحواله طبراني في الأوسط بسند حسن]

جواب(٦): قاضی ابوبکر باقلانی اور قاضی عیاض شارح مسلم نے فرمایا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کی قرآنی سورت ہونے کے منکر نہیں تھے، کیونکہ جس طرح ان کے مصحف میں معوذتین کی کتابت نہیں تھی، اسی طرح انہوں نے سورۃ الفاتحہ کو بھی مصحف میں ثبت نہیں کیا تھا، پس فاتحہ کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ قرآن کا جزء نہیں۔

جواب(۷): صحیح احادیث سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم معوذتین کو بکثرت نمازوں میں پڑھا کرتے تھے، جبکہ نمازوں میں صرف قرآن مجید ہی کی تلاوت ہوتی ہے۔ یہ احادیث صحاح ستہ کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں بھی درج ہیں۔

جواب(۸): کسی سورت میں صحابی یا صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف اخبار آحاد کے زمرے میں آتا ہے، اخبار آحاد ظنی ہوتی ہیں، جو متواتر اور قطعی حکموں کے خلاف بالاتفاق ساقط شمار ہوتی ہیں، جب کسی مسئلہ کا اثبات تواتر سے ہو تو وہاں اخبار آحاد کی طرف قطعاً التفات نہیں ہوگا۔

ضروری وضاحت:

جواب نمبر پنجم کے تحت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کا واضح مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو ان دونوں سورتوں کے بارے میں (یعنی نزول سے) آگاہ فرمایا، اس سلسلے میں ہوسکتا ہے کہ اس سے پہلے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی خیال ہو کہ یہ معوذتین صرف جھاڑ پھونک کے لئے ہوں، اور قرآن کا حصہ نہ ہوں، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سننے کے بعد ان کا شک وشبہ دور ہو گیا، اور خیال بدل گیا اور انہوں نے اپنے پہلے قول سے رجوع کیا جس پر ثبوت یہ اس کی روایت ہے، کمامر۔

اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ قرآن کریم وہ صحیفہ رحمت ہے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سنا اور تواتر کے ساتھ نقل کیا، پھر اسی تواتر کے ساتھ تابعین نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سنا اور نقل کیا، اور اسی سلسلہ تواتر کے ساتھ بلاکم وبیش ہم تک پہنچا، اور کبھی کسی زمانے میں اس تواتر پر کوئی انقطاع واقع نہ ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن حکیم کی جمع وترتیب کے لیے جو کمیٹی مقرر کی تھی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اس کمیٹی کے سربراہ مقرر

ہوئے تھے، کمیٹی نے سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں قرآن مجید کا نسخہ مرتب و مدون کیا، پھر اس کی متعدد نقول اپنی نگرانی میں تیار کر کے مملکت اسلامیہ کے مختلف امراء کی طرف روانہ کئے، تاکہ عرب وعجم میں اسی کے مطابق تلاوت کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے، تو قرآن حکیم صرف اسی مصحف کا نام ہے۔ اس کے خلاف جو روایت نظر آئے یا وہ سند کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہوگی یا وہ خبر واحد ہوگی یا کسی شخص کا اپنا ذاتی قول ہوگا۔

الغرض! کلام اللہ وہی ہے جو اس مصحف عثمانی کے مطابق ہے، جس پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے، اور اس وقت سے لے کر آج تک اپنے مخصوص رسم الخط کے ساتھ ہے کہ اس میں نہ کسی لفظ کی کمی بیشی ہوئی، نہ کسی آیت یا کسی جملہ میں تقدیم وتاخیر رونما ہوئی، نہ کلمات والفاظ کی ترتیب میں کوئی تغیر روپذیر ہوا، حتیٰ کہ اصولی طور پر اس کے متعلق علماء امت نے یہ بنیادی شرط وضع فرمائی: وهو اسم للنظم والمعنى جميعاً کہ قرآن پاک صرف الفاظ یا صرف معانی کا نام نہیں، بلکہ الفاظ ومعانی دونوں سے مرکب کا نام ہے، اگر محض کسی لفظ میں تبدیلی آئی اور معنی میں تبدیلی نہیں آئی یا برعکس تو اس پر کلام اللہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم

حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو جادو ہوا تھا، اس کی تفصیل وبیان:

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہوا، اور ذات اقدس پر اس کا اثر بھی ہوا، یہی اہلسنت والجماعۃ کے علماء کی رائے ہے، اور صحاح ستہ کی احادیث صحاح اس پر گواہ ہیں، البتہ معتزلہ اور کچھ دوسرے لوگ اس کے قائل نہیں کہ آپ پر جادو ہوا اور اس کا اثر بھی ظاہر ہوا، اگرچہ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں اور انہیں شہرت کا درجہ حاصل ہے، مگر ان کے مجموعہ کو تواتر کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ تواتر بقدر مشترک۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سلسلہ رشد وہدایت جیسے جیسے ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے عام ہوتے گئے اور ہر طرف قبائل میں پھیلتے گئے، ساتھ ساتھ فتوحات کا سلسلہ روز افزوں جاری رہا اور عام ہوتا گیا، تو دوسری طرف سے معاندین اور مخالفین خواہ مشرکین ہوں یا یہود ونصاریٰ ان کی عداوت کے شعلے بھڑکتے اور شدت اختیار کرتے گئے ۷ھ میں صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح فرمایا، جس میں حجاز کے یہودیوں پر قیامت قائم ہوئی، جبکہ اس سے پہلے مدینہ کے یہود بنو قریظہ، بنونضیر، بنو قینقاع اور ان کے مشہور سردار کعب بن اشرف اور ابورافع مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جا چکے اور جلاوطن ہوئے تھے، جہاں ان کے سینکڑوں جنگجو نوجوان کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر تہ تیغ کیا تھا، تو یہودیوں کی عداوت میں بے اندازہ اضافہ ہوا، اور

خاص کر خیبر کے یہودی ہر طرح سے مسلمانوں سے انتقام کے درپے ہوئے۔

بقول امام واقدیؒ خیبر کے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ کے مشہور جادوگر لبید بن اعصم کے پاس آیا، یہ شخص مذہباً یہودی نہیں تھا، بلکہ قبیلہ بنی زریق کا منافق تھا، اور قوم یہود کا حلیف تھا اور یہود کے ساتھ اس کے گہرے مراسم تھے، خیبر کے یہودی وفد نے لبید بن اعصم کے سامنے اپنی تباہی اور ہر قسم کی ناکامیوں کا رونا رویا اور خوب آہ وفغان کر کے اس کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، اور بھاری نذرانہ پیش کر کے اسے آمادہ کیا کہ تم پیغمبر اسلام پر زبردست جادو کر کے اسے کمزور اور بیمار کرلو، اور ہماری اشک شوئی کر کے مزید اس کی گرفت سے ہمیں نجات دیدو۔

اس دوران ایک یہودی لڑکا انہیں ہاتھ لگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا کرتا تھا، (جو بعد میں مسلمان ہوا تھا) اس بچے کو ورغلا کر اس کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنگھی کے کچھ دندانے اور چند موئے مبارک حاصل کرلئے۔ لبید اور اس کی بیٹیوں نے (جو اس فن میں اپنے باپ سے بھی چند قدم آگے نکلی ہوئی تھیں) جادو کیا اور ان چیزوں کو نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں بند کر کے بنی زریق کے ایک کنویں کی تہہ میں ایک بھاری پتھر کے نیچے دبا دیا، اس کنویں کا نام ذی اروان یا ذروان تھا، اور اس کا پانی مہندی کی طرح رنگین تھا، چند وقت تک اس کا کوئی خاص اثر معلوم نہ ہوا، آخر کار چھ ماہ بعد معمولی اثر ظاہر ہونے لگا، پھر ایک وقت مسلسل چالیس روز تک کافی زیادہ اثر معلوم ہونے لگا، اور آخری چار دن بڑی شدت کے ساتھ تکلیف محسوس ہوئی۔

حضرت علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: کان النبي صلی اللہ علیه وسلم یذوب ولا یدر ماو جعه۔ یعنی آپ ﷺ کی طبیعت گھٹنے لگی، ضعف بڑھتا گیا، لیکن بظاہر اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوئی۔ صحیح بخاری میں ہے: حتی یخیل إلیه أنه فعل الشيء ولم یکن فعله۔ [بخار ۵، روح المعاني] یعنی ایسا دنیوی کام جو نہ کیا ہوتا اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوتا کہ کرلیا گیا ہے، یعنی نسیان ہوتا۔

کتب حدیث شریف میں اس جادو کے اثرات کے بارے میں جتنی روایات ملتی ہیں ان سب کا خلاصہ ونچوڑ یہی ہے کہ جسمانی طور پر کمزوری وضعف ضرور معلوم ہوتا، لیکن ایسی کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ فرائض نبوت کی ادائیگی میں کبھی بال برابر فرق آیا ہو، یا کوئی ادنیٰ فروگزاشت واقع ہوئی ہو، حاشاء و کلاّ کوئی نقص پیدا ہوا ہو، کیونکہ ربّ العرش العظیم اپنی اس نعمت عظیمہ کی حفاظت کا خود انتظام کیا ہوا تھا، تو ظاہر یہی دیکھنے میں آیا کہ کچھ دنیوی امور کی انجام دہی میں تھوڑا سا دقیقہ فروگزاشت ہوا، مگر وہ بھی نہ ہونے کے

برابر۔ رہا دینی عبادات کا معاملہ، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نماز کے ارکان میں تقدیم وتاخیر سرزد ہوئی ہو، یا تلاوت قرآن میں کوئی نسیان طاری ہوگیا ہو، یا امور جہاد وتعلیم مسائل واحکامِ شریعت میں کوئی سہو واقع ہوا ہو، یا مملکت اسلامیہ کی توسیع واستحکام یا اسلامی تبلیغ میں کوئی رخنہ پیدا ہوا ہو، علیٰ ہٰذا القیاس باقی امور بھی۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکلیف میں اضافہ ہوا تو بار بار بکثرت دعاء والتجاء میں مصروف ہوئے، ایک شب آپ کو خواب میں حقیقت حال سے آگاہ فرمادیا گیا، چنانچہ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتادیا کہ اے عائشہ! میں نے ربّ العزّت سے جس بات کے بارے میں دریافت کیا تھا، میرے ربّ نے مجھے اس کے متعلق بتادیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کو کیا بتادیا گیا ہے؟ ارشاد فرمایا: رات کو دو آدمی میرے پاس آئے، ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا پاؤں کے نزدیک، (بعض روایات میں ہے کہ وہ جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام تھے) ایک نے دوسرے سے پوچھا: انہیں کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے جواب دیا: انہیں جادو کیا گیا ہے۔ پوچھا: کس نے کیا ہے؟ جواب دیا: لبید بن اعصم نے، پوچھا: وہ کس چیز میں؟ بتایا گیا: کنگھی کے دانوں کو اور چند بالوں کو نر کھجور کے خوشہ کے پردے میں رکھا گیا ہے۔ پوچھا: کہاں رکھا ہے؟ بتایا: ذی اروان کے کنویں کی تہہ میں ایک پتھر کے نیچے۔ پوچھا: اب کیا کرنا چاہئے؟ بتایا: اس کنویں کا سارا پانی نکالا جائے، پھر اس پتھر کے نیچے سے ان چیزوں کو نکالا جائے۔

صبح ہوتے ہی آپ نے فوراً حضرت علی، عمار بن یاسر، زبیر بن العوام رضی اللہ عنہم کو اس مہم پر روانہ فرمایا، انہوں نے اس کنویں کا پانی نکال کر کنویں کو خشک کردیا، اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی وہاں تشریف لے گئے، جب پتھر کو اٹھایا تو اس کے نیچے سے وہ غلاف نکل آیا، جب اسے کھولا گیا تو اس کے اندر کنگھی کا ایک ٹکڑا، چند بال جو تانت کے ایک ٹکڑے میں بندھے ہوئے تھے اور اس تانت میں گیارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں، اسی اثنا میں حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی حاضر ہوئے اور یہ دونوں سورتیں پڑھ کر سنائیں اور عرض کیا کہ آپ ان سورتوں کی ایک ایک آیت پڑھتے جائیں اور ایک گرہ کھولتے جائیں اور ایک سوئی نکالتے جائیں، چنانچہ دونوں سورتوں کی گیارہ آیتیں پڑھی گئیں۔ ان کی تلاوت سے گیارہ گرہیں کھل ہی گئیں، اور ساری سوئیاں نکل گئیں۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ہشاش بشاش اور صحیح ہوگئی، جادو کا اثر زائل ہوگیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جادو کے اثر سے نکل کر بالکل ایسے ہوگئے جیسے کوئی بندھا ہوا شخص کھل جائے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لبید بن اعصم کو بلا کر اس سے باز پرس کی، اس نے اپنے قصور کا اعتراف کیا، پس آپ نے سیاسۃً اور مصلحت کے طور پر اور اپنی عظیم لازوال شفقت اور کرم کی بناء پر اسے معاف فرما کر چھوڑ دیا، کیونکہ آپ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی شخص سے انتقام نہیں لیا، اور اپنے مہربان ربّ کے فرمان ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ﴾ [المائدۃ:۱۳] (تو ان کی خطائیں معاف کردو، اور (ان سے) درگزر کرو) پر عمل پیرا رہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس کریمانہ خلق عظیم پر فتح مکہ کا واقعہ گواہ وثبوت ہے، جہاں آپ نے آگ وخون سے کھیلنے والے مشرکین قریش سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا تھا: **لاتثریب علیکم اذھبوا أنتم الطلقاء**۔ اس روز اگر ابوجہل وعقبہ، امیہ، ولید بن مغیرہ، ابولہب اور اس کی بیوی جیسے مجرم زندہ ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلا تامل انہیں بھی آزاد فرما کر معاف کرتے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے سینہ مبارک کو اتنا وسیع وفراخ رکھا ہے کہ اس میں پورا جہاں سما سکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لبید کے بارے آپ سے اجازت طلب کی کہ اس کا سر قلم کرلیں، اس پر ارشاد فرمایا: **أما أنا فقد شفاني الله وإني أكره أن أثير على الناس شرا**۔

یارب تو کریمے وحبیب تو کریم ☆ صد شکر کہ ہستیم بمیان دو کریم

ان واقعات کو معتزلہ اور دوسرے لوگ تسلیم نہیں کرتے، اور ان تمام روایات کو ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں، جن میں جادو کا تذکرہ اور بیان ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ روایات قرآنی آیت ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ [المائدۃ: ٦٧] (اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا) وغیرہ کے ساتھ متصادم ہیں، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ان روایات کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس سے منصب نبوت کی توہین ہوجاتی ہے، بلکہ پوری شریعت اور ہر قسم کی وحی سے وثوق واعتماد اٹھ جاتا ہے، اور آیت کریمہ کے بموجب عصمت نبوت کی ذمہ داری خود اللہ ربّ العزّت نے لی ہے، تو پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ قوم یہود کے جادو کا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اثر ہوگیا ہو؟

اہل سنت والجماعۃ کے حضرات یہ کہتے ہیں کہ جادو کا اثر ہو یا کوئی اور جسمانی درد وتکلیف ہو، یہ ہرگز منصب نبوت کے منافی نہیں، کیونکہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور وجود مسعود کی دو حیثیتیں ہیں: ایک حیثیت نبوت کی ہے، دوم حیثیت بشریت کی ہے۔

نبوت کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر عارضہ اور صدمہ سے محفوظ ہوتے ہیں، جس طرح ہر قسم کے گناہوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باذن اللہ محفوظ ہیں۔ رہا معاملہ بشریت کا، اس حیثیت سے آپ عوارض بشریہ سے محفوظ نہیں ہوتے،

مثلاً بیمار ہونا، پیاس وبھوک، بخار، درد، دندان مبارک کا شہید ہونا، چہرہ انور کا زخمی ہونا، سفر طائف میں قدموں کا زخمی ہونا، کسی عمومی یا ذاتی صدمہ کی وجہ سے پریشان ہونا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے عوارض وقتاً فوقتاً لاحق ہوتے رہے ہیں۔

کتب حدیث وسیرت میں ان کی بڑی بڑی تفصیلات ہیں، پس جادو کا اثر بھی انہی عوارض بشریہ کا حصہ ہی ہوگا، ان عوارض سے شانِ نبوت اور منصب رسالت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، جیسے پہلے بیان ہوا، اور جادو کا اثر صرف صحت جسمانی کے ساتھ مخصوص رہے گا، نہ اور کچھ، پس آیت کریمہ کا مطلب یہ لیا جائے گا اور یہی معنی متعین ہیں کہ اس میں آپ کی جان کی حفاظت کا وعدہ ہے کہ آپ کو کوئی شہید نہیں کرسکتا، اور عوارض طبعیہ بشریہ سے آیت کریمہ میں حفاظت پر کوئی وعدہ نہیں، جیسے کہ زندگی بھر یہ عوارض موقع بموقع پیش آتے رہے، حتیٰ کہ غزوۂ خیبر میں یہودی عورت نے گوشت میں زہر ملا کر آپ ﷺ کو پیش کیا، جس کا اثر وصال کے وقت تک باقی رہا، جیسے کہ صحیح بخاری ودیگر کتب حدیث میں اس کی تصریح ہے۔ واللہ اعلم

خلاصۃ الکلام:

حاصل یہ ہے کہ سحر سے متأثر ہونا نہ شانِ نبوت کے منافی ہے، نہ وعدۂ حفاظت کے خلاف ہے، بلکہ اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کفار مکہ آپ ﷺ کو ساحر (جادوگر) کہتے تھے، حالانکہ کفار کا خیال (عقیدہ) یہ بھی تھا کہ ساحر پر کسی جادوگر کا سحر اثر نہیں کرسکتا، تو اس واقعہ سحر سے کفار کی تغلیط ہوگئی، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کا اثر ہوگیا، تو کفار کے عقیدہ کے مطابق آپ ﷺ ساحر نہ ہوئے، ورنہ سحر کا اثر نہ ہوتا۔

دوم مصلحت یہ ہوئی کہ ہمارے زمانہ کے مشرک جو آپ ﷺ کو مختارِ کُل اور غیب دان سمجھتے ہیں ان کی تغلیط بھی ہوگئی کہ اگر آپ ﷺ عالم الغیب یا مختارِ کُل ہوتے تو آپ پر جادو کا اثر نہ ہوتا، اور جادو سے پہلے آپ کو علم ہو جاتا، حالانکہ واقعات صاف صاف بتارہے ہیں کہ آپ کو اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا، اور یہ واقعات مسلمات میں سے ہیں جن سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔

یہ روایات عمومی معنی کے اعتبار سے حدتواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، جنہیں بکثرت متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کی ہیں۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، امام احمد، امام عبدالرزاق، بیہقی، حمیدی، طبرانی، ابن مسعود، ابن مردویہ، حاکم ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، وغیرہ محدثین نے بڑی کثرت سے روایت کی ہیں۔ واللہ اعلم

رہا یہ مسئلہ کہ جادو کیا ہے، اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ جادو سے کسی چیز کی حقیقت تبدیل ہوسکتی ہے یا فقط

نظر بندی ہوتی ہے؟ یہ ایک بہت بڑی بحث ہے۔ اس کی پوری تفصیل سورۃ البقرۃ میں گزر چکی، دوبارہ اعادہ کی حاجت نہیں، وہاں دیکھا جائے۔

دم، تعویذ، رقیہ، جھاڑ پھونک کا شرعی حکم:

قدیم زمانہ سے جھاڑ پھونک کا رواج ہر انسانی معاشرہ میں موجود رہا ہے، اس مقصد کے لیے جو نقوش، طلسم، منتر لوگوں کے ہاں رواج پذیر تھے، یا اب بھی اقوامِ عالم میں کسی حد تک اس پر عمل ہو رہا ہے، مثلاً یہود، عیسائی، سکھ، ہنود کہ ان کی دیویاں اور دیوتاؤں کے نام اور دیگر شیطانی قوتوں سے استمداد اور اسی طرح آسمانی کواکب وسیارات وبروج سے مختلف مہمات میں استغاثہ وغیرہ کسی وقت عام معمول رہا ہے، اور اب بھی ہندوستان کے ہنود میں اس کا بکثرت رواج چل رہا ہے، یہ لوگ کفر وشرک اور بندہ پرستی کے چونکہ عادی اور خوگر ہیں، اسی وجہ سے وہ ان طلسمات ونقوش کو مؤثر حقیقی سمجھ کر اس پر عمل کر رہے ہیں۔

اسلام نے شرک وبت پرستی اور استمداد من غیر اللہ کو بیخ وبن سے اکھیڑ کر رکھ دیا ہے، اور ہر قسم استغاثہ و استعانت لغیر اللہ کو قطعی طور پر شرک اور حرام قرار دیا، اور اس قسم کے شرکیہ اعمال کو باطل کر کے اپنے ماننے والوں کو ان سارے خرافات سے بچنے اور دور رہنے کا واضح حکم دیا، اور فرمایا کہ کوئی دیوی دیوتا، کوئی چاند وسورج اور کوئی کوکب وستارہ مستقل فاعل اور مؤثر حقیقی نہیں ہوسکتا، بلکہ ہر چیز میں مؤثر حقیقی اور مستقل فاعل ربّ العزّت کی ذات ہے، ﴿وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ﴾ [الدھر: ۳۰] (اور تم کچھ بھی ارادہ نہیں کر سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے) آیت کریمہ اور دیگر بے شمار نصوص قرآنیہ اس پر گواہ ہیں، یہاں تک کہ اس ذات پاک کے حکم کے بغیر کسی درخت کا پتہ حرکت تک نہیں کرسکتا۔

سارے عالم کی ساری چیزوں پر اور کائنات کے ہر ذرہ پر اس کی حکمرانی قائم ہے، اور وہی خالق ومالک و مختار ہے، تو یہ محال ہے اور ہرگز ممکن ہی نہیں کہ شرع انور کسی ایسے منتر، طلسم ونقوش وغیرہ کی اجازت دے، کیونکہ ہر وہ چیز جس میں صراحۃً تو درکنار اگر کسی طرح شرک کا خفی ذرہ بھر شائبہ ہو اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے یہ تمام نقوش وطلسم اور شرکیہ منتر اسلام میں حرام اور ممنوع ہیں۔ اور جن احادیث میں جھاڑ پھونک، رقیہ، دم، تعویذ وغیرہ کی ممانعت آئی ہے وہاں یہی شرکیہ اعمال ہی مراد ہوں گے، لیکن ایسا دم، تعویذ، رقیہ جس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے کوئی اسم مبارک، کوئی قرآنی آیت یا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا کوئی جملہ، کوئی ورد، کوئی

وظیفہ، یا ایسا کوئی نقش جو قرآنی آیت سے مستخرج ہو جس میں کوئی شرک یا کوئی مہمل بات کا شائبہ نہ ہو، جائز ہی ہوگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات سوتے وقت سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتے، پھر سارے جسم مبارک پر ہاتھ تین مرتبہ پھیر لیتے۔ [بخاري، مسلم، ترمذي، وغيرهم]

محدثین کرام فرماتے ہیں کہ شیطانی وسوسوں اور مخلوقات کے شر سے پناہ مانگنے کا یہ بہت بڑا کارآمد نسخہ ہے، چاہئے کہ سب لوگ اس پر عمل کریں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مؤثر حقیقی اللہ ربّ العزت کی ذات ہے، اور ہر چیز (دوا، دعا، دم، تعویذ) اسی وقت فائدہ مند ہوتی ہے جب اذنِ الٰہی ہو، بغیر اذنِ الٰہی کے کوئی چیز بھی اثر نہیں کرتی، اگر جڑی بوٹیاں، جوشاندہ، گولیاں، شربت، معجون، انجکشن یا غذائی پھل یا خوراک، دودھ، شہد صحت وعافیت کا سبب بن سکتے ہیں، بایں سبب کہ مؤثر حقیقی، مسبب الاسباب عزّ شانہ نے ان چیزوں میں کوئی خاص اثر رکھا اور پیدا کیا ہے، کمافي الحديث: ما أنزل الله داء إلا أنزل معه شفاء۔ [ترمذي]

تو اللہ تعالیٰ شانہ کے اسماءِ حسنی، آیات قرانی، ادعیہ ماثورہ، فرمودات سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اذنِ الٰہی کے ساتھ کیوں مؤثر نہیں ہو سکتے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: جو ایک مریض پر دم فرما کر کہا: تربة أرضنا بريقة بعضنا يشفي سقيمنا بإذن ربنا۔ [ترمذي]۔ سب سے بڑا ثبوت تو ان دونوں سورتوں کا نزول ہے، اور یہ کہ ان کے پڑھنے کی برکت سے جادو کا اثر بالکل ختم ہو گیا، اور آئندہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوتے وقت ان کو پڑھنے کا معمول بنایا۔ [بخاري، مسلم، ترمذي، أبو داؤد، ابن ماجة وغيرهم]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن، حضرت اور حسین رضی اللہ عنہما کو ان کلمات کے ساتھ دم فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کلمات کے ساتھ حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام کو دم فرماتے، یعنی: أعيذ كما بكلمات الله التامة من كلّ شيطان وهامة ومن كلّ عين لامة۔ [بخاري، أحمد، ابن ماجة، ترمذي عن ابن عباس وابن عمرو عبدالله بن عمرو بن العاص]

حضرت حفصہ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے، میرے پاس شفاء نامی ایک عورت موجود تھی، جو نملہ (ذباب) کا دم کیا کرتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شفاء اپنے والا دم حفصہ کو بھی سکھاؤ، شفاء بنت عبداللہ نے کہا کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے

حفصہ کو جس طرح لکھنا پڑھنا سکھایا ہے اسی طرح نملہ کا دم بھی اسے سکھادو۔ [أبو داؤد، نسائي، مسند أحمد وغیرهم]

صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر پوچھا: اے محمد! آپ بیمار ہوگئے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! انہوں نے کہا: بسم اللہ أرقیک من کل شیء یؤذیک من شر کل نفس أو عین۔ اللہ یشفیک باسم اللہ ارقیک۔ حضرت عثمان بن العاص ثقفی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں جب سے اسلام لایا ہوں، مجھے ایک درد محسوس ہوتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: درد کی جگہ سیدھا ہاتھ رکھو پھر تین مرتبہ بسم اللہ شریف اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھو، ہاتھ پھیر دو: أعوذ بعزة اللہ وقدرته من شر ما أجد وأحاذر۔ [حاکم، مسلم، طبراني، موطأ] عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرا درد جاتا رہا اور صحت ہوگئی۔

مطلب یہ ہے کہ ان روایات کے علاوہ کئی احادیث سے دم تعویذ کا جواز ثابت ہے، البتہ ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے جو منع فرمایا تھا تو اس لئے کہ عام طور پر دم کرنے والے ایسے کلمات سے دم لگاتے، جن میں شرک کا شائبہ ہوتا، یا مہمل کلمات ہوتے یا اس لئے کہ جواز اگرچہ ثابت ہے مگر مستحسن نہیں، کیونکہ توکل کے منافی ہے، یا اس لئے کہ پھر لوگ مستقل عادت بنا کر دوسری تدبیروں کو ترک کریں گے، جیسے کہ آج کل ہمارے زمانہ میں ہورہا ہے، جہاں لوگوں نے اسی پر انحصار کیا ہوا ہے، تعویذ گنڈوں کا دھوم دھام ہے، لوگوں نے باقاعدہ پیشہ بنا کر خوب تجارت وکاروبار کا ذریعہ بنایا ہے، اور منظم طریقوں پر اخبارات میں اشتہار شائع کرا رہے ہیں، بڑے بڑے بورڈوں کے ذریعہ اس فن کی تشہیر ہورہی ہے۔

بعض لوگ اتنا مال اور شکرانہ کما رہے ہیں جو بیچارے کارخانہ دار بھی نہیں کما سکتے ہیں، پورا معاشرہ تعویذ گنڈوں میں اتنا غرق ہے کہ ادنیٰ غریب سے لے کر وزراء وصدر مملکت تک لوگ اس غیر شرعی غیر اخلاقی پیشے پر نذر ہورہے ہیں۔ ہندوؤں کے شرک وطلسمات مسلمان قوم میں اتنی قوت سے سرایت کر چکے ہیں کہ حطام دنیا کی خاطر سب کچھ قربان کررہے ہیں، ایک ایک تعویذ پر لاکھ لاکھ روپیہ اور لاکھوں کی قیمتی گاڑیاں تعویذ گروں کی خدمت میں پیش کررہے ہیں، اور پورے معاشرے پر عنکبوت مکڑیوں کا جالا بچھا ہوا معلوم ہورہا ہے۔ لا حول ولا قوة إلا باللہ

اندکے باتو بگفتیم ولے می ترسیم ☆ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار ست

حسبنا اللہ ونعم الوکیل

سُورَۃُ النَّاسِ

مَكِيَّة آياتها ۶ ركوعها ۱

سورۂ ناس مکی ہے، اس کی چھ (۶) آیتیں، اور ایک رکوع ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الناس ہے، پہلی آیت کے لفظ النَّاس سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، دوبارہ ملاحظہ ہو: اس کا نزول سورۃ الفلق کے ساتھ ہے، اس کی آیات چھ (۶) ہیں، کلمات کی تعداد بیس (۲۰) اور حروف اسی (۸۰) ہیں۔

ربط ومناسبت:

سورۃ الفلق میں دنیوی آفات ومصائب سے پناہ مانگنے کی تعلیم تھی، اور اس سورت میں اخروی آفات سے پناہ مانگنے کا حکم ہے، گویا کہ اس سورت میں مصائب وآفات کی بنیاد شیطانی وساوس سے پناہ مانگنے کی تاکید ہے جو کہ آخرت کے لیے سخت نقصان دہ ہے، اور مؤمن کے لیے یہ سب سے اہم اور ضروری ہے، اسی لئے اس کے سبب سے بچنے کی شدت تاکید کے ساتھ قرآن حکیم کو ختم کیا گیا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۙ
الۡخَنَّاسِ ۙ﴿۴﴾ الَّذِىۡ يُوَسۡوِسُ فِىۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾

ترجمہ: آپ کہہ دیں: میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے ربّ کی ① انسانوں کے بادشاہ ② انسانوں کے حقیقی معبود کی ③ اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے ④ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے ⑤ خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے ⑥

معارف ومنازل

سورۃ الفلق میں مستعاذ منہ تین چیزیں ہیں: (غاسق، جادو، حاسد) اور مستعاذ ایک ہے یعنی ربّ الفلق، لیکن اس سورۂ ناس میں اس کے برعکس ہے، یعنی مستعاذ منہ ایک ہے (وسوسہ) اور مستعاذ تین ہیں: (صفاتِ الٰہیہ، ربّ، ملک، الٰہ) اس میں نکتہ یہ ہے کہ سورۃ الفلق میں دنیوی جسمانی مضرتوں کا بیان تھا اور وہ متعدد ہوسکتی ہیں، اور سورۂ ناس میں روحانی اخروی مضرت کا بیان ہے اور وہ ایک ہے، یعنی وسوسۂ شیطانی۔

﴿بِرَبِّ النَّاسِ﴾ رَبّ کے معنی پالنے والے، اصلاح کرنے والے یعنی آہستہ آہستہ تدریجاً نہایت لطف وشفقت کے ساتھ مربوب کو اس کے ابتدائی حال سے ترقی دے کر انتہائی حال کمال تک پہنچانا جس درجہ تک اس کی حد ہو (تفصیل دیکھنا چاہو تو سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں دیکھو)۔ اس سورت میں ''رَبّ'' کی اضافت النَّاس کی طرف کی گئی، سورۃ الفلق میں ''رَبّ'' کی اضافت اَلْفَلَق کی طرف، نکتہ یہ ہے کہ سورۃ الفلق میں ظاہری اور جسمانی آفات سے پناہ مانگنے کا بیان تھا، اور وہ آفات انسان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دوسرے حیوانات کو بھی جسمانی آفات پہنچتی رہتی ہیں، بخلاف شیطانی وساوس کے کہ وہ انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں گو کہ جنات بھی تبعاً اس میں شامل ہیں، اس لئے یہاں اضافت انسان کی طرف کی گئی۔ [مظهري وغيره]

لفظ ''رَبّ'' اگر کسی خاص چیز کی طرف منسوب ہو جیسے: رب الأرض، رب المال، رب الغلام، رب الدار، وغیرہ تو اس میں عموم ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لئے بھی بولا اور کہا جاتا ہے بمعنی مالک کے یعنی گھر کا مالک، مال کا مالک، اور یہ بات واضح ہے کہ ہر مالک بادشاہ نہیں ہوتا، اس لئے ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ کا اضافہ کیا

گیا، یعنی وہ ربّ جو مالک بھی ہے اور بادشاہ بھی، پھر چونکہ ہر بادشاہ معبود نہیں ہوتا، اس لیے ﴿اِلٰهِ النَّاسِ﴾ تیسری صفت کا اضافہ کیا گیا، ان تینوں صفات کا مصداق حضرت حق سبحانہ ہی ہے جو ربّ بھی ہے اور مالک و بادشاہ بھی ہے اور معبود بھی، یہ تینوں شانیں اس کی صفات ذاتی ہیں بلاشرکت غیر کے۔

ان تینوں صفات کو جمع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ان میں سے ہر صفت حفاظت کی داعی اور مقتضی ہے، اس لئے کہ ہر مالک اپنے مملوک کی حفاظت کرتا ہے، اسی طرح ہر بادشاہ اپنی رعیت و ملک کی حفاظت کرتا ہے، اور معبود برحق کا اپنے عابد کی حفاظت کرنا تو بالکل اظہر من الشمس ہے، جب یہ تینوں صفات صرف حق تعالیٰ شانہ میں جمع ہیں اس کے سوا کوئی دوسرا ان تینوں صفتوں کا جامع نہیں اس لئے اس کی پناہ حاصل کرنا سب سے مضبوط بڑی پناہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ان تینوں صفات کے ذریعہ استعاذہ کرنا دعا مانگنا اقرب الی الاجابۃ اور یقینی ہے، کیونکہ وہی ربّ اور بادشاہ واِلٰہ ہے، اس لئے اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ جس سے ہم پناہ مانگیں اس لئے کہ اس کا غیر کسی بھی حقیقی پناہ دینے پر قادر نہیں، اور اس کے غیر میں جب یہ صفات مفقود ہوں تو وہ کیسے قابل ہوگا کہ اس کے حضور ہم ہاتھ پھیلائیں، کیونکہ ربوبیت، بادشاہت، مالکیت، معبودیت، قدرت، علم، جود وسخا اور بخشش یہ ساری صفات اسی ذات واحد لاشریک رحمن ورحیم کے ساتھ مختص ومخصوص ہیں، تو ہر التجاء ودعوت استعاذہ واستغاثہ اسی کے بارگاہ وحضور میں زیب دیتا ہے، اور اطمینان وحوصلہ افزاء ہے۔

حضرت امام ابوالقاسم السہیلی رحمۃ اللہ علیہ نے روض الانف میں جو مناجات ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ میرا تجربہ ہے کہ جو شخص حسن ظن اور شوق وطرب کے ساتھ آداب وطہارت سے اس کو پڑھے گا تو اس کی حاجت برآری ہوگی، اور جس مقصد کے لیے اول وآخر درود شریف پڑھ کر استغاثہ کرے گا تو اس کی حاجت پوری ہوگی وہ یہ ہے:

یامن یریٰ مافی الضمیر ویسمع ★ انت المعد لکل مایتوقع
یامن یرجیٰ للشدائد کلها ★ یامن الیه المشتکیٰ والمفزع
یامن خزائن جودہٖ فی قول کن ★ امنن فان الخیر عندک اجمع
مالی سوا فقری الیک وسیلة ★ فبالافتقار الیک فقری ادفع
مالی سوا قرعی لبابک حیلة ★ فلئن رددت فایّ باب اقرع
ومن الذی ادعوواهتف باسمه ★ ان کان فضلک عن فقیرک یمنع

حاشا لجودک ان تقنط عاصیا ★ الفضل اجزل والمواهب اوسع
ان کان لایرجوک الامحسن ★ فالمذنب العاصی الیٰ من یرجع
ثم الصلوٰة علی النبی واٰلہ ★ خیر الانام ومن بہ یتشفع

اللہ ربّ العزّت اس بندے کو پسند کرتا ہے جورات دن ہر لحہ ذکر اللہ اور دعا وتضرع میں ہمہ تن ہر وقت مشغول ہو، فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرة: ١٥٢] (پس تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا) اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ عرش پر ملاء اعلیٰ میں کسی بندے کو یاد فرمائے۔

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ وسواس مصدر ہے بمعنی وسوسہ، شیطان کو بطور مبالغہ وسواس کہا گیا ہے، کیونکہ وہ وسوسہ ڈالتے ڈالتے سراپا وسوسہ بن گیا جیسے کہتے ہیں زید عدل وسوسہ کہتے ہیں، مخفی برے خیالات کو اور وسوسہ کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کچھ مخفی کلام کے ذریعہ لوگوں کو اپنی فرمانبرداری کی طرف بلاتا ہے، اور وہ مخفی کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم انسان کے قلب میں آجاتا ہے، اور کوئی آواز باہر سے محسوس نہیں ہوتی۔

﴿الْخَنَّاسِ﴾ یہ ﴿الْوَسْوَاسِ﴾ کی صفت ہے جس کے معنی پیچھے لوٹنے کے ہیں، شیطان کو خناس اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی یہ عادت ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہ پیچھے کو بھاگ جاتا ہے، اور جب کچھ سکوت یا غفلت طاری ہو تو پھر آ کر وسوسہ ڈالنا شروع کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مؤذن اذان شروع کرتا ہے تو شیطان پیچھے سے ہوا نکالتے ہوئے اتنا دور بھاگ جاتا ہے جہاں مؤذن کی آواز نہ پہنچے، اور جب اذان ختم ہوجاتی ہے تو وہ دوڑتا ہوا واپس آجاتا ہے، جب اقامت شروع ہوجاتی ہے تو وہ دوبارہ بھاگ جاتا ہے اقامت کے اختتام پر واپس آکر نمازیوں کو پریشان کرتا ہے اور ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، حتیٰ کہ بیشتر نمازی نماز میں سہو کرتے ہیں رکعتوں کی گنتی اور ارکان میں غلطی کرکے پریشان ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ سجدہ سہو کی نوبت آجاتی ہے۔ [بخاري]

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان کے دل میں دو خانے ہیں: ایک میں فرشتہ رہتا ہے دوسرے میں شیطان (فرشتہ نیکیوں پر رغبت دلاتا ہے شیطان برائیوں پر) پھر انسان جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ ذکر میں مشغول نہیں ہوتا یعنی غافل ہوجاتا ہے تو وہ اپنی چونچ انسان کے دل پر رکھ کر اس میں برائیوں کے وسوسہ ڈالتا ہے، اور دل میں برائیوں کے خیال ایسا داخل کرتا ہے جیسے مچھر اپنے سونڈھ کے

ذریعہ انسان کے بدن میں اپنا زہر پیوست کرتا ہے۔امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح مکھی کسی حلوایا غذا پر بیٹھ کر اسے چوستا ہے بعینہٖ اسی طرح انسان کے دل پر شیطان بیٹھتا اور چوسنا شروع کرتا ہے، نیکیوں سے دوری اور برائیوں پر انسان کو رغبت دلا کر معاصی پر آمادگی کی کوشش کرتا ہے۔

فائدہ:

سورۂ تکویر میں: ﴿فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ۝۱۵ الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ۝۱۶﴾ [التکویر] کے تحت الخنس والخناس کی کچھ تفصیل گزر چکی ہے۔مطلب یہ ہے کہ جس طرح خنس کا اطلاق ستارے پر ہوتا ہے اسی کیفیت کے ساتھ خنس کا اطلاق شیاطین پر بھی ہوتا ہے وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

﴿مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ یہ وسواس کا بیان اور اس کی نشاندہی ہے، کیونکہ وسوسہ ڈالنے والے جنات شیاطین میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی، قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ﴾[الأنعام: ۱۱۲] (اوراسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن مقرر کیے ہیں، انسانوں اور جنوں کے شیطان)۔

تفسیر لباب وغیرہ نے کہا ہے کہ کلمہ النّاس کو صراحت کے ساتھ پانچ مرتبہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ لفظ الناس سے مراد جدا جدا مطلب ومراد ہے، اگر یہاں اسم ظاہر کے تکرار کی بجائے ضمیر استعمال کی جاتی تو ایک ہی مفہوم مراد ہو جاتا، یعنی وحدت مراد ہوتی اور کلام کا مقصد پورا نہ ہوتا، کیونکہ اول الناس سے مراد بچے ہیں جو پرورش کے محتاج ہوتے ہیں، اور لفظ رَبّ اس پر دلالت کر رہا ہے، دوسری جگہ الناس سے مراد عقلاً جوان ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، لفظ مَلِك اس پر دلالت کر رہا ہے، کیونکہ لفظ مَلِك میں عروج وسیاست کے معنی موجود ہیں، اور مجاہد سیاست کا تابع ہوتا ہے، تیسری جگہ الناس سے بوڑھے عمر رسیدہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو دنیوی کاروبار اور مشاغل سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، اس پر لفظ اِلٰه دلالت کر رہا ہے جس کے اندر عبادت کا مفہوم ہے، اور بوڑھے لوگوں کا مشغلہ عبادت ہی متعین ہے، چوتھی جگہ الناس سے مراد اہل صلاح وتقویٰ ہیں، کیونکہ شیطان انہی کا دشمن ہوتا ہے، پانچویں جگہ الناس سے مراد اغواء کرنے والے مفسدین ہیں، کیونکہ یہ وہی خناس ہیں جن سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو اس کا تعلق ماں باپ کے ساتھ ہوتا ہے اور وہی حتی

المقدور اس کی پرورش کرتے ہیں، گویا اس وقت بچے کی ساری کائنات اس کے والدین ہی ہوتے ہیں، لہٰذا یہاں النَّاسِ کے ساتھ صفت ربوبیت کا ذکر ہے بِرَبِّ النَّاسِ، لیکن جب یہ بچہ بڑا ہوجاتا ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض ضروریات ایسی ہیں کہ والدین ان کے پورا کرنے سے عاجز ہیں، اور ایسی ضروریات کے لیے حاکم یا بادشاہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، تو یہ بات اس کی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ماں باپ کے بعد کسی دوسری ہستی کے تعاون کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہستی بادشاہ ہے تو اس موقع پر اسے اللہ تعالیٰ کی صفت مالکیت کی ضرورت پڑتی ہے تو دوسرے نمبر پر آگیا مَلِكِ النَّاسِ، لیکن اس کے بعد اسے یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ضروریات زندگی کے کچھ ایسے مراحل بھی ہیں جنہیں نہ والدین پورا کرسکتے ہیں اور نہ ہی بادشاہ مثلاً سردی، گرمی، رزق، اولاد، سعادت، وغیرہ، یہ وہ مسائل ہیں کہ ماں باپ اور بادشاہ کے علاوہ کسی بلند وبالا ہستی کے دائرۂ اختیار میں ہوتے ہیں جو کہ انسانی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے پر قادر ہے تو اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہستی اللہ جل شانہ ہے تو اس پر صفت الوہیت کا ذکر مناسب ہوا اِلٰهِ النَّاسِ۔

جب یہ واضح ہوا کہ الٰہ ومعبود برحق کے سوا کوئی تمام ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا، اور نہ کوئی حقیقی تربیت کرسکتا ہے، اور نہ کوئی حقیقی مالک ہے تو پھر حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی محبوب ومقصود بھی نہیں ہوسکتا، وہ تمام محبوبوں کا محبوب ہے، اور سب کا الٰہ برحق ومقصود بھی ہے جو کہ الصَّمَدُ کے معنی ہے، بات تربیت سے چلی اُلوہیت پر اس کی انتہاء ہوگئی، اب اس کی معرفت ومحبت کو حرزِ جان بنا کر اس کے ہر حکم پر بصد محبت ورغبت مال وجان اور اولاد تک کی قربانی کا مصمم عزم کرکے اس پر عمل کرنا ہوگا۔

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد ☆ فارغ از بند زن واولاد شد
می کند از ماسوا قطع نظر ☆ می نہد ساطور بر حلق پسر

ایسے موقع پر انسان محبت وعقیدت کی بدولت آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا، مگر ابلیس لعین ہر ممکن پوری قوت کے ساتھ محض وسوسہ کیا بلکہ ہتھیاروں سے مسلح ہوکر مقابلہ کے لیے میدان میں اترے گا، مگر ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ [الحجر: ۴۲] (بیشک میرے بندوں پر تمہارا کوئی اختیار نہیں ہے) والا فیصلہ سامنے آئے گا، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام تینوں مرتبہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے کہنے پر ابلیس پر سنگباری کرکے اسے ذلت آمیز شکست سے دوچار کردیا، جس کی سنت پر قیامت تک حجاج کرام شیطان پر سنگباری کریں گے، اور عام

مسلمان استعاذہ کی سنت پر عمل پیرا رہیں گے، اسی مناسبت سے فرمایا:

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ. الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾ یہاں النَّاسِ سے مراد اہل صلاح واہل تقویٰ ہیں، جنہیں ربّ العزّت کی اُلوہیت وتوحید پر پختہ اور مصمم یقین ہے، اور اس کی محبت ومحبوبیت اور معرفت کی لذتوں سے شناسا ومحظوظ ہیں۔ ربّ العزّت ہمیں سب کو اپنی محبت ومعرفت نصیب فرمائے۔ آمین

حضرت مالک بن دینارؒ نے کہا: بڑا افسوس اور صدمہ ہے کہ لوگ سب سے اچھی لذیذ چیز کا مزہ چکھے بغیر دنیا سے چلے جاتے ہیں، یہ ان کے لیے بڑی محرومی ہے، لوگوں نے پوچھا: حضرت! وہ کونسی چیز ہے؟ فرمایا: محبت ومعرفت الٰہی، یعنی ذات واحد جل شانہ کی پہچان، گویا یہ نعمت تمام نعمتوں سے افضل اور بلند وبالا ہے۔ [حلية الأولياء أبو نعيم رحمه الله] حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے فرمایا کہ شیطانی وساوس اگرچہ بے شمار بکثرت ہیں، مگر ابلیس کے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ وساوس حضرت باری تعالیٰ جل شانہ کی ذات وصفات اور دیگر مقامات کے بارے میں ہوتے ہیں، کیونکہ ایمان یہیں سے بنتا ہے، اور ابلیس کی دشمنی وعداوت کا مرکز یہی ایمان ہے جو کہ سارے اعمال خیر اور سعادتوں کا موقوف علیہ اور بنیاد ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کے دل پر خیالات وخطرات اس طرح وارد ہوتے ہیں جس طرح بارش کے قطرات زمین پر گرتے ہیں، مگر انسان یہ جاننے سے قاصر ہے کہ خیالات کے وارد ہونے کے اسباب کیا ہیں، جب انسان کا عقیدہ پختہ ہوجاتا ہے تو ارادہ پختہ بنتا ہے اس کے بعد عزم ہوتا ہے پھر جب فعل شروع ہو تو شیطان اس میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ [حجة الله البالغة]

اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی کوشش کرے، اور اللہ تعالیٰ کا ذکر شروع کرے، انسان کا ایمان وعقیدہ سب سے بڑا قیمتی سرمایہ ہے، سارا جہاں ایک طرف ایمان کا سرمایہ ایک طرف یہی وجہ ہے کہ صرف ایک مسلمان پورے جہاں کے کافروں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ قیمتی اور پسندیدہ ہے تو شیطان ہمیشہ پیچھے لگا رہتا ہے تاکہ اس قیمتی سرمایہ کو خراب کرکے انسان کو ایمان کی دولت سے محروم کردے، مگر اس کے شر سے وہ مسلمان بچ سکتا ہے جو ربّ العزّت کی پناہ میں آجائے، اس کا طریقہ خود ربّ العزّت نے تجویز کیا، اور فرمایا:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝۴﴾۔ کہ شیاطین الانس والجن کے شر سے بچنے کی خاطر اللہ تعالیٰ شانہ کی پناہ میں آنے کی کوشش کرو، جب اللہ تعالیٰ کی پناہ

تمہیں حاصل رہے گی تو شیطانی وسوسے سارے بیکار ہو جائیں گے۔سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں مزید تفصیلات ہیں وہاں رجوع کیا جائے۔

فائدہ:۔

﴿فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾ کے جملے میں شیاطین الجن والانس کے وساوس کو ''صدور'' یعنی قلوب کے ساتھ اس لئے مقید فرمایا کہ انسانی بدن کے دوسرے اعضاء اول تو کسی وسوسہ کو قبول نہیں کرتے،اور وہ براہ راست کسی وسوسہ سے متاثر بھی نہیں ہوتے، بخلاف قلب کے کہ وہ نہایت نازک حساس عضو ہے، وہ معمولی باتوں سے فوراً متاثر ہوتا ہے، اور اس کا اثر خود بخود دوسرے اعضاء کو بھی متاثر کرتا ہے۔حدیث میں اس کے متعلق ارشاد ہے: **إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله۔** [بخاري] دل کو پورے بدن پر حکمرانی حاصل ہے، اس کی صلاح پورے بدن کی صلاح ہے، اور اس کے فساد سے پورے بدن میں فساد پھیل جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کا دل شیطانی وساوس سے متاثر نہیں ہوتا، وہ ہر قسم دفاع کی قوتوں سے فوراً مسلح و مالا مال ہوتا ہے، غافل اور برے لوگوں کے قلوب اس قسم کی قوتوں سے خالی ہیں وہ فوراً شیطانی وسوسوں کا شکار ہو جاتے ہیں، اور سب کچھ کر گزرتے ہیں۔نعوذ باللہ

حکایت:۔

کہتے ہیں کہ یونانی حکیم افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے امتحان کے طور پر پوچھا کہ بتاؤ اگر سارے آسمان تیر کمان ہوں، اور سارے ستارے اس کے گولے ہوں، اور تیروں کا رخ زمین کی طرف ہو، اور چلانے والا ربّ العزّت سبحانہ ہو تو نجات کی کیا صورت ہوگی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب ارشاد فرمایا کہ نجات کی واحد صورت تیر چلانے والے کا قرب (پناہ) اور گود ہوگی، اس کے علاوہ نجات کی کوئی صورت متصور نہیں، حکیم افلاطون نے جواب کو سراہا اور کہا کہ ایسا جواب نبی ہی دے سکتا ہے نہ اور کوئی۔

انسانی دشمن کبھی ظاہر ہوتا ہے کبھی مخفی، چھپا ہوا ظاہری دشمن (انسان ہے) جتنا طاقتور اور مکار خطرناک ہو مگر کسی طرح طمع لالچ سفارش، لحاظ، رشوت، یا کسی احسان، لین دین کے ذریعہ کبھی صلح و مصالحت پر آمادہ ہو سکتا ہے یا کسی بیرونی دباؤ کی وجہ سے بھی مصالحت پر اسے راضی کیا جاسکتا ہے، مگر انسان کا ازلی مخفی طاقتور دشمن شیطان لعین کبھی کسی تدبیر و حیلہ سے کسی مصالحت پر آمادہ ہرگز نہیں ہو سکتا، وہ اتنا زبردست عیار و مکار دشمن ہے کہ اسے کبھی تدبیر سے

شکست نہیں دی جاسکتی، وہ ربّ العزّت سبحانہ کے حضور بڑی دلیری اور ہٹ دھرمی سے قسم کھا کر کہا تھا: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [صٓ: ۸۲] (تیری عزّت وعظمت کی قسم میں تمام اولادِ آدم کو گمراہ کر کے رہوں گا)۔

پھر ایک طرف سے یہ عیار ومکار چالباز ازلی دشمن اکیلا تنہا بھی نہیں اس کا وزیر بے تدبیر دوسرا مخفی دشمن نفس امارہ ہر موقع قدم بقدم اس کا معاون ورفیق کار ہے، اور بعض امور میں وہ شیطان سے چند قدم بھی آگے ہے، جب یہ دونوں مل کر کسی کارروائی پر آمادہ ہوتے اور اقدام کرتے ہیں تو بڑے صاحب ہمت لوگ روحانی ہستی بھی کانپ اٹھتے اور راستہ گم کرتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں وزیر ووکیل ہر وقت مسلح ہو کر جب حملہ آور ہوتے ہیں، تو سوائے تائید ایزدی اور حفاظت خداوندی کے کوئی تدبیر انسان کو نہیں بچاسکتی، اس لئے ضروری ہوا کہ انسان خاص کر مؤمن ہمیشہ ان کے شر وفتنوں سے محفوظ رہنے کی خاطر حق تعالیٰ شانہ کی پناہ کی تلاش میں رہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مؤمن کا ازلی طاقتور چالباز دشمن شیطان ہی ہے، اور اس کا معاون خاص نفس امارہ جو دونوں پہلوؤں کے درمیان میں ہے، یہ دشمن کسی مصالحت پر آمادہ نہیں اور نظر سے مخفی وپوشیدہ ہے، مکر وفریب میں بڑا ماہر، انسانی تدبیروں سے بالاتر بھی ہے، انسانی بدن کے رگ وخون میں پیوست جاری ساری بھی ہے، اپنے کام سے غافل بھی نہیں، ہوا کی طرح تیز رفتار بھی ہے، تو پھر ایسے چالاک دشمن سے نجات کا ذریعہ وسامان قرب وپناہ الٰہی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، یہی وہ محفوظ ایزدی قرب وجوار ہے جس کا توڑ نفس وشیطان کے پاس نہیں، یہی قرب وپناہ ایزدی تمام شیطانی چالوں سے مکمل دائمی نجات وخلاصی کا سامان ہے اور بس۔

قرآن کریم نے ارشاد فرمایا: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ [الزمر: ۳۲] (کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟)۔ ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ [حٰمٓ سجدة: ۳٦] (اور اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کبھی کوئی کچوکا لگے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو)۔ یعنی ربّ تعالیٰ کے مضبوط قلعے میں پناہ لے لو جہاں شیطان کی رسائی نہیں ہوتی۔

سلف وخلف کے علماء ربانیین نے بے شمار آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تمام ظاہری وباطنی دشمنوں کا مقابلہ قوت ایمانی اور اتباعِ شریعت وتقویٰ سے کیا جائے، کیونکہ مؤمن کی پوری زندگی اور تمام اعمال خیر میں ایک طرف نفس وشیطان کے ساتھ دوسری طرف کفار ومنافقین اور ملحدین کے ساتھ مقابلہ رہتا ہے، یہ دونوں قسم کے عیار دشمن ہمیشہ بدخواہی اور قتال وجدال پر آمادہ رہتے ہیں، پس ایسے دشمنوں پر فتح پانا اور انہیں شکست فاش

دینا سوائے نصرت الٰہی کے نہایت مشکل ہے، اور نصرت الٰہی کی آمد وحصول تہذیب نفس عمل صالح، تقویٰ، اتباع شریعت وسنت، طہارتِ ظاہر وباطن پر موقوف ہے، قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی نصرت کو انہیں چیزوں پر موقوف ومشروط رکھا، فرمایا: ﴿إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ﴾ [محمد:۷] (اگر تم اللہ کی مدد کرو تو وہ تمہاری مدد کرے گا)۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت یا اس کی پناہ ہمیں اس وقت نصیب ہوگی جب ہم ہر اعتبار سے اس کے حقدار ہوں گے اور یہ ہماری قوت ایمانی اور صبر وتوکل اور اعتماد علی اللہ پر موقوف ہے، کئی لوگوں نے مختلف محاذوں پر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کی پناہ سے اس لئے محروم رہے کہ ان کے پاس قوت ایمانی اور ظاہری وباطنی طہارت کا فقدان رہا، البتہ مافوق الاسباب اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وحکمت کی بناء پر اگر کسی بے عمل انسان کی نصرت فرمائے، یا اسے امان وپناہ میں رکھے تو وہ اس پر قادر ہے، اور وہ جو بھی فیصلہ فرمائے وہ سزاوار لائق ہے، کیونکہ وہ ہر چیز کا مالک ورب ہے۔ واللہ اعلم

قرآن حکیم کے شروع کا اختتام کے ساتھ ربط ومناسبت:

نمبر شمار	سورۃ الفاتحہ میں فرمان الٰہی	نمبر شمار	سورۃ الناس میں فرمان الٰہی
۱	اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲	۱	قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱
۲	مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳	۲	مَلِكِ النَّاسِ ۝۲
۳	اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴	۳	اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳
۴	اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷	۴	مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝۴ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۶

ایسا لگتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے اخیر میں جن مغضوب علیھم اور ضالین کا تذکرہ ہے، وہی یہود ونصاریٰ ہی ہیں جن کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم سورۃ الناس کے آخر میں ہے، اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ زمانہ نزول قرآن سے لے کر آج تک اور آج کے بعد قیامت تک جو شر وفساد دنیا میں جاری ہے، اور جتنے جرائم اور بدامنی وہر قسم کی تباہی پھیلی ہوئی ہے کرۂ ارض حتیٰ کہ سمندری حدود بھی ہر قسم کے فساد کے لپیٹ میں ہیں، ان تمام بدامنیوں کا سہارا یہودیت ونصرانیت ہے، اور یہ سارے تباہ کن حربے انہی شیطانی صفت دونوں منحوس قوموں کی پیداوار ہیں، چاہئے کہ مسلمان

قوم ہر موقع ہر وقت ان شیاطین الانس والجن کے ظاہری و باطنی شر سے پناہ مانگیں، اور اللہ تعالیٰ کی مضبوط پناہ میں آنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر سمندر میں مچھلیاں آپس میں لڑتی ہوں تو یقین کریں کہ اس لڑائی میں ضرور مغرب کا ہاتھ اور شرارت شامل ہے۔ نعوذ باللہ من الشیطان و من شر أبناء الشیاطین الیھود و النصاریٰ۔ اللّٰھم إنا نجعلک في نحورھم و نعوذ بک من شرورھم۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں فساد پھیلا کر دجال اکبر خبیث کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں، شیطانی جتنے کارنامے دنیا میں چل رہے ہیں ان سب کو یہود و نصاریٰ کی سرپرستی حاصل ہے، اور انہی گمراہیوں کے ذریعہ وہ دجال کو دعوت دے رہے ہیں۔

بعض محققین نے لکھا ہے کہ قرآن حکیم کی ابتداء ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کے لفظ ''ب'' سے ہے، اور اس کی انتہاء لفظ ''سین'' پر ہے، مجموعہ ''بس'' ہوتا ہے، جس کے معنی کافی کے ہیں، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن حکیم دنیوی اخروی دینی دنیاوی زندگی کے تمام امور میں مسلمان قوم کے لیے کافی شافی ہے، کیونکہ دونوں جہانوں کے سارے مسائل وضروریات کا حل قرآن پاک کی ہدایات وتعلیمات میں موجود ومنحصر ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول وفرمان ہے۔

اول وآخر قرآن زچہ با آمد وسین ☆ یعنی اندر رہ دین رہبر تو قرآن بس

حکیم سنائی

اللّٰھم ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم، وتب علینا إنک أنت التواب الرحیم، وتقبل من عبدک الضعیف المذنب العاصي ھذہ البضاعة المزجت وأوف له الکیل وتصدق علیه واغفر له و ارحمه ولوالدیه ولمشائخه وأساتذته وانفع به المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات وطلبة العلم والطالبات، واجعلھا مقبولة محمودة بین العلماء والمعلمین والمعلمات کما تقبلت من عبادک المخلصین والمخلصات بجاہ سید الأنبیاء وخاتم المرسلین علیه وعلی اٰله وصحبه أفضل الصلوٰة وأزکی التسلیمات۔

الحمد للہ آج شب عید الفطر ۱۴۳۲ھ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے تفسیری فوائد اختتام کو پہنچے، اور اسی کے ساتھ قرآن کے آخری دونوں پاروں کی تفسیر مکمل ہوئی، اس سلسلے میں ناچیز ہیچمدان اپنے پروردگار سبحانہ وتعالیٰ کا جتنا

شکر بجالائے اور ساری زندگی اس نعمت عظیمہ جلیلہ کا شکرانہ ادا کرتا رہے شاید ادا نہ ہو۔ میں بے علم و بے ہنر یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ اتنا بڑا مبارک کام ''تفسیر قرآن حکیم'' میرے کمزور شکستہ قلم سے بخیر وخوبی انجام پائے گا، لیکن ربّ العزّت جل شانہ کی توفیق وکرم نے میری دستگیری فرما کر اس مبارک عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

اللّٰهم لک الحمد کماینبغي لجلال وجهک وعظیم سلطانک، لا إله إلا أنت سبحانک وبحمدک استغفرک وأتوب إلیک، ولا حول ولا قوة إلا بک أنت حسبنا ونعم الوکیل

فقیر سید عبدالستار شاہ عفا اللہ عنہ

جامعہ رحیمیہ نیلا گنبد کوئٹہ